

نجلوں کی لہجہ میں

فاخرہ جبین



اُجالوں کی بستی میں

رات نجانے کیسی قیامت گود میں لے کر آئی تھی۔ سرشام ہی پورب سے اٹھنے والا گرد کا طوفان ایک لخت ہی ماحول کو سیاہ چا اور اوڑھا گیا تھا۔ شائیں۔۔۔ شائیں چلتی منہ زور ہوا۔۔۔ درختوں کی ٹوٹی ٹہنیاں، دھڑ دھڑ بجتے دروازے اور کھڑکیاں۔

ابامیاں گھر پر نہ تھے۔ منی خالہ فکر مند اور وہ خود خوفزدہ ان کی ساڑھی کا پتو مٹھی میں دبوچے صحن اور برآمدے سے چیزیں سمیٹنے میں لگی رہی۔ پانی کا مٹکا، کھوئی سے لٹکتی ابامیاں کی واسکٹ۔ ان کا مچن، برآمدے کے تخت پر پڑی چند ایک کتابیں جو منی خالہ نے پڑھتے پڑھتے یوہی رکھ چھوڑی تھیں۔ اور اسی دوران انہیں خبر ہی نہ ہوئی۔ دروازے پر دستک ہوئی رہی۔ مسلسل، لگاتار۔

وہ اس طوفان سے خوفزدہ ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے چھوٹے کمرے میں آئے۔ ہی پلنگ پر بیٹھی کیکیا پانی رہیں۔ دیواریں، چھتیں، لرز رہی تھیں، بند کھڑکیوں کے تختے بجنے لگے تھے۔ طاق میں جلتے دیے کی لوکی بارلرزی، اور پھر کوئی سہارا نہ پا کر یک دم بجھ گئی۔ وہ آنکھیں نیچ کر منی خالہ کے بازوؤں میں ٹھس گئی تھی۔ دروازے کی جھریوں سے گرد آلود ہوا دبے پاؤں اندر آئی اور ہولے ہولے پھنکارنے لگی تھی، ایسے میں دستک کی آواز کہاں سنائی دیتی۔

پھر معلوم نہیں؟ کتنا وقت یونہی بیت گیا۔ کمرے میں جس اور گھٹن کی فراوانی ہو گئی۔ بند کھڑکی پہ جلتے رنگ سی بجنے لگی تب منی خالہ اٹھیں۔ چراغ روشن کیا۔ ادھ جلی دیا سلائی ابھی ان کے ہاتھ میں ہی تھی جب اس نے اٹھ کر کھڑکی کا بٹ کھول دیا۔ بارش کی ہلکی سی پھوار سیدی اس کے چہرے پر آ کر پڑی تھی۔

”بارش۔۔۔“ اس نے فقط اتنا ہی کہا تھا جب منی خالہ زور سے چوکیں۔ خود وہ بھی حتماً ہوئی۔

دروازے پر دستک۔۔۔

جملہ حقوق محفوظ ہیں

بار اوّل 2012

ناشرین خواتین ڈائجسٹ

پریس پرنٹ لائن

قیمت 400 روپے

سول ایجنٹ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی

”کون۔۔۔؟ کون۔۔۔؟“ انہوں نے عجلت میں پکارا۔

تب ہی منی خالہ نے دروازے کی کنڈی گرائی۔ دھاڑ سے دروازہ کھلا اور بارش میں بری طرح بھٹکے ابا میاں لڑکھڑا کر دہلیز پار کر آئے۔ اندر آتے ہی انہوں نے کسی سختی سے منی خالہ کو دھکا دیا تھا۔ وہ پھسل کر گرتے گرتے چلیں۔

گالیاں، کونے، بیٹن، بددعائیں، سیاہ برستے آسمان تلے، دونوں ہاتھ سر پر رکھے وہ چیختے چلاتے رہے۔ دل میں چھپا غم، غصہ کسی کیسی حالت میں باہر نہ نکلا تھا۔ مٹی خالہ انہیں سنبھالنے کی کوشش میں بے حال ہو گئیں۔ اور وہ برآمدہ کی دیوار سے چپکی کا پتی رہی۔

”یہ سارے دکھا اسی نے دیے ہیں مجھے۔۔۔ یہ در بدری، یہ پائمالی، یہ ٹھوکریں سب اسی کی دین، بے رحم، پالی، دھوکے باز، میرا کچھ خیال نہ کیا۔ مجھ بوڑھے کمینے کو اس عمر میں ذلیل کروا رہا ہے۔“ وہ کلہاڑے پر کلہاڑا چلا رہے تھے۔

نبی بہت زور سے پٹی تھی۔ ابامیاں کا رخ ہوتا چہرہ اور زخم آلود ہاتھ۔۔۔ وہ بس ایک جھلک ہی دیکھ پائی، منی خالہ، ابامیاں کو جیسے تیسے سہارا دے کر کمرے کی طرف لا رہی تھیں۔ وہ گھبرا کر پلٹی۔ ہاتھ میں پتھر اچراخ آوندھا ہو گیا۔ لوجہ بھگئی۔ سارا تیل بہہ گیا۔ وہ دوپوارے لگ کر سکنے لگی۔

6

وہ سسکیاں دہاتی چھوٹے کمرے میں آگئیں۔

”نور! تم جاگ رہی ہو۔ سو جاؤ اب، ابامیاں بھی سو رہے ہیں۔“

وہ چند لمحے ان کی پشت کو کھوڑی رہی۔ اور پھر کبھی سانس لے کر دیو

”بے چاری سی خالہ! اسے لمرے میں دھکے دھکے سے ابھری

”جی پریشان رہی ہیں حالہ۔۔۔ اور ابامیاں، امیں کی پیری پر

کے انکار غلط فہم سمجھ رہے جانے والوں پر کس کس انداز میں عذاب بن کر

نہ کنواری ہیں نہ بیاہی۔ زندگی روگ بن گئی۔ یہ وٹے سٹے کی شادیاں۔ اوہ می

اس نے ہتھیلیاں کھڑکی سے باہر نکال دیں۔

جامن کے چوڑے پتوں پر بلند سروں میں بجتا ساز اب مدھم ہو گیا تھا۔ ہر

اس نے کھڑکی کے پٹ آہستہ سے بند کیے اور پھر چیلے سے پلنک پر لیٹ آ

منہ تھیں۔ کہ ہمیں کہ جس کا یہ ہے کہ آنگن۔

رہی۔ بڑی دیر سے لڑی یہ اوسکی نور ذرا سا چوٹی، نو دین پر اٹھیا ساری دین پر
نگاہ نہ کر کے کہ آئی منہ، خال کلمہ، کر جھنڈ کے باسرا بیٹہ

جنہا کے گلے پر لکھا ہے کہ وہاں سنہ ۱۹۸۷ء میں ختم ہوئے نیم خشک مالوں میں ابھی

اب سے پھدیر چہے یہ ساراں عیاں دس بجیں گے؟ اس نے پوچھا۔ مسکراتے ہوئے اس نے گردن گھما کر انہیں دیکھا۔ جواب بڑے بے نیاز

7

”آہم۔۔۔“ وہ دیکھ کر کھڑے ہوئے سے کھکاری۔ منی خالہ ذرا سا چمکیں اور واقع بھائی نے گھبرا کر ہاتھ میں پکڑا سارا باجرہ چڑیوں کی طرف اچھال دیا۔ وہ ڈر کے مارے پھر سے اڑیں اور جاسن کی شاخوں میں دبک کر شور مچانے لگیں۔
نور کھڑکی بند کر کے باہر نکل آئی۔ چھوٹا سا صحن دھل کر کھرا ہوا مویسے، چنبیلی کی کلیوں سے مہک رہا تھا۔

”آپ نے تو ساری چڑیاں اڑا دیں واقع بھائی۔“
”نہیں۔۔۔ ساری چڑیاں تو نہیں اڑائیں۔“ انہوں نے کن آنکھوں سے منی خالہ کو دیکھتے ہوئے متنبہ لہجے میں کہا۔ وہ بوکھلا کر اٹھ کھیں۔
”تم نے ناشتا کیا؟ نہیں نا۔۔۔ میں گرم کرتی ہوں۔“ وہ اپنا مہکتا وجود لیے اس کے قریب سے گزرتی چلی گئیں۔
”اور سناؤ نور القمر، کسی گزر رہی ہے؟“ واقع بھائی جاسن کے خشک پتے کو ہاتھوں سے مل رہے تھے۔

ان کے چہرے کی بنجیدگی اسے تنبیہ کر رہی تھی۔
”راز یوں عیاں نہیں کرتے۔“
وہ اپنے کمزور پڑنے پر خفت محسوس کرتی آگے بڑھ گئی۔
”ابا میاں کی دیوانگی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم انہیں کسی ڈاکٹر کو۔۔۔“ منی خالہ کی آواز جاتے جاتے اس کے کانوں میں پڑی۔ واقع بھائی سے مشورہ کر رہی تھیں۔
وہ جل کر خاک ہو گئی۔

”ہونہ۔۔۔ ڈاکٹر کو دکھائیں، جیسے مفت میں دیکھنے آئے گا۔ اور یہ دیوانگی کم ہونے والی نہیں، یہ تو بڑھے گی اور بڑھتی ہی جائے گی۔ ہزار بار کہا عاطف ماموں کو خط لکھیں، پیغام بھیجوائیں۔ سارا کیا دھرا ان ہی کا ہے۔ اور بھگتے کو ہم۔۔۔“

جانتی تھی عاطف ماموں کا کوئی اتا پتا نہیں پھر بھی دل کی ہیز اس نکال لیتی تھی۔ کبھی بکھار یونہی زیادہ چڑنی تو منی خالہ سے ہی اٹھنے لگتی۔ اور تھا بھی کون۔۔۔؟ وہ چپ چاپ اس کی الٹی سیدھی بکواس سن لیتیں۔ اور جب وہ بھی میسر نہ ہوتیں تب وہ خود سے جھگڑتی۔ اب بھی باور پچی خانے میں پیسے کڑا مارے بڑبڑاتی رہی۔
”ڈاکٹروں کی فوج تو تیار کھڑی ہوگی۔ کب منی خالہ بلائیں اور کب وہ بھاگے چلے آئے۔ ہونہ۔۔۔“ اس نے سر جھکا۔

اور جب یہ بات ابامیاں تک پہنچی تو گھر میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔
”ہاں، ہاں، بلاؤ ڈاکٹر کو۔۔۔ میں مانگ لوں گا۔ دیوانہ ہوں، دماغ الٹ گیا ہے۔ کراؤ علاج، زنجیروں سے جکڑ دو۔۔۔ بجلی کے جھکے لگواؤ۔ پاگل خانے میں چھوڑ کر آؤ۔ جان چھڑاؤ مجھ سے۔ میں ہوں ہی اسی قابل، کیا اوقات ہے میری، کیا حیثیت؟ بال بکھرائے، کرتا پھاڑے کٹی میں نکل جاؤں تو بستی والے پتھر مارنے لگیں۔ آؤ لوگو آؤ! پتھر مارو۔ سنگ برسائو، اصغر علی مہتاب، سابق ہیڈ ماسٹر، ایم

اے عربی، پر کچلے ہوئے وجود کو اور روند ڈالو، آؤ لوگو آؤ۔۔۔“
اسے معلوم تھا یہ ہی سب ہوگا۔ سودر وازے کی کندھی چڑھائے، کانوں پہ ہاتھ رکھے۔ نیکیے میں منہ دیے دوکری رہی۔

منی خالہ مجرم بنی دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھیں۔ صرف ایک ہی بات تو کہی انہوں نے۔
”ابامیاں آپ کی طبیعت خراب رہنے لگی ہے۔ اگر ڈاکٹر کو دکھائیں تو۔۔۔“ اور یہ جملہ مکمل ہونے سے قبل ابامیاں مشتعل ہواٹھے تھے۔ وہ بے چاری شہر کا پتی واضح کرتی رہیں۔
”نہیں ابامیاں! ہرگز نہیں۔ میں نے کب کہا۔۔۔؟ آپ میرے قابل محترم، آپ میرے ابا میاں، میرے اپنے ابا۔ خدارا یوں مت کیجیے۔“ وہ خود کو نوچنے کھسوٹنے لگے تو منی خالہ غم کے مارے ہلکتی ہوئی ان سے جا پھٹیں۔

”میرے ابا۔۔۔ میرے اچھے پیارے ابا، کیا ہو گیا ہے آپ کو۔۔۔؟“ سنسنیل جابیئے مجھ پر ترس کھائیے۔ میرا خیال کیجیے۔ آپ کی وہی منی ہوں، لاڈلی، پیاری منی۔ دیکھیے میری طرف معاف کر دیجیے۔ میری توجہ جو آئندہ بھولے سے بھی ایسی بات کی۔ آپ بیٹھ جائیے۔“
کن دقتوں سے انہیں پرسکون کیا تھا۔ خود منی خالہ کا اپنا وجود جھکیوں سے جھٹکے کھارہا تھا۔ چہرہ آنسوؤں سے تر پتر، ابامیاں بے دم ہو کر چار پائی پر گر گئے۔

”تم۔۔۔ تم میرے لیے سب سے بڑی مصیبت ہو۔ میری جان کا عذاب، مجھے مرنے بھی نہیں دیتیں۔ میرا جینا بھی حرام۔۔۔ تمہارا کوئی بندوبست کرتا ہوں۔ یوں جان نہیں چھوڑو گی۔“ جب تک منی خالہ ان کے لیے پانی لے کر آتیں وہ بغیر چیل کے گھر سے نکل گئے تھے۔
منی خالہ ان کے پیچھے پھلکیں، مگر وہ بہت دور چلے جا رہے تھے۔ ننگے پاؤں، خاک اڑاتے۔

منی خالہ وہیں دبلیز پر بیٹھ کر روتی رہیں۔
”ہائے! یہ گردش دوران، کوئی اس کی زد سے بچا بھی ہے کہ نہیں۔ ایسی شان والے میرے ابا میاں اور کہاں یہ حالت۔۔۔“ دل کٹنا جا رہا تھا۔

اصغر علی مہتاب کا نام سن کر لوگ احتراماً کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ کم قیمت مگر صاف ستھر لباس، تہذیب، شائستگی، عادات و اطوار، رعب داب، زیرک نگاہی۔۔۔ کون سی خوبی بھی جوان کی شخصیت میں جمع ہونے سے رہ پائی ہو۔ ہاں مگر، اپنی ذات کے فخر سے باہر نہ نکل سکے۔ تمام عمر اپنا سوچا۔ اپنا چاہا، اولاد پر توجہ نہ دی۔ اکلوتا بیٹا اور وہ بھی آوارہ۔ کم عمری کی شادی سے نالاں۔۔۔ تھو، آٹھ سال بھگتائی اور پھر تین حرف بیوی کے نام لکھ کر سب سے دور، پرانے ویس جا بیٹھا۔ وٹے سٹے کی شادی تھی۔ منی خالہ بسنے سے پہلے اجڑ گئیں۔ سسرال والے رخصتی پر تو خیر راضی ہی نہ تھے طلاق پر بھی آمادہ نہ ہوتے۔ جیتے جی مار کر اپنے کلیجے میں لیں آگ شغنی کرنے کا یہ ہی طریقہ تھا۔

وقت نے اصغر علی مہتاب کو کمزور پڑے دیکھا تو اس نے اور بھی کاری وار کر دیے، بیوی کی موت کا دکھ، بڑی بیٹی کی بیوگی اور پھر دائمی جدائی کا صدمہ، منی خالہ کے نہ بسنے کا غم، اور بیٹے کی طوطا چٹائی کا عذاب، سماجی تنہائی اور معاشی دھچکوں نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔ دل و دماغ لڑتے لڑتے بالآخر تھک گئے ہار گئے۔ ایک ایک کر کے سارے ہتھیار پھینک دیے۔ ہمت، حوصلہ، بہادری سب چھن

گیا۔ اور پیچھے خالی کشکول سا بے کار و کھوکھلا وجود رہ گیا تھا۔ جس میں بے بسی، لا چاری اور بے چارگی کے سکون کی گھنک کے سوا کچھ نہ تھا۔

خبر نہیں کس چیز کی تلاش تھی، ابامیاں کو، کیا کھوتے رہتے تھے؟ بے قراری حد سے سواتھی۔ چین و اطمینان جانے کہاں رخصت کیے بیٹھے تھے۔ گھڑی گھڑی انھہ کرآمدوں، کمرؤں میں ٹہلنے لگتے۔ راہداری ان کے بوڑھے قدموں کی مضطرب آواز سے گونجتی رہتی۔ اپنے کمرے میں ہوتے تو الماریوں، صندوقوں کو کھنگالتے رہتے۔ کبھی چپ لیٹ جاتے تو کبھی نگاہیں فضا میں کچھ کھوجتی رہتیں۔ ہر دوسرے لمحے مٹی خالہ کو پکارتے، چائے کی فرمائش ہوتی۔ سارا دن پیالیاں بھر بھر چائے پیتے اور پھر رات کو کھری چار پانی پر بیٹھے بڑبڑاتے رہتے۔ کمرؤں بدلنے کا سلسلہ جاری رہتا۔ چار پانی کی چرچاہٹ سے نور انہری کی نیند بار بار اکھڑ جاتی۔

”اف۔۔۔ یہ ابامیاں سو کیوں نہیں جاتے؟“ وہ گردن اٹھا کر انہیں دیکھتی پھر سونے کی کوشش کرنے لگتی۔

مٹی خالہ کی کھلی آنکھیں اندھیرے میں چمکتی رہتیں۔ جب تک ابامیاں نہ سو جاتے۔ ان کی آنکھوں میں نیند کا آنا محال تھا۔ صبح کو نور کمرے میں گھس کر دن چڑھے تک اپنی نیند پوری کرتی رہتی۔ اور سودا سلف کو پوچھنے کے لیے آئے ہوئے واثق بھائی، مٹی خالہ کی خمار آلود سرخ آنکھوں کو دیکھ کر کلیاں مسل مسل کر پھینکتے رہتے۔

اور پھر ایک شام ابامیاں کی بے چینی و بے قراری کا یہ عقدہ بھی حل ہو ہی گیا۔ نور القمر نے بالٹیاں بھر بھر پانی صحن میں بہا دیا تھا۔ اور اب کلیوں کے جھنڈ کے آس پاس بکھری تازہ کلیاں چن رہی تھیں۔ خوشبو سے معطر اس بھگی ہوئی شام میں جب شفق کے تمام رنگ گھر کے در و دیوار پہ اترے ہوئے تھے، مٹی خالہ سفید ساڑھی پہن کر باہر آئیں تو وہ انہیں ٹوکے بغیر نہ رہ سکی۔

”یہ سفید رنگ مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ مٹی خالہ! آپ اس ساڑھی کو دھنک رنگوں میں کیوں نہیں رنگ لیتیں۔ سچ، آپ پر بہت چچیں گے یہ ساتوں رنگ۔“

مٹی خالہ جواب میں مسکرا کے رہ گئی تھیں۔ بتا ہی نہ سکیں کہ جب وہ سفید رنگ پہنتی ہیں تو کسی کی آنکھوں کی چمک چاندنی کی پھوار بن کر ان پر برسے لگتی ہے۔ تن من بھگڈا لیتی ہے۔ اور جب جب ان کے وجود میں صحرائیں لگتا ہے وہ یہ سفید ساڑھی ضرور پہنتی ہیں۔

”مجھے ساڑھی بہت پسند ہے۔ لیکن اچھی صرف آپ پر لگتی ہے۔ میں پہنوں تو شاید عجوبہ لگنے لگوں۔“ وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”اماں کے صندوق بھرے ہوئے تھے، نت نئی ساڑھیوں سے۔“ مٹی خالہ بتانے لگیں۔

”خود وہ ہمیشہ دو چار میں ہی گزارا کرتی رہیں۔ بنگال سے آئی تھیں۔ کبھی کوئی اور لباس میں نے

ان کے وجود پہ سنا نہیں دیکھا تھا۔ ان کے بعد سب کی سب ساڑھیاں میرے ہی کام آئیں۔“

انہوں نے دو چار بل دے کر بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا بنایا تھا۔ نور القمر نے اٹھ کر اس پہ کلیاں سجا دیں۔ گجرا بنا کر ان کے بازوؤں میں ڈالا۔ خود پہنے لگی تو اچھا نہ لگا یونہی چار پانی پہ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

تب ہی واثق بھائی دروازہ کھٹکھٹا کر اندر داخل ہوئے۔

”کوئی سودا سلف منگوانا ہوتا۔۔۔“ ایک دیوار کا ہی فاصلہ تھا۔ بازار جانا ہوتا تو ادھر کا چکر ضرور لگاتے تھے۔

نور القمر نے مڑ کر دیکھا۔ بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ اور دروازے میں رک گئے تھے۔

”اندر آجائیے نا۔۔۔“ اس کے پکارنے پر وہ چونکے۔ پھر حسب عادت چند ایک کلیاں توڑنے لگے۔

”سنا ہے، جس گھر میں کلیاں ہوں وہاں سفید تلی ضرور آتی ہے۔“

وہ پانی کا چھڑکاؤ کر رہی تھی کیا رہی میں۔ ان کی بات سن کر قدرے حیران ہوئی۔

”اچھا۔۔۔ لیکن ہمارے ہاں تو بھی نہیں آئی، مطلب میں نے بھی نہیں دیکھی سفید تلی۔“

”کمال ہے تم نے نہیں دیکھی۔“ ان کا لہجہ شری تھا۔ وہ پلٹ کر ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”ہاں تو اس میں ہنسنے والی کون سی بات ہے؟“ وہ اپنا مزاق اڑائے جانے پر قدرے ناراض سی ہو گئی۔

”نہیں تو۔۔۔ تم سے کس نے کہا میں ہنس رہا ہوں۔ اچھا جاؤ تھیلالے کر آؤ۔ میں سبزی لا دیتا ہوں۔“ ان کی ہتھیلی بھر گئی تھی کلیوں سے۔۔۔

نور نے جاتے جاتے اپنے ہاتھوں میں جمع کلیاں بھی ان کی چوڑی ہتھیلی پہ انڈیل دیں۔

مٹی خالہ جامن کے درخت تلے کرسی ڈالے بیٹھی تھیں۔ اور ان دونوں کی باتوں پر اپنی بھی ہولے ہولے مسکرا رہی تھیں۔

”کون سی سبزی منگوائیں خالہ!“ وہ یاورچی خانے سے تھیلالے کر لوٹی تو ٹھٹھک کر رہ گئی۔ واثق

بھائی موجود نہ تھے۔ اور مٹی خالہ اپنے وجود پہ بکھری کلیاں سمیٹ رہی تھیں۔

”واثق بھائی چلے گئے؟“

”ہاں۔۔۔ کہہ رہے تھے بازار میں بہت تھیلے ہیں۔“

”ارے تو میں کیا بے وقوف تھی۔ جو اس کو ڈھونڈنے میں ہلکاں ہوتی رہی۔“ وہ چڑ کر بولی۔ مٹی

خالہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے پیڑے کا تھیلالہ گول مول کر کے ایک طرف اچھالا اور کمرے میں آکر ریڈو کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے لگی۔

بیرونی دروازے پر ٹنگی سی آہٹ ہوئی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر کھلی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ابامیاں

اندر آ رہے تھے۔ اور ان کے پیچھے ایک فطعی اجنبی، انجانی صورت کو دیکھ کر وہ فوراً ہارنگی۔

مٹی خالہ بے خبر بیٹھی کرسی جھلا رہی تھیں۔ بند آنکھیں، گلابی ہونٹوں پہ سخی مدھر مسکان، جوڑا

ڈھلک کر کندھے پہ آ رہا تھا۔ گودیں دھری کلیوں کو اپنی پوروں سے چھوتے ہوئے وہ جانے کن خیالوں

میں گم تھیں۔

ابامیاں اور اجنبی بالکل سر پر پہنچ گئے تھے اور وہ جوں کی توں انجان، بے خبر نور القمر نے آنے

والے کی طرف دیکھا۔ جو ابامیاں کی موجودگی سے بے نیاز مٹی خالہ پہ نظریں گاڑے کھڑا تھا۔ وہ لپک کر

مٹی خالہ کی طرف بڑھی اور اگلے ہی پل انہیں جھنجھوڑ ڈالا۔ انہوں نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ اور

پھر بڑا کراٹھ کھڑی ہوئیں۔ سیاہ بال کھل کر نکھر گئے تھے۔ ساڑھی کا پتو سر پر ڈالتے ہوئے ان کی نگاہ آنے والے پر پڑی تو ہاتھ وہیں ساکت رہ گیا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں اس کے چہرے پہ آکر ٹھہری گئی تھیں۔

حیرت۔۔۔ شدید حیرت۔۔۔ ان کی آنکھوں سے ہویدا تھی۔

”نور! کرسی لے کر آؤ۔“ ابامیاں بکارے۔

”بیٹھو میاں، تب تک بیٹھیں بیٹھو۔“ ابامیاں بچھے جارہے تھے۔

گہری بھرپور نظر منی خالہ پر سے ہٹا کر آنے والا وہیں چارپائی پہ ٹک گیا تھا۔

نور نے کرسی اٹھا کر چارپائی کے برابر رکھ دی۔ ابامیاں مہمان کو کرسی پہ بیٹھنے کے لیے اصرار کرنے لگے۔ وہ انکار کر کے گاؤ تکیے سے ٹک لگا کر بیٹھ گیا۔

”نور! اپنی خالہ سے کہو، چائے تیار کر لے۔“ واق کو چائے کا سامان لینے بھیجا ہے۔ وہ آتا ہی ہوگا۔“

ابامیاں کے عقب میں کھڑی نور نے منی خالہ کو دیکھا۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر ساکت کھڑی تھیں۔

ان کی ساڑھی کا عکس چہرے پر اتنا گہرا تھا کہ بالکل سفید ہوتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔

”افو، ہزار بار کہا یہ سفید رنگ مت پہنا کریں۔“ اس نے جھنجھلا کر انہیں ہلایا۔

وہ چونک کر اس کی طرف پلٹیں اور پھر بات سننے بغیر وہاں سے چل دیں۔ وہ بھی ان کے پیچھے پکی۔

”ابامیاں نے چائے بنانے کو بولا ہے۔ سامان بھی دامت بھائی سے کہہ کر خود ہی منگوا لیا، کوئی خاص مہمان لگتا ہے۔ آپ جانتی ہیں انہیں۔۔۔؟ آج سے پہلے تو کبھی انہیں نہیں دیکھا۔“

وہ مارے اشتیاق کے ان کے پیچھے پیچھے باورچی خانے میں آگئی۔ منی خالہ پیڑھی پہ بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی تھیں۔ انہیں اس قدر رستی برستے دیکھ کر اس نے خود ہی آگ جلا کر چائے کا پانی اوپر رکھ دیا۔

”افو۔۔۔ اس طرح سے کیوں بیٹھی ہیں؟ بتاتی کیوں نہیں، کون صاحب ہیں یہ؟ ابامیاں اتنے خوش لگتا ہے اتنے دنوں سے ان ہی کا انتظار تھا۔ اب کیسے چین اور سکون سے بیٹھے ہیں۔“ وہ خود ہی بولتی رہی۔ منی خالہ نے پانی کا گلاس مانگا اور غنا غٹ چڑھا گئیں۔ ابامیاں شاپران کے سامنے ڈال گئے۔ انواع اقسام چیزوں سے بھرے۔۔۔ خوشبودار بسکٹ، تازہ پیڑھیاں، خستہ پکوڑے۔۔۔

اس کے منہ میں پانی بھر رہا تھا۔ ”آج تو اپنی بھی عید ہوگئی۔“

بڑی سی ٹرے سجا کر مہمان خانے میں رکھ آئی۔ ابامیاں کو بتا دیا وہ مہمان کو لے کر وہیں چلے آئے۔ وہ باورچی خانے میں آگئی۔ منی خالہ ابھی تک کھٹنوں پر سر رکھے بیٹھی تھیں وہ اپنے لیے بچا کر رکھی پیڑھی کھانے لگی، مزے مزے سے۔ منی خالہ کو کبھی اصرار کیا مگر انہوں نے منہ پھیر کر انکار کر دیا۔

ذرا دیر بعد وہ ابامیاں کا پیغام لے آئی۔

”کہہ رہے ہیں اوپر کا کمر صاف کرو۔ لگتا ہے، مہمان کچھ دن یہاں رہے گا۔ ہائے مگر یہ کون۔۔۔؟ کیا ہمارا کوئی رشتے دار؟ منی خالہ آپ ابامیاں سے پوچھ لیں۔“ اسے جسس ہو رہا تھا۔ منی

خالہ نے سر اٹھا کر بغور اسے دیکھا پھر خشک لبوں پر زبان پھیری۔

”بھابھی کے بھیا ہیں یہ۔۔۔۔۔“ کسی کونٹیں میں سے آواز نکلی تھی ان کی۔

”ہائیں۔۔۔ کون سی بھابھی کے بھیا؟“ وہ سب فراموش کیے بیٹھی تھی۔ یک لخت چونکی۔

”آپ کی بھابھی کے بھیا۔۔۔؟ یعنی رفعت ممانی کے بھیا، اوہ، اوہ یعنی اطہر خالو۔۔۔ آپ کے میاں!“ وہ آنکھیں پھاڑے انہیں کھٹنوں پہ سر گراتے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

ایک عرصے سے بند ادھوری داستان کی کتاب دوبارہ کھل گئی تھی۔ گزشتہ اوراق پر جی دھول کو ہٹانے کا نام گشتہ ابواب کو ڈھونڈنے کی کوشش کسی نے نہ کی تھی۔ اور ضرورت بھی کیا تھی؟

اس کہانی کا ایک آخری باب ہی تو رُم ہونا تھا۔ پھر کیا ضروری تھا کہ ابتدائی صفحات میں دفن مردہ تتلیوں کے بے رنگ پروں سے گواہی طلب کی جاتی۔ یا ساکن حروف پہ چپکے، خوشبو سے عاری، سیاہ پڑتے پھولوں کی بھر بھری پتیوں سے پوچھا جاتا کہ۔

اس کہانی کے ادھورا چھوڑے جانے پر احساس زیاں کس کردار پر حاوی رہا۔

اجلی چاندی سے بھری راتوں پر آنسوؤں سے شکوے کس نے کاڑھے۔

گرمی لگی مٹی دو پیروں میں من کے جنگل میں کون کون بن کر کوا؟

پر قاب رتوں میں ٹھمد ہوتے خوابوں کو گرمانے کے لیے کن آنکھوں نے اپنی نیند بے خوابی کے دہلے الاؤ میں جھونک ڈالی؟

اور۔۔۔۔

مردہ ہوتے جذبات کو زندہ رکھنے کے لیے ان کے حلق میں اپنے من کا قطرہ قطرہ لہو کس نے پٹکایا۔

یہ سب سوال بے معنی تھے۔ بے جواز، غیر ضروری۔

اہم تھا تو صرف یہ کہ کہانی اختتام پذیر ہونے کو تھی۔ انتظار کی سولی پہ لٹکتے کردار اپنے انجام کو پہنچنے والے تھے۔

لیکن اس کہانی کے ادھورے پن سے جو ایک نئی کہانی جنم لے چکی تھی، وہ۔۔۔؟

”منی خالہ!“ نور القمر نے زور سے پکارا تھا۔ خود میں ابھی کھوئی منی خالہ جی جان سے لرز گئیں۔ وہ دھپ سے ان کے قریب آ بیٹھی۔

”اف۔۔۔ منی خالہ! اتنے پیارے ہیں اطہر خالو کہ بس کیا ہی کہیے۔۔۔ سفید کرتا یا عجمہ اتنا چچتا ہے ان کے لمبے چوڑے قد پر۔ بولنے میں رکھ رکھاؤ میں، بلکہ ان کے تو دیکھنے میں بھی ایک ادا ہے۔ شہزادے لگتے ہیں پورے شہزادے۔۔۔“

انہوں نے سر اٹھا کر بغور اسے دیکھا۔ وہ بہت پر جوش نظر آ رہی تھی۔ ابامیاں اور دامت بھائی کے بعد وہ تیسرے مرد تھے جنہیں اس نے قریب سے دیکھا تھا۔ شام سے ان کی آؤ بھگت میں مصروف تھی۔ اوپر کا کمر ادھو کر صاف کیا۔ پلنگ نئے سرے سے کس کر اس پہ سب سے اچھی چادر بچھائی۔ پانی کا کولر، ٹائم ٹیمیں۔۔۔ رات کو پہننے کے لیے چپل ایک ایک چیز کا دھیان رکھا۔

”منی خالہ کتنی جلدی سو گئیں۔۔۔ ورنہ وہ بھی سنتیں، خالو یا نسری کتنی اچھی بجاتے ہیں۔“
اس نے تکیے پہ سر رکھ دیا۔ یہ بانسری عاطف ماموں کی تھی۔ نجانے اوپر کمرے میں انہوں نے کہاں سے ڈھونڈ لی تھی۔

اس کی آنکھیں دھیرے دھیرے بند ہونے لگی تھیں۔ مگر سونے سے ایک لمحہ پہلے تک اس کے کانوں میں بانسری کی آواز رس گھولتی رہی تھی۔ اس کے بے خبر ہوتے ہی منی خالہ کا پلنگ چرچا ایا تھا۔ دھیرے سے اٹھ کر وہ کھڑکی تک آئیں اور آہستہ سے کھڑکے کے دونوں پٹ بند کر دیے۔ پھر دیوار سے لگ کر ہولے ہولے سسکنے لگی تھیں۔

باہر رات بھگ رہی تھی اور بانسری کی دردناک لے اس کہانی کے دو کرداروں کی المیہ داستان سناتی جا رہی تھی۔ یہ رات۔۔۔ آج کی رات۔۔۔ دو جانوں پر بہت بھاری تھی۔

☆☆☆

اور منی خالہ اس گھر سے رخصت ہو گئیں۔
وہ بھی اس طرح کہ ان جانے کے بعد نور القمر پاؤں پٹخ پٹخ کر روتی رہی۔

”اس گھر کا ہر کام ہی نرالا، ہر رسم انوکھی۔ ہر رواج بے ڈھنگا، لوگوں کی شادیاں ہوتی ہیں۔ بارات آتی ہے۔ بینڈ بجا جاتا ہے۔ ڈھول ڈھمکا ہوتا ہے۔ یہاں وہی بے روتی ہی بے روتی۔ ڈھولک کی تھاپ سننی بھی نصیب نہیں۔“ وہ بلند آواز میں بڑبڑاتی رہی۔ مگر وہاں تھا ہی کون جو اس کی سنتا۔

خالی دیران گھر اور وہ خود۔۔۔ نور القمر۔۔۔ کلیوں کے جھنڈ کے پاس بیٹھی اپنے آنسو خود ہی پونچھتی جا رہی تھی۔ دانت بھائی کی اماں نے خالہ کو رخصت کرنے کے بعد پلٹ کر نہ دیکھا۔ ابامیاں باہر سے ہی کہیں اور چل دیے۔ وہ تنہا بیٹھی گزری چند گھڑیوں کو سوچتی رہی۔

صبح سویرے ہی ابامیاں نے ”حکم نامہ“ جاری کر دیا تھا۔

”منی کا سوٹ کیس تیار کر دو۔“ وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔ منی خالہ کو بخار تھا۔ بے سدھ پڑی تھیں۔ کچھ کہنا چاہا مگر ابامیاں کی سرخ آنکھوں میں غصہ انگڑائیاں لینے لگا۔

”پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے بے وقوف لڑکی! اب مزید دیر مت کرو۔“

ایسا سخت لہجہ وہ کچھ بولنے کی ہمت نہ کر سکی۔ روتی دھونی سوٹ کیس تیار کرنے لگی۔ منی خالہ بند ہوتی آنکھوں سمیت غسل خانے میں جا چھپیں۔ وہ بیٹیوں، صند دقوں میں گھسی ساری اچھی اچھی چیزیں نکال کر ان کے سوٹ کیس میں بھر بیٹھی تھی، یہ چیزیں کسی زمانے میں ان کے جہیز کے لیے ہی بنی تھیں۔

منی خالہ نہا کر آئیں تو ان کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ ان کی آنکھیں گلابی اور رنگت سپید ہو رہی تھی۔ اس نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر سیاہ بارڈر والی سرخ ساڑھی نکال کر انہیں دی۔ سرخ چوڑیاں پہنائیں، پھر گجر بانے باہر آگئی۔ صحن میں خالو جامن تلے کرسی ڈالے بیٹھے تھے۔ ہلکا آسمانی کرتا، سفید پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ گھنے بالوں میں دھیرے دھیرے انگلیاں چلاتے، کھڑے نقوش والے، سوتی جاگی آنکھوں والے خالو بکل سے بڑھ کر اچھے لگ رہے تھے۔

”کیسے بالکے جیلے ہیں میرے خالو، چھیل چھیلے۔ میں تو بالکے خالو کہا کر دیں گی۔ باقی سب کے لیے ہوں گے اطہر۔“ وہ منی خالہ کو بہلانے کا سامان کرتی رہی۔ گجر پہنانے والی تھی کہ انہوں نے زور

رات کا کھانا بھی اسی نے پکایا۔ گوشت اور فرنی۔
منی خالہ نے کہہ دیا تھا۔ ”طبیعت ٹھیک نہیں۔“

”صاف کہیں، خالو سے چھپ رہی ہیں۔“ وہ آتے جاتے انہیں چھیڑ رہی تھی۔
کھانا کھا کر خالو آرام کرنے اوپر چلے گئے۔ باہر چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ ان کا دل نہ چاہا کمرے میں سونے کو۔ پلنگ باہر بچھا لیا۔ ذرا دیر بعد وہ نیچے آگئے۔ پیاس لگی تھی اور کمرے میں بہت اندھیرا۔
ابامیاں بگڑنے لگے۔

”چراغ کیوں نہیں جلایا اوپر۔۔۔“

غلطی نور کی تھی بھاگ کر دوسرے کمرے میں چھپ گئی۔

”گھر آئے مہمانوں کی یہ عزت ہے کہ وہ اندھیرے میں ٹاک ٹوئیاں مارتا پھرے۔“

ابامیاں کی گھن گرج، ایسے عالم میں نور باہر نکلتی۔ ناممکن تھا۔ منی خالہ نے اٹھ کر دیا جلایا اور لے کر اوپر چڑھ گئیں۔

”بجی نہیں ہے گھر میں؟“ خالو پوچھ رہے تھے۔

”اندھیروں کے مسافر ہیں میاں! ہمیں روشنی اچھی نہیں لگتی۔ یہ ننھے منے چراغ ضرورت پوری کر دیتے ہیں۔ اس سے زیادہ کی ہمیں چاہ نہیں۔“

ابامیاں کا رخ اپنے کمرے کی طرف تھا۔ نور کچھ دیر بعد ڈرتے ڈرتے نکلی اور اپنے کمرے میں گھس گئی۔ تپ ہی ٹھک سے دروازہ کھول کر منی خالہ اندر آ گئیں۔ برہم سا انداز تھا۔ بالوں کی لٹیں چہرے پہ آ رہی تھیں۔ کلائی سے ایک گجر اغائب، آتے ہی بیڈ پہ گر گئیں۔

”کیا ہوا؟“ وہ پریشان سی ان کی طرف بڑھی۔

”کچھ نہیں۔۔۔ نیند آ رہی ہے۔“ ہموار لہجہ۔۔۔ پرسکون آواز۔۔۔

اس نے سکھ کا سانس لیا اور کھڑکی میں آ بیٹھی۔ روز کا معمول تھا مگر منی خالہ پتا نہیں کیوں بے چینی محسوس کر رہی تھیں۔ کروٹ یہ کروٹ بدلنے کے بعد وہ اپنے پلنگ پر آ کر بیٹھ گئی تھیں۔

”کیوں کھول رکھی ہے کھڑکی۔۔۔؟ کب بند کرو گی۔۔۔؟“

”کیا ہوا؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔۔۔“ وہ دوبارہ لیٹ گئیں۔ پلو منہ پہ ڈال لیا۔

نور کھڑکی سے باہر جھانکتی رہی۔ اوپر خالو کے کمرے میں چراغ کی ہلکی ہلکی روشنی یہاں سے دکھائی دے رہی تھی۔ دو دھپیا چاندنی، پورے چاند کا حسن، وہ بہت دیر تک کھڑکی میں بیٹھنے کے بعد لیٹ گئی۔ کچھ دیر بعد نیم غنودگی کے عالم میں اس نے بانسری کی آواز سنی۔ دل کو چھو لینے والی مدھم۔۔۔ غم زدہ سی لے۔

سر اٹھا کر کھلی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ اوپر چھت کی چھوٹی سی دیوار سے ٹیک لگائے اطہر خالو کھڑے تھے۔ بانسری پر ان کی انگلیاں دھیرے دھیرے تھک رہی تھیں۔ رات کے دوسرے پہر میں چلنے والی ہوا سے ان کا ملبوس دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔ بہت بڑا سا، روشن چمکتا ہوا پورا چاند ان کے بہت نزدیک تھا تھاں بھر بھر چاندنی ان پہ لٹا رہا تھا۔ نور نے گردن گھما کر دیکھا۔

سے ہاتھ جھٹک دیا۔ یوں جیسے کوئی سانپ ان کی کلائی سے لپٹا رہا ہو۔

”کیا ہوا؟“ اس نے حیرت سے دیکھا۔

”نہیں، مت پہناؤ۔۔۔“ انہوں نے گجڑے اس کے ہاتھوں سے چھین کر دور اچھال دیے تھے۔

پھر اچانک ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ذرا سا لڑکھڑائیں، پھر سیاہ چپل پیروں میں ڈال لی۔

”کہہ دو۔ میں چلنے کو تیار ہوں۔“ وہ جو ہاتھ میں کا جل لیے بیٹھی تھی۔ ان کے تیوروں سے

خوفزدہ ہو کر باہر بھاگی۔

”خالہ تیار ہیں۔“ ابامیاں اور خالو دونوں ایک ساتھ چونکے تھے، اس کی بات سن کر۔

”وامق سے کہہ کر آؤ، تا نگہ لے آئے۔“ ابامیاں نچانے کس وجہ سے اتنا تھک گئے تھے کہ اب

اٹھنے کی ہمت خود میں نہ پا رہے تھے۔ وہ اپنی سسکیاں دہانی باہر بھاگ آئی۔ وامق بھائی کے گھر کا

دروازہ کھلا تھا۔ وہ سیدھی اندر آگئی۔

”وہ کون سا ابا د تھا جن کا جب میں نے اپنی خواہش کا اظہار نہیں کیا، آپ نے میری پرواہ ہی نہیں کی

ورنہ۔۔۔“ وامق بھائی نے جانے کس بات پر خفا ہو رہے تھے۔

”وہ کسی کی امانت تھی۔“

”وہ بھولے بیٹھے تھے اسے، آپ کی ضد نے یہ دن دکھایا کہ اسے کسی فالتو سامان کی طرح۔۔۔“

وامق بھائی کی بلند ہوئی آواز سے سہم کر وہ بے اختیار انہیں پکار بیٹھی۔

”وامق بھائی!“ اس کے ساتھ ہی کمرے میں یک لخت خاموشی چھا گئی۔

اس نے ابامیاں کا پیغام پہنچا دیا۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ منڈھال سے چار پائی برگر گئے تھے۔

وہ کھڑی انگلیاں جٹختا رہی۔ تب وہ یک دم اٹھے اور اٹھ کر باہر نکل گئے۔ ان کی اماں اسے ساتھ

لگائے گھر آ گئیں۔

پھر تا نگہ آنے اور منی خالہ کو رخصت کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ نور آخری وقت میں منی

خالہ سے گلے لگ کر ملنا چاہتی تھی مگر انہوں نے اس کی طرف توجہ ہی نہ کی۔ وامق بھائی اسے کہیں نظر نہ

آئے تھے۔ ان کی اماں آج منی خالہ پر بہت مہربان تھیں۔ ہزار دعاؤں سے انہیں نوازی تا نگے پر بٹھا

آئیں۔

وہ دہلیز پر کھڑی اس وقت تک نہیں تکتی رہیں جب تک تا نگہ آنکھوں سے ادھل نہیں ہو گیا تھا۔

پھر پلٹ کر دیکھا، خالی گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔

جامن کی شاخوں میں دبی چڑیاں اداس اور خاموش تھیں۔ کلیاں مرجھائی ہوئی، اسے اور کچھ نہیں

سوچھا تو کلیوں کے جھنڈ کے پاس بیٹھ کر بہت دیر تک روتی رہی تھی۔

”سنو نور القمر! تم اپنی ماں کے ساتھ مریکوں نہ گئیں؟“

”ہائیں۔۔۔“ نیند میں ادھر ادھر ڈوٹی نور نے ہٹ سے آنکھیں کھولیں۔ ابامیاں چھت پہ نظریں

جمائے بڑے آرام سے کہہ رہے تھے۔

”ہاں ہاں مرجاتیں تو اچھا ہوتا۔۔۔ میرے لیے جینا آسان ہو جاتا۔ اب تو تم ایک مصیبت ہو

میرے لیے۔ جان کا عذاب۔۔۔ تمہاری ماں کا دکھ سہہ لیا تھا۔ تم پہ بھی فاتحہ پڑھ لیتے۔“ ان کے لیے

گویا یہ کوئی بات ہی نہ تھی۔

نور القمر رو ہاسی ہوئی۔ براہو ا جو کمرے میں اپنی تنہائی سے خوفزدہ ہو کر یہاں ابامیاں کے کمرے

میں آ بیٹھی۔

”اب ایسی باتیں سننے کو ملیں گی۔“ اس کا جی اچاٹ ہو گیا اس کمرے سے۔

”اور اتنے سال جی کر بھی تم نے کیا کمال کیا؟ الٹا فکر میں ہی لا دیں میرے کاندھوں پر۔“ اس کا

دل چاہا پوچھتے۔

”آپ نے کبھی میری طرف دیکھا تک نہیں۔ کپڑا، ٹٹا، کھانا، پیتا۔ ہر چیز کا خیال منی خالہ نے

رکھا۔ پھر میں نے کون سی فکر میں لا دیں آپ کے کاندھوں پر، یہ نہیں کہ مہر حومہ بیٹی کی نشانی سمجھ کر گلے

سے لگائیں، الٹا مرنے کی باتیں کر رہے ہیں۔“ وہ چپکے سے اپنی آنکھوں میں آئے آنسو پونچھنے

لگی۔

”یہ زندگی کچھ نہیں دیتی انسان کو۔ سوائے ذلت و رسوائی کے۔ یہ ہمیں پہاڑ کی چوٹی تک لے جاتی

ہے اور پھر وہاں سے دھکا دے دیتی ہے۔ انسان کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ صرف موت کی آرزو کر سکتا ہے۔

اپنی بھی، اور اپنے پیاروں کی موت کی آرزو، اسی لیے کہتا ہوں تم بھی مرجاتیں۔ میرا بھلا ہو جاتا۔“ وہ خود

کلامی کے انداز میں بول رہے تھے۔

”نہیں مری تو اب مرجاؤں گی۔۔۔ آپ کی یہ باتیں کتنے دن جینے دیں گی مجھے۔۔۔“

وہ اٹھ کر باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھی مگر ابامیاں نے درمیان میں ہی ہاتھ تھام کر

اسے روک لیا تھا۔

”یہاں بیٹھو۔۔۔“ انہوں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اس کے لیے بھی جگہ بنائی۔

”خفا ہو مجھ سے۔۔۔؟“ وہ ان کے پاس بیٹھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان کے دونوں ہاتھ دیکھنے

لگی۔ ابھی جو وہ کوئی چھری، چاقو گھونپ دیتے اس کے پیٹ میں تو وہ کیا کر لیتی۔

ابامیاں کو جانے کیسے خبر ہو گئی اس کے خدشوں کی، ذرا سا ہنس دیے۔

”ڈرنی ہو مجھ سے۔ لگی نا ہو تو۔۔۔“ ابامیاں ہنس رہے تھے۔

”کہیں دوبارہ تو دورہ نہیں پڑنے والا۔۔۔“ وہ سہمی بیٹھی تھی۔ ابامیاں دونوں ہاتھوں میں اس کا

چہرہ تھامے اسے دیکھتے رہے پھر پیشانی چوم لی، اس کے لیے حیران کن لمحہ تھا۔

”یہ۔۔۔“

”ابامیاں نیند میں ہیں۔ یا بالکل ہی دماغ الٹ گیا ہے۔“

”تمہاری ماں بھی تمہارے بیسی ہی تھی۔ بد مزاج، تک چڑھی، غریبی، اور تمہاری نانی کہا کرتی

تھیں۔ اصغر علی مہتاب! آپ کے لاڈ پیار نے اسے ایسا بنا دیا ہے۔“

”لو جی بھی بات تو کی نہیں مجھ سے۔ اور بنا دیا تک چڑھی، غریبی اور بد مزاج۔“ وہ چڑ گئی۔ ابا

میاں اس کی بے چینی بھانپ گئے تھے۔

”نور القمر! میرے لیے صحن میں چار پائی بچھا دو۔ آج یہاں نیند نہیں آنے کی۔“ وہ اٹھ کر اپنے

جوتے تلاش کرنے لگے۔
 ”اب یہ ستائیں گے مجھے۔“ وہ بددلی سے اٹھ کر باہر آگئی۔ ابامیاں کے لیے چار پائی بچھائی۔
 بستر لگا یا اور خود کمرے میں آگئی۔

”منی خالہ کی جدائی نے تو چند دنوں میں بھلا چنگا کر دیا ابامیاں کو۔“ اس نے بستر پر لیٹتے ہوئے سوچا۔ پھر جلد ہی اسے نیند آگئی۔ گہری اور پرسکون نیند۔
 صبح آنکھ کھلتے ہی منی خالہ کے پانگ کی طرف نگاہ اٹھی۔ حسب معمول خالی تھا۔ وہ گہری سانس لیتے اٹھ گئی۔ ابامیاں کے لیے ناشتا تیار کرنا تھا۔ دیر ہو جاتی تو پھر لٹی سیدھی باتیں سننے کو ملتیں۔
 ”مرکیوں نہ گئیں؟ زندہ کیوں بچ گئیں؟“

”جیسے سارے معاملات ہمارے ہی ہاتھ میں ہیں۔“

رات والی باتیں یاد آ کر اسے جلائی رہیں۔ ناشتا تیار کر کے باہر آئی۔ تو ابامیاں ابھی تک سو رہے تھے۔ اس نے جگانے کی غلطی کیے بغیر صفائی ستھرائی کا کام شروع کر لیا۔ اس سے بھی فارغ ہوگئی۔ دھوپ دیواروں پر اتر آئی تھی اور ابامیاں کی نیند بھی کہ ختم۔ نے میں نہ آرہی تھی۔ تنگ آ کر اس نے انہیں جھنجھوڑ ڈالا، کروٹ کے بل لیٹے ابامیاں کا بے جان سا وجود اس کے جھنجھوڑنے پر سیدھا ہو گیا تھا۔

”انہیں کیا ہوا ہے؟“ اس نے حیران ہوتے ہوئے انہیں پکارا، ایک بار۔۔۔ دوبار۔۔۔ مگر دوسری طرف کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ اپنی نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے جب بہت دیر تک ابامیاں نے پلکیں نہ جھپکیں تو ان کی ساکت پتلیوں سے خوفزدہ ہو کر وہ ننگے پاؤں چلاتے ہوئے واپس بھائی کے گھر بھاگ گئی تھی۔

☆☆☆

”ابامیاں مر گئے۔“ اس نے ٹاپ چند آنسو بہائے اور پھر گھٹنوں میں سر دیے کن آنکھوں سے آنے جانے والوں کو دیکھتی رہی۔

”ہائے اللہ! منی خالہ اتنا ڈھیروں ڈھیروں ہوتے ہوئے کیسی پیاری لگ رہی ہیں۔“ اس نے چورے چھپے منی خالہ کو دیکھا، بے تحاشا رونے سے آنکھیں اور ناک سرخ ہو گئی تھی۔ سسکیاں، ہچکیوں میں ڈھل گئی تھیں۔ اور آنسو ایک تو اتر کے ساتھ بڑی روانی سے بہہ رہے تھے۔

”کاش مجھے بھی اتنا رونا آئے جتنا منی خالہ رو رہی ہیں۔“ اس کے دل میں شدید خواہش جاگی۔ مگر یہاں رونے دھونے کا تو سوال ہی کیا۔ عجب سکون اور اطمینان پھیل رہا تھا۔

”روز روز کی چیخ چیخ سے جان چھوٹی۔ خود بھی چین سے رہیں گے ہمیں بھی قرار آئے گا۔“ اس نے بڑی بے حسی سے سوچا۔

بھی کبھار تو لگتا تھا دیوانگی کے عالم میں، ایک آدھ کو جان سے مار کر ہی چین لیں گے۔ اس حالت میں وہ ان سے دور دور رہی رہتی۔ رات کو بیکار سا کھتا ہوتا تو سوتے سے جاگ جاتی تھی۔

سو خدشوں سے جان چھوٹی تھی۔ سو بے فکر بھی تھی۔ آنے والے ہزار و سوسوں اور فکروں سے بے نیاز لاعلم۔

اور پھر اسی شام ابامیاں، کلمہ شہادت کی آوازوں میں گھرے گھرے سے رخصت ہو گئے۔ کوئی اپنا کاندھا دینے والا نہیں تھا۔ غیروں نے تھا ما اور قبر میں اتار دیا۔ منی خالہ گھر میں دہائیاں دیتی رہ گئیں۔ ابامیاں کے کفن دفن کا انتظام مولوی صاحب نے ہی کیا ہے۔ اپنی زندگی میں ہی کچھ نہ کچھ روپے ان کے ہاں جمع کرواتے رہے تھے۔

”میں نہیں چاہتا کہ میری میت پر کفن کے لیے دو دو آنے خیرات کیے جائیں۔“

سو مولوی صاحب نے کفن دفن کا انتظام کیا۔ جو روپے بچے۔۔۔ پلاؤ، زردے کی دیگ پکوائی۔ آنے والوں نے جی بھر کے کھایا اور فاتحہ پڑھ کر گھروں کی راہ لی۔

وامق بھائی گھر میں نہیں آئے تھے۔ باہر مردوں کے بیٹھنے اور ان کے لیے ٹھنڈے پانی کا بندوبست کرتے رہے۔ بعد میں جھوٹے برتن اور دریاں سمیٹنے کی فکر میں لگ گئے۔ ان کی اماں، منی خالہ کو تسلی دلا سادے کر گھر لوٹ گئیں۔ اور پیچھے منی خالہ کا ساکت وجود اور ان کے دردناک بین کی بازگشت اسے ہولاتی رہی۔

خالی، ڈھنڈا گھر میں اسے اپنا آپ اجنبی سا لگنے لگا تھا۔

جس وقت بانگے خالو گھر میں داخل ہوئے، منی خالہ ایک کونے میں دم سادھے بیٹھی تھیں۔ نور القمر بولائی بولائی سی سارے گھر میں چراتی پھر رہی تھی۔ آنگن میں مٹی کی چلی در یوں پر جھوٹے چاول بکھرے تھے اور دو چار گلاس اوٹھ پڑے تھے۔ بانگے خالو کمرے میں چلے گئے تھے۔ دیوار سے دیوار تک، فرش سے چھت تک، آنکھیں سکڑ سکڑ کر کمرے کا جائزہ لیا۔ پھر سارے گھر میں آزادانہ گھومنے لگے۔ باورچی خانہ، گول کمر، ڈرائنگ روم ایک ایک چیز کو بغور دیکھا اور پھر باہر نکل آئے۔
 ”یہ گھر کس کے نام ہے؟“ وہ منی خالہ کے سر پر کھڑے پوچھ رہے تھے۔

”معلوم نہیں۔۔۔“

”کاغذات کہاں ہیں؟“

”پتا نہیں۔“

منی خالہ کی لاعلمی پر بانگے خالو کچھ بڑبڑائے تھے۔

نور القمر نے پانی کا گلاس منہ سے ہٹا کر انہیں دیکھا۔ مگر سمجھ نہ پائی۔

تب وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

”ابامیاں، ایسے ضروری کاغذات کہاں رکھتے تھے؟“

”آپ نے کچھ کھایا بھی ہے یا یونہی۔۔۔ نور القمر۔۔۔“ اس کے بولنے سے قبل منی خالہ نے

اسے اشارہ کیا اور خود مہمان خانے کا دروازہ کھولنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

وہ ٹرے رکھنے کے لیے گئی تو منی خالہ وہاں موجود نہ تھیں۔ وہ پانی کا جگ رکھ کر انہیں ڈھونڈتی ابامیاں کے کمرے میں چلی آئی۔ آہٹ پا کر کاغذات کی صندوق پر جھنجھنی منی خالہ بری طرح کھرا کر اس کی

طرف پلٹیں۔ رنگ ایک لمحے کے لیے زرد ہوا مگر پھر اسے دیکھ کر گویا جان میں جان آئی تھی۔

”آؤ۔۔۔ آؤ۔۔۔ نور! میں بس ابھی ایک منٹ میں آئی ہوں۔“ وہ ساڑھی کا پلوارد گرد پھیلاتی

کمرے سے باہر نکلیں پھر اسی وقت پلٹ کر عجلت میں سرگوشی کی۔

”اپنے خالو سے کچھ مت کہنا۔۔۔ کہ میں کہیں گئی ہوں۔ بس ایک منٹ میں آتی ہوں۔“ وہ بجلی کی سی تیزی سے باہر نکلیں اور ذرا سی دیر میں کنڈی کھول کر باہر۔
 ”یہ کیا بات ہوئی بھلا؟“ اس نے حیران ہو کر دیکھا۔
 صندوقچی یونہی کھلی پڑی تھی۔ اس نے تمام کاغذات سمیٹ کر اندر رکھے اور صندوقچی پلنگ کے نیچے کھسکا کر باہر نکل آئی۔

اگلے دن کا سورج نمودار ہوا تو وہ تینوں گھر سے رخصت ہونے کے لیے تیار کھڑے تھے۔
 رات منی خالہ نے دامق کی اماں کی کس قدر منت سماجت کی تھی۔
 ”خالہ! نور القمر کو اپنے پاس رکھ لیں۔ جھار پونچھا، صفائی کپڑے۔“
 نور آنکھوں میں حیرت بھرے منی خالہ کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ اور دامق کی اماں نے صاف صاف لفظوں میں ہی جواب دے دیا تھا۔

نکوئی رشتہ نہ تعلق۔۔۔ محض ہمسائیگی، جوان جہان لڑکی کی ذمہ داری وہ کیونکر اٹھاتیں۔ ان کے انکار سے منی خالہ کی جو حالت ہوئی تھی۔ نور القمر ان کی طرف سے سخت بددل ہوئی۔
 ”کیا میں اتنی ارزاں ہوں۔۔۔ بوجھ۔۔۔ بیکار۔۔۔ منی خالہ مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتیں۔ کتنی بری ہوں میں۔ اور میں نے سوچا تھا اب میں اکیلی ہوں تو منی خالہ یہاں آجائیں گی میرے پاس۔ مگر یہ تو شادی کے بعد بدل ہی گئیں۔“
 وہ انگلیاں چٹختے، لب کاٹتی رہی۔ اب ابامیاں یاد آ رہے تھے۔

ساری رات منی خالہ سکیاں بھرتی سامان سمیٹتی رہیں۔ وہ تکیے میں منہ دیے آڑی ترچھی اپنے پلنگ پہ لیٹی رہی۔ ساتھ تو کچھ بھی لے کر نہ جانا تھا۔ بس ایک سوٹ کیس میں پہنے اوڑھنے کے کپڑے رکھے اور باقی سب سامان کمروں میں رکھ کر تالا لگا دیا گیا۔
 بانے خالو کا موڈ اچھا نہ تھا۔ صندوقچی کھٹنگا لٹنے کے بعد سے انہوں نے کسی سے کلام نہ کیا تھا۔ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے رہے۔ اپنی مرضی کا کوئی کاغذ انہیں نہ مل سکا تھا۔ نور القمر ساتھ جانے کے لیے تیار ہوئی تو وہ چونک گئے۔

”سہ۔۔۔؟“ سوالیہ نگاہوں سے منی خالہ کو دیکھا۔
 وہ ہچکلائی گئیں۔۔۔ نور القمر کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔
 ”اگر آپ مجھے ساتھ نہیں لے جانا چاہتے تو میں یہیں رہ لوں گی۔ اکیلی۔۔۔ تنہا۔“ وہ اپنی خالہ سے زیادہ بہادر اور نڈر لگ رہی تھی اس لمحے۔

بانے خالو نے بغور اسے دیکھا۔ روٹھی روٹھی نفاسی، بچوں کی طرح ناراض ہو رہی تھی۔
 ”کیوں رہو گی ہمارے ہوتے ہوئے اکیلی۔۔۔ تنہا۔۔۔ ہم نے کوئی اعتراض نہیں کیا جو۔۔۔“
 ”اچھا چلیں اب۔۔۔ دیر۔۔۔“ منی خالہ بھاری سوٹ کیس اٹھا کر لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھیں۔

دامق بھابھا پر دروازے پہ کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ آگے بڑھ کر سوٹ کیس تمام لیا، منی خالہ کی چال میں سستی آگئی تھی۔ چہرہ بھگائے دھیرے دھیرے قدم اٹھانے لگیں۔

نور القمر جھٹ پٹ تانگے پہ چڑھ گئی اسے اگلی سیٹ پہ بیٹھنا پسند تھا۔ بانے خالو اس کے برابر بیٹھ گئے۔ منی خالہ دروازے پہ بھاری تالا لگا کر پیچھے آ بیٹھیں۔
 دامق بھیا نے ان کے پیروں کے قریب سوٹ کیس رکھا۔ اور ہتھیلی منی خالہ کے سامنے پھیلا دی۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑی چابی دامق بھائی کی ہتھیلی پہ رکھ دی۔ ہاتھ ہٹنے سے قبل ہی دامق بھائی نے منی بند کر لی تھی۔ منی خالہ نے ہبہرا کر بانے خالو کی طرف دیکھا۔ وہ متوجہ نہ تھے۔ اپنا ہاتھ واپس کھینچتے ہوئے انہوں نے سر پہ سے پھسلتی چادر درست کی۔ اور نگاہیں اپنے پیروں پہ گاڑ دیں۔

کوچوان کا چابک ہوا میں لہرایا۔
 بانے خالو نے پلٹ کر دامق بھائی کو الوداعی سلام کہا اور پھر سیدھے ہو بیٹھے۔ تانگے کے بڑے بڑے پیسے سڑک کو پیچھے دھکیلنے لگے تھے۔
 ”اللہ کے سپرد۔۔۔“ دامق کی اماں نے دروازے میں کھڑے کھڑے دعادی۔ دامق بھائی چند

قدم ان کے پیچھے آئے اور پھر وہیں رک گئے۔ کچھ دور جا کر منی خالہ نے سر اٹھایا۔
 وہ دونوں ہاتھ پشت پہ باندھے، گھر کے سامنے لگے کیکر کے نیچے کھڑے تھے اور ننھے منے زرد مخملیں پھول ہلکی ہوا میں ان کے چاروں اطراف گر رہے تھے۔ ان کے ہونٹ دھیرے دھیرے ہل رہے تھے اور منی خالہ کی نگاہیں فضا کی کبھی تحریروں کو پڑھ پڑھ کر مٹا رہی تھیں۔
 شیشم کے درختوں میں گھری کوئٹا کی سڑک گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز اگلے کئی روز تک، شام کے آخری پہر میں زندہ ہوتی رہی اور کوچوان کا چابک اداس فضا پر درد کی شکنیں داغتا رہا۔

☆☆☆

”اف۔۔۔ خالو آپ بہت اچھے ہیں۔۔۔“ ریل گاڑی کی جھک جھک سنتے ہوئے اس نے کوئی تیسری بار خالو کی تعریف کی تھی اور ساتھ ہی کن آنکھیوں سے منی خالہ کو دیکھا جو سر جھکائے اپنے سرخ ہونٹوں کو کاٹ کاٹ کر مزید سرخ کیے جا رہی تھیں۔ کھٹی میٹھی املی کا چٹخارہ لیتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں خوب مزا لیا۔

وہ ان سے ناراض تھی۔ انہیں تنگ کرنے کے لیے فرمائشوں پہ فرمائشیں کیے جا رہی تھی۔ اور بانے خالو ٹھہرے دل کے رئیس، بلا تر ڈواس کی مانے جا رہے تھے۔ نان کباب شربت چائے، اور ذرا دیر پہلے اس کی لالچی نگاہوں کے تعاقب کے بعد انہوں نے بغیر اس کے کہے کھٹی میٹھی املی کے ڈھیروں پیکٹ لے کر اس کی گود میں ڈال دیے تھے۔

”ہونہہ! کہاں کی خالہ ہیں؟ بانے خالو نہ ہوتے تو وہاں دامق بھائی کے گھر نوکرانی بنا کر چھوڑ آتیں۔ یا پھر اس خالی ڈھنڈار، ویران قبرستان میں گاڑ آتیں۔ شادی کروا کے خود کو کچھ سمجھنے لگی ہیں۔ ایسی بیگانگی۔۔۔ ہونہہ۔۔۔“
 ”ہائے خالو! آپ کتنے اچھے ہیں۔“ وہ مزے سے ان کے کندھے پہ سر رکھے المیاں چوس رہی تھی۔

بانے خالو کھلکھلا کر ہنس دیے۔ منی خالہ پہلو بد لگئیں۔
 ”کیسے جل بھن رہی ہیں۔ ساری راہ خالو نے جھوٹے منہ بھی نہیں پوچھا۔“ منی کیا کھاؤ

گی۔۔۔؟“ میری بڑی قدر کرتے ہیں۔“ وہ جی جان سے خوش ہو رہی تھی۔
ریل کسی چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی تھی۔ ذرا دیر کے لیے نیچے اتر گئے تھے۔ منی خالہ نے بڑے صبر سے ان کے جانے کا انتظار کیا اور پھر جھپٹ کر اس کی کلائی پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ دھپ سے ان کے برابر آ گری۔

”کیا بھی بچی کی طرح ان کے کاندھے سے لگی جا رہی ہو۔ تمیز سے یہاں بیٹھو اور اگر اب تمہاری زبان بلی تو اٹھا کر ٹرین سے باہر پھینک دوں گی۔“ کیا قہر برس رہا تھا ان کی آنکھوں سے۔
”ہونہ۔۔۔ آئیں بڑی نہیں سے۔۔۔“ ان کی سخت گرفت سے اپنی کلائی آزاد کرواتے ہوئے اس نے خونخوار نگاہوں سے انہیں دیکھا اور پھر جھٹکے سے اپنا رخ موڑ لیا۔ منی خالہ سن سی ہو گئیں۔
”کیا چوزوں کی طرح سہمی رہتی تھی گھر میں۔ خوفزدہ کیوتری، اور اب کیسی بے خوفی اتر آئی ہے اس کی آنکھوں میں، ڈر، لحاظ، مروت کہاں چھوڑ آئی سب کا سب۔۔۔؟“ وہ کھڑکی سے باہر گمشدہ چیزوں کو کھوجنے لگیں۔

نور القمر اپنی جگہ بیٹھی تلملارہی تھی۔
”ساری عمر ابامیاں کی تلوار سر پر لگی رہی۔ ہم معصوم گائیں، بھیڑیں آگے آگے اور ابامیاں کا ڈنڈا پیچھے پیچھے۔۔۔“

”اوچی آواز میں مت بولو۔۔۔ ابامیاں ناراض ہوں گے۔“
”زور سے مت ہنسو۔۔۔ ابامیاں کو غصہ آ جائے گا۔“
”ریڈیو کی آواز آہستہ رکھو، ورنہ ابامیاں خفا۔۔۔“
”باہر مت نکلو۔۔۔ دو پیڑ ڈھنگ سے اوڑھو۔ چھت پہ نہیں جانا۔ رات دیر تک بتی نہیں جلائی۔ ورنہ۔۔۔ ورنہ۔۔۔ ابامیاں، ابامیاں، ناراض۔۔۔“

ابامیاں کی ڈانٹ، ابامیاں کی جھاڑ، ابامیاں کی پھکار، اف۔۔۔ اف۔۔۔
”اف۔۔۔ جاسوئے ابامیاں قبر میں۔۔۔ جان پھوٹی خدا خدا کر کے۔“
اب جیسے دل چاہے گا جنیں گے۔ زور سے بولیں گے۔ قہقہہ لگا کر ہنسیں گے۔ ابامیاں پڑے تلملاتے رہیں قبر میں ہماری بلا سے۔“ وہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ ارد گرد سے بے نیاز اپنی ہی سوچوں میں گم۔
بانگے خالو نے چونک کر اس شاداب چہرے والی دیوانی سی لڑکی کو دیکھا۔ اور سر جھٹک کر مسکرا دیے۔

”ابوزرہ گئیں ابامیاں کی جانشین۔۔۔“ اس نے پلٹ کر منی خالہ کو دیکھا۔
”توان سے میں نمٹ لوں گی۔“ زیر لب مسکراتے ہوئے اس نے ہاتھ جھاڑے اور سیٹ سے ٹپک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

ان ڈبے کے بیشتر مسافر آنکلیں بند کیے اوجھ رہے تھے۔
اضطرابی انداز میں اپنے برس میں کچھ تلاش کرتی منی خالہ نے سر اٹھا کر چورنگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ سب مسافر اپنی اپنی جگہ محو تھے۔ نیم غنودگی میں نور القمر کا سر ان کے کندھے سے آگاتھا۔

انہوں نے ایک گہری نظریاہ چمکدار بالوں میں کھنچی سیدھی مانگ پر ڈالی اور پھر تھک کر اپنا سر سیٹ سے لگا دیا۔
نور القمر کی شوخ کھلکھلائی ہنسی کے سنہری سکے اس کی ساعتوں پر ابھی تک گول گول گھوم رہے تھے۔

☆☆☆

”آگئیں بہورانی! بھانجی کو بھی لے آئیں۔ بہت اچھا کیا۔ ہم تو یوں بھی ٹھیکے دار ہیں۔ تیموں، مسکینوں کے، ایک پہلے پال رہے ہیں۔ دوسری کو اب پال لیں گے۔ اور پھر تمہارے خاندان میں تو رواج ہی بن گیا ہے۔ کچھ کو اللہ تعالیٰ نے تیمی دے دی اور کچھ اپنے جیتے جی بچوں کو یتیم کر گئے۔ میں کہتی ہوں خاندان میں کچھ اور بن ماں، باپ کے ہیں تو انہیں بھی لے آؤ یہاں۔ میں تو یوں بھی گھر کے باہر سختی نصب کروا رہی ہوں۔ پناہ گاہ یتیمیاں، دارمسکیناں۔۔۔“

کسی نے سر کے عین وسط میں تلوار گھونپی تھی جو اسے پاؤں کے انگوٹھے تک کاٹتی چلی گئی تھی۔ ایک بار نہیں۔۔۔ دو بار۔۔۔ سہ بار۔۔۔ چہار بار۔
پلکوں پہ پہاڑ آن کرے تھے۔ اس نے بدقت تمام نگاہ اٹھائی۔
کہنے والی نے مکروہ ہنسی تاک کر اس کی مردہ آنکھوں میں اچھالی، اپنی تھیلی میں سے سونف نکال کر پھانکی اور نیچے پہ نیم دراز چگالی کرنے لگی تھی۔
اسے لگا وہ لبق و دق صحرائیں جلتی ریت پر سنگے بدن پڑی ہے اور دکھتا سورج بڑی فیاضی سے اسے آگ کا لباس پہنارہا تھا۔
کوئی ہے جو میرے حلق میں چند بوندیں پانی کی ٹپکا دے۔۔۔“ اس نے مدد طلب نگاہوں سے کسی مہربان کو کھوجا۔

بانگے خالو کسی کمرے کے جالی دار دروازے کے پیچھے کھوکھے تھے۔ اور منی خالہ۔۔۔ انہوں نے آتے ہی سیاہ چادر اتار کر ساڑھی کا پلو کمر میں اڑسا تھا اور صحن میں بکھری چیزیں سیٹنے لگی تھیں۔ یوں جیسے انہیں معلوم ہو کہ یہ سب انہیں ہی کرنا ہے۔ چہرے کی اصل رنگت اور ہونٹوں کی لالی تو اس گھر میں داخل ہوتے ہی کہیں چلی گئی تھی۔ اور اب وہ بھاگ بھاگ کر چیزیں اٹھا رہی تھیں۔
”یہ گلاس۔۔۔ وہ جوتا۔۔۔ بکھرے کھلونے، گدے پانی کا ٹب، صابن کا جھاگ۔۔۔ وہ شواپ شواپ جھاڑو چلانے لگیں۔

”کیا یہ وہی منی خالہ ہیں جو ابھی ابھی میرے ساتھ ٹرین کا بہت لمبا سفر طے کر کے آئی ہیں؟“
اٹھارہ گھنٹے کے سفر کی تکان اس کی پنڈلیوں میں کینچوے کی طرح ریگ رہی تھی۔
منی خالہ کی بھگتی ہوئی نگاہ یونہی اس پہ جا پڑی تھی۔ انہوں نے کن آنکھوں سے سخت پہ پڑے وجود کو اونگھتے دیکھا تو دبے پاؤں اس کی طرف آگئیں۔ اس کا ہاتھ تھامے وہ اسے ایک کمرے میں لے آئی تھیں جہاں ان کے جہیز کا تھوڑا بہت سامان گرد سے اٹا ہوا تھا۔ وہ پلنگ کی پٹی پہ ٹپک گئی۔ ان دونوں کے بیچ موجود چند لمحے، مکار چپ نے بڑی عیاری سے ہڑپ کر لیے تھے۔ تب ہی دروازہ کھول کر ایک نوعمر لڑکا اندر آیا۔

”چھوٹی امی۔۔۔ بڑی امی کہتی ہیں۔ اپنے پوٹی، بستر تو صحن سے اٹھالیں۔ کیا گند مچایا ہوا ہے۔“
منی خالہ ٹپٹا کر باہر نکل گئیں۔

نور القمر نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ تالو سے چپکی زبان بمشکل چھڑائی اور زیر لب دو لفظ دوہرائے۔
”چھوٹی امی، بڑی امی!“ کیسا تھرا کر رکھ دینے والا انکشاف تھا۔

اس نے سینے کو زور سے مسل کر اپنا انکا ہوا سانس باہر نکالنے کی کوشش کی۔
کمرے میں آکسیجن نہ ہونے کے برابر تھی۔ ہوا کو اندر کھینچنے کی کوشش میں اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔

”آہ۔۔۔“ وہ اٹھ کر کمرے میں موجود واحد کھڑکی کی طرف بھاگی۔

ایک جھٹکے سے کھڑکی کے دونوں پٹ باہر کی جانب کھول دیے۔

”ہا۔۔۔ آ۔۔۔“ وہ چوکھٹ پہنچتی لمبے لمبے سانس کھینچنے لگی۔ اس کی گردن دو نا دیدہ ہاتھوں کے شکنجے میں جکڑی ہوئی تھی۔ اگلے لمبے وہ چوکھٹ پہ پیر جمائے کھڑکی سے باہر تھی۔ اجڑا ویران چھوٹا سیاباغ تھا۔ زرد مسلی ہوئی مردہ گھاس، وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گر گئی۔ اس کے اطراف میں ہر چیز ساکت تھی۔ لمبے لمبے درخت، درختوں کے پتے۔ ڈالیاں، اور ان ڈالیوں پہ بیٹھے چڑیاں، طوطے، سب ساکت، آسمان ساکت، زمین منجمد، ہوا ٹھہری ہوئی۔ اور اس کا اپنا دل، کسی ایک سنبی ہوئی دھڑکن کے بعد سے لے کر اب تک بے حس حرکت، اس کا دل چاہا وہ چیخے۔ اتنی زور سے کہ فضا کا سکوت چمن سے ٹوٹ جائے۔

کچھ اور بس میں نہ رہا تو وہ سہ پہر کے ان لمحوں میں اجڑے، ویران باغ کی زرد مسلی ہوئی مردہ گھاس پہ گھٹنوں میں سر دیے با آواز رونے لگی تھی۔

☆☆☆

مغرب کی اذان ہونے میں ابھی کچھ وقت تھا، جب وہ منی خالہ کے پیچھے پیچھے بہت بڑی بڑی سیڑھیوں کو ایک ایک کر کے اپنے قدموں سے دھکیلتی اور پر آئی۔ منی خالہ نے کمرے کا بوسیدہ دروازہ کھول کر سامان ایک کونے میں رکھ دیا۔ اس نے کمرے میں قدم رکھتے ہی اس کے در و دیوار پر نظر ڈالی تو نگاہیں بے اختیار ہی بھٹک کر منی خالہ کے چہرے پہ جم گئیں وہ نظریں چرا کر خواجواہ ہی کھٹکھارنے لگیں۔
”بلب۔۔۔ بلب نہیں ہے اس کمرے میں۔۔۔ لیکن خیر ہمیں تو بڑا عرصہ ہوا اتنی روشنی کی عادت بھی نہیں رہی۔۔۔ ابامیاں کے کمرے سے چراغ اٹھالائی تھی نشانی کے طور پر۔ سوٹ کیس کھول تو نکال کر دے دینا۔ میں تیل ڈلوالوں گی۔“

”ابامیاں کی ہر نشانی تو ان کے کمرے میں سنبھال کر رکھ آئی تھیں آپ۔۔۔ چراغ یوں اٹھا لائیں کہ آپ کو پہلے سے ہر چیز کی خبر تھی۔“ اس نے سوچا ضرور مگر کہ نہ سکی۔ منی خالہ ساڑھی کے پلو سے زور زور سے آنکھیں مسل رہی تھیں۔

”کیا ہوا۔۔۔؟“ وہ پوچھ بیٹھی۔

”کچھ نہیں۔۔۔ گردی آنکھوں میں بھر گئی ہے۔ شاید سفر کی وجہ سے۔۔۔“ وہ غلت میں باہر کی طرف بوھیں۔ دروازے کے قریب ٹھوکر سی لگی تھی۔

نور القمر اپنی جگہ سے ایک انچ آگے نہ بڑھی تھی۔ وہ خود ہی سنبھل گئیں۔
”رات کو کھانا میں یہیں لاؤں گی۔ تم نیچے مت۔۔۔“ نجیانے کسی گرد گھس گئی تھی ان کی آنکھوں میں، نکلنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ وہ خود البتہ تیز تیز قدم اٹھائی وہاں سے چلی گئی تھیں۔۔۔ وہ دم سادھے، فرش پہ نظریں ٹکائے کھڑی رہی۔

کئی لمحوں گزر گئے، تب سیڑھیوں پہ بڑی والے جوتے کی ٹھک ٹھک ابھری، اس کی سماعتیں کچھ دیر تک سیڑھیاں اترتی چاب کا تعاقب کرتی رہیں اور جب آواز بہت مدھم ہو گئی تب اس نے سر اٹھایا اور اس کمرے کی طرف دیکھنے لگی جہاں اسے اب رہنا تھا۔

دو شہتروں پہ ڈالا گیا یہ کمر البانی، چوڑائی میں بالکل برابر تھا۔ بہت سارا کاٹھ کباڑ یہاں جمع تھا۔ ٹوٹی ہوئی چار پائیاں، دو چار کرسیاں۔۔۔ زنگ لگا بیڈسل فین، فوم کے گدے، لوہے کے ٹوٹے پھوٹے ٹرنک، ردی اخبارات، کاپیاں، بغیر آئینے کی سنگھار میز، اور اس دولت بے بہا کو نجیانے کن مشکلوں سے ایک طرف ہٹا کر منی خالہ نے اس کے لیے ایک گوشہ صاف کیا تھا۔

ڈبڑھ، دو چار پائیوں کے برابر خالی جگہ، نہ کوئی پلنگ نہ چار پائی، سینٹ اوہڑا او نیچا فرش۔۔۔
”منی خالہ نے یقیناً بہت محنت کی ہے۔۔۔“ ٹوٹے پھوٹے فرش پہ پوچھا لگنے کے نشان نظر آ رہے تھے۔ وہ مرے مرے سے قدم اٹھاتی باہر نکل گئی۔ ایک یہ کمر تھا، اور چھت کے آخری سرے پہ ایک اور کمر، دروازے پہ تالا لگا ہوا تھا۔ چھت کی بیرونی دیوار کے ساتھ نیم کا بہت بڑا سا درخت جڑا ہوا تھا۔ جس کے سر سبز پتوں سے زرد زرد نمولیاں جھانک رہی تھیں۔ گھر کی طرف دیوار میں سینٹ کی جالیاں لگی تھیں۔ اس نے کندھوں تک آتی دیوار پر ہاتھ جما کر نیچے جھانکا۔ شطرنج کی بساط جیسا سیاہ، سفید ٹانکوں سے بنا صحن مختلف افراد کی آوازوں سے بھرا ہوا تھا۔ سامنے برآمدے میں رکھا ٹیلی ویژن بار بار تصویریں بدل رہا تھا۔ وہ بس ایک نظر ڈال کر پیچھے ہٹ گئی۔ مغرب کی اذان ہو چکی تھی۔ اندھیرا تیزی سے پھیلنے لگا تھا۔ وہ واپس اسی کمرے میں آگئی۔ ٹھنکن زدہ جسم نرم گرم بستر کا متقاضی تھا۔ اس نے ایک نظر کھر درے فرش پر ڈالی اور سوٹ کیس پر پڑا بستر بچھانے لگی۔

ایک موٹا کھیس اور اس پر پچھی چادر بھی اگرچہ فرش کی سختی کو ختم نہ کر پائی تھی۔ مگر اس کا جسم اور ذہن دونوں اتنے تھک چکے تھے کہ پھر وہ اس چیز کو زیادہ دیر تک محسوس نہ کر پائی تھی۔ اور اپنے عین اوپر کھڑکی میں لگی جالی سے باہر چھلتی تاریکی کو دیکھتے دیکھتے نیند کی وادیوں میں جا گری تھی۔
نجیانے کتنی دیر سوئی تھی وہ۔ لیکن اس وقت ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی جب منی خالہ موسم بتی ہاتھ میں لیے اس کے سر پہ کھڑکی تھیں۔

”اٹھ جاؤ نور! کھانا کھا لو۔“

چند لمحوں بونہی انہیں دیکھتے رہنے کے بعد وہ کسلندی سے اٹھی تو لبوں سے بے اختیار ہی آہ نکل گئی۔ اونچے نیچے فرش پہ سونے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ اور اسے اپنی پشت پہ جا بجا گھاؤ لگے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

منی خالہ ٹرے اس کے پاس رکھ کر بیٹھ گئی تھیں۔

”آپ نے کھا لیا؟“

”ہوں۔۔۔“ وہ پگھلتی ہوئی موم بتی پر نگاہ گاڑتے بیٹھی تھی۔
اس نے پہلا لقمہ توڑتے ہوئے ان کی جانب دیکھا۔ دن کے اجالے کی نسبت اس نیم تاریکی میں
ان سے بات کرنا آسان لگا تھا۔ مگر پھر بھی اس نے قدرے ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا۔
”منی خالہ! آپ کو پہلے سے پتا تھا کہ۔۔۔؟“
”نہیں۔۔۔“
”یہاں آکر معلوم ہوا۔۔۔؟“
”ہاں۔۔۔ سواگت اسی نے کیا تھا۔“ وہ جلتے ہوئے موم کے قطرے اپنی ہتھیلی پہ پٹکانے لگی
تھیں۔

”آپ نے۔۔۔ آپ نے ابامیاں کو نہیں بتایا تھا؟“
”وہ لاقلم کب تھے؟“
”کیا۔۔۔؟“ لقمہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔
”اس کے باوجود انہوں نے۔۔۔؟“
”ہاں اس کے باوجود۔۔۔“

”ہائے ابامیاں! قبر میں نہ پڑے ہوتے تو یہ موٹی موٹی گالیاں دیتی آپ کو۔۔۔ میری نازک سی
منی خالہ۔۔۔“ اس نے بھرے دل کے ساتھ بڑے پیچھے کھسکا دی۔
”کتنے بچے ہیں ان کے؟“
”تین۔۔۔ تینوں بیٹے ہیں۔“

وہ چپ کی چپ رہ گئی۔
منی خالہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا یوں جیسے پوچھ رہی ہوں۔
”بس یا کچھ اور۔۔۔“

لیکن اسے واقعی چپ لگ گئی تھی۔ اگر کوئی سوال ذہن و دل میں تھا بھی تو اب دم توڑ چکا تھا۔
”کھانا جلدی کھاؤ۔۔۔ مجھے جانا ہے۔“

”بس کھا چکی۔۔۔ آپ جاییے۔۔۔“ اس نے مجھے دل کے ساتھ بڑے اٹھا کر ان کے ہاتھوں
میں دے دی۔

”موم بتی، یہاں چھوڑ جاؤں؟“

”ضرورت نہیں۔۔۔“ وہ کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔

منی خالہ کے جاتے ہی کمر اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر تک ساکت و صامت لیٹی
رہی پھر اٹھ بیٹھی۔ اس تنگ و تاریک کونجڑی میں سانس گھسنے لگا تھا وہ تنگے پیر ہی باہر نکل آئی۔

تھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ نیم کے پتوں کی ہلکی ہلکی سرسراہٹ ماحول کی خاموشی میں ارتعاش سا پیدا
کر رہی تھی۔ اس نے سینٹ کی جالیوں سے پرے صحن میں جھانکنے کی کوشش کی۔ وہاں بھی مکمل خاموشی
اور تاریکی کا راج تھا۔

”پتا نہیں وقت کیا ہوا ہے؟“ وہ وہیں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر

چاروں طرف دیکھنے لگی۔

”اب معلوم نہیں کب نیند آئے گی؟“ وہ جلد ہی اکتا گئی۔ اٹھ کر سامنے والے کمرے پر لگے تالے
کو ہلا جلا کر دیکھا۔

”اس میں اللہ جانے کون سے خزانے دفن ہیں۔“ تالا کافی مضبوط تھا۔ وہ مایوس ہو کر چھت کے
ایک کونے سے دوسرے کونے تک چکرانے لگی۔

تب ہی اسے محسوس ہوا، کہیں کوئی آہٹ ہوئی ہے۔۔۔ وہ چونک سی گئی۔ قدم روک کر ادھر ادھر
دیکھنے لگی۔

”شاید کوئی سیڑھیوں سے اوپر آ رہا ہے۔“ بھاری قدموں کی آواز سیڑھیوں پہ ابھری تو وہ بگٹٹ
بھاگ کر کمرے میں گھس گئی۔ دروازہ بند کیا اور دم سادھے اپنے بستر پر جا بیٹھی۔

”رات کے اس پہر کون ہو سکتا ہے؟ ہو سکتا ہے کسی نے نیچے سے مجھے ٹپکتے ہوئے دیکھ لیا ہو اور
اب ڈانٹ پھٹکار۔۔۔“ اس کا دل ڈوبنے لگا۔

قدموں کی چاپ نزدیک آ رہی تھی۔ اس نے آنکھیں میچ کر سر گھٹنوں میں دے دیا۔ اب دروازہ
کھلا کہ اب۔۔۔

”بیانا نام کا دیا۔۔۔ دروازے کے عین سامنے گنگناہٹ ابھری۔“

”جلا ہے ساری رات۔۔۔“

کوئی کمرے کے سامنے سے گزر کر آگے بڑھ گیا تھا۔

”ہاں میں۔۔۔ یہ کون۔۔۔؟“

اس نے گھٹنوں کے بل ہو کر جالی دار کھڑکی سے باہر جھانکا۔ ایک سایہ سا بڑی بے نیازی سے چلتا
ہوا اس مقفل کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اگلے چند لمحوں میں اس نے دروازہ کھلتے اور اس کمرے کو بلب

کی زرد روشنی سے منور ہوتے دیکھا تھا۔ چوہٹ کھلے دروازے سے کمرے کا یہ بے حد روشن منظر اسے
بہت بھایا تھا۔ اپنے کمرے کی تاریکی میں بیٹھ کر وہ اس روشنی کو اگلے کئی لمحوں تک دیکھنا چاہتی تھی، مگر وہ

دروازہ قامت نو جوان دروازے کے فریم میں نمودار ہوا اور اگلے ہی بل دروازہ بند ہو گیا تھا۔ اسے
قدرے مایوسی ہوئی، کچھ دیر تک وہ یونہی جالی پر انگلیاں پھیرتی اس دروازے سے باہر آئی روشنی کی ان

لیکروں کو دیکھتی رہی جو باہر صحن میں جا بجا بکھری ہوئی تھیں۔ پھر تھک ہار کر سیدھی ہو گئی۔
”پتا نہیں میرے نصیب میں روشنی کیوں نہیں ہے؟“ اس نے لیٹتے ہوئے دل گرفتگی سے سوچا، اور

سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

”اُف میرے اللہ! کس دوزخ میں کئی ہے ساری رات۔۔۔ ایک اندھیری قبر تھی، جس کے جس
اور سنائے نے ہر لمحے بے چین کیے رکھا۔ اور کاٹھ کباڑ اس میں سے نجانے کتنے ساپ بچھو نکل نکل کر

میری طرف آتے رہے۔ جسم تو یوں لگتا ہے رات بھر میں ساری نرمی کھو بیٹھا ہے۔ منی خالہ کیا ایک
چار پائی نہیں مل سکتی؟“ اس قدر بے چارگی سے پوچھا تھا اس نے، اور نجانے کیسے منی خالہ کے ہاتھ سے

گرما کر مجھے چھلکی اور ان کے ہاتھ کو جلائی چلی گئی۔

ایک سکاری بھرتے ہوئے انہوں نے فوراً پیالی زمین پر رکھی اور ساڑھی کا پلو اپنے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”زیادہ جل گیا؟“ ان کی آنکھوں کو آنسوؤں سے لبالب بھرتے دیکھا تو فوراً ان کا ہاتھ تھام کر دیکھنے لگی۔ ہلکی ہلکی سرخی ہاتھوں پر پھیلنے لگی تھی۔

اس نے کچھ کہنے کے لیے سر اٹھایا تو حیران رہ گئی۔

”ممنی خالہ! آپ اتنی سی تکلیف پر رو رہی ہیں۔“

”اتنی سی تکلیف تو نہیں نور! تکلیف بہت زیادہ ہے۔ بہت درد ہو رہا ہے۔“ ان کا زار و قطار رونا اسے پریشان کر گیا تھا۔

”تو آپ اس پر کچھ لگائیں نا۔۔۔“

”ہاں۔۔۔ ہاں کچھ لگائی ہوں۔۔۔“ وہ اپنا ہاتھ دبوچے اٹھ کر باہر نکل گئیں۔

”کتنی احمق ہوں میں اور بے وقوف بھی۔ بھلا یہ سب ممنی خالہ سے کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر وہ میرے لیے اس سے بہتر کچھ کر سکتیں تو کیا میں یہاں۔۔۔؟ لیکن ان کا اپنا کمرابھی تو ہے نا۔۔۔؟“

چاہیں تو مجھے وہاں لے جائیں۔ ہانکے خالو تو اپنی پہلی بیوی کے پاس ہی ہوتے ہیں۔“

قبو سے ملتی جلتی چائے میں دو پاپے ڈبو ڈبو کر کھاتے ہوئے وہ جو سوچ سکتی تھی اس نے سوچ لیا۔ پاپے فقط دو کھائے اور پلیٹ خالی۔ چائے کا گھونٹ بھرنے کو دل ہی نہیں چاہا۔ وہ چڑ کر اٹھی۔ بغیر آئینے کی سنگھار میز تک گئی۔ بمشکل اس کی دراز کھولی، چائے اس میں انڈی اور پلیٹ اٹھا کر باہر آ گئی۔

”ممنی خالہ سے بات کرنی ہوں جا کر، نہ مانیں تو ہانکے خالو سے کہوں گی۔ وہ میری بات نہیں ٹال سکتے۔ لیکن ان کی اماں بڑی چیز ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ بھی ان ہی کے دباؤ میں ہوں۔۔۔“ وہ میز ہیاں اتر کر بیٹھ آ گئی۔ صحن بالکل خالی تھا اور کمروں کے جالی دار دروازے بند۔۔۔

”کہاں جاسوئی ساری مخلوق۔۔۔“ وہ ادھر ادھر جھانکتی ہوئی خالہ کے کمرے کی طرف بڑھی۔

باورچی خانہ بھی کدھر تھا؟

”یہ نہ ہو دھوکے میں کسی اور کے کمرے میں جا گھسوں۔“ دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تب ہی کسی نے جگلت میں اندر سے دروازہ کھولا۔ پٹاخ سے آکر منہ پہ لگا۔ ناک اور پیشانی سے گویا آگ سی نکلی تھی۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے کو ہٹی، اس سے قبل کہ گرتی، ہانکے خالو نے اس کی کمر میں بازو ڈال کر بڑے سہاؤ سے اسے سنبھالا دیا تھا۔ ہاتھ میں پکڑے برتن نیچے گر کے چور ہو گئے تھے۔ وہ ناک اور پیشانی کو سہلائی، آنکھوں میں نمی لیے دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ہانکے خالو ہونٹوں پہ مہربان سی مسکراہٹ سجائے معذرت کے دو لفظ کہتے قریب سے گزرتے چلے گئے۔ وہ اپنی ناک کو سہلاتے ٹوٹے برتنوں پر بھرمانہ سی نگاہ گاڑھے کھڑی تھی۔ جب دائیں طرف کا دروازہ کھلا اس نے رخ موڑ کر دیکھا۔

”یہ عورت یقیناً۔۔۔“ وہ ایک لمحے میں اسے پہچان گئی تھی۔

اس کا قد لمبا تھا اور جسم فربہ ہی مائل، گہرے سرخ رنگ کا لباس اس کی گوری رنگت پہ خوب سج رہا تھا۔ سبز کناری والا سرخ رنگ کا چٹا ہوا دوپٹہ تھا۔ گہرے سرخ رنگ کی لپ اسٹک نے چہرے کو اچھی

خاصی رونق بخشی تھی۔ اس کی شخصیت اتنی بارعب تھی کہ وہ خواجوا ہی گھبرا سی گئی تھی۔

”کیا کر رہی ہو یہاں؟“ لہجے میں نمکنت تھی۔

”کک۔۔۔ کچھ نہیں، میں۔۔۔ وہ ممنی خالہ۔۔۔“

”ہاں تمہاری خالہ۔۔۔“ وہ ذرا سا ہنسی۔ سرخ ہونٹوں سے جھانکتے موتی جیسے دانتوں کی چمک نے اس کے چہرے کو روشن سا کر دیا تھا۔

”ہوں گی نہیں کہیں، یا شاید اماں کے کمرے میں۔۔۔“ بڑا لا پرواہ سا انداز تھا بتانے کا۔

”تم نور ہونا۔۔۔؟ نور القمر۔۔۔؟“ اس کی بھوری آنکھوں میں بہت عجیب سا تاثر تھا، نور کو وہ عورت اپنے حواسوں پر چھاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ فقط اثبات میں سر ہلادیا۔

”اظہر نے ذکر کیا تھا مجھ سے۔۔۔ لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم واقعی ”اتنی“ خوبصورت ہو۔“ دو قدم آگے بڑھ کر اس نے اپنی پوروں سے اس کے چہرے کو ہلکا سا چھوا تھا، ان خوشبودار پوروں کے سرد لمس نے اس کے جسم میں سنسنائیں سی دوڑا دی تھیں۔ ذرا سا جھجک کر وہ بے اختیار ہی دو قدم پیچھے ہٹی مگر اگلے ہی پل ہلکی سی چیخ اس کے لبوں سے نکلی تھی۔ بے ساختہ نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ جواب میں وہ کھل کر مسکرا رہی تھی۔

”کالج چھ گیا نا بیروں میں، ہاں یونہی ہوتا ہے۔ بعض اوقات ہم اپنے آپ کو زخمی کرنے کے لیے خود ہی اپنی راہ میں کرچیاں بکھیر لیتے ہیں۔ ہاں ہوتا ہے، یونہی ہوتا ہے۔“ وہ اپنے ہونٹوں کے گوشوں میں چھپی مسکراہٹ اس کی آنکھوں میں بھرنی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ لیکن اس کی جاندار ہنسی نور القمر کے آس پاس بکھری کرچوں کرچوں کے نیچے سے جھانک رہی تھی۔

”کون تھی یہ۔۔۔؟ ساحرہ، جادوگر، پھل پیری۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے چاروں طرف دیکھا۔ سرمئی خاموشی میں لپٹے درود بوار آسب زدہ معلوم ہو رہے تھے۔ بمشکل تھوک نلگتے ہوئے وہ پلٹی، پیرتے تلے چیچا ہٹ کا احساس ہوا مگر وہ بغیر رکے بیٹوں کے بل دوڑتے ہوئے میز ہیاں چڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

ایڑی میں لگے آدھانچ لیے زخم سے رہ رہ کر ٹپسیں اٹھ رہی تھیں۔ کپڑے کی بندھی ہوئی پٹی زخم کے اوپر چمک سی گئی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے پیرتھامے وہ بہت دیر سے ممنی خالہ کی منتظر تھی۔ آنتیں بھوک کے مارے سٹرنے لگی تھیں۔ پہلا پہلا دن اور اس پر یہ سزا۔۔۔ چند دن بعد نجائے کیا شہر ہوتا تھا؟

”اللہ جانے کن گناہوں کی سزا ہے؟ دو باپوں اور سڑی ہوئی چائے کی ایک پیالی پہ سارا دن بتانا پڑ گیا۔ ہائے کیے بھوکوں کے گھر میں مرے ہیں آکر۔۔۔“

اٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے وہ بس کو سننے ہی دے سکتی تھی۔ پھر قدرے لنگڑا کر چلتے ہوئے دروازے تک گئی۔ میزھیوں سے نیچے جھانکا۔ پھر سینٹ کی جالیوں سے پیشانی ٹکا دی۔ سارا صحن بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ ایک بار دل چاہا نیچے چلی جائے۔

”چلی تو جاؤں، مگر وہ بچھل پیری، جانے کیا پڑھ کر پھونکتی ہے زبان ہی نہیں ہلتی اس کے سامنے، ادھر سے آنکھیں ایسی، جیسے سانپ سے انسان بنی ہو۔ پلٹیں بھی نہیں جھپکتی، ہنستی ہے تو جسم میں کپکپی سی ہونے لگتی ہے۔ ممنی خالہ تو بری پھنسیں۔“

وہ پھر سے آکر کال کوٹھڑی میں بیٹھ گئی۔ سورج سوانیزے پہ آ کے ڈھلنے لگا تھا۔
نقاہت کے مارے بیٹھنا دشوار ہو گیا۔ لیٹ گئی اور پھر پتا نہیں کیسے آنکھ لگ گئی۔
جاگی تو اس وقت جب کوئی سایہ اس کے قریب کھڑا اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔ وہ منہ کھولے نکلتی رہی
پھر پہچانتے ہی منہ موڑ لیا۔

”پیر پہ پٹی بندھی ہے؟ کیا ہوا؟ اور یہ تم اس وقت سو کیوں رہی ہو؟ اندھیرا ہو گیا اور تم نے شمع تک
نہیں جلائی۔ کل رکھ کر تو گئی تھی یہاں۔۔۔“ وہ مطلوبہ جگہ ٹٹولنے لگیں۔ ذرا سی دیر میں دیا سلائی کا مناسا
شعلہ لہرایا اور شمع جلا کر بجھ گیا۔ کھڑکی کی دہلیز پر شمع کا کردہ اس کے قریب بیٹھ گئیں۔
کسی ایک سوال کا جواب بھی نہ دیا۔ منی خالہ کھنی ماندی نظروں سے اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

”دو پہر کو کچھ کھایا؟ نہیں نا؟ مجھے پہلے سے خبر تھی۔ یہاں تھا ہی کون جو۔۔۔؟ تمہارے خالو کو کہیں
جانا تھا، ساتھ میں مجھے بھی لے گئے۔ رہ رہ کر تمہارا خیال آتا رہا۔ وہاں بھی جی نہیں لگا۔ اب آتے ہی
کھانا پکایا۔ تمہاری طرف بھاگی ہوں۔“ انہوں نے ٹرے اٹھا کر اس کے سامنے رکھی۔
وہ خاموشی سے موم بتی کی سرخ زبان کو لپ لپ کر کے اندھیرا انگٹتے دیکھتی رہی۔

”تو سحرتم خود عیش کر رہی رہیں۔ یہاں میری جان پہ جو بھی آفت، قیامت آئے، ان کی بلا
سے۔۔۔“ صبح سے بھوکی نہ ہونی تو شاید ٹرے اٹھا کر دیوار پر دے ماری۔
”کھاؤ نا، میں بھی تمہارے ساتھ کھاتی ہوں، لیکن وہ تمہارے خالو۔۔۔ ابھی آجائیں گے۔ کھانا
کھانے میں وہاں نہ ہوں تو۔۔۔“ وہ انگلیاں جٹھا رہی تھیں۔

”ہاں جب آپ یہاں نہیں تھیں تب تو جیسے وہ کھانا ہی نہیں کھاتے تھے۔ نوالے بنانا کر منہ میں
ڈالتی ہوں گی اس چوچو کے۔“ وہ سارے جہان سے خفا ہوئی بیٹھی تھی۔ دانتوں تلے زبان دبائے ٹرے
اپنی طرف کھسکالی۔

”تم سے کہا تھا دیے میں تیل ڈلو، رات گئے بہت اندھیرا ہو جاتا ہو گا نا۔“
”جانے دیجیے، یہاں اندھے کونئیں میں بیٹھ کر باگ در اٹھتی ہے کسی نے جو روشنی کی ضرورت
ہو۔ اور پہلے کون سی آسائشیں دے ڈالیں جواب ذرا سی روشنی کے لیے اتنا تردد ہو رہا ہے۔ ایک چار پائی
تک تو۔۔۔“

”تم نے بتایا نہیں، پیر پہ کیا ہوا؟“ منی خالہ اسے بولنے کے لیے مجبور کر رہی تھیں اور وہ تھی کہ بے زار و
لاچار۔۔۔ بولنے کو دل ہی کہاں چاہ رہا تھا۔ تنگ آکر انہیں یاد دلایا۔۔۔

”بائے خالو، آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے۔“
”اوہ۔۔۔ ہاں۔۔۔“ بھولی ہوئی بات نے ڈیک مارا تھا۔ وہ مہرتی سے انھیں اور تیز تیز قدم
اٹھاتی باہر کو پکیں۔

”کیسی عجیب سی ہو گئی ہیں منی خالہ۔۔۔ بہانے باز، جھوٹی اور پرانی بھی بات کرتے ہوئے
نظریں چراتی رہتی ہیں۔ اب معلوم نہیں واقعی کہیں گئی تھیں یا مجھے ہی کھانا دینا بھول گئیں۔ انوہ یہ یہاں
آکر تو انسان بدل ہی جاتا ہے۔ وہ وہ نہیں رہیں۔ میں، میں نہیں رہی۔ اور بائے خالو، وہ تو آکیشن پہ
اترتے ہی شاید کہیں کھو گئے تھے۔ عجب جادوگری ہے یہ۔۔۔“ اس نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ پانی پیا۔

برتن اٹھا کر ایک طرف رکھ دیے۔ ہوا کا ذرا سا جھونکا آیا تھا۔ موم بتی کی لولہ زلنے لگی تھی۔ اس نے دونوں
ہاتھوں کی آڑ بنا کر اسے بجھنے سے بچایا اور باہر جھانکنے کی کوشش کی۔

تاریکی میں کچھ دکھائی نہیں دیا۔ مگر اسے معلوم تھا سامنے کے دروازے پہ ابھی بھی بڑا سا قفل پڑا
ہے۔ صبح اس کے اٹھنے سے قبل ہی اس کمرے کا مکیں اسے چھوڑ کر جا چکا تھا۔ معلوم نہیں کون تھا اور کون
نہیں۔

موم بتی بجھنے کے قریب تھی، اور اس کا دل بھی۔۔۔ ایسا کالا سیاہ اندھیرا اترتا تھا اس کمرے میں
کہ حد نہیں۔

”ہائے روشنی ذرا سی بھی ہو، اچھی تو لگتی ہے نا۔۔۔“ وہ سوٹ کیس کی طرف آگئی۔ کھولا اور ٹٹول
ٹٹول کر چراغ ڈھونڈنے لگی۔ تب ہی کوئی چیز کھڑکڑائی، نکال کر روشنی میں دیکھا۔ وہی کھٹی میٹھی الملیاں،
بائے خالو نے سفر میں لے کر دی تھیں۔ کچھ کھا چکی تھی کچھ رکھ کر بھول گئی تھی۔ اب کتنی خوشی ہو رہی تھی
انہیں دیکھ کر۔ نکال کر اپنے بستر پر چلی آئی۔ چراغ سنہال کر اپنے سر ہانے رکھا۔ موم بتی کی لو آخری
ہچکیاں لے رہی تھی۔ اس نے بے دردی سے پھیلی اور پر تھی اور زور سے مسل ڈالی۔ بڑی جلن ہوئی، مگر
یہاں پروا کسے تھی۔ تب ہی کمرے سے باہر قدموں کی آہٹ ہوئی، ذرا دیر بعد تالا کھٹکنے کی آواز آئی۔ اس
نے اچک کر دیکھا۔ کمراروشنی سے بھر گیا تھا۔ لمحے میں ایک تیر سا گر گیا تھا سینے میں۔

”کس طمطراق سے روشنی پھیلتی ہے ہر طرف۔ یوں جیسے کمرے میں سورج طلوع ہو رہا ہو۔ اور
یہاں اس تین بائی پانچ فنٹ کی قبر میں ہے چراغ جلے گا۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر چراغ اٹھایا۔

”کیا وقت ہے اس کی، اور کیا حیثیت، لوگ چکا چوند روشنیوں میں جیتے ہیں اور میرے لیے یہ
جلتی مرنی روشنی والا بڈھا چراغ، دیواروں پر سائے بنیں گے۔ بن بن کر مجھے ڈرائیں گے۔ یہ کاٹھ کباڑ
نجانے کیا سے کیا ہو جائے گا۔ ہونہ، بھاڑ میں جائے ایسی روشنی۔ جہنم میں جلیں یہ دیے۔“ اس نے
چراغ کو ہاتھ میں تولیا اور زور سے کاٹھ کباڑ کے ڈھیر پہ دے مارا۔ زوردار آواز پیدا ہوئی۔ اگلے لمحہ پھر
خاموشی کا تھا۔

”ہونہ، اما میاں کی نشانی، گلہتی رہے اس انبار تلے۔“ اس نے ایک ساتھ اما میاں اور منی خالہ کا
بدلہ چکایا، اور پھر گھورا اندھیرے میں بیٹھ کر کھٹی میٹھی الملیاں چوستے ہوئے اس نے سارے خیالات اپنے
ذہن سے جھٹک دیے تھے۔

☆☆☆

زرد رو سنہری کرنیں سامنے کی دیوار پر اٹھ کھیلایاں کر رہی تھیں۔ سورج ابھی کچھ دیر پہلے نکلا تھا۔
لیکن وہ بہت دیر سے جاگ رہی تھی۔ شاید اس وقت سے جب کوئی چپل گھینٹا اس کمرے کے سامنے
سے گزرا اور پھر دھپ دھپ کرتا سیڑھیاں اتر گیا تھا۔

رات بھر کمرے کے فرش میں بے قرار ہو کر روئیں بدلنے کے بعد ایک وہی ذرا سا وقت ہوتا تھا۔
جب مزے کی نیند آجاتی تھی مگر آج جی اچاٹ ہو چکا تھا۔ سو چادر اتار کر باہر نکل آئی۔ صبح کی اولین
ساعتوں کی ٹھنڈی، خوشبودار ہوائ نے اس کے گالوں کو نرمی سے سہلایا۔ تو ساری کلفت دور ہو گئی۔ جگ
سے پانی لے کر دو چار چھپکا کے منہ پہ مارے اور ٹٹولنے لگی۔ بھی نیم کی شاخوں سے جھولی، بھی دیوار سے

لگی۔ اور کبھی سینٹ کی جالیوں میں ناک گھسا کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر صحن میں جھانکنے لگی۔
 باہر گلی میں رفتہ رفتہ چہل پہل کا آغاز ہوا اور پھر رونق بڑھتی چلی گئی۔ دودھ والوں کی آمد و رفت،
 سبزی، پھل فروشوں کی پکار، سائیکلوں کی ٹانٹن، موٹر سائیکل، رکشوں کی پھٹا پھٹ، بچوں کی نرم، ہنستی
 ٹھٹھکیلائی آوازیں۔۔۔ اور ان سب کے ساتھ صبح کے ناشتوں کی خوشبوداری مہک، پراشوں، پوریوں،
 آلیٹ اور لسی کی مہک۔ چائے کی خوشبودار دھوئیں کی میٹھی سی کڑواہٹ، جو اس کے حلق میں گھس کر
 معدے کو بچھن کر گئی تھی۔

رات کے برتن ہاتھوں میں لیے وہ سیدھی نیچے اترتی چلی گئی۔ آخری سیڑھی یہ قدم رکھتے ہی منی
 خالہ کی ساس پہ نظر جا پڑی جو اپنا تخت طاؤس سنبھالے قدموں کی آہٹ پر اب اسی کی طرف متوجہ تھیں
 جس لمحے اس نے آخری قدم سیڑھی سے نیچے اتارا عین اسی لمحے منی خالہ باورچی خانے کے دروازے
 سے برآمد ہوئی تھیں۔

”ہائے ہائے بھادوں ختم ہونے کو آیا۔ پر یہ آسمان گدھوں، چیلوں سے خالی نہ ہوا، کم بخت منحوس
 شکلوں والی مخلوق، ادھر دن چڑھا ادھر سر پہ منڈلانے لگی۔ ڈھنگ سے کھانا بھی نصیب میں نہیں۔“ کیسی
 کراری، پچھتے ڈھول جیسی آواز تھی ان کی، منی خالہ گولی کی سی تیز رفتار سے ان کی طرف بھاگیں۔ وہ منہ
 کھولے ناتجھی کے عالم میں خالی آسمان کو تنکے لگی۔ تب ہی کسی نے برتن اس کے ہاتھ سے اچک لیے۔ وہ
 بری طرح چوٹیں۔

☆☆☆

نہائے دھوئے عرصہ گزر گیا۔ سفر کا میل پچیل بھی ساتھ لیے پھرتی تھی۔ کیوں نہ موقع سے فائدہ
 اٹھائے، ورنہ وہ توڑ کے مارے لم ہی ادھر کا رخ کرتی تھی۔ دروازہ کھول کر باہر جھانکا، چنگیز خان کو
 ناشتے میں خود دیکھا تو بھاگ کر کپڑوں کا دوسرا جوڑا اٹھالائی۔ خوب رگڑ رگڑ کر نہائی۔ کپڑے بدلے اور
 برسی ہوئی بدلی کی طرح ہلکی پھلکی ہو کر نکھری نکھری سی باہر نکل آئی۔ میلے کپڑے گول مول کر کے ہاتھ میں
 پکڑ رکھے تھے۔ جسے بھاگ کر منی خالہ نے چھپٹ لیا۔ ان کی افراتفری سمجھ سے باہر تھی۔

”اوں ہوں۔ خوشبودار صابن کیا ہاتھ میں آگیا۔ آپے سے باہر ہی ہو گئیں۔ جھاگ و جھاگ ہو گیا
 سارا غسل خانہ۔۔۔ اے بہو۔۔۔ ایک دو جھاڑو لگاؤ یہاں۔۔۔“ کیا تھکمانہ انداز تھا اور پھر جو کہا تھا۔
 نور کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، وہ دونوں باتوں میں سے کس پر حیران ہو، وہ کیا کوئی گنوار، جاہل لڑکی تھی جسے
 نہانے کے طور طریقے نہ آتے تھے۔ وہ مکر مکر منی خالہ کو دیکھنے لگی جو جھاڑو لے کر غسل خانے کو بھاگی
 جا رہی تھیں۔

وہ خود جو ہاتھ دھوئے بغیر ہی واپس پلٹ آئی تھیں۔

اب تنکے انداز میں اس سے مخاطب تھیں۔

”کب تک مینار پاکستان بن کر کھڑی رہو گی۔ وہاں برآمدے میں دیکھو۔ بچے کھا رہے تھے۔

کچھ بچہ دوج گیا ہو تو تم بھی۔۔۔“

”جی۔۔۔“ وہ ہکا بکار ہو گئی تھی۔

”اب کھڑی کھڑی منہ کیا تک رہی ہو؟ کیا میں نہیں جانتی کن بھیک منگوں کی اولاد ہو تم؟ باپ مر

گیا تو دودھیال والے دودن روٹی نہ کھلا سکے۔ اماں سمیت نانا کے سر ڈال گئے۔ وہ کھاؤں کھاؤں کرتی
 بنا علاج کے مر کھپ گئی۔ اور وہ بڑھے میاں، اصغر علی مہتاب ایک کو تو ہمارے سر منڈھنا ہی تھا۔ جاتے
 جاتے دوسری کو کبھی ہمارے ہی کھاتے میں ڈال گئے۔ کم تو وہ بھی نہیں، چوبیس سال سے ہمارے سینے پہ
 مونگ دل رہا ہے۔ ہمارا ہی حوصلہ ہے جو سہہ لیا۔ ورنہ میری بیٹی کس کس چیز کے لیے نہ ترستی تھی۔ آج
 بھی سوچتی ہوں تو کچھ۔۔۔“

وہ زمین میں گڑی ہوئی تھی۔ معلوم نہیں کیسے منی خالہ نے اسے کھینچا اور سیڑھیوں تک لائیں۔ وہ
 کچھ کہہ رہی تھیں۔ دبے دبے لفظوں میں، سرگوشیوں میں، مگر وہ سن ہی نہ پائی تھی۔ بس سیڑھیوں کا راستہ،
 نجات کا راستہ تھا۔ اس نے قدم رکھا تو پھر پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔

☆☆☆

”گزر بھر لمبی زبان، اللہ کرے کٹ جائے، کپڑے پڑیں، گوگی ہو جائیں۔ غاں غاں کرتی
 پھریں۔ کوئی سننے کو سمجھنے والا نہ ہو۔۔۔ کیسی کیسی باتیں سنائیں مجھے، نہ لحاظ، نہ پاس داری، میرے
 دودھیال والوں نے میری اماں کو اپنے پاس نہ رکھا تو انہیں کیا تکلیف۔۔۔؟ اور پھر رکھتا بھی کون؟“
 نو عمر چچا ہی تو تھے۔ ذمہ داریوں سے گھبرا کر اماں کو ابامیاں کے پاس چھوڑ گئے۔ اور اگر میری اماں علاج
 کے بغیر مریں تو بھی ان کا کیا گیا۔ اور بیٹی کا رونانجانے کیوں بے وقت رو رہی تھیں۔ کیا میں نہیں جانتی
 ان کے اگلے تللے فرمائشوں نے ماحول کو کس درجہ عاجز کیا ہوا تھا۔ دو چار دن سے زیادہ کتنی ہی کب تھیں
 ہمارے ہاں۔ جب دیکھو یہاں آنے کو تیار۔ اور مر مرا گئیں، تو وہ بھی ہمارا تصور۔۔۔ ہونہ۔۔۔ ابھی تو
 میکے میں جان دی تھی۔ سسرال میں مرتیں تو شاید اب تک ان کے کیے گئے مقدمے ہی جھگڑ رہے
 ہوتے، یا اللہ۔“ اس نے تھک ہار کر ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

”ابھی تو چند ہی دن گزر رہے ہیں، دو پاپوں اور ایک سوکھی روٹی کے بدلے ایسی ذلت۔ میں وہیں
 ابامیاں کے گھر میں کیوں نہ رہ گئی؟“

اس کے لبوں سے بے اختیار ہی ”آہ“ نکل رہی تھی۔

”بے چاری منی خالہ جب ہی تو ایسی ہچکچاہٹ کا شکار تھیں۔ یہاں لانے سے گریزاں۔۔۔“ وہ

پنڈولم کی طرح جھولنے لگی۔ دروازے پہ ہلکی سی آہٹ ہوئی۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اور پھر خود بخود ہی آنکھیں بھیکنے لگیں۔

منی خالہ اس کے قریب آ بیٹھیں۔ چوڑی مار کر۔۔۔ یوں جیسے بہت فرصت سے ہوں اور پھر اس
 کی آنکھوں میں جھانکنے لگیں۔

دبیز دھند کے اس پار نور القمر نے ان کے ہونٹوں کو ذرا سا پھیلنے دیکھا۔

”کیا منی خالہ مسکرا رہی ہیں؟“ اس نے زور سے پلکیں جھپکیں۔ دو آنسو لڑھک کر گالوں پہ ٹھہر

گئے۔ سامنے نکھری ہوئی تھی وہی مسکراہٹ جو موتیا کے پھولوں کو دھاگے میں پروتے ہوئے ان کے

شاداب چہرے پہ بھر جایا کرتی تھی۔

جاندار۔۔۔ پھر پورے۔۔۔ زندگی کی عکاس مسکراہٹ۔

اس کی منی خالہ بٹھکی تھیں۔ بالکل اپنی منی خالہ۔ وہ بے اختیار ہی ان سے لپٹ کر رونے لگی۔

وہ روتی جا رہی تھی۔ منی خالہ اسے بانہوں میں سینے مسکراتی رہیں۔
 ”کوئی دکھ بانٹ لینے والا ہو تو دکھ سہنا کتنا آسان ہو جاتا ہے۔ کوئی آپ کے آنسو مارے چن کر بدلے میں ہنسی دے دے تو دل میں کدک نہیں رہتی۔“ وہ بھی اگلا پچھلا غبار نکال کر سیدھی ہوئی تو بہت مطمئن تھی۔ گھنے سیاہ بال پشت پہ بوجھ لگ رہے تھے۔ انہیں دو چار بل دے کر جوڑا بنالیا۔ اور چہرے پہ آئی نٹوں کو کانوں کے پیچھے اڑتے ہوئے منی خالہ کی طرف دیکھا۔ وہ ناشتا اس کی طرف بڑھا رہی تھیں۔

”چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔“ ساتھ ہی انہوں نے اطلاع دی۔
 ”کوئی بات نہیں۔“ سارا قصور اپنا تھا، اس لیے اعتراض نہیں کیا۔
 ”میں اب چلوں۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔“ جھکا ہوا سر اثبات میں ہلا دیا، منی خالہ اٹھ کر باہر نکل گئیں اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔
 ”اف۔۔۔ ہمارے قسمت میں پھر یہی ہے۔۔۔“ اس نے دانت پیسے۔
 ”یہ دونوں پاپے آنکھوں پہ باندھ لوں۔ اس سڑی ہوئی چائے کو پکھلا ہوا سیسہ سمجھ کر اپنے کانوں میں اندیل لوں تو اس گھر میں رہنا کتنا آسان ہو جائے گا۔“

☆☆☆

سورج سوانیزے پر تھا اور مارے بھوک کے اس کے پیٹ میں جلن سی ہونے لگی تھی۔ ادھر ادھر کے چکر لگا کر وہ بے چارگی۔ سہ اپنی جگہ پر آئی تھی۔

”کیونکر گزار پاؤں گی یہاں، اتنے بہت سے دن، یا اللہ کیا اب کبھی پیٹ پھر کھانا نصیب نہ ہوگا۔“ دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو دباتے ہوئے وہ خود کو بہت بے بس محسوس کر رہی تھی۔ اس گھر میں دوپہر کا کھانا نہیں پکتا تھا۔ یہ بات اسے منی خالہ نے نہیں بتائی تھی بلکہ منی خالہ نے تو اسے اور بھی بہت کچھ نہیں بتایا تھا۔ مگر اب کچھ باتیں وہ بغیر کہے سنے ہی جانے لگی تھی۔

باورچی خانے کا سب انتظام منی خالہ کی ساس کے ہاتھ میں تھا۔ ایک ایک چیز پہ لگے تالے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی۔ دوپہر کو کھانے کی ضرورت اس لیے محسوس نہ ہوتی تھی کہ افراد خانہ ان ”لوازمات“ سے پیٹ پوچا کر لیتے تھے جو ان کے کمروں میں ہمہ وقت موجود ہوتے تھے۔ رہی سہی کیر یاہر سے آنے والا کھانا پوری کر دیتا تھا۔ اب یہ تو ان دونوں کی بد قسمتی تھی کہ وہ ”افراد خانہ“ میں شمار نہ ہوتی تھیں۔

”منی خالہ! آپ تو شاید ہوا، پانی پر ہی گزارہ کر لیں لیکن اگر یہ صورت حال رہی تو مجھ پہ بہت جلد فاتحہ پڑھ لیں گی آپ۔۔۔“

وہ غڈ ہال سی ہو کر چت لیٹ گئی۔ ذرا سی غنودگی طاری ہوئی اور پلاؤ، زردے کی بھری ہوئی پلیٹیں سامنے آکر تپنے لگیں، اس نے نان تو رے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا جب ہاتھ پانی کے گلاس کو جا لگا۔ چھناکے کی آواز ابھری اور ساتھ ہی آنکھ کھل گئی۔ وہ بدحواس ہو کر اٹھ بیٹھی۔ دروازہ کھول کر منی خالہ اندر آ رہی تھیں۔ اس نے بڑی امید سے انہیں دیکھا۔

ساڑھی کے پلو سے ان کا ہاتھ برآمد ہوا اور ایک شاپراس کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ بولیں۔

”یہ لو۔۔۔ وقت بے وقت کے لیے سنبھال رکھنا، یہاں چیز منگانی بہت مشکل ہے۔“ وہ دروازے کی طرف پلٹیں پھر ٹھٹک کر رک گئیں۔
 ”دروازہ کھلا کیوں رکھتی ہو نور! کنڈی لگا کے رکھا کرو۔“

اس نے شاپر کھولتے ہوئے سراٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ باہر نکل گئیں۔ شاپر کھول کر نندیوں کی طرح دیکھا۔ چند باقر خانیاں تھیں۔ کچھ کریم رول ایک ڈبل روٹی، اس نے دل ہی دل میں منی خالہ کو ڈھیروں دعا میں دیں۔

ایک باقر خانی، ایک کریم رول کھا کر دو گلاس پانی پیا اور باقی سب سوٹ کیس میں چھپا کر نیچے آ گئی۔ منی خالہ کا شکریہ بھی تو ادا کرنا تھا۔ نیچے حسب توقع سکوت طاری تھا۔ جالی دار بند دروازوں کے پیچھے پراسراری تاریکی اور سناٹا۔ اسے ہر دروازے سے دو چار آنکھیں خود کو گھورتی محسوس ہوئیں تو بھاگ کر ترقنی خالہ کے کمرے میں کھس گئی۔ آہٹ پر انہوں نے جھکا ہوا سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر اپنی ساڑھی استری کرنے میں مصروف ہو گئیں۔ گیس سے جلنے والی استری کی ہلکی سی شوں شوں کے سوا کمرے میں کوئی آواز نہ ابھر رہی تھی۔ اس نے نیم تاریک کمرے کے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ اور پھر منی خالہ کو دیکھنے لگی۔ بے حد گھنے، سیاہ لمبے بال پشت پہ بکھرے تھے۔ جن کی نوکوں میں سے قطرہ قطرہ پانی ٹپک رہا تھا۔ گویا ابھی ابھی نہا کر نکلی تھیں۔ سیاہ رنگ کی سوئی ساڑھی میں ان کا اجلا کھرا چاند سا مکھڑا دک رہا تھا۔ وہ بے اختیار ہی ان کے پاس نزدیک چلی آئی۔

”کہیں جا رہی ہیں؟“

”ہاں۔۔۔“ بہت مختصر جواب تھا۔ قدرے کھوئی کھوئی، الجھی الجھی سی لگ رہی تھیں۔ اس نے بغور ان کا چہرہ دیکھا۔ پکوں کی جڑوں میں سرخی سی پھیلی ہوئی تھی۔ گلابی ہونٹوں پہ دقنوں دقنوں سے کپکپاہٹ سی اثر آئی۔

”ننگ۔۔۔“ کی آواز سے انہوں نے استری کا بیٹن گھمایا اور بند کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ وہ بھی ذرا سا چونکتے ہوئے سیدھی ہو گئی۔ بالوں کو جھٹک کر تولیے سے ہلکا ہلکا دبا کر خشک کرنے تک وہ خاموشی سے اپنی جگہ کھڑی تھی، منی خالہ بھی اسے یوں بھولیں جیسے کمرے میں اس کی موجودگی سے ناواقف ہوں۔ اس کام سے فارغ ہو کر انہوں نے ساڑھی کا پلو ہٹایا تو وہ پلٹ کر دروازے میں آ کھڑی ہوئی۔

دروازے کے اس پاس وسیع صحن میں پھیلی خاموشی میں ایک پیاسی چڑیا کی چوں چوں نے کتنے ہی ننھے ننھے چھید بنا ڈالے تھے۔ سائے لمبے ہو رہے تھے اور دھوپ پانی پڑ چکی تھی۔ بس ذرا سی دیر تھی۔ اور پھر یہاں وہاں تک ہر رنگ نارنجی رنگ کی سرخی میں ڈوب جاتا تھا۔

”آجاؤ نور!“ منی خالہ کی مدھم پکار پر وہ پلٹی، منی خالہ لباس تبدیل کر چکی تھیں۔ انہیں سنگھار میز کے سامنے بیٹھتے دیکھ کر اس نے بتی جلادی۔ دودھیا روشنی میں ان کا نازک سراپا ایک دم نمایاں تھا۔

”رہنے دیا ہوتا نور۔۔۔“ سنی ہوئی آواز میں انہوں نے ٹوکا۔

”اندھیرے میں تیار کیسے ہوں گی؟“ وہ لکڑی کا کنگھا اٹھا کر ان کے بال سلجھانے لگی۔

”جانا کہاں پر ہے؟“

”تمہارے خالو کے دوستوں نے دعوت کی ہے۔“ وہ سنگھار میز پر بکھری چیزوں میں سے کچھ تلاش کرنے لگی۔

”ارے۔۔ تو کیا مردوں کی محفل میں۔۔۔“ اس کا ہاتھ ایک دم رک گیا۔
”افوہ، ان کی بیگمات بھی تو ہوں گی ناساتھ۔“

”پھر بھی، یوں بنج کر مردوں کے سامنے جانا ہمارے خاندان کی ریت تو نہیں، کیا ڈھونڈ رہی ہیں؟“ انہیں چیزوں کی اٹھا بچ کرتے دیکھ کر اس نے اپنی بات درمیان میں ہی چھوڑ دی۔
”آئینہ تھا یہاں پر۔“

”یہ سامنے ہی تو رکھا ہے۔“ اس نے حیرت سے انہیں دیکھتے ہوئے آئینہ اٹھا کر ان کے ہاتھ میں دیا۔

”چٹیا بنائیں گی یا جوڑا۔۔۔“ بالوں کو خوب اچھی طرح سلجھا کر اس نے پوچھا۔
”بس یونہی کھلے رہنے دو۔۔۔“ وہ لپ اسٹک لگا رہی تھیں۔ ہاتھوں کی لرزش سے بار بار خراب ہو رہی تھی۔

”وہ کیوں بھلا؟ اتنے سارے غیر مردوں کی نگاہ پڑے گی۔۔۔“ ان کا ہی پڑھایا ہوا سبق تھا جو وہ دہرائی تھی۔

”ٹھک۔۔۔“ سے کوئی چیز گری۔ اس نے دو قدم پیچھے ہٹ کر پیروں کے پاس پڑی لپ اسٹک کو دیکھا اور پھر جھک کر اٹھالی۔

”اوہو۔۔۔ یہ تو ٹوٹ گئی مٹی خالہ۔۔۔“ اس نے پریشانی سے کہتے ہوئے بچی کچھی لپ اسٹک ان کی طرف بڑھائی، جسے اس کے ہاتھوں سے لے کر انہوں نے سنگھار میز پر پٹخا دیا تھا۔

”تم جاؤ نور! میں خود ہی تیار ہو جاؤں گی۔ یوں بھی تمہارے خالو آنے والے ہیں۔“ بے دردی سے ہونٹ چباتے، تیزی سے پلکیں جھپکتے وہ اسے جانے کے لیے کہہ رہی تھیں۔

اس کا دل چاہا کہہ دے ”بانگے خالو مجھ سے پردہ تو نہیں کرتے۔“ مگر مٹی خالہ یوں غیریت برت رہی تھیں تو پھر وہ بھلا کیوں رکتی۔ دروازے کی طرف جاتے جاتے اس نے دیکھا۔ وہ گہرے نیلے بارڈر والی فیروزہ ساڑھی کے ساتھ پہننے کے لیے نیلے اور فیروزہ موتیوں کا بھاری ہار سنگھار میز کی دراز سے نکال رہی تھیں۔ اور یہ ہار نکالتے ہوئے دو بار ان کے ہاتھ سے چھٹ کر زمین پر گر رہا تھا۔

”یہ مٹی خالہ کو ہوا کیا ہے؟“ وہ ان کے غیر معمولی رویے کو سوچتی چھٹ پڑ گئی تھی۔

سر مٹی شام یہ لیکھت ہی اندھیرا چھا گیا تھا۔ ردی اخباروں میں سے ڈھونڈ نکالے رسالے میں کھوئی نور نے سر اٹھا کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ سیاہ بادل کھڑکی پر بچکے چلے آ رہے تھے۔ نٹ کھٹ، شریر ہوا کھڑکی کے راستے اندر آئی اور کمرے میں چپک پیسیریاں کھائی دروازے سے باہر نکل گئی۔

”ہائیں۔۔۔ اتنے سیاہ بادل۔۔۔ کب آئے، کب چھائے۔۔۔؟ خبر ہی نہ ہوئی۔“

وہ گھبرا کر جھٹ پٹ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ابھی بارش آجانی تو پہلی بو چھاڑ میں ہی بستر گیلا، اس نے رسالہ تکیے کے نیچے رکھا اور لمحوں میں بستر گول۔ خود دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ اف۔۔۔ ہوا کیسی جھوم جھوم کے چل رہی تھی۔ ریلی گھٹا برس جانے کو تیار، نیم کا درخت اپنے آپ میں مست، وہ دونوں بازو

پھیلائے گول گول گھومنے لگی۔

”ہائے آج تو چھاجوں چھاج بینہ برے، ہر طرف جل قہل ہو جائے۔ اور میں مورنی بن کر آنگن میں خوب ناچوں، مست، گمن، سرشار، تن من بھگو ڈالوں، بے خود ہو جاؤں۔“

آسمان جھکا آ رہا تھا اس لیے، وہ کیوں کر نہ آپے سے باہر ہوئی۔ ایسی آزادی اس سے پہلے کب نصیب ہوئی تھی۔ وہ چھٹ پڑا کیلی تھی۔ تنہا، اپنی مرضی کی مالک جو دل چاہا کرتی، جب ہی تو ساری چھٹ پڑا بھاگی پھر رہی تھی۔ بھی دو کونوں سے پکڑ کر دوپٹہ اڑائی۔ بھی نیم کی تہنیوں سے جھولی۔ بھی آسمان پہ قلم بازیاں کھاتے برندوں کو پکڑنے کی کوشش کی۔ خوب قلقاریاں مارنے کو جی چاہ رہا تھا۔

”دیکھو۔۔۔ مٹی خالہ آگئی ہوں تو انہیں بھی بلا لاؤں۔ دونوں مل کر خوب مزہ لیں گے۔“ وہ دیوانی ہوتی دیوار پر جھک گئی۔ صحن خالی خالی تھا۔ مایوس ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔

”شکر ہے گھر والوں کا اوپر آنا جانا نہیں، ورنہ تو ایسا اچھا موسم غارت ہی ہو جاتا۔“ اسے ابا میاں کی یاد آگئی جن کی دیوانگی اس موسم میں عروج پہ پہنچ جایا کرتی تھی۔ کوئی نہ کوئی ہنگامہ ہو کر رہتا۔ وہ ڈری سبھی کسی کمرے میں دبی رہتی۔

آج نہ کوئی ڈر تھا، نہ خوف۔۔۔ پھوار پڑنے لگی تھی۔ بادلوں کے سبب وقت سے پہلے رات ہوگئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر دیوار سے نیچے جھانکا۔ برآمدے میں ستون سے ٹیک لگا کر کھڑے بانگے خالو نے اسے چونکا دیا۔

”بانگے خالو تو یہ رہے۔ گویا مٹی خالہ بھی آگئیں۔“ وہ پلٹ کر سیڑھیوں کی طرف بھاگی، ہوا میں لہراتا دوپٹہ سپیٹ کر بھاگتے بھاگتے اوڑھا۔ دھڑ دھڑ سیڑھیاں اترنے کے بعد صحن میں پہلا قدم رکھتے ہی اس کی رفتار خود بخود دھیمی پڑ گئی تھی۔

برآمدے میں جلے بلب کی روشنی یہاں صحن تک آرہی تھی۔ گیلے فرش پہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتی وہ مٹی خالہ کے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جب ستون کی دوسری جانب کھڑے بانگے خالو یک لخت ہی گھوم کر اس کے سامنے آگئے۔ وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔ باریک پھوار حریری پردے کی طرح ان دونوں کے بیچ تن لگی تھی۔

بانگے خالو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بہت ہو لے سے سج گئی تھی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ بارش کی کن من میں ان کی آواز کی گھمبیر تا اسے خاص طور پر محسوس ہوئی تھی۔

”مٹی خالہ کے پاس۔۔۔ آگئی ہیں نا۔۔۔ کمرے میں ہوں گی یا۔۔۔؟“ اس نے ذرا کی ذرا گردن موڑ کر دیکھا۔ باورچی خانے میں اندھیرا تھا۔

”وہ تو ابھی نہیں آئیں۔۔۔“ بانگے خالو نے اطلاع دی۔

”نہیں آئیں۔۔۔“ اس نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔ ”مگر آپ تو۔۔۔“

”وہ میرے ساتھ تو نہیں گئی تھی۔“ خالو دو قدم آگے بڑھ آئے تھے۔

”لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ تو بھی اکیلی باہر نہیں گئیں۔ اور پھر اس وقت تو خالو رات ہوگئی ہے۔ اور دعوت بھی آپ کے دوستوں نے کی تھی۔ پھر آپ کیوں ان کے ساتھ نہیں گئے؟“ وہ ایک دم ہی فکر

مند ہو گئی تھی۔

”ارے۔۔۔ ارے۔۔۔ اتنی پریشانی۔۔۔“ وہ بے اختیار ہی ہنس دیے۔ ”بہت محبت کرتی ہو اپنی خالہ سے؟“

وہ چپ چاپ ان کا منہ دیکھنے لگی۔ تب ہی ان کے عقب سے ایک چہرہ نمودار ہوا تھا۔

”کیوں خواہ مخواہ تنگ کر رہے ہو اسے۔ چننا! تمہارے خالو کی طبیعت خراب تھی، اس لیے یہ رہ گئے۔ اپنی خالہ کے لیے فکر مند نہ ہو۔ وہ اپنے ہی لوگوں میں ہے۔ موسم خراب تھا اس لیے نہیں لوٹ سکی۔ اس نے فون کر دیا تھا۔“ وہی نرم، میٹھا، مدہم، ساحر لہجہ۔۔۔

وہ چپ کھڑی رہ گئی۔

”ساری کی ساری بھیگ گئی ہو، آؤ یہاں بیٹھو۔“ اس کے ہنسنے کا انداز بہت دلکش تھا۔ ہاتھ بڑھا کر نور کو اپنی طرف کھینچا تو وہ بے بس ہو گئی۔ برآمدے میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھی تو اس نے کھانا لا کر سامنے رکھ دیا۔

بازار کا کھانا تھا۔ تندوری روٹی، آلو کا سالن، منی خالہ گھر پر نہیں تھیں۔ بعد میں کون کھانا لیے پیچھے پیچھے آتا اس نے پلیٹ اپنی طرف کھینچی، مگر نہ جانے کیوں، کھانے کو جی نہ چاہا۔ آدھی، پون روٹی گزارے کے لیے کھائی اور برتن ڈھاپ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

بانے خالو ابھی تک ستون سے لگے کھڑے تھے۔ بارش تیز ہو گئی تھی، ہوا ہر بار ان پر کچھ نہ کچھ پانی گراتی۔ ذرا سا بھیگ گئے تھے۔ بارش کے باریک قطرے بلب کی روشنی میں ان کے بالوں پر دمک رہے تھے۔ ان کے برابر آتے ہوئے اس نے گردن موڑ کر انہیں دیکھا سنجیدہ چہرہ بیک وقت اپنا بھی لگ رہا تھا۔ اور بہت پر اپنا بھی۔

”خالو! آپ جا کر انہیں لے آتے تو اچھا تھا۔۔۔“ نجانے کیوں لہجے میں لجاجت سی اتر آئی تھی۔ سینے پہ ہاتھ باندھے، ترجیحی نگاہوں سے اسے چند لمحے دیکھتے رہنے کے بعد انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”ہاں۔۔۔ بارش رک جائے تو جاتا ہوں۔“ لہجہ تسلی آمیز تھا۔

وہ بارش سے بچنے کے لیے دیوار کے ساتھ لگے لگے اور آگئی۔ کمرے میں داخل ہوئی تو دروازہ بھیڑتے ہوئے ہاتھ خود بخود کنڈی کی طرف اٹھ گئے۔ منی خالہ گھر پر نہ تھیں۔ اس احساس نے اسے گویا سڑک پہ لا کھڑا کیا تھا۔ کنڈی لگا کر اپنے مطلوبہ جگہ کی طرف بڑھی تو پہلا قدم ہی جھپاک سے پانی میں پڑا۔ جالی دار کھڑکی سے آنے والا سارا پانی میٹیں پر تو جمع ہوتا تھا۔ اس نے پیر واپس ہٹ چھ لیا۔ اندھیرے میں کچھ بھائی نہ دے رہا تھا۔ اندازاً آگے بڑھی اور کھڑکی کے اس صندوق پر اکڑوں بیٹھ گئی۔ فٹے کھانے کے برتن وغیرہ رکھنے لیے منی خالہ نے کھینچ کھانچ کر دیوار کے ساتھ لگا دیا تھا۔

باہر بادل دیوانہ وار برس رہے تھے دھواں دار بارش بالکل ویسی، جیسی وہ چاہ رہی تھی۔ لیکن کچھ دیر پہلے، اب تو دل چاہ رہا تھا ایک اشارہ کرے اور بارش غائب۔۔۔ دوسرے اشارے سے بادل چھٹ جائیں۔ بانے خالو بھاگ کر خالہ کو لے آئیں۔ یا پھر منی خالہ ہی اڑ کر یہاں تک آپہنچیں۔

بجلی زور سے کڑکی تھی۔ اس نے سہم کر گھنٹوں کے گرد بازو پلیٹ لیے۔ دل ہی دل میں ”جل تو

جلاں تو“ کا ورد کرنے لگی۔

”اس موسم کی خوشی مجھے کبھی راس نہیں آئی۔“ اس کا دل بھرا آیا۔

”بے چاری منی خالہ! دن کی روشنی میں گھر سے نہ نکلنے والی رات کو گھر سے باہر ہیں وہ بھی ایسے خراب موسم میں۔ پرانے لوگوں کے بچ۔۔۔ دل تو اندر سے سوکھے پتے کی طرح لرز رہا ہوگا۔ اور اس پریشانی میں بھی رہ رہ کر میرا خیال آتا ہوگا کہ کہیں بھوک نہ بیٹھی رہوں۔ اور اب، بارش ساری رات نہ رکے گی؟“

وہ بے چین ہو کر کھڑکی تک آئی تیز بوجھاڑنے لگی۔ بھوک ڈالا تھا۔ وہ بغیر پروا کیے جالی سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ نیچے صحن میں پرنا لے سے کرتے پانی نے اچھا خاصا شور مچا رکھا تھا۔ ٹھوکریں مارتی ہوا برستے پانی سے مقابلہ۔ ساری خاصی خوشخوار ہوئی جا رہی تھی۔ بارش رکنے کا کوئی امکان نظر نہ آیا تو وہ تھک کر دوبارہ صندوق پر آ بیٹھی۔

”اگر خالو کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو کیا ضرورت تھی انہیں جانے کی۔ ہونہ۔۔۔“ وہ خواہ مخواہ جھنجھلا رہی تھی۔ وہم، خدشے، ڈر اور یہ خوفناک ساموسم، کیا کچھ نہیں ڈر رہا تھا اسے۔

”کیا خبر؟ اس پچھل پیری نے زور و زبردستی ہی بھجوا دیا ہو۔ منی خالہ کا وجود اس گھر میں کہاں برداشت ہوتا ہوگا ان سے۔“ گیلے کپڑوں سے انھن ہورہی تھی۔ اندھیرے میں ٹٹول کر سوٹ کیس کھولا۔ دھلے ہوئے کپڑے نکال کر بدلے۔ بارش کا زور ٹوٹ رہا تھا اسے سونے کی فکر ہوئی۔ پانی کیسے نکالوں؟ بستر کہاں بچھاؤں؟ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھتی رہی۔ پھر تھک کر دوبارہ صندوق پر جا بیٹھی۔

بہت سادقت بیت گیا۔ بارش رکتے رکتے بالآخر رک ہی گئی وہ کنڈی کھول کر باہر نکلی، پہلا کام صحن میں جھانکنے کا کیا۔ برآمدے کا بلب روشن تھا۔ لیکن کوئی ذی روح نظر نہ آیا۔ مایوس ہو کر کمرے میں آگئی۔ یونہی بیٹھے بیٹھے بہت سادقت بتا دیا۔ پانی نکالنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔

”ذرا سی روشنی ہوئی تو۔۔۔“

”روز کہتی ہوں دے میں تیل ڈالو۔۔۔“ ایک بازگشت کی خاموشی میں گونجی۔

وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹنے لگی۔ ابانیاں کا گلاسز اچراغ یا دیا تھا۔ پھر سے صندوق سنبھالا، دیوار سے ٹیک لگائی اور سر کندھے پر گر دیا۔ نیند آنکھوں سے بہت دور تھی۔ وہ کھڑکی سے باہر جھانکتی رہی۔ بادل ایک دوسرے سے ہاتھ پھڑائے یہاں وہاں بھاگ رہے تھے۔ چاند بھی کبھی اپنی چھپ دکھلا کر غائب ہو جاتا۔ رات لمحہ بہ لمحہ بیت رہی تھی۔ وہ ایک ہی زاویے سے بیٹھے بیٹھے تھک سی گئی تھی۔ جب رات کے ستارے میں قدموں کی مخصوص چاپ دھیرے دھیرے ادھر آئے۔

خوب ہوئی تیری اے عشق پذیرانی
تا حشر مقدر میں لکھ دی گئی رسوائی

دھیمے سروں میں گاتا وہ دروازے کے سامنے سے گزرا تھا۔ سرسراتی ہوا کے ساتھ غناک اور دلگیر آواز کمرے کے اندھیرے میں چمک پھیریاں سی کھانے لگی تھی۔

اے دوست! مجھے ٹونے وہ چیز عطا کی ہے

سوغات شب ہجراں اور عالم تنہائی

نور القمر کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ دل تو پہلے سے بھرا ہوا تھا۔ اب آنکھ بھی بھر آئی، دونوں ہاتھ گود میں دھرے وہ آنسو بہانے لگی تھی۔ آج دروازے پہ لگا تالا کھلنے میں نہ آ رہا تھا۔

سوغات شب ہجر اور عالم تنہائی

”کون ہے یہ آوارہ نکتا۔۔۔ رات گئے واپس آتا ہے اور صبح کے اُجالے سے پہلے چلا جاتا ہے۔“

اے دوست مجھے تو نے۔۔۔

عجب بے چینی سی بے چینی تھی۔ وہ وہیں گول مول ہو کر لیٹ گئی۔

سوغات شب ہجر اور

”ہا۔۔۔ عالم تنہائی۔ کیوں دل کے پچھو لے پھوڑتا ہے۔ یہ بد بخت۔۔۔ آج اس کا دل بھی کمرے میں نہیں لگ رہا کیا؟“ وہ اٹھی اور پانی میں پیر دھونی اپنی بلی جیسی آنکھوں سے باہر جھانکنے لگی۔ رات کے اس پہر چلتی ہوا سے اس کا بلوس ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ اور وہ عالم بے خودی میں گنگناتے ہوئے سمنٹ کی جالیوں سے ٹپک لگائے اندھیرے چاند کو تک رہا تھا۔ اس کی ننناک آواز پر سکوت فضا میں ہلکی ہلکی لہریں سی ڈال رہی تھی یوں جیسے رات گئے سمندر کی پرسکون لہریں ساحل کی ہموار بیت پر اپنا ہلکا سا نقش چھوڑ جاتی ہیں۔

اے دوست! مجھے تو نے وہ چیز عطا کی ہے

سوغات شب ہجر اور عالم تنہائی

نیم کی شاخوں میں دیکھ کر کسی پرندے نے پر پھیلا کر انگڑائی لی تو پتوں کی کھڑکھڑاہٹ سے وہ لمحہ بھر کے لیے چونکا اور پھر صحن میں بکھری نیم جان سی چاندنی کو اپنے پیروں تلے روندنا کمرے میں چلا گیا۔ وہ کچھ دیر خالی، گئیے کمرے کو کتنی رہی اور پھر اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ بدن سے نکلنے والی ہوائی سے بھر پور اور ٹھنڈک سے بھر پور اور ٹھنڈک سے لبریز تھی۔ وہ دہلیز پہنچ گئی۔

کیا خوب ہوئی تیری اے عشق پذیرانی

تا حشر مقدر میں لکھ دی گئی رسوائی

بے ارادہ ہی وہ زیر لب دہرانے لگی۔ پھر یک نخت خاموش ہو گئی۔ اسے منی خالہ بے طرح یاد آ گئی تھیں۔

☆☆☆

سب سے پہلے کا وقت تھا اور وہ چھت پہ یہاں سے وہاں تک چکراتی باؤلی ہو گئی تھی، رات ساری آنکھوں میں کالی تھی۔ سونے کی جگہ نہ تھی، بمشکل وقت گزارا۔ رات جس اذیت میں گئی تھی۔ دن کا آغاز اس سے کہیں زیادہ تکلیف دہ انداز میں ہوا تھا۔

”تمہاری خالہ نہیں لوئیں ابھی تک۔“ جس لمحے اپنی تہی ہوئی مغرور بھنوں میں اچکائے خالو کی بیگم نے اسے اطلاع دی تھی اسے لمحے وہ نور کو دنیا کی منحوس ترین عورت لگی تھی۔

کسی قدر گھبرا کر اس نے خالو کی طرف دیکھا تھا۔

لب بھینچے بنجیدہ چہرہ لیے وہ گھونٹ گھونٹ پانی پی رہے تھے۔

پیشانی سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ اور نگاہیں کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں۔

”خالو! آپ گئے نہیں انہیں لینے؟“

”گئے تھے، اور کیوں نہ جاتے بھلا، رات نجانے کس طرح کانٹوں پر بسر کی تھی اور صبح پتا چلا محترمہ رات ہی ان کے کسی دوست کے ساتھ گھر جانے کے لیے نکل گئی تھیں۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں خالو! یہ کیسے ہو سکتا ہے، میں انہیں خوب جانتی ہوں وہ بلا جواز بلا ضرورت کبھی گھر سے باہر نہیں نکلتیں۔ اور رات گئے کسی غیر کے ساتھ نہیں ناممکن، آپ جا میں خالو، دوبارہ معلوم کریں۔“ ٹھوس لہجے کے ساتھ آن واحد میں اس نے ان کی بات کو مسترد کر دیا تھا۔

خالو سے زیادہ ان کی بیگم کو ناگوار گزرا تھا۔

”وہ تو لنگی ہیں سیر سپاٹے پر، سارا شہر گھوم پھر کر آئیں گی۔ یہ بے چارے کہاں گئی، کوچوں میں خوار ہوتے پھریں گے۔“

”آپ میری خالہ کے متعلق اس طرح بات مت کریں۔“ اس کی آواز بے اختیار ہی بلند ہو گئی۔ ”انہیں کوئی شوق نہیں اس طرح سڑکوں، پارکوں میں چکرائے پھرنے کا۔ وہ اللہ جانے کس مصیبت میں ہوں گی اور آپ ہیں کہ۔۔۔“ خالو نے سلگتی نگاہوں سے اسے دیکھا تو مجبوراً خاموش ہونا پڑا۔

”نور! تم اوپر جاؤ۔“ خالو کا لہجہ سپاٹ تھا۔ ان سے کچھ کہنے کی کوشش میں وہ چند لمحے کھڑی رہی، مگر پچھل پیری کے پراندے کے گھٹکھ وایک مخصوص تال سے بچنے لگے تھے۔ اس کی طنزیہ مسکراہٹ سے ذہن ایسا منتشر ہوا کہ وہ بس کچھ بھی کہے بغیر اوپر بھاگ آئی تھی۔

”ہونہر، یہ کوئی نہ سمجھے کہ ان کے آسرے پہ بڑی کوئی مجبور ولا چار لڑکی ہوں۔ شام ہونے تک خالہ گھر میں نہ ہوں تو دہائی بچادوں گی۔ ڈھنڈورا پیٹ دوں گی، سارے شہر میں۔“ غصے کے عالم میں بڑبڑاتی رہی ورنہ درحقیقت وہ کیا کر سکتی تھی۔ اس کا بھی خوب علم تھا۔

”ہائے! کیا خبر ان لوگوں نے ہی دھکے دے کر نکال باہر کیا ہو۔“ دل بیٹھنے لگا تو وہ خود اٹھ کھڑی ہوئی۔

”نہیں۔۔۔ بھلا ایسا کیوں کریں گے یہ۔ اور پھر خالہ خود ہی تو تیار ہو رہی تھیں جانے کے لیے۔“

چھت پہ ٹپکتے ہوئے خود کو دلا سا دیا۔

”مگر ذرا بھی تو فکر نہیں ان لوگوں کو۔ پریشان ہوتے تو ان کی تلاش میں ہلکان ہوئے پھرتے۔ یہاں تو جین ہی جین ہے۔ ہاں بھی کسی کا کیا جائے گا۔ سارا نقصان میرا، پچھل پیری کی تو جان چھوٹ جائے گی۔ لیکن میرا ان کے سوا اس دنیا میں کون ہے۔“ بیرونی دیوار سے لگی وہ آنسو بہانے لگی۔

”راہ رستوں کا علم ہوتا تو اب تک انہیں کھوجنے کے لیے سارا شہر جھان آتی۔“

دانتوں سے ناخن کاٹتے کاٹتے پوریں زخمی کر لیں۔ عالم پریشانی میں ہی دھوپ ڈھل گئی۔

صبح سے کچھ کھایا پیا نہ تھا، ایک کریم رول پانی کے ساتھ نگلا اور نیچے آ گئی۔ ”کچھ خبر تولوں۔“

نیچے جنگیز خان نے اسے دیکھتے ہی ہتھیار تیز کر لیے۔

”کیا خدائی فوجدار بھرنی کیے ہیں ہم نے۔ ایک عالم میں مرگشت کرتے پھرتے ہیں اور کوئی

پوچھنے والا نہیں۔“

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ غسل خانے میں بند ہو چکی تھیں۔

چار اطراف پھیلی ویرانی اور بے رونق پن نظر کرتی وہ آگے بڑھی۔ کس کو پکارے۔ کس سے سوال جواب کرے۔ وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔ تب ہی عقب میں غسل خانے کا دروازہ کھلا۔ وہ گھبرا کر خالہ کے کمرے کے برابر بنی راہداری میں پھس گئی۔ اور تیز تیز چلتی دوسری طرف آگئی۔ یہاں اجڑے باغ میں آکر یاد آواہ ایک مرتبہ پہلے بھی یہاں آچکی تھی۔

باغ میں کل رات بارش کے آثار ابھی موجود تھے۔ بے شمر درختوں کے سبز پتے ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گرے ہوئے تھے۔ بارش کے پانی کی باسی مہک درختوں کی جڑوں سے پھوٹ رہی تھی۔ اور بہت سا پانی زمین میں جذب ہونے کے بعد جگہ جگہ پھسلن سی ہو گئی۔ وہ بچتی بچاتی آگے بڑھ آئی۔ معلوم نہیں کتنے عرصے بعد پیاسی زمین سیراب ہوئی تھی کہ خشک گھاس میں سے نہیں کہیں سبزہ سر اٹھ رہا تھا۔ وہ گھومتی گھومتی کوئل کی کوک سنتی مٹی خالہ کے کمرے کی بند کھڑکی کے سامنے سے گزری تو ٹھٹک کر رک گئی۔ کھڑکی سے آتی جھنجھناہٹ کی ہلکی سی آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔

”یہاں کون ہوگا؟“ وہ کیاری پھلانگ کر کھڑکی کے عین سامنے پہنچی ہی تھی کہ اچانک کھٹکی آواز کے ساتھ کھڑکی کھل گئی تھی۔ اس غیر متوقع صورت حال پر وہ بھونچکا رہ گئی تھی اور پانکے خالو بھی۔ جواب کھڑکی کے دونوں پٹ کھولے اپنی جگہ ساکت و صامت رہ گئے تھے۔ اس سے قبل کہ وہ بمشکل اپنے منجمد وجود کو حرکت میں لانی، کھڑکی کے دونوں پٹ اسی تیزی سے بند ہو گئے تھے، وہ اگلے کئی لمحوں تک سانس نہ لے سکی تھی۔

”وہ کیا سمجھے ہوں گے، میں یہاں کیا کر رہی تھی؟“ اس نے انگلیاں جچائیں، ہاتھ میں ٹھنڈک سی اتر آئی تھی۔ مہرے مہرے قدم اٹھانی راہداری کی طرف چل دی۔ وہ ڈر رہی تھی، معلوم نہیں خالو اس کی یہاں موجودگی پر کتنے خفا ہوں گے۔ برآمدے میں آنے سے پہلے گردن لمبی کر کے جھانکا، برآمدہ صحن، سب خالی کسی بھی وجود سے عاری اور پاک، اس نے دبے پاؤں برآمدہ پار کیا اور پھر بھاگ کر سیڑھیاں چڑھ گئی۔

☆☆☆

مٹی خالہ کو دیکھے ہوئے صدیاں بیت گئی تھیں اور آئندہ نہ جانے کتنے برس انہیں دیکھنے کی آرزو کرتے ہوئے بیت جانے تھے۔ گزرنے والے چوبیس گھنٹے، چوبیس گھنٹے نہیں چوبیس صدیاں تھیں جو مایوسی کی سیاہ چادر اوڑھا کر اسے ڈھال کر گئی تھیں۔ دیوار کے بڑھتے ہوئے سائے میں دیر سے کشتوں پر چہرہ نکا کر بیٹھے ہوئے اس نے اپنے رخسار پر سرخ نشان ڈال لیے تھے۔ ڈھلتی ہوئی شام سے قبل کی ساری گرمی اور پیش اس کے وجود نے بڑی آسانی سے جذب کر کے دل کے کسی کونے میں ڈال دی تھی، جواب بھی دھیرے دھیرے سلگ رہی تھی۔

”ہائے کیا اب میں بھی مٹی خالہ کو نہیں دیکھ پاؤں گی۔“ درآسمان کنارے اندھیرے نے اس کی ساری آس، امیدوں کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔ مٹی خالہ نہیں کھو گئی تھیں۔ اس بڑے شہر کی بارونق سڑکوں نے انہیں نگل لیا تھا یا وہ خود کسی اور دیس

جانگلی تھیں۔ کسی کو کچھ خبر نہ تھی۔

نورا انہیں تو بس اتنا جانتی تھی کہ روح دھیرے دھیرے اس کے بدن کا ساتھ چھوڑتی جا رہی تھی۔ ”اور اگر مٹی خالہ مجھے نہ ملیں تو میں بہت جلد مر جاؤں گی۔ آج رات یا شاید آج رات سے بھی پہلے۔۔۔“ اس نے بمشکل اپنے منجمد وجود کو حرکت دی اور سینٹ کی جالیوں میں انگلیاں پھنسا کر نیچے جھانکنے لگی۔

تخت کا دایاں کونا، برآمدے میں بڑی واشنگ مشین کی جھلک، جالی کا ادھ کھلا دروازہ، ستون کے پاس پڑے کھلے کپڑوں والے جوگر۔۔۔ اور اسی ستون کے عقب سے کوئی آنچل لہرا رہا تھا۔۔۔ اور اس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے نیلا بھیس سی بھر گیا تھا۔

وہ چونکی۔

ساڑھی۔۔۔ نیلی ساڑھی کا سفید موتیوں بھرا پلو۔۔۔ اس کے سونے سونے حواس پہ بجلی چمکی اور پھر اس کے پورے وجود میں سما گئی۔

”مٹی خالہ!“ اس کی پکار جیسے چپ کی قید سے ہاتھ چھڑا کر بھاگی تھی۔

”مٹی خالہ! میری مٹی خالہ!“ وہ لبالب بھری آنکھوں سمیت اندھا دھند اٹھ بھاگی۔ وہ بڑی بڑی سیڑھیاں جانے کس غلت میں پھلانگ کر وہ نیچے اتری تو مٹی خالہ برآمدے میں کھڑی منتظر نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”مٹی خالہ!“ وہ لپک کر ان سے لپٹی تو ہچکھ کر رو دی تھی۔

کسی کڑی جدائی کا ٹپ تھی اس نے، اپنے حوصلے اور برداشت سے کہیں بڑھ کر اور اب انہیں بازوؤں میں یوں پیچھے کھڑی تھی، گویا ان کے وجود میں سما جانا چاہتی ہو۔

”ارے بھئی! یوں کیوں رو رہی ہو تم؟“ لب بھیچے کی انتہائی اذیت کو برداشت کرتے ہوئے انہوں نے بمشکل خود کو اس کے بازوؤں سے آزاد کرایا۔

”آؤ میرے ساتھ۔۔۔“ وہ اسے لیے سست روی سے چلتے ہوئے کمرے میں آگئی تھیں۔

”کہاں چلی گئی تھیں آپ؟ کچھ اندازہ ہے آپ کو، میں کتنی پریشان تھی؟“

بہتے آنسوؤں کے درمیان اس نے شکوہ کیا تو وہ بے اختیار اسے دیکھنے لگیں۔ سوجی سوجی آنکھیں، بکھرے الجھے بال، ملکبے سے کپڑے۔

بخوراسے دیکھتے ہوئے وہ انگلیوں سے اس کے بال سنوارنے لگیں۔

”ہاں، مجھے اندازہ تھا۔ لیکن تم میرے اندازے سے بڑھ کر پریشان لگ رہی ہو۔“

”صرف پریشان، ارے میں تو مر جاتی اگر آج آپ نہ آتیں تو۔۔۔“ وہ دوپٹے سے مسلسل اپنی آنکھیں رگڑ رہی تھی۔

”کیوں اتنا کمزور بنا رہی ہو خود کو۔۔۔؟ یہ زندگی بہت بڑے بڑے امتحان لیتی ہے۔ اگر یہ ہی حالت رہی تو کیونکر جی پاؤں گی؟ اور پھر ہمارا ساتھ ہمیشہ کا تو نہیں نا۔۔۔“ وہ ہتھیلیوں پہ نگاہ گاڑھے مجھے نیچے انداز میں کہہ رہی تھیں۔

نور نے چونک کر انہیں دیکھا۔

پھولی موٹی سی کلیاں۔۔۔ اب تو سب سوکھ گئی ہوں گی نا؟“ وہ افسردگی سے پوچھنے لگی۔
 ”ہاں لیکن گھر تو ابھی بھی مہکتا ہوگا۔“

گالوں پر اترتی خوشگوار سی ٹھنڈک کو محسوس کرتے ہوئے وہ رک گئی۔
 ”خشک پھولوں سے خوشبو آتی رہتی ہے خالہ۔“

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ چند لمحے انتظار کرتی رہی پھر ان کی خاموشی سے اکتا کر دیوار پار جھانکنے لگی۔ نیچے گلی میں اندھیرا، کسی کبڑے بھکاری کی طرح گھروں کے بند دروازوں پر دستک دیتا پھرتا تھا۔ کسی گھر سے کم سن بچے کے رونے کی آواز یکلخت ہی ابھری تو ان دونوں کو چونکا گئی۔
 ”خوشبو صرف پھولوں کی ہی نہیں ہونی نور!“ منی خالہ کی آوازی رات گئے دریا کے پانی پر ڈولی کشتی کی طرح ہلکورے لیتی اس تک پہنچی تھی۔

”خوشبو یادوں کی بھی ہوتی ہے۔۔۔ احساس کی بھی۔۔۔ سرگوشیوں کی بھی۔۔۔“ بیتے ہوئے لمحے نے انہیں ابھی ابھی آزاری بخشی تھی۔ نور بوئی کھڑے کھڑے ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

”خوشبو دبیز پرسونی جاگتی آہٹوں کی بھی ہوتی ہے۔۔۔ آگن میں بکھری اداسی کی بھی۔۔۔ کمروں میں اونگھتے انتظار کی۔۔۔ چراغوں کی بھی ہوئی لوکی بھی۔۔۔ اور ایسی خوشبو آتی ہی رہتی ہے۔ گھروں اور دلوں کو آباد رکھتی ہے۔ وہ گھر بھی ابھی تک مہک رہا ہے۔۔۔ مہکتا ہی رہے گا۔۔۔ یہ خوشبو اس گھر کی بنیادوں میں بسی ہوئی ہے، آتی ہی رہے گی۔۔۔ ہمیشہ۔۔۔ ہر آن۔۔۔ ہر گھڑی۔۔۔“

ان کی آواز ڈوب رہی تھی۔ نور گھبرا کر ان کی طرف پلٹی۔ وہ دیوار سے لگی بیٹھی تھیں۔ دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے ہوئے، سر جھکا رکھا تھا۔۔۔ وہ فوراً ان کے پاس آ بیٹھی، دھیمی آواز میں انہیں پکارا۔۔۔ پھر آہستگی سے ان کا جھکا ہوا سر ادا پر اٹھایا۔ وہ رو رہی تھیں یا نہیں۔ اندھیرے میں ایسے کچھ اندازہ نہیں ہوا۔ تاہم تجلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے وہ اسے اپنی سسکیاں دہانی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔
 ”کیا ہوا ہے؟ کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا، گھریا دیا ہے۔ اوہ! کیا ابامیاں۔۔۔؟“ وہ بے قرار ہو کر خود ہی سوال جواب کرنے لگی۔ انہوں نے بس اثبات میں سر ہلایا اور اٹھنے لگی۔

”چلتی ہوں اب، دروازہ کھلا نہ ملا تو پھر دیواریں پھلانگتا پھرے گا۔“
 ”کون، کس کی بات کر رہی ہیں؟“ وہ منی خالہ کے کچھ دیر پہلے کے رویے میں الجھی ہوئی تھی، فوری طور پر سمجھ نہ پائی۔
 ”ایاز کی۔“

”ایاز۔۔۔“ اس کی نگاہیں دروازے پر لگے تالے پر اٹھ گئیں۔ یہ وقت تو اسی کے آنے کا تھا۔
 ”وہی جو اس کمرے میں۔۔۔“

”ہاں۔“ انہوں نے واپسی کے لیے قدم اٹھائے پھر ٹھٹھک کر رک گئیں۔ ”جانتی ہو، کون ہے وہ؟“
 ”نہیں، مجھے کیا خبر۔“ اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے جبکہ دل میں شدید خواہش ہوئی تھی جاننے کی۔

”بھائی صاحب کا بیٹا۔“ بڑے آرام سے انہوں نے انکشاف کیا۔
 وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھے گی۔

”ایسا کیوں کہا ہے خالہ نے۔“
 ”سب سہارے عارضی ہوتے ہیں نور۔۔۔ کبھی نہ کبھی ہاتھ سے چھوٹ جانے والے۔ کمزور بنا دینے والے۔ تم ان سہاروں کی عادی مت بنو۔ تم ہمیشہ میری اوٹ لے کر اس زندگی کو دیکھتی رہی ہو۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ میں تمہیں بہادر اور جرات مند دیکھنا چاہتی ہوں۔“ ان کے حسرت آمیز لہجے میں نمی سی کھل گئی تھی۔ نور ان کی نہ سمجھ میں آنے والی باتوں میں ایسی الجھی کہ سب سوال جواب بھول بیٹھی۔
 ”میں اتنی کمزور تو نہیں خالہ! کہ آپ یوں فکر مند ہو جائیں۔ وہ تو بس آپ بغیر بتائے یوں اچانک غائب ہو گئیں تو میں پریشان ہو گئی۔ پھر باقی سب لوگ باتیں بھی تو عجیب عجیب کرنے لگے تھے۔“
 ”سب لوگ۔۔۔؟“ ان کی سوالیہ نظریں انھیں تو اس نے قدرے سوچ کر نفی میں سر ہلادیا۔
 ”نہیں صرف وہی پچھل پیری، لیکن خالو نے بھی تو نہیں ٹوکا۔ جب میں بولی تو کہنے لگے۔“
 ”اور جاؤ۔۔۔“ شاید بہت اچھے ہوئے تھے اس وقت۔ بتا رہے تھے کہ آپ ان کے کسی دوست کے ساتھ گھر آنے کے لیے نکلی تھیں؟“

”ہاں۔۔۔ ان کی بیگم بھی ساتھ تھیں۔ راستے میں اس کی طبیعت خراب ہو گئی۔ ہسپتال لے جانا پڑا۔ بہت پریشانی میں وقت کٹا۔ رات گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ ادھر اس کی حالت سنبھلی، ادھر میں گھر پہنچ گئی۔“

”خالہ! آپ یوں تنہا مت جایا کریں کہیں بھی۔ خواہ تو خالو کا دل پرا ہو جائے گا۔ آپ کی طرف سے۔“ وہ بہت کچھ کہنا، سنانا چاہ رہی تھی مگر خالہ کی اتاری صورت اور ٹھکن زدہ لہجہ نے اسے روک دیا تھا۔

باہر ہلکی سی کھڑ پڑ ہوئی تھی۔ منی خالہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”بہت وقت ہو گیا، میں کھانا بنا لوں۔“

”میں آپ کی مدد کراؤں۔“ وہ بھی ان کے پیچھے لپکی۔

”نہیں تم جاؤ اوپر، میں رات کو آؤں گی، پھر باتیں کریں گے۔“ وہ اسے ٹالتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

نور نے جاتے جاتے یونہی سرسری نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ منی خالہ کی غیر موجودگی میں سارا کمر اگر د آلود ہو رہا تھا۔ اس نے وہیں سے جھاڑن لیا اور کمرے کی ایک ایک چیز جھاڑ پونچھ کر اوپر آگئی۔

اور رات گئے سچ مچ منی خالہ آگئیں لیکن اس وقت جب وہ ان کے آنے کی امید چھوڑ بیٹھی تھی۔ سوکھی روٹی اور مونگ کی دال بھی آج اس نے کس مزے سے کھائی تھی۔۔۔ کہ لانے والی منی خالہ تھیں۔ ایک دن کی جدائی نے منی خالہ کو اس کے لیے کیا سے کیا بنا ڈالا تھا اور پھر بہتی چاندنی کے سکوت میں چلتے پھرتے وہ بہت دیر تک ان سے باتیں کرتی رہی، ادھر ادھر کی۔۔۔ اوٹ پٹانگ باتیں۔۔۔ کبھی پچھلے گھر کا تذکرہ۔۔۔ کبھی واقع بھائی کی یاد۔۔۔ منی خالہ چلتے چلتے ٹھہر کر بہت خاموشی سے اسے سننے لگتیں۔

”منی خالہ! جب ہم یہاں آئے تھے تو کلیوں کا جھنڈ سفید ہوا پڑا تھا، سارا گھر مہکا کرتا تھا، یہ پھولی

”عا۔۔۔ عاطف ماموں کا بیٹا۔۔۔ اور آپ نے مجھے بتایا بھی نہیں۔“ وہ یک دم ان کے سامنے آگئی۔

”مجھے کیا معلوم تھا، تم اتنی بے خبر ہو۔“

”ریڈیو پر نشر ہوئی تھی یہ خبر یا مسجد میں اعلان کرایا تھا جو مجھے خبر ہوئی۔ آپ کو معلوم ہے یہاں آپ کے سوا اور کوئی نہیں مجھے خبریں پہنچانے والا۔“ وہ جل کر بولی۔ اتنی بڑی بات خالد اب بتا رہی تھیں۔ گویا اس کی تو کوئی اہمیت ہی نہ تھی ان کے نزدیک۔

”چلو اب تو بتا چل گیا نا، اب سو جاؤ اور دروازہ بند کر لینا اندر سے۔“ وہ اسے ہدایت دیتی چل دیں۔ یہ سر جھٹک کر کمرے میں آگئی۔

”انتازد کی رشتہ۔۔۔ اور میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔“ اسے اپنی عقل پر غصہ آیا پھر سوچنے لگی۔

”ایسا آوارہ، ٹکنا بیٹا، عاطف ماموں کا۔۔۔ رات گئے گھر آتا ہے۔۔۔ جانے کہاں کہاں کی فلمی ہیرو کی طرح گانے گانے والا۔۔۔ آوارہ مزاج۔۔۔ نالائق۔۔۔ دن میں کبھی گھر میں دکھائی نہیں دیا۔ ایسے رنگ ڈھنگ شریفوں کے تو نہیں ہوتے۔ ہاں بھئی! نہ ماں سر پہ نہ باپ۔ ایسا تو ہونا ہی تھا۔۔۔ سچ۔۔۔ سچ۔۔۔ پتا نہیں یہ ابامیاں کا خاندان بھی کس کی بددعا کے زیر اثر رہا ہے۔“

عاطف ماموں تو جانے کہاں جا چپے تھے، مہر گئے یا چپے جاتے ہیں کسی کو پتا نہیں۔ ابامیاں کے خاندان کے آخری سپوت کے یہ چھن دیکھ کر اسے واقعی بہت افسوس ہوا۔

☆☆☆

کاسک کا مہینہ شروع ہونے میں ابھی کچھ دن باقی تھے لیکن رات کے آخری پہر چلنے والی خنک ہوائیں ابھی سے اس کی آمد کا پتا دے رہی تھیں۔ جوں جوں رات گزرتی جانی چادر کے نیچے اس کا وجود سکڑتا جاتا۔ تنگ آ کر وہ خالہ سے کہہ بیٹھی۔

”کچھ دن اور گزریں گے اور میں ان کپڑوں میں ٹھہرنے لگوں گی۔ چلیں، اپنے گھر چلتے ہیں۔“ منی خالہ کا ہاتھ ڈراسا کا نپا اور سوئی کپڑے میں سے نکل کر انگلی کی نرم پور میں جا گھسی۔ لب بچھڑچھر انہوں نے سوئی واپس بھیجی اور خون کے ننھے سے قطرے کو غور سے دیکھنے لگیں۔

نورا اپنی باتوں میں مگن تھی۔

”گرم کپڑوں کی کاٹ چھانٹ کا موسم ہے، سارے کے سارے لے آتے ہیں۔ یاد ہے نا وہ میرا پرانا سوٹر۔۔۔ کہنی سے ادھر ر ہا تھا۔ اسے بھی دوبارہ بنائیں گی نا آپ؟ پھر کچھ دن وہاں آرام سے رہ کر آئیں گے۔ دوپہر کی گرم گرم روئی اور تازہ شور بے والا سالن۔ واہ کیا عیاشی ہوگی۔۔۔ یہ سوچی باقر خوانیوں سے توجی اوب گیا اور پھر پلنگ پر خوب کروٹیں بدل بدل کر سوئیں گے۔ اف ایسے مزے۔۔۔ آتے وقت میں صندوق میں بنائی ساری گڑیاں نکال لاؤں گی۔ سیلن کی باسی مہک سے بھری بوڑھی، بیمار گڑیاں۔۔۔ کسی کے بال جھڑ گئے ہوں گے، کسی کا منہ پولا لیکن پھر بھی لے آؤں گی۔ تنہا یا بانٹ لیں گی اور کیا چاہیے۔“

وہ بولتی رہی، بولتی رہی۔۔۔ منی خالہ اپنی ساڑھی کی ہر مت چھوڑ کر حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔ وہ اپنا دل بہلائے کو یونہی ادھر ادھر کی ہانکنے لگتی تھی۔ دن رات کی تنہائی اسے عجیب و غریب

رویے بخش رہی تھی۔ پہلے تو چوبیس گھنٹے منی خالہ کا ساتھ ہوتا تھا، ہزاروں کہتی۔۔۔ ہزاروں سنتی۔۔۔ اور اب چوبیس گھنٹوں میں سے چند گئے جنے گھنٹے تھے جنہیں بھی تو وہ ہنس بول کر گزار لیتی، کبھی گسم گسم چپ چاپ بیٹھی رہتی اور کبھی یوں خود کلائی کے سے انداز میں باتیں کرتی کہ منی خالہ کو اپنا وجود غیر ضروری سا لگنے لگتا۔

وہ بولتے بولتے تھک سی گئی۔ تب اس نے خالہ کی طرف دیکھا، نجانے کیا سوچ رہی تھیں کہ ہاتھ میں پکڑی سوئی بھی کپڑے میں ہی رہ گئی تھی۔ وہ چڑ کر ان کے پاس سے اٹھی اور اوپر آگئی۔ ابھی دوپہر کا وقت تھا اور اس سوتے جاگتے پوریت بھرے دن کا انجام اس رات پر ہوا تھا، جو بہت خوشگوار تھی اور اس کی نرم سی ٹھنک کبھی کبھار جسم کو گدگدا سی جاتی تھی۔ وہ ابھی ابھی کھانا کھا کر بیٹھی تھی۔ موسم بتی بجھنے کے بعد بھی جلے ہوئے موسم کی ہلکی سی مہک پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ چہل قدمی کے لیے باہر جانے کی غرض سے دوپٹہ اچھی طرح لپیٹتے ہوئے اٹھی کہ اس وقت واقعی ان کپڑوں میں ٹھنڈی محسوس ہونے لگی تھی۔ چہل پہنٹے ہوئے باہر مخصوص قدموں کی مانوس سی چاپ ابھری تو وہ لمحہ بھر کے لیے دروازہ کھولتے ہوئے رک سی گئی۔

”انتا قریبی رشتہ۔۔۔ درجہ بہ درجہ بڑھتا ہوا اپنائیت کا احساس بھی۔۔۔ اس کے باوجود یہ جھجک۔۔۔ افوہ۔۔۔“ اسے غصہ آیا خود پر۔

پہلے تو وہ اجنبی تھا۔ نہ جان نہ پہچان۔۔۔ چھپتی پھرا کرتی مگر اب تو وہ عاطف ماموں کا بیٹا تھا، وہی عاطف ماموں جن کی گود میں وہ کھیلا کرتی تھی۔ ایاز کو دیکھ کر بے اختیار انہیں یاد کرتی۔۔۔ اس سے بات کرنا چاہتی تھی مگر۔۔۔

قدموں کی ہلکی ہلکی چاپ گم ہونے میں نہ رہی تھی۔۔۔ وہ کھڑکی سے آگئی۔۔۔ باہر ٹھنڈی ہوا کا لطف لیا جا رہا تھا۔ چاندنی کی شرارت۔۔۔ ہوا کی انھکھیلیاں۔۔۔ نیم کی شاخوں میں اٹکنے بڑے سے چاند سے گفتگو۔۔۔ گنگناہٹ جاری۔۔۔

کل رات میں تنہا تھا میرے دھیان میں تم تھے

اس کی آواز بہت نرم اور میٹھی تھی۔۔۔ سنتے رہنے کو جی چاہتا تھا۔۔۔ وہ جالی سے سرٹکائے دیر تک کھڑی رہی۔۔۔ پھر بستر پر لیٹ گئی۔ دیوار کے اس پار اور اس پار تنہائی کا ایک سا عالم تھا۔

تحریر میں تم تھے میرے وجدان میں تم تھے

وہ اندھیرے میں آنکھیں کھولے پلکیں جھپکتی رہی، آج اس تاریکی میں مدھم مدھم سی روشنی جانے کہاں سے پھیل رہی تھی۔ وہ اس روشنی میں کسی سائے کو اپنے آس پاس چلتے پھرتے محسوس کرنے لگی۔ نرم آواز گرم جذبات سے لودے لگتی تھی۔

گو اجنبی دستک تھی مگر میں نے درجاں

یہ سوچ کے کھولا تھا کہ امکان میں تم تھے

اس کا ہاتھ کسی مضبوط ہاتھ کی اپنائیت بھری گرفت نے تھا تو پلکیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ ہونٹوں پر مدھم مدھم مہکان اور وجود کے گرد ایک بہت ہی خوب صورت احساس کا حصار۔۔۔ آج وہ ایک انوکھی نیند سوئے جا رہی تھی۔

☆☆☆
 بہت دور کسی دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔۔۔ مسلسل۔۔۔ متواتر۔۔۔ لگاتار گہری نیند میں اس دستک کی آواز اسے لاشعور سے شعور تک پہنچنے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کے کانوں نے سنا مگر نیند میں ڈوبا، سو یا ہوا ذہن مسلسل اسے تھک رہا تھا۔۔۔ پھر رفتہ رفتہ دستک نزدیک آتی گئی۔۔۔ نزدیک۔۔۔ اور نزدیک اتنی کہ اس کے کمرے کے دروازے پہ آکر ٹھہر گئی تھی۔
 ٹھک۔۔۔ ٹھک۔۔۔ ٹھک۔۔۔ اس نے جھٹلانا چاہا مگر آنکھیں پٹ سے کھل گئی تھیں۔
 ٹھک۔۔۔ ٹھک۔۔۔ دستک اسی کے دروازے پہ ہو رہی تھی، وقفے وقفے سے۔ یوں جیسے کوئی بہت آرام سے کھڑا محض تفریحاً دروازہ بجا رہا ہو۔
 جو اس کے مکمل بے دار ہونے ہی وہ چادر جھٹک کر اٹھ بیٹھی، آنکھوں میں ادھوری نیند کی کڑواہٹ بھری تھی۔ معلوم نہیں کیا وقت ہوا تھا مگر اسے لگا وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی سوئی تھی۔
 ”کون۔۔۔ کون ہے؟“ وہ بجلت میں دروازے کی طرف بڑھی، مگر کنڈی کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ فضا میں حلق رہ گیا تھا۔
 باہر سے کوئی آواز آرہی تھی۔
 اس نے سننے کی کوشش کی۔

”نوری۔۔۔ دروازہ کھولو۔۔۔ نوری۔۔۔“ ہلکی سی سرگوشی۔۔۔ پہنچی ہوئی آواز۔۔۔ وہ ایک دم ڈر گئی۔ پہلے تو یہی خیال کیا تھا کہ مٹی خالہ ہوں گی۔ وہ اکثر رات گئے آیا کرتی تھیں مگر یہ آواز طلعی اجنبی۔۔۔ نامانوس۔۔۔
 ”کون ہے؟“ اس نے قدرے بلند آواز میں پوچھا۔
 جواباً وہی سرگوشی ابھری، وہ دروازے سے پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، ٹانگوں میں لرزش سی اتری تو وہ بھاگ کر اپنے بستر پر آ گئی۔ کھڑکی کے اس پار پھلکی تاریکی اور خاموشی بتا رہی تھی کہ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی ہے۔
 دستک ایک بار پھر ہوئی تھی۔

اسے اس جھنڈ میں بھی پسینہ آ گیا تھا۔
 ”کون ہے باہر۔۔۔ کون ہے؟“ باوجود کوشش کے وہ چلا نہ سکی۔ روہی آواز بمشکل اس کے حلق سے نکلی تھی۔ چند ثانیے دوسری طرف سے کوئی آواز نہ ابھری تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ چپک کر بیٹھ گئی۔ عین اسی لمحے کھڑکی کے دوسری جانب سے سرگوشی ابھری تھی۔

”نوری! دروازہ۔۔۔“ اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ سیاہ بلند قامت سایہ کھڑکی کی جالی پہ اس پر جھکا آ رہا تھا، خوف، پوری قوت سے اس پر حملہ آور ہوا تو زوردار چیخ خود بخود اس کے حلق سے نکلی تھی اور پھر وہ خود کو روکنے کی معمولی سی کوشش بھی نہ کر پائی تھی۔ مسلسل چیختے ہوئے وہ برق رفتاری سے کھڑکی سے دور بھاگی تو نجانے کہاں کہاں، کس کس چیز سے ٹکرائی، کوئی آفت قیامت تھی جو رات کے اس پہر اس پر نازل ہوئی تھی۔ سایہ کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا تھا مگر اسے لگ رہا تھا وہ جالی کے اندر سے ہاتھ بڑھا کر اسے باہر پھینچ لگایا پھر بند دروازے کی جھریوں سے زبردستی اندر آ گئے گا۔

اپنی ہی بے ہنگم چیخوں کے درمیان اس نے دروازہ دھڑ دھڑانے اور بہت سے قدموں کے بھاگنے دوڑنے کی آواز سنی تھی۔

”نور! نور! دروازہ کھولو۔۔۔ نور!“ بہت ساری آوازوں میں وہ بس ایک ہی آواز تھی جو اس کی زائل ہوتی توانائیوں کو واپس کھینچ لاتی تھی۔ دروازے کی کنڈی گرا کر وہ بے دم ہو کر مٹی خالہ کے بازوؤں میں جا گر گئی تھی۔

”یہاں کوئی تھا، مٹی خالہ! یہاں کوئی تھا۔ دروازے پر پھر ادھر کھڑکی میں۔“ رورو کر ہلکان ہوتے ہوئے اس نے بمشکل بتایا۔

”دروازے پر دستک دیتا رہا۔۔۔ پتا نہیں کون تھا خالہ!“ ڈر کے مارے اسے کچھ بھائی نہ دے رہا تھا۔ ”کون؟ کون تھا اور کیا کچھ کہہ رہا تھا۔“ بس بانٹے خالو کی دھاڑ تھی جو اس کے رہے سبے اوسان بھی خطا کیے جا رہی تھی۔

”تمہاری اتنی جرأت غلیظ انسان! تم نے کیا سوچ کر یہ حرکت کی ہے۔“
 وہ کس پر چلا رہے تھے، نور دیکھنے کی ہمت نہ کر سکی۔ بس آنکھیں میچے، مٹھیاں بھینچے روئے چلی جا رہی تھی۔ مٹی خالہ اسے بازوؤں میں سمیٹ کر نیچے لے آئی تھیں۔ ان کا کراہیلے سے روشن تھا، پلنگ پر بٹھا کر وہ بغیر کچھ کہے اس کے آنسو پونچھنے کی ناکام کوشش کرنے لگیں۔ انتہائی مضطرب اور پریشان۔۔۔
 وہ اسے دلاسا دینے کی ہمت بھی خود میں نہ پا رہی تھیں، باہر صحن میں ایک ہنگامہ سا جاگ اٹھا تھا۔ بانٹے خالو ایاز کو کھینٹے ہوئے نیچے لے آئے تھے۔

”تم ابھی اور اسی وقت یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“ بانٹے خالو چلا رہے تھے۔

”ارے، ہے نا گنداخون۔ اپنے ہی خاندان کی عزت۔۔۔“ ان کی ماں کی پاٹ دار آواز۔۔۔
 نور، مٹی خالہ کے سینے میں منہ چھپانے لگی تھی۔ کیا خوف اتر آیا تھا ذہن و دل پر اور مٹی خالہ کو جانے کیا ہوا کہ خود سے لپٹی نور کو ایک جھٹکے سے پرے ہٹا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

”جھوٹ ہے، سب کو اس ہے۔۔۔ یہ الزام ہے مجھ پر۔“ ایاز کی آواز میں شدید غصہ تھا۔

نور نے بمشکل خود کو سنبھال لیتے ہوئے مٹی خالہ کو پکارا۔ وہ کمرے سے باہر جا رہی تھیں۔ نور کے لیے ان چند لمحوں کی تنہائی بھی عذاب تھی، وہ فوراً اٹھ کر ان کے پیچھے لپکی۔۔۔ مٹی خالہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی اس تک جا پہنچی تھیں۔

”آپ میرا یقین کریں، میں تو صرف چیخوں کی آواز سن کر۔“
 وہ فوراً مٹی خالہ کے سامنے صفائی پیش کرنے لگا تھا، مگر اگلے ہی پل مٹی خالہ کے زنائے دار تھپڑ نے اسے گنگ کر دیا تھا۔

اندھا دھند دروازہ کھولتے ہوئے نور اتر صحن میں پھیلتے ستائے کو صرف محسوس کر سکی تھی، اسی لمحے اس نے اپنے وجود کو بے جان ہوتے محسوس کیا تو وہیں دروازے کے قریب فرش پر بیٹھ کر مٹی خالہ کو پکارتی رہ گئی تھی۔ اس کی ڈوبتی ہوئی آواز مٹی خالہ تک بہت دیر میں پہنچی تھی اور جس لمحے وہ پلٹ کر اس تک آئیں، وہ ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔

☆☆☆

آنا فنا وہ سب کچھ ہو گیا تھا جس کا اس نے تصور بھی نہ کیا تھا۔ ایاز کو کھڑے کھڑے گھر سے نکال دیا گیا تھا اور نکالنے والی بھی کون۔۔۔ منی خالہ۔۔۔

”اتنا حوصلہ کہاں سے آیا ہوگا۔۔۔ سگا بھتیجا، گمشدہ بھائی کی واحد نشانی۔۔۔ اپنے ہاتھوں کھو دی۔۔۔ اس کائنات کا اثر دھام پہلے باپ کو ہڑپ کر گیا تھا، اب بیٹے کو بھی نگل لے گا۔۔۔ پہلی غلطی تو قابل معافی ہوتی ہے منی خالہ! اب آپ اپنے زندہ رشتوں کی موت کا سوگ کیونکر منائیں گی۔“

آج تین دن بعد بخار ٹوٹا تھا اس کا۔ رات کے کسی پہر آنکھ کھلی تھی اور اب وہ چپ چاپ تکیے پر سر ڈالے لیٹی ہوئی تھی۔ جانتی تھی، ذرا ہلے گی اور منی خالہ چونکی ہو کر اٹھ بیٹھیں گی۔ ہزار خاطر کریں گی اس کی۔۔۔ ”دو اکھالو، پھل لے لو، سرد بادوں۔“ اور نجانے کیا کیا۔ خود بھی کئی گھنٹوں کی نیند اس کے پیچھے خراب کر پڑی گی اور اسے بھی عاجز کر دیں گی جبکہ وہ ابھی صرف سوچنا جا رہی تھی، وہ سب جو کچھ ہوا تھا۔ معلوم نہیں، اس میں کیا صحیح تھا اور کیا غلط۔ شاید وہ کبھی اتنی بے چینی محسوس نہ کرتی مگر وہ ایک آواز جو رات کے اس پہر بھی چاند کے ساتھ ساتھ سفر کر رہی تھی، وہ اسے ان نتائج سے مطمئن نہ ہونے دے رہی تھی۔

اے دوست! مجھے تو نے دو چیز عطا کی ہے

سوغاتِ شبِ ہجر اور عالمِ تنہائی

”کیا اس کا جرم اتنا بڑا تھا کہ اسے یوں در بدر کیا جاتا لیکن اس نے ایسا کیوں کیا۔۔۔ آدھی رات کے وقت مجھے خوفزدہ کرنے کی یہ بھیا تک حرکت کیا تھی، کوئی شرارت، بھونڈا مذاق یا حقیقتاً مجھے نقصان پہنچانے کی خواہش۔۔۔ اور اس لمحے خوف کے مارے میرا دل بند ہو جاتا تو۔۔۔“

وہ سوچتے سوچتے بلکان سی ہونے لگی تھی۔ نیند بھی نہ آرہی تھی۔۔۔ کہ کچھ اور وقت ہی کٹ جاتا۔۔۔ تنگ آن کر منی خالہ کو جگانے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور پھر قدرے چونکتے ہوئے رک گئی۔

”یہ کیا ہوا؟“ اس کی نظریں منی خالہ کی دودھیا گردن پر لگے زخم پر جم کر رہ گئی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی بہت باریک چیز گوشت کو کاٹنے ہوئے ڈیڑھ دو انچ لمبا زخم ڈال گئی ہو۔

”کب آئی یہ چوٹ۔۔۔ خالہ نے ذکر ہی نہیں کیا۔“ زخم پر کھرنڈ آ گیا تھا مگر پھر بھی اسے تشویش ہوئی۔ منی خالہ دوسری جانب رخ کیے لیٹی تھیں، اس نے ان کی لمبی بل دار چوٹی سر کاٹتے ہوئے قدرے جھک کر اس زخم کو دیکھنا چاہا مگر منی خالہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔

”کیا۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔“ وہ پریشان ہو کر پوچھ رہی تھیں۔

”کچھ نہیں، میں تو یہ زخم دیکھ رہی تھی آپ کی گردن پر۔۔۔ کیا ہوا تھا؟“ منی خالہ کا ہاتھ بے اختیار زخم کو چھو گیا۔

”ہاں یہ۔۔۔ معمولی سا زخم ہے۔ پتا نہیں کب لگا۔۔۔ تم یہ بتاؤ، کتنی دیر سے جاگ رہی ہو۔“

اس کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہ تھا، وہ پریشان ہو کر پوچھنے لگیں۔

”ابھی کچھ دیر پہلے آنکھ کھلی ہے، بھوک لگ رہی تھی۔“

”پہلے کیوں نہیں جگا دیا مجھے۔“ وہ جلدی سے پلنگ سے نیچے اتر گئیں اور سب اٹھا کر اس کے پاس آ گئیں۔

تکیے سے ٹپک لگا کر بیٹھتے ہوئے اس نے منی خالہ کو سب کاٹتے ہوئے دیکھا تو بے اختیار ہی ہانکے خالو کا دھیان آ گیا۔ پچھلے دنوں میں انہوں نے اس کا بہت خیال رکھا تھا۔ دودھ، پھل، دوائیں۔۔۔ کسی چیز کی کمی نہ ہونے دی تھی۔ شاید وہ اس شرمندگی کا ازالہ کرنا چاہ رہے تھے جو ایاز کی وجہ سے انہیں نور کے سامنے اٹھانی پڑی تھی۔

☆☆☆

”نوری۔۔۔ نوری۔۔۔ نوری۔۔۔“ ہلکی سی آواز۔۔۔ پر اسرار پکار۔۔۔ معنی خیز سرگوشی۔ وہ نیند میں ذرا سا کسمپاسی اور اگلے ہی پل ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ دائیں دیوار کے ساتھ لگی کرسی پر بیٹھے ہانکے خالو نے چہرے کے سامنے پھیلے اخبار کا کونا ذرا سا ہٹایا اور اسے دیکھ کر ذرا سا مسکرا دیے۔

”خیریت۔“ انہوں نے پوچھا۔

اس نے چونک کر انہیں یوں دیکھا، گویا ان کی موجودگی سے بے خبر ہو۔

”کیا ہوا؟“ انہوں نے دوبارہ پوچھا۔

وہ ڈری سہمی بیٹھی تھی۔ اڑے اڑے حواس، زرد زرد چہرہ، بمشکل تھوک نگلا۔ ہانکے خالو نے اخبار تہ کر کے ایک طرف رکھا اور جگ اٹھا کر گلاس میں پانی اٹھ پینے لگے۔ وہ چورنگا ہوں سے ادھر ادھر دیکھتی رہی، محض وہم تھا جو اسے نیند میں بھی بے چین و بے سکون کر گیا تھا۔ وگرنہ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ ہانکے خالو کمرے میں موجود تھے، سوڈا ہارس بندھ گئی تھی۔ چند گھنٹوں پانی پی کر اس نے گلاس واپس تھما دیا تھا۔

”بخار تو نہیں ہے۔“ انہوں نے ماتھے پر ہاتھ رکھا پھر نبض چیک کی اور پلٹ گئے۔ تب ہی منی خالہ اندر آئیں، جانے کا کپ ہاتھ میں تھا۔

”اٹھ گئیں، منہ ہاتھ دھو لو۔“ آتے ہی غلت میں پوچھا۔ ہانکے خالو کو کپ پکڑاتے پکڑاتے چائے چھلک گئی تھی۔ انہوں نے گھبرا کر کچھ کہنا چاہا مگر خالو بغیر کچھ کہے سننے ایک نظر انہیں دیکھ کر کرسی پر جا بیٹھے تھے۔

”کچھ دیر بعد نہا لوں گی۔“ نقاہت سی ہو رہی تھی۔ وہ تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔

”ابھی کیوں نہیں، تین دن سے یہی کہہ رہے۔“ انہیں پتا نہیں کیوں اتنی جلدی تھی، نہ خیریت کا پوچھا، نہ حال احوال کی طلب۔ نور کو وحشت سی ہونے لگی۔ بعض اوقات ان کے رویے یوں ہی ناقابل فہم ہو جاتے تھے اس کے لیے۔

”پہلے اس کے لیے ناشتا لے آؤ، وہ ابھی ابھی سو کر اٹھی ہے۔“ ہانکے خالو نے گویا یاد دہانی کرائی تھی۔

”ابھی دل نہیں چاہ رہا۔“ اس نے فوراً منع کر دیا تو منی خالہ اس کے قریب بیٹھ کر پھل کاٹنے لگیں۔

”تھوڑا بہت کھا لینا۔“

”اوپر کا کمر اخالی ہے، اسے نور القمر کے لیے سیٹ کر دو۔ وہ شخص اب اگر کبھی واپس آیا بھی تو۔۔۔“

”اماں آپ کا پوچھ رہی تھیں، غالباً کوئی کام کہا تھا انہوں نے آپ سے۔“ منی خالہ کو اچانک یاد

وہ کھسک کر منی خالہ کے نزدیک پہنچ گئی۔ انہوں نے محسوس کیا، اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ سانس کی رفتار معمول سے تیز تھی۔
 ”نور!“ اس کی بدلتی حالت ان کے لیے پریشان کن تھی۔
 ”منی خالہ!“ اس نے پوری قوت سے ان کے دونوں ہاتھ جکڑ رکھے تھے۔
 ”منی خالہ!“ وہ مدھم آواز میں کچھ کہنے جا رہی تھی کہ منی خالہ کا ہاتھ سختی سے اس کے ہونٹوں پر ثبت ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں کڑی تہیہ۔۔۔ وہ دانتوں تلے ہونٹ دبائے ان کے کندھے سے لگ گئی تھی۔

”کیا ہوا؟“ بانکے خالو ملے تھے۔
 ”کچھ نہیں، شاید کمزوری محسوس کر رہی ہے، چکر آنے لگتے ہیں۔“ انہوں نے کاندھے سے لگی نور کو لٹکانا چاہا مگر وہ ان سے بری طرح لپٹی ہوئی تھی۔
 ”تم اس کے لیے بیٹھی۔۔۔“

”خالہ! مجھے تے آرہی ہے۔“ اس نے بمشکل کہا تھا۔
 ”آؤ۔“ منی خالہ اسے ساتھ لیے باہر نکل آئیں۔
 غسل خانے میں گھستے ہی ان کے ساتھ لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ اسے اپنی پہچان پر بھروسہ تھا۔ منی خالہ اسے تھپکتی رہیں۔ رات تک وہ بمشکل اسے نادل کر پائی تھی۔
 ”انہوں نے بہت غلط سمجھا ہے مجھے، وہ مکان چھین کر ہم سے ہماری جائے پناہ چھین لینا چاہتے ہیں مگر میں ایسا ہونے نہیں دوں گی۔ صرف تمہارے صحت مند ہونے کا انتظار تھا مجھے۔“ وہ اٹھ کر کسی کام سے باہر جانا چاہتی تھیں۔

”آپ میرے پاس رہیں، مجھے ڈر۔۔۔“
 ”بے وقوف مت بنو، ہر کام، معمول کے مطابق ہونے دو۔“ انہوں نے سختی سے کہا پھر جھک کر اس کے کانوں میں بولیں۔
 ”کل کا سورج ہمیں اس گھر میں نہیں دیکھے گا۔“ ان کے ارادے کی چٹنگی ان کی آنکھوں سے ہوید اٹھی۔ نور مگر ان کا منہ دیکھتی رہ گئی تھی۔

☆☆☆
 ٹرین کی جھک جھک میں بلا کی تیزی آگئی تھی۔ نور ان کے احسانوں کے بوجھ تلے دلی ان کی گود میں سر رکھے مضمحل سی لپٹی تھی، غالباً سوچیں ہی اور سونے سے قبل وہ بار بار ان کا چہرہ کھوجتی رہی تھی۔
 دکھ، پریشانی، اضطراب۔۔۔ منی خالہ جانتی تھیں وہ کیا ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی ہے، اسی لیے خود کو مطمئن ظاہر کرتی رہیں اور وہ ان کا ہاتھ تھامے اونٹھنے لگی تھی۔

”تم پر سے ان احسانوں کا بوجھ ہٹا دو نور! مگر کیا ہے کہ اس سے میرا پناہ وجود ہلکا پڑ جائے گا۔ وہ اور لوگ ہوتے ہوں گے جو خود پر کیے گئے ظلم کی داستان بڑھا چڑھا کر سب کو سناتے ہیں۔ یہاں تو آنکھ تھک جاتی ہے، اس ظلم و زیادتی کو سوچ کر جو مجھ پر ہوا اور جو میں نے چھپ چاپ سہہ بھی لیا۔“
 انہوں نے جیسے تھک کر اپنا سر کھڑکی سے نکا دیا اور باہر اندھیرے میں ڈوبی کائنات کو بھاگتے

آگیا۔
 ”کیوں بھی! اب تو ڈر نہیں لگے گا نا تمہیں۔“ وہ سنی ان سنی کرتے براہ راست اس سے پوچھنے لگے تو وہ جھل سی ہو گئی۔
 ”اتنے دنوں سے منی خالہ کا کمر اسنبھالے بیٹھی ہوں، شاید اسی لیے۔“ وہ سوچ کر شرمندہ ہونے لگی۔
 ”نہیں، اب کیوں ڈرے گی۔ بس ذرا طبیعت سنبھل جائے تو پھر۔۔۔“ منی خالہ اس کی جگہ جواب دے رہی تھیں۔

”ہوں۔“ انہوں نے ہنکارا بھرا پھر اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگے۔
 ”ایک بات تو بتاؤ۔“ وہ نور کے پاس آکھڑے ہوئے تو اس نے سر اٹھا کر سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

”ابامیاں اپنے ضروری کاغذات کہاں رکھتے تھے۔“ قطعی غیر متوقع سوال تھا۔ منی خالہ تو چونکیں ہی، وہ بھی قدرے حیران سی ہو کر انہیں دیکھنے لگی مگر وہ جواب کے منتظر تھے۔
 ”لوہے کی صندوقچی میں ہوتے تھے سارے کاغذات۔“ حیرانی میں لپٹا جواب تھا۔
 ”اونہوں۔“ انہوں نے لب بھینچ کر لٹی میں سر ہلایا۔ ”مکان کے کاغذات وہاں نہیں تھے، اس کے علاوہ کوئی اور جگہ۔۔۔ یا کوئی دوست۔۔۔ محلے دار۔۔۔ جس کے پاس وہ اپنی ضروری چیزیں رکھوا سکتے ہوں۔“

نور نے الجھ کر منی خالہ کی طرف دیکھا۔ کچھ یاد آیا تو تھا مگر۔۔۔
 ”اگر بتانے والی بات ہوئی تو یقیناً منی خالہ بتا چکی ہوتیں، مجھ سے پوچھنے کی نوبت نہ آتی۔“ اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور اسے یوں سوچ میں گم دیکھ کر بانکے خالو جھنجھلا گئے تھے۔
 ”دیکھو نور۔“

”نور۔“ اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر دیکھا۔ بانکے خالو غیر شعوری طور پر بات کرتے کرتے رک سے گئے تھے مگر اگلے ہی پل شعوری طور پر خود پر قابو پاتے ہوئے انہوں نے بات دوبارہ شروع کر لی تھی مگر لمحے کے ہزار دیں حصے میں جس طرح نور سے نظریں ملتے ہوئے انہوں نے نگاہ چرائی تھی، وہ تھرا کر رہ گئی تھی۔
 ”مجھے مکان کا کوئی لالچ نہیں۔ وہ خود مجھے یہ کاغذات۔“ وہ پلٹ کر کھڑکی کی طرف چلے گئے تھے۔

نور پتھرائی آنکھوں سے ان کی پشت کو گھورتی رہی تھی۔
 ”نور۔۔۔ نور۔۔۔“ وہی سرگوشی اس کے آس پاس بکھری۔
 آج سے پہلے بھی کسی نے اسے اس نام سے نہیں پکارا تھا۔ ہاں مگر اس رات سے آج تک سماعتوں میں گونجتی ”وہ“ آواز۔۔۔ اور ”یہ“ آواز ریزہ کی ہڈی میں سردی لہر دوڑ گئی۔ اس نے بے ساختہ منی خالہ کا ہاتھ پکڑا۔ وہ چونک کر استغناء میں نظروں سے اس کے پکپکاتے لب دیکھنے لگیں۔
 ”میں وہ مکان بچ کر تمہاری تعلیم اور۔۔۔“ بانکے خالو کھڑکی کھولے باہر جھکا رہے تھے۔

دوڑتے دیکھنے لگیں۔ ریل گاڑی کی جھک جھک ان کی سہاگ رات کی کہانی سنانے لگی تھی۔ جب اس کی لمبی چوٹی کے بل ایک ایک کر کے کھولتے ہوئے وہ سرگوشیاں کر رہے تھے۔

”تم بہت حسین ہو، بہت خوب صورت، دل کو چھو لینے والی مگر پہلی نظر میں تم مجھے بہت عام سی لگی تھیں۔ ہاں مگر وہ لمحہ۔۔۔ جب تمہارے گھر میں رات گئے چھت پر میں نے تمہاری کلائی پکڑی تھی اور تم کسی خوفزدہ بہرنی کی طرح مجھ سے اپنا آپ چھڑا لے گئی تھیں۔ ہاں، اس ایک لمحے میں تم نے مجھے اسیر کر لیا تھا۔“ گھنے بال پشت پر بکھر کر ان کے نازک وجود کو چھپا سگئے تھے۔

”جانتی ہو۔۔۔“ وہ اتنے نزدیک تھے کہ انہوں نے بے اختیار رخ موڑ کر گھٹنوں میں سر دے لیا تھا۔

”مجھے ڈری سبھی عورتیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ خوفزدہ کبوتری کی مانند لرزتی، کانپتی عورتیں میری کمزوری ہیں۔“ انہوں نے ایک جھٹکے سے سراٹھا کر انہیں دیکھا۔

اس کی آنکھوں میں اتنی حیرت دیکھ کر وہ مسکرائے۔ بلاشبہ بہت دلکش مسکراہٹ تھی مگر اس بل وہ صرف ان کی آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔

سنگ دلی، کٹھور پن، سرد مہری اور۔۔۔ اور بر فیلا انتقام۔۔۔ ان آنکھوں کو پڑھ کر وہ واقعی ڈر گئی تھیں، سہم گئی تھیں۔

ایک جھٹکے سے اٹھ کر انہوں نے ان سے دور ہو جانا چاہا تھا مگر اس کے پلنگ سے اترتے ہی انہوں نے ساڑھی کے پلو کو اس انداز سے کھینچا تھا کہ وہ گھٹنوں کے بل گریں تو بچاؤ کے لیے سہارا تلاش کرتا ہوا ہاتھ بے اختیار ان کے سینے پر جا پڑا تھا۔ ان کی چوڑیوں بھری نازک کلائی کو ہاتھ کی مضبوط گرفت میں لیتے ہوئے وہ ان کی طرف جھٹکتے ہوئے مسکرائے تو وہ پلنگ کی مٹی سے لگ کر بیٹھ رہ گئی تھیں۔ بدن میں روح نکلتے کچھ زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ قہر بھری سفاکی دیکھتے ہی دیکھتے ان کی آنکھوں سے پھٹکی اور اگلے ہی بل ان کے ہاتھ کے دباؤ سے کلائی میں اپنی سرخ چوڑیاں ایک ایک کر کے ٹوٹتی پتی لگی تھیں۔ وہ اپنا سفید پڑتا چہرہ لیے کلائی سے ٹپکتے قطرہ قطرہ خون کو دیکھتی رہیں اور وہ ہنستے ہوئے اس پری چہرہ کو آنکھوں کے رستے دل میں اتارتے رہے۔

ان کی پرورش باپ کے کٹھور پن اور ماں کی سنگدلی کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ ان کے بد صورت رویوں کی جڑ ان کے ماضی میں پیوست تھی۔ بیوی ملی تو اپنی عمر سے چند سال بڑی۔۔۔ اور شاطرانہ مزاج۔۔۔ تحکمانہ انداز۔۔۔ اوپر تلے تین بیٹے پیدا کیے تو گویا ساتوں آسمان اسی کے ہو گئے۔

ان کے جذبات کو کہاں کہاں پکلا گیا۔ ان کی خواہشات کس کس طرح مسترد ہوئیں۔ ان کی آنکھوں سے کون کون سے خواب نوج لیے گئے۔ انہیں کس کس مقام پر ٹھکرایا گیا۔ وہ کچھ نہ جانتی تھیں، بس اتنی خبر تھی کہ پس پردہ ذات ”عورت“ کی بھی۔ ان کے ارد گرد چھائی ہوئی عورت مضبوط۔۔۔ طاقتور اور حاکمیت کے غلط استعمال کی عادی تھی۔ ان کے باپ کے مرنے کے بعد ان کی ماں نے اپنے انداز سے زندگی گزار لی تھی اور ان کی بیوی نے اپنی زندگی اپنے طور طریقوں میں ڈھال رکھی تھی۔ معلوم نہیں ان دو عورتوں کے سوا اور کس کس ”عورت“ کا دخل ان کی زندگی میں رہا تھا اور کس انداز میں۔۔۔ کہ اب ان کے وجود میں کھولتا ہوا لاوا

تھا جو بہہ جانے کے لیے راہ ڈھونڈتا تھا۔ غصہ تھا، تلخی تھی، نفرت تھی، سرکشی تھی، اناتھی، انتقام تھا جو اپنے سامنے روٹی دھوتی عورت کو دیکھ کر تسکین چاہتا تھا اور ان کی بد نصیبی کہ وہ پہلے مقام پر ہی ان سے ہار گئی تھیں اور پھر بارتی چلی گئی تھیں۔

”آج تم یہ ساڑھی پہنو گی۔“ نیلے اور فیروزہ رنگ کی ساڑھی پلنگ پر رکھی تھی۔ وہ کمرے میں آئیں تو ٹھنک سی گئیں۔

”خوب اچھا سا میک اپ کرو، بال کھلے چھوڑنا۔“ وہ پر خیال نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

”زیور، گہنا سب پہن لو، آج ہم ایک دعوت میں جا رہے ہیں۔“

”دعوت۔۔۔“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”اور تمہیں سب سے حسین نظر آنا چاہیے۔“ وہ ان کے قریب آئے تو آواز حسب معمول سرگوشی میں ڈھل گئی تھی۔ گیلے بالوں کو اس کے صبح چہرے سے ہٹاتے ہوئے وہ بہت محبت سے مسکرائے اور باہر نکل گئے تھے۔

عجیب وغریب انداز تھا۔ کسی نئی قیامت کا پیش خیمہ، وہ الجھتی رہیں۔ دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانٹا رہا تھا۔ آنکھوں میں کاہل بار ہا پھیلا۔ لب اسٹک بار بار خراب ہوئی۔ عجب خوف میں گہری زندگی تھی ان کی اور جس لمحے وہ کمرے میں داخل ہوئے، وہ انہی کا دیا ہوا پرفیوم اسپرے کر رہی تھیں۔ عقب میں دروازہ بند ہونے کی آواز سنی تو وہ چونک کر پائیں۔

وہ آنکھیں پھیلائے ساکت کھڑے تھے، یوں جیسے ان کے خیرہ کرتے حسن اور جگر جگر کرتے وجود نے انہیں مہبوت کر دیا ہو۔

”ارے تم جنت سے آئی ہوئی کوئی حور تو نہیں۔“ وہ واقعی دنگ رہ گئے تھے۔ ایسا والہانہ انداز تھا ان کے دیکھنے کا۔ وہ گہرا کر ساڑھی کا پلو درست کرنے لگیں۔

”کب چلیں گے ہم۔“ ان کی وارفتگی ان کے لیے عذاب کا سبب ہی بنتی تھی۔

”ہم کہیں نہیں جا رہے۔“ وہی سرگوشی، ان کا پورا جسم ٹھنڈا اٹھا رہا تھا۔

”ہم کہیں نہیں جائیں گے، آج کی دعوت۔۔۔ صرف ہماری اور آپ کی۔۔۔ اسی کمرے میں۔۔۔“ ان کی آنکھوں میں وہی خاص چمک ابھری تھی جو ان کے وجود کو بھر بھری مٹی میں تبدیل کر دیا کرتی تھی۔ انہیں اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر انہوں نے کتر کر نکل جانا چاہا مگر ہر راستہ مسدود تھا۔ وہ بے ساختہ ہی کئی قدم پیچھے ہٹ کر دیوار سے جا لگی تھیں۔

”تمہاری آنکھیں کس قدر خوب صورت ہیں۔۔۔؟ نہیں۔۔۔“ انہوں نے خود ہی اپنی بات کو رد کیا۔

”تمہاری آنکھیں اتنی خوب صورت نہیں، جتنا ان میں تیرتا پانی انہیں خوب صورت بنا دیتا ہے۔“ وہ بہت نرمی سے ان کی پلکوں کو چھونے لگے تو انہوں نے سختی سے آنکھیں بند کر لیں۔

”تمہیں پتا ہے، برستی ہوئی آنکھیں مجھے بہت پیاری لگتی ہیں۔“ ان کے ریشمی بال ان کی مٹھی میں جکڑے گئے تو اس اذیت کو برداشت کرتے ہوئے بے اختیار بند آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے

تھے۔
 ”لیکن۔۔۔؟“ لمحے میں لہجہ بدل گیا تھا۔ ساری نرمی، کو خستگی میں ڈھل گئی۔
 ”اگر بھی ان آنکھوں میں غصہ، نفرت یا بے زاری جھلکی تو جانتی ہو میں یہ آنکھیں نکال کر چیل کوؤں کو ڈال دوں گا۔“ بال جڑ سے اکھڑنے کے قریب ہو گئے تھے، وہ ہنستے ہنستے بھی خود کو زارو قطار رونے سے باز نہ رکھ سکیں۔
 ان کے یوں رونے سے گویا ان کے جھلتے ہوئے جذبات پر نرم پھواری برس گئی تھی۔
 آسودہ سی مسکراہٹ لبوں پر سجائے وہ اس کے آنسوؤں کو موتیوں کی طرح ٹوٹ کر گرتے ہوئے دیکھتے رہے۔

”ہاں، عورت کو ہمیشہ روتے سکتے رہنا چاہیے۔ زبان چلاتی عورت، تہمت لگاتی عورت سے مجھے نفرت ہے، شدید نفرت۔“ ان کی انگلیاں اس کی نازک گردن پر سرسراہی تھیں اور اگلے ہی پل ایک جھٹکے سے گلے میں پہنا ہوا ہار پہنچنے لگی تھیں۔
 کوئی تیز چیز ان کی گردن کو کاٹتی چلی گئی تھی۔
 ”آہ۔۔۔“ دونوں ہاتھ لبوں پر رکھے وہ گرنے کے سے انداز میں زمین پر بیٹھ گئیں۔
 گاڑھے، گرم خون کی باریک لکیر اپنی پشت پر بہتے ہوئے محسوس ہو رہی تھی۔ سارا بدن ایک ان دیکھی آگ میں جلنے لگا۔ صبر، حوصلے، برداشت کی طنائیں ہاتھ سے چھوٹیں تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھیں۔

”تم میرے ساتھ یوں مت کرو، تمہیں خدا کا واسطہ ہے، تم میرے ساتھ یوں مت کرو۔“ وہ کہتی رہیں مگر وہ سن نہیں رہے تھے، صرف دیکھ رہے تھے۔ روٹی، کرلائی، سستی، بلتی عورت کو۔۔۔
 ”تم۔۔۔ تم اس کائنات کی سب سے حسین عورت ہو قمر ضیاء۔“ ان کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھامے وہ بہت جذب کے عالم میں کہہ رہے تھے اور اس حسن کی سزا انہیں یوں دی گئی کہ اپنے زخم زخم وجود کے ساتھ وہ دونوں تک کمرے میں بند رہیں اور باہر ڈھنڈیا مچی رہی۔ وہ نہ چیخ سکیں، نہ پکار سکیں۔ ایک ان چاہے وجود کے لیے کون مدد کو آگے بڑھتا وہ دونوں کمرے میں ہوتے اور سوتن جلے پاؤں کی تکی کی طرح باہر گھومتی رہتی۔

”کیا گھول کر پلا دیا میاں کو۔۔۔“ اپنی تکی دور کرنے کے ان کے پاس بھی ہزار طریقے تھے۔ ایک یہی دو گھڑیاں تو تھیں جو اس کے سینے پر سانپ بن کر لوٹی تھیں تو پھر اپنے زخم دکھا کر سوتن کو فاج بنا تیں۔ یہ ان کی برداشت سے باہر تھا۔

”چائے۔۔۔ گرما گرم چائے۔۔۔“ ریل گاڑی ٹھہر گئی تھی۔ ایک دم بہت سا شور کانوں میں بڑا تو انہوں نے ہڑ بڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ کوئی چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ وقتی پڑاؤ، وہ آنکھوں میں ہلکی ہلکی سرخی لیے سستی سے باہر دیکھتی رہیں۔ اُجالا ہر سو پھیل رہا تھا۔ نور چڑیا کے بھوکے بچے کی طرح بے چین لگ رہی تھی۔۔۔ انہوں نے پرس میں سے پیسے نکال کر اسے تھمائے تو وہ بھاؤ تاؤ کر کے ناشتے کا سامان لینے لگی۔ حلوہ پوری اور گرما گرم چائے۔ وہ رات سے بھوکی تھی اور اب خوب مزے لے لے کر کھا رہی تھی۔ انہوں نے چند لقمے لیے اور پھر گرم گرم چائے طاق سے نیچے اتارنے

لگیں۔
 کچھ ہی دیر میں دوبارہ سفر کا آغاز ہو گیا تھا۔ نور ڈبے میں بیٹھے دوسرے مسافروں کا جائزہ لینے لگی تھی۔ وہ چڑھتے سورج کی زردی مائل دھوپ کو درختوں پر پھیلتے دیکھتی رہیں۔
 اور وہ کہتا تھا۔ ”تم اس دنیا کی واحد عورت ہو جس سے میں نے محبت کی ہے۔“ لیکن تمہاری محبت میری روح کا ناسور بن گئی۔ تمہاری محبت میرے لیے اذیت تھی، دکھ درد تھی، بے پناہ تکلیف تھی، تمہاری محبت میرے بدن پر سگریٹ کے جلے ہوئے نشان تھے۔ خونخوار ناخون کی کھر و چھیں تھیں، جا بجا دکھتے ہوئے زخموں کے ٹیل تھے۔ تمہاری محبت ”میری“ چاہ نہیں، میری بے بسی اور مجبوری تھی جو اختتام کو جا پہنچی۔

پہلے میرے باپ کی دیوانگی اور بے حسی نے تمہیں فائدہ پہنچایا۔ دوسری مرتبہ اس کی موت نے مجھے بے سہارا بنا کر تمہارے در پہ لا پھینکا اور تیسری مرتبہ نور القمر کا وجود میری بے بسی بن گیا۔ اس گھر میں ایاز تھا اور مجھے لگا خدا نے نور کے لیے سہارا ڈھونڈ نکالا ہے۔ جب تک وہ وہاں تھا، میں چاہنے کے باوجود کوئی قدم نہ اٹھا سکی مگر جب ایاز ہی وہاں نہیں ہے تو پھر مزید اس دوزخ میں، میں خود بھی جلتی اور نور القمر کو بھی جلاتی، یہ تو ممکن ہی نہ تھا صاحب! سواب چل نکلی ہوں تو خدا سے دعا ہے۔ اس سفر کو ہم دونوں کے لیے بختاؤر بنا دے۔۔۔ تو پروردگار، اس کے سوا اور کچھ نہ مانگوں کی زندگی میں۔“

☆☆☆

جس وقت وہ لوگ ٹرین سے اتر کر تانگے پر سوار ہوئیں، سورج غروب ہو چکا تھا۔ برندے اپنے اپنے کھولتوں میں لوٹ چکے تھے اور اس قدر سردی رات میں دور گھروں میں جلتی بستی روشنیاں ٹھہرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ نور خوش تھی، بہت خوش۔۔۔ اس اندھیرے میں بھی اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ اپنا شہر، اپنی فضا، اپنی زمین، اپنا آسمان، وہ لوٹ کر اپنے گھر جا رہی تھی۔

منی خالہ چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ ان کی نگاہیں نہر کے سیاہ چکدار پانی پر ڈولتی ناؤ پر جمی تھیں جس پر بھیرا کیے وہ تھما لالچ اسی پر سکوت آسمان تیلے ٹھہرے ہوئے پانی سے جانے کیسا سرور حاصل کر رہا تھا۔ نم آلود ٹھنڈی ہوا مانوس خوشبو سے لبریز تھی۔

شہر دور رہ گیا تھا، بستی نزدیک تھی۔ سفیدے اور شیشم کے درختوں میں گھری سڑک کا آغاز ہوا تو نور قدرے کھسک کر منی خالہ کے نزدیک ہو گئی۔ اس سڑک پر سفر کرتے ہوئے سب سے پہلے محسوس کی جانے والی چیز خاموشی تھی۔ گھری دبیز خاموشی اور درختوں کی شاخوں میں چھپا گھورتا ہوا ستانا۔ کھوڑے کے سموں کی ٹپ ٹپ رفتہ رفتہ بلند ہوتی جا رہی تھی۔ منی خالہ کا دل بھی ذرا سا کپکپایا تھا مگر نور کو سلی دینے کی خاطر وہ ہولے ہولے اس کا ہاتھ دبائے لگی تھیں۔

چائن دے لئی دوج، ہنیرے جنداں جالن والے
 دسدے رہین اجاڑاں دے دوج دیوے بالن
 والے

اس آسب زدہ خاموشی سے گھبرا کر کوچوان نے جا بک لہرایا اور بلند آواز میں گانے لگا۔ اس کی بے ہنگم آواز کا خوب صورت بول گھوڑے کے سموں کی ٹپ ٹپ سے ہم آہنگ ہو گیا تھا۔

چائن دے لئی۔۔۔ ٹپ ٹپ۔۔۔ وچ ہنیرے۔۔۔ ٹپ ٹپ
نور کو ہنسی آگئی اس تال میل پر مگر لطف آ رہا تھا۔ چپ چاپ سنتی گئی۔

وسدے رہیں اجاڑاں دے وچ دیوے بان والے

”بہن جی! جانا کہاں ہے۔ یہ سڑک آخر پر دھول مٹی میں کھو جاتی ہے۔ یہ سامنے دو چار گھر

کھڑے ہیں، آگے تو بے آباد زمینیں ہیں جی۔“

”آخری گھر پر روک دینا بھائی۔“ منی خالہ نے کہا اور سامان سمیٹنے لگیں۔

نور چلتے تانگے سے چھلانگ لگانے کو تیار بیٹھی تھی۔ جونہی کوچوان نے باگیں کھینچیں وہ فٹ سے نیچے۔۔۔ سوٹ کیس ہاتھ میں لیا۔۔۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتی دروازے کی طرف بڑھی۔ منی خالہ کوچوان کو پیسے دے رہی تھیں، تب ہی برابر کے گھر سے کوئی نکلا اور پھر دہلیز پر کھڑا رہ گیا۔
”وامق بھائی!“ اس نے پہچان کر آواز لگائی مگر وہ سنے بغیر ایک ایک قدم اٹھاتے منی خالہ کے سامنے جا پہنچے تھے۔

وہ کچھ پوچھ رہے تھے۔۔۔ کیا۔۔۔؟ نور کو یہاں کھڑے کھڑے سمجھ میں نہ آیا۔ منی خالہ نے جواب میں کچھ کہا اور جھپک کر بیک اٹھانے لگیں۔ وامق بھائی نے ایک دم ان کا ہاتھ تھام کر روکا اور خود سامان اٹھانے لگے۔ بھی دروازے سے ان کی اماں باہر آئیں، چند لمحے رک کر اس سارے منظر کو دیکھتی رہی تھیں۔ بیٹے سے نگاہیں ملیں تو طویل سانس لے کر تیز قدم اٹھاتی منی خالہ تک جا پہنچیں۔

گزرا ہوا وقت انہیں بہت کچھ سمجھا، پڑھا گیا تھا۔ آج عرصے بعد بیٹے کی آنکھوں میں زندگی کو کروٹ لیتے دیکھا تو آگے بڑھ کر مئی خالہ کی پیشانی چوم لی۔ انہیں بانہوں میں لیا اور اپنے ساتھ لیے لیے گھر میں داخل ہو گئیں۔

نور ہکا بکا جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی تھی۔

”یہ کیا بات ہوئی بھلا۔“ اس گھنی تاریکی میں وہ تنہا، بے بار و مددگار کھڑی رہ گئی تھی اور کسی نے اسے جھوٹے منہ بھی ساتھ آنے کو نہیں کہا۔ پلٹ کر دیکھا تک نہیں۔ اسے شدید غصہ آ رہا تھا یا شاید رونا بھی۔ چند لمحے منتظر رہی، کوئی آئے اور اسے بھی ساتھ لے جائے۔۔۔ مگر۔۔۔

”مجھے سے تو خدا واسطے کا بیر ہے انہیں ہمیشہ سے۔ یوں ہے تو یونہی سہی۔ اب مر کے بھی ان کے گھر میں قدم نہ رکھوں گی۔“ ہاتھ میں پکڑا سوٹ کیس ایک دھماکے سے زمین پر گر آیا، اینٹ تلاش کی اور پوری قوت سے دروازے پر لگے تالے پر دے ماری۔ غصہ تو پہلے ہی بہت تھا، سو پہلی ضرب ہی کا رگرتا بیت ہوئی تھی۔ تالا اٹھا کر دور پھینکا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔

☆☆☆

سرسراتی ہوا کے ساتھ جاسن کا پتا لہراتا ہوا فرش پر گرا تو یہ نرم سی آہٹ اسے چونکا گئی تھی۔ کئی لمحے یونہی کھڑے کھڑے بیٹا دیے تھے اس نے۔ بہت کچھ یاد آ رہا تھا۔ سب سے بڑھ کر ابا میاں۔

برے بھلے جیسے بھی تھے، اب یاد آ رہے تھے۔ وہ زندہ ہوتے تو آج یہ گھریوں اجاڑ، ویران نہ ہوتا۔ گھر کے کسی نہ کسی گوشے میں کوئی دیا ٹمٹما ہی رہا ہوتا۔ وہ اداس اداس سی آگے بڑھی برآمدہ پار کیا۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندازے سے آگے بڑھنے لگی۔ سامنے کی دیوار میں طاق تھا، جہاں ہمیشہ ایک دیار کھا ہوتا تھا۔ باورچی خانے سے مارجس بھی یقیناً مل ہی جاتی۔ آگے بڑھتے ہی اچانک ہی ٹھوکر لگی تھی۔

وہ بے اختیار ہی سسک کر رک گئی۔ پیر کے انگوٹھے کو دبا یا۔ جب تک درد کم نہ ہوا، یونہی کھڑی رہی پھر آگے بڑھنے کو تھی جب عقب میں ہلکی سی آہٹ ابھری۔ بے اختیار ہی پلٹ کر دیکھا، تبھی روشنی کا جھماکا سا ہوا اور اگلے ہی پل سارا کمر اسفید روشنی سے بھر گیا۔ اتنی تیز روشنی کہ آنکھیں چند ہی سیکنڈ میں۔ بس ایک لمحہ لگا تھا کھینچنے میں۔

”یہ میں کہاں آگئی ہوں۔“ مارے گھبراہٹ کے اس نے آنکھیں پھیلا پھیلا کر دیکھا۔ سارا سامان تو وہی تھا پھر۔۔۔ ناچھی کے عالم میں باہر بھاگی۔ سامنے ابا میاں کا کمر ابھی روشن تھا مگر خالی۔۔۔ بھی باورچی خانہ جھلما لیا۔
”کون ہے؟“ وہ زور سے چلائی۔

عجلت میں باورچی خانے کی طرف بڑھی۔ کسی سے ٹکراتے ٹکراتے بجی تھی۔ خوف کے مارے جسم میں سے جان نکل گئی تھی۔ دروازے کے پٹ سے لگی تھر تھرا کا پتی دیکھتی رہی۔
تیز تیز چلتی ہوئی سانس، حیرت سے پھٹی آنکھیں، خوفزدہ چہرہ۔ سامنے کھڑا شخص اس کی کیفیت پر ذرا سا مسکرایا تھا۔

”کسک۔۔۔ کون ہو تم۔۔۔“ اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔

”کمال ہے میں تو سمجھا مجھے پہچان کر یہ حالت ہوئی ہے۔“ وہ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پلٹا۔

”چائے پیو گی؟“ آواز کی نرمی، لہجے کی خوب صورتی۔

”یہ۔۔۔ یہ آواز۔۔۔“ پہلی بار وہ روشنی میں اس کے سامنے تھا۔ بے یقینی سے دیکھتی رہ گئی۔

”ایاز۔۔۔ ایاز نام ہے میرا۔“ نہایت آرام سے اطلاع دے رہا تھا۔ اپنے کام میں مگن۔۔۔ مصروف۔۔۔ ڈبے کھولتا۔۔۔ بند کرتا۔۔۔ کپ نکالتا ہوا۔۔۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے کو بھی۔
”اونہوں سن بھل کے۔“ اس نے اسٹول گھسیٹ کر سامنے رکھا۔

”تم یہاں کیسے؟ کب سے؟“ وہ ہکلائی۔
”کافی دن ہو گئے، تم نے دیکھا نہیں، میں نے گھر کا نقشہ بدل کر رکھ دیا ہے۔“ وہ شوخی سے بولا پھر ٹرے اٹھائی۔

”آؤ وہاں بیٹھتے ہیں۔“ وہ اسے ابا میاں کے کمرے میں لے آیا۔ یہاں ترتیب بدلی ہوئی تھی۔ کرسی میز کا اضافہ ہو گیا تھا۔ دو کپ چائے اور بسکٹوں سے بھری پلیٹ درمیان میں میز پر رکھ کر وہ موڑ ہاٹھیت کر اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔

”تم اتنی پریشان کیوں ہو۔۔۔ او۔۔۔ ہو، کہیں تم اس دن والے واقعے کی وجہ سے۔۔۔
 بھی میرا یقین کرو، وہ حرکت میں نے نہیں۔۔۔“
 ”میں جانتی ہوں۔“ وہ جلدی سے کہہ گئی تو اس نے قدرے سکون کا سانس لیا۔ ”میں تو
 صرف یہ سوچ رہی تھی کہ۔۔۔“
 ”میں یہاں کیسے موجود ہوں۔“ اس نے خود ہی نور کی بات مکمل کی پھر اپنے کپ میں سے
 چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے دوسرا کپ اس کے سامنے کھسکا دیا۔
 ”چائے پیو، بہت مزے کی بنی ہے۔“

اس نے ایک نظر چائے کے کپ پر ڈالی اور پھر الجھ کر اس کی سمت دیکھ گئی۔
 ”یہ سب منی خالہ کی عنایت ہے۔“ وہ اس کی حد درجہ بے چینی بھانپ گیا تھا۔ ”اس رات
 جب خواجہ خواجہ پر شک کرتے ہوئے گھر کے سب افراد مجھے گھر سے نکالنے کے درپے تھے، منی
 خالہ انتہائی غصے میں میرے سامنے آکھڑی ہوئی تھیں۔ میں نے ان کے سامنے اس الزام کو رد کرنا
 چاہا مگر ان کا مارا گیا پھپر۔۔۔ اف۔۔۔ میں جیسے آسمان سے زمین پر آگرا تھا۔ میں بے یقینی سے
 انہیں دیکھ گیا۔ تب انہوں نے مجھے جھجھوڑ ڈالا تھا، مجھے گالیاں دی تھیں۔ مجھے کوسا تھا، برا بھلا کہا
 تھا۔۔۔ پھر اسی غصے کے عالم میں انہوں نے مجھ سے ہاتھ دھکے دیتے ہوئے گھر سے باہر نکال دیا تھا۔ جس
 وقت میرے قدم اس گھر کی دہلیز سے باہر نکلے، اس لمحے ان کا ہاتھ میرے ہاتھ تک آیا اور جب
 میرے عقب میں گھر کا دروازہ زوردار طریقے سے بند ہوا، میں ہاتھ میں پکڑی چابوؤں کو دیکھتا رہ
 گیا تھا۔ بہت دیر تک میں سمجھ نہیں پایا اور جب جانا، تو مجھے لگا۔۔۔ میں ابھی بھی پہلے جیسی بلندی پہ
 کھڑا ہوں۔ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں سرکا۔ منی خالہ کو مجھ پر اعتبار تھا، یقین تھا۔ بس اس کے
 علاوہ مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ ایک ہفتہ اپنے دوست کے ہاں رہا، امتحان مکمل کیا اور پھر یہاں چلا
 آیا۔ بیرونی دروازے کی چابی واپس بھائی سے مل گئی تھی۔“ اس نے لمبا سا گھونٹ لے کر اپنی چائے
 ختم کی۔

”تو منی خالہ کو اس وقت بھی علم تھا کہ۔۔۔“ اس نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔
 ”جب میں اس گھر میں آیا تو مجھے بہت عجیب سا لگا تھا۔ اس گھر سے، اس کے کیمینوں سے میں
 نے بہت نفرت کی تھی۔ در بدری، پائمالی، ٹھوکر س، مار پیٹ، تنہائی، طعنے، سب اسی گھرانے کی
 دین تو تھے۔ ہو سکتا ہے حالات کچھ اور ہوتے، اگر میری ماں زندہ رہتی تو۔۔۔ لیکن وہ مر گئی
 اور اس کی موت کا ذمہ دار بھی میں ہی ٹھہرا۔ اس گھر میں مجھے ہمیشہ عاطف کا بیٹا کہہ کر پکارا
 گیا۔ میری ماں کو سب فراموش کر گئے۔ وہ مجھے یتیم کہتے تھے مگر میں پر یقین تھا ایک دن میرا
 باپ آئے گا، مجھے یہاں سے لے جائے گا۔“

میں انتظار کرتا رہا۔ اس گھر کو اپنی یادوں میں آباد رکھا۔۔۔ کہ یہ گھر میرا تھا، اپنی عمر کے
 سات سال گزارے تھے میں نے یہاں۔ وقت گزرتا رہا، انتظار ناامیدی میں بدل گیا، یاد، نفرت
 میں ڈھل گئی۔ میں دن رات محنت، مزدوری، مشقت کر کے خود کو پالتا رہا۔ کاؤنٹس کی تعلیم بہت
 مہنگی تھی مگر میں نے ناممکن کو ناممکن کیا۔ کارخانوں، فیکٹریوں، بھٹوں، منڈیوں میں سرکھپایا۔

اور پھر۔۔۔ بھوپھو وہاں آگئیں۔ یعنی تمہاری منی خالہ۔۔۔ میں ان سے بھی نفرت کرتا تھا۔
 کرتے رہنا چاہتا تھا مگر معلوم نہیں کیوں میرا دل اسے آس پاس رہنے والوں کی طرح ظالم اور
 کٹھور نہ بن سکا۔ منی خالہ نے میرا بہت خیال رکھا۔ بالکل یوں جیسے کوئی ماں اپنے ننھے بچے کا خیال
 رکھتی ہے۔ وہ چند دنوں میں میرے معمولات میں اس طرح شامل ہوئیں کہ میں حیران رہ گیا تھا۔
 ان کی محبت میں ایک جادوئی اثر تھا۔ وہ بات بہت کم کرتی ہیں، ساری گفتگو ان کی خاموشی میں ہوتی
 ہے۔ انہوں نے کبھی میرے لیے پیار محبت جتنا نہیں، بس ان کا عمل خود بخود ثابت کر دیتا تھا۔ میں
 رات گئے دیوار پھلانگ کر گھر آتا تھا۔ وہ بغیر کبے دروازہ کھولنے کے لیے جاگتی رہتیں۔ میرا کھانا
 پینا، پہننا اوڑھنا، سب ان کی ذمہ داری بن گیا۔ میرا دل چاہتا تھا میں گھنٹوں ان کے پاس بیٹھوں
 اور بس اپنی ہی کہتا رہوں۔ وہ سب جو اتنے سالوں سے میرے اندر جمع ہے۔ وہ ان کے سامنے
 کھول کر رکھ دوں لیکن کبھی اتنا وقت ہی نہیں مل سکا۔ وہ اپنے دھندوں میں الجھی رہیں، میں اپنے
 مسئلے نبھاتا رہا اور پھر ان کی محبت مجھے یہاں بھیج لائی۔“
 وہ بات کرتے کرتے کہیں کھوسا گیا تھا۔ نور نے اس سارے وقت میں پہلی مرتبہ نگاہ اٹھا کر
 اسے دیکھا۔

سوچ میں ڈوبی ہوئی گہری، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اس خاندان کی میراث تھیں۔ سیاہ بال،
 گوری رنگت، دلکش نفوش۔۔۔ سرمئی سوٹ پہنے بہت ہی عام اور سادہ حلیے کے باوجود اس قابل تھا
 کہ ہر کوئی اسے کچھ دیر تک دیکھتے رہنے کی خواہش کرتا۔
 نور نے طویل سانس لے کر نظر اس پر سے ہٹائی اور پلیٹ میں سے لسکٹ اٹھا کر دانتوں سے
 کترنے لگی۔ تب وہ ذرا سا چونکا۔ اسے دیکھا پھر جانے کیا سوچ کر مسکرایا۔ مسکرانے کا انداز
 بالکل منی خالہ جیسا تھا۔ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ گویا مسکراہٹ کا مفہوم جانا چاہتی ہو۔
 ”ایک دفعہ منی خالہ نے بہت عجیب سی بات کہی تھی۔ میں اپنے مستقبل کی ترقی کے ہزار نقشے
 ان کے سامنے کھینچ رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھتی رہیں پھر کہنے لگیں۔ معلوم نہیں تم اسے میری خود غرضی سمجھو
 گے یا کچھ اور۔۔۔ لیکن مجھے لگتا ہے تم صرف نور کے لیے بنے ہو۔“ وہ کہہ کر خاموش ہو گیا تھا۔
 بالکل غیر متوقع بات تھی، نور کے ہاتھ سے لسکٹ چھوٹ گیا۔

”ہاں اس وقت میری بھی یہی حالت تھی۔“ وہ ہنستے ہوئے اٹھ گیا۔
 ”جائے تو ٹھنڈی ہوگئی لیکن اب گرم میں نہیں، تم خود کروگی۔“
 وہ پلنگ پر سے کپڑے اٹھا کر کھوٹی پر لٹکانے لگا۔ جبکہ وہ ابھی تک اس کی کچھ دیر پہلے کی کہی گئی
 بات کے زیر اثر ساکت بیٹھی تھی۔

”جب میں یہاں آیا تو یہ گھر بہت بے آباد، ویران تھا۔۔۔ مجھے ذرا اچھا نہیں لگا۔ حالات و
 واقعات جو بھی رہے ہوں، یہ میرا آبائی گھر ہے۔ میں اسے ہر حال میں آباد، ہنستا بستا دیکھنا چاہتا
 ہوں اگر تم تھوڑا سا ساتھ دے دو تو میرا خیال ہے یہ زیادہ جلدی اور آسانی سے ہوگا۔“ وہ بڑی
 لا پرواہی سے کہتے ہوئے چپل پہن رہا تھا۔ نور سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

”اور۔۔۔ اور منی خالہ کا کیا ہوگا۔۔۔ وہ بانگے خالو۔۔۔“ اس نے گہرا کر پوچھا۔

”تمہارے خالو سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل نہیں ہوگا۔ منی خالہ کو ایک ساتھی مل گیا ہے جو ان کی ساری مشکلات آسان کر دے گا پھر ہم بھی تو ان کے ساتھ ہیں۔ لیکن تم سے ابھی تک چائے کا ایک کپ تو ختم نہیں ہوا۔ حد ہے بھی سستی کی۔ تالا توڑنے میں تو بہت جلدی کی، وامق بھائی کے گھر میں بیٹھا تھا اس وقت، پانچ منٹ منی خالہ سے ملنے میں کیا لگ گئے محترمہ سب سامان باہر پھینکے تارک کمرؤں میں ٹھوکریں کھائی پھر رہی تھیں۔ ایک ذرا سا بن دبانے کی زحمت کر لیتیں تو۔۔۔“

اس نے ٹھنڈی ٹھار چائے سے بھرا کپ اس کے سامنے سے اٹھاتے ہوئے کھلی آنکھوں میں جھانکا اور چپل گھسینا باہر چل دیا۔ وہ جو پچھلے کئی منٹ سے منہ بند کیے صرف اسے دیکھ اور سن رہی تھی، اس کے باہر نکلتے ہی بندھی پر چہرے جمائے مسکرانے لگی۔ لمحہ بہ لمحہ گہری ہوتی ہوئی مسکراہٹ آئی۔ سارا گھر روشن تھا۔ اس کا اپنا چہرہ بھی اندرونی خوشی سے دھک رہا تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر جگر جگر کرتے کمرے کے دروازے پر دیکھا۔

”گھر تو تم نے آباد کر لیا ہے ایاز! یہ دل بھی۔۔۔ مجھے تو صرف تمہارا ساتھ دینا ہوگا۔ اجالوں کی بستی میں پھول کھلانے کے لیے، دائمی محبت کے رنگ بھرنے کے لیے۔۔۔“ وہ کرسی کھسکا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ابامیاں اپنے پلنگ پر بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ وہ بھی جواباً مسکرائی اور پھر گنگنائی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی۔

وسدے رہیں اجاڑاں دے وچ دیوے بالن والے

☆☆☆☆☆☆

چاندنی میں نہائی رات

بجلی بہت زور سے کڑکی تھی۔ دوستوں پر ڈالی گئی چھت کے نیچے تخت پر سوئی ماہین کچی نیند سے بڑبڑا کر جاگئی تھی۔ اس ہیبت ناک ماحول نے اسے اتنا سہا دیا تھا کہ چند لمحوں کے لیے وہ گنگ سی پٹیشی رہ گئی تھی۔ سرمئی شام سیاہ بادلوں سے ڈھکے آسمان میں کہیں کھڑکی تھی اور خوفناک سی تاریکی چہار جانب سے اسے اپنے گھیرے میں لے رہی تھی۔ دھواں دھار برستی ہوئی ناپیدہ بارش اور پُر زور گرج سے ماحول کو مزید وحشت ناک کر دینے والے بادل، بجلی ایک بار پھر کڑکی تھی۔ بہت تیز روشنی کی آڑی تر چھٹی لکیر آسمان کے سیاہ بدن پر نمودار ہوئی تو وہ پوری لرز گئی تھی۔

”اماں!“ اس نے پوری قوت سے پکارا تھا مگر آواز یہیں کہیں پہنچا کرتی ہوئی ہوا میں جک پھیریاں کھا کر کم ہوتی چلی گئی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے ارد گرد دیکھنا چاہا، یہ اس کا اپنا گھر نہیں تھا۔ وہ پہچان گئی تھی۔

”یہ کون سی جگہ ہے؟“ اسے بری طرح رونا آ گیا۔ تب ہی اس کی نظر میڑھیوں کی طرف لگی جہاں لکڑی کا چھوٹا سا دروازہ ہوا کے زور سے بار بار کل کر بند ہو رہا تھا اور اسے ایک دم ہی یاد آ گیا کہ وہ اپنے نانا ابو کے گھر میں تھی۔ شام کو جب سب بچے چھت پر کھیلنے کے لیے آئے تھے تو وہ بھی ان کے ساتھ اوپر چل آئی تھی۔ یہاں ایک ہی بڑا سا کمر تھا جس کے دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا اور اس کمرے کے ساتھ یہ برآمدہ جس میں پچھلے سال خوردہ تخت پر اونگھی لیٹی وہ بچوں کو کھیتے ہوئے دیکھتی رہی تھی مگر ان کے کھیل میں حصہ لینے پر آمادہ نہ ہوتی تھی۔ دو روز ہو گئے تھے اسے یہاں آئے ہوئے مگر ابھی تک وہ کسی سے کھل مل نہ پائی تھی۔ بے حد شرارتی، جھگڑالو، شیطان نما بچے اسے ایک آنکھ نہیں بھائے تھے پھر دوستی کیسے ہوئی، وہ بس تخت پر لیٹی ان کے عجیب و غریب قسم کے کھیل دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتی رہی تھی۔ آسمان

پر اس وقت بادل چھائے ہوئے تھے اور خوشگوار ہوا بہت بھلی لگ رہی تھی۔ شروع میں دو چار بڑے بڑے چھینے گرتے تو بڑے ماموں کا لمبا ساجھ ایک دم ناچ اٹھا تھا۔
 ”ارے یہ دیکھو اٹھنیاں گر رہی ہیں، ارے یہ دیکھو چونیاں۔“ وہ پانی کے ہر قطرے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی بانی بچے بھی اسی کھیل میں لگ گئے۔

کوئی اٹھی ہاتھ میں لینے کو دیوانہ ہوا تو کوئی چونی کے پیچھے بھاگتے بھاگتے گھنے چھیل بیٹھا۔ اس بے تکے کھیل سے خواخواہ ہی چڑ کر اس نے منہ پھیر لیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد آوازیں آتی بند ہو گئی تھیں۔ اس نے بازوؤں پر رکھا ہوا سر اٹھا کر ذرا کی ذرا دیکھا، بارش پوری طرح نہیں آئی تھی اور اب دن بھر کی جلتی پلتی چھت نے بارش کے کچھ قطروں کو اس طرح جذب کیا تھا کہ ان کا نام و نشان بھی نہ رہا تھا۔ اس نے آسمان پر مزید گہرے ہوتے بادلوں کو دیکھا اور پھر بازوؤں میں منہ چھپا کر لیٹ گئی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اسے دھیرے دھیرے تھپک رہے تھے اور پھر اسے معلوم ہی نہیں ہوا کہ کب اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں اور کب بارش نے زور پکڑ لیا اور اب اس کی آنکھ کی تو کچھ بھائی ہی نہ رہا تھا۔

”اماں!“ اس نے پہلی سسکی بھری اور ڈرتی کا پتلی تخت سے نیچے اتر کر زینے کی طرف بھاگی تب ہی بادل بہت زور سے گر جاتا تھا، اس نے ایک تیز چیخ ماری اور صحن کے عین وسط میں رک گئی۔ ننھا سادل دھڑک دھڑک کر اس کی سانسیں اٹھل پھٹل کیے جا رہا تھا۔ بادلوں کی گرج کھیں دور تھا کہ گہرائیوں میں دفن ہو گئی تب اس نے بدقت اپنے سر اٹھایا اور ہوتے وجود کو حرکت دی تھی۔ زینے تک پہنچی ہی تھی جب تیز ہوا سے جھولتا ہوا دروازہ ٹھک سے اس کے اوپر آگیا، وہ لڑکھڑا کر گری۔ چند لمحوں کے لیے گلا پھاڑ کر چیخی اور پھر دیوانہ وار دروازہ کھول کر نیچے کی طرف لپکی۔ پہلی سیڑھی پہ قدم رکھتے ہی اس کی نظر صحن میں سیڑھیوں کے برابر لگے پیری کے درخت پر پڑی۔ جو کسی دیو کی مانند اسے اپنی گرفت میں لینے کے لیے اس کی طرف جھکا آ رہا تھا۔

”اماں، اماں۔“ وہ چیختے چیختے ٹڈھال ہو گئی مگر اس کی مہین آواز اس طوفانی بارش سے بچنے کے لیے کمرے میں بند افراد کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر پاتی تھی۔ بارش کا پانی اس کی آنکھوں میں گھسا چلا آ رہا تھا۔ اس پر گھپ اندھیرے میں بڑی بڑی سیڑھیاں اترنا بھی دشوار تھا۔ ہر جھٹکے پر یوں لگتا جیسے وہ ابھی سیڑھیوں پر لڑھک جائے گی۔ تب ہی آخری سیڑھی سے کوئی سایہ سامو دار ہوا تھا اور کسی جن بھوت کی طرح اوپر ہی اوپر چلا آ رہا تھا۔ وہ دونوں مٹھیاں زور سے بٹختی کراس قوت سے چلائی تھی کہ اپنے ہی کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہونے لگے تھے۔ سایہ اس کے بے حد نزدیک آ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ خوف کے مارے اس کا دل پھٹ جاتا اور وہ اپنے ہوش و حواس کھو کر سیڑھیوں پر گر جاتی، اس سائے نے اپنے بازو پھیلا کر اسے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔

”درومت گزرا! آؤ اماں کے پاس چلتے ہیں۔“ بہت ہی نرم مگر غیر مانوس انسانی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی مگر اندھیرے کے سبب خدو خال واضح نہ ہو سکے۔ بادل ایک بار پھر گر جاتا تھا۔ بارش کی شدت میں اضافہ ہو گیا تو اس کی پیچ کی ایک بار پھر بندھ گئی۔ تاہم دل کچھ ٹھہر سا گیا تھا۔ آنے والا اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں تھا۔ سنبھل سنبھل کر سیڑھیاں اتر رہا تھا اور مایہن نے اپنے بازوؤں سے اس کی گردن کو بری طرح جکڑ رکھا تھا۔

”ہائی اماں۔۔۔! ہائی اماں! دروازہ کھولے۔“ لمبا صحن عبور کرنے کے بعد وہ زیرو پاؤر کے بلب کی روشنی میں برآمدے میں کھڑا ہوا دروازہ پیٹ رہا تھا جبکہ وہ اس کے شانے میں منہ گھسائے ابھی تک روئے چلی جا رہی تھی۔

”روؤ مت مایہن! تمہیں کچھ نہیں ہوا، اچھے بچوں کو کسی چیز سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔“ وہ تسلی آمیز لہجے میں اس سے کہہ رہا تھا مگر اس کے رونے میں کوئی کمی واضح نہ ہوئی۔

تب اس نے پہلے سے بھی زیادہ قوت سے دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ یہ بڑے کمرے کا دروازہ تھا جہاں رات گئے تک اہل خانہ نشست جمائے بیٹھے رہتے تھے۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھل گیا۔ یہ بڑے ماموں تھے جو انہیں دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے تھے۔

”ارے مایہن، یہ۔“ انہوں نے فوراً سسکی ہوئی مایہن کو گود میں لیتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”شاید یہ اور تھی، میں نے اسے سیڑھیوں پر چلا تے ہوئے دیکھا تو۔“ بڑے ماموں اس کی بات سننے بغیر واپس پلٹ گئے تو وہ بھی چپ سا ہو کر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ اماں نے کمرے میں اس کے رونے کی آواز سنی تو وہ بھلائی چلی آئیں۔ بارش سے بھیگی کا پتلی مایہن کو دیکھا تو بجائے اسے چپ کروانے کے خود ہی رونے بیٹھ گئیں۔

”میں تو بے فکر تھی کہ بچی اپنوں کے درمیان ہے۔ سو پوچھنے والے، سودیکھنے والے ہیں مگر یہاں کس کو فکر ہوگی، سب نے اپنے بچوں کو پکڑ دھکڑ کر کمروں میں بٹھالیا۔ ایک میری سیم پچی اس طوفانی بارش میں بچانے کہاں خوف سے دنگی رہی۔“

اماں کو اپنی بیوی کے بعد بھائیوں کے در پہ آ پڑنے کا شدت سے احساس تھا اور اسی احساس نے انہیں حد سے زیادہ حساس اور زور درنچ بنا دیا تھا۔

”ایسی بات نہیں فریدہ! تم سر شام ہی سونے کے لیے کمرے میں چلی گئیں تو ہم سمجھے شاید مایہن بھی تمہارے ساتھ ہوگی ورنہ ہم تو اپنے بچوں سے بڑھ کر اس کا خیال رکھتے ہیں۔ تم خواخواہ دل خراب مت کرو، مایہن خوفزدہ ہے اسے کمرے میں لے جا کر دلاسا دو۔“ بڑی ممانی نے رساں سے انہیں سمجھایا۔

”نیند کس کا فر کو آتی ہے، اب تو دل چاہتا ہے خود بھی کچھ کھا کر سو رہوں۔ اگر مایہن کا خیال نہ ہو تو۔“

وہ خود کھانے کے انداز میں کہتی مایہن کو گود میں اٹھائے کمرے میں چلی گئیں اور اسے اپنے ساتھ لٹا کر تھکنے لگیں۔ مایہن نیم غنودگی کے عالم میں پچکیاں لیتی رہی اور اماں کی میٹھی میٹھی میں جکڑے جانے کس وقت دوبارہ اس کی آنکھ لگ گئی تھی پھر اس کے بعد وہ جتنی بار بھی اٹھی، گھر کے سب افراد کو پریشان چہروں کے ساتھ خود پر جھکے پایا تھا۔ ایک دو بار بازو میں سوئی کی سی تیز چبین کا بھی احساس ہوا، وہ درد سے تڑپی چلائی اور پھر غافل ہو گئی۔ کئی دن بعد طبیعت سنبھلی تو معلوم ہوا، اتنے دن وخت بخار میں بھٹکتی رہی تھی۔

اس طوفانی بارش نے اس بچی کو اچھا خاصا ہراساں کر دیا تھا اور اب بخار اترنے کے بعد بھی کمزوری اتنی تھی کہ وہ خود سے اٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتی تھی۔ کڑوے کڑوے سیرپ پینے کے بعد کچھ کھانے

کودل نہ چاہتا۔ اماں مٹیں کر کر کے تھک جاتیں تب بڑے ماموں آجاتے۔ ان کی ذرا سی ڈانٹ ڈپٹ سے ماہین کی جان نکل جاتی۔ ان کے رعب و دبدبے کے سامنے سارے انکار دم توڑ جاتے وہ جہاں تک ہو سکتا دل پہ جبر کر کے دلیہ، کھجور کی نلکتی پھر آنسوؤں سے لبالب بھری آنکھوں میں التجا سیٹے ماموں کی طرف دیکھتی تو ان کا سارا جادو و جلال رفع دفع ہو جاتا۔ ہونٹوں پہ شفقت آمیز مسکراہٹ نمودار ہوتی اور پھر وہ جھٹ سے اسے اپنی گود میں بٹھالیتے۔

”ہماری مانو کہانی سنے گی؟“ ان کے پوچھنے پر وہ اثبات میں سر ہلا دیتی اور بڑے ماموں کوئی بہت ہی مزے داری کہانی اسے سناتے لگتے۔



کمرے میں پڑے پڑے دل اچاٹ سا ہونے لگا تو وہ اٹھ کر باہر چلی آئی۔ اماں برآمدے میں تخت پر منہ سر لپیٹے پڑی تھیں۔ ماہین نے ان کے قریب جا کر آہستگی سے انہیں پکارا انہوں نے منہ سے دوپٹہ ہٹا کر اپنی سرخ متورم آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اپنے پاس بٹھا کر اس کی پیشانی کو چومے اور پھر ایک آہ بھرتے ہوئے دوپٹہ دوبارہ سے چہرے پہ تان لیا۔ وہ ان کے پاس بیٹھی بے زاری سے ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ بڑی ممانی سبزی بناتے ہوئے ٹکی بوا کو دوپٹہ کے کھانے کی ہدایات دے رہی تھیں۔

وہ کچھ دیر ٹکرائن سب کو دیکھتی رہی۔۔۔ چھوٹی ممانی آج بہت اکتائی ہوئی لگ رہی تھیں۔ اسی لیے بار بار اپنے بچوں کو جھڑک رہی تھیں۔ وہ تنگ آ کر وہاں سے اٹھ گئی اور پھر برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر پائیں باغ میں چلی آئی۔ یہاں کونے میں دھری میز پہ بجہ خالہ کی کتابیں اور نظر کی عینک موجود تھی مگر وہ خود غائب تھیں۔ ماہین ان کی کرسی پہ بیٹھ کر ایک کتاب کے درق گتے لگی پھر ان کی عینک اٹھا کر ناک پہ جماتے ہوئے اس نے کتاب پڑھنے کی کوشش کی مگر کتاب ہاتھوں سے پھسل جاتی تھی اور عینک ناک پر سے۔ چند لمحوں تک خود کو بجہ خالہ محسوس کرتے ہوئے وہ اکتائی تو دونوں چیزوں کو ان کی جگہ پر رکھ کر آرم کے درخت کی کھنی چھاؤں میں آکر لیٹ گئی۔ حالیہ بارشوں نے موسمِ قدرے خوشگوار کر دیا تھا۔ سبک ہوا کی چھیر خانی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ وہ سبز گھاس پر لیٹی درختوں پر کودتی، شور مچاتی چڑیوں کو دیکھنے لگی۔

”یہ والا باغ تو بہت چھوٹا ہے، چڑیاں بھی تھوڑی سی ہیں۔ ہمارے گھر والا باغ کتنا بڑا تھا اور اس میں کتنے ڈھیر سارے درخت تھے، چڑیاں تو ایسی رنگ برنگ ہوتی تھیں کہ۔۔۔“

”ارے ماہین گڑیا ادھر بیٹھی ہے؟“ کوئی اس کے قریب آکر بولا تھا اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ دس گیارہ سال کا لڑکا تھا۔ چہرے پہ پھر پور دوستانہ مسکراہٹ لیے وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”پتا نہیں کون ہے؟“ اس نے گھاس کا تنکا منہ میں ڈال کر سوچتے ہوئے اپنا رخ پھیر لیا جبکہ وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا۔

”مجھے پہچانتی ہو؟“ وہ بہت امید سے پوچھ رہا تھا۔ ماہین نے ایک نظر دوبارہ اسے دیکھا اور پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

”اچھا۔“ وہ خواہواہ ہی ہنسا۔

”اس دن رات کو بارش ہو رہی تھی ناں۔ تم چھت پہ ڈر گئی تھیں کسی نے بھی تمہارے رونے کی

آواز نہیں سنی تھی۔ میں کھڑکی بند کرنے کے لیے اٹھا تھا۔ بجلی چمکی تو اس کی روشنی میں مجھے تمہارا سایہ سا نظر آ گیا۔ پھر میں ہی نہیں اماں کے پاس لے کر گیا تھا۔“ وہ فخریہ انداز میں بتا رہا تھا۔ ماہین کو ایک دم سے یاد آ گیا مگر بولی کچھ نہیں۔

”تمہیں بارش سے ڈر لگتا ہے کیا؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔ ماہین نے جھٹ سے نفی میں سر ہلا دیا تو وہ اس کے صاف جھوٹ بولنے پر بے اختیار ہنس دیا تھا۔ ماہین شرمندگی سے سمجھنے کے لیے سر اٹھا کر اوپر دیکھنے لگی۔ درخت کے گتے پتوں سے چھن چھن کر آتی روشنی کی کرنیں عجب کھیل، کھیل رہی تھیں وہ دلچسپی سے انہیں دیکھنے لگی۔

”تم کو یہ گھر کیسا لگا ماہین؟“ اس کے دوبارہ بولنے پر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی اور کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔

”اچھا ہے مگر۔“

”مگر۔۔۔؟“

”ہمارے والا گھر زیادہ اچھا تھا۔“ وہ دل کی بات کہہ گئی۔

”کیا واقعی؟“ وہ حیران ہوا تھا۔

”ہاں سچ وہ گھر تو بہت اچھا تھا، بہت پیارا۔“ وہ اب اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”اور وہاں کے درخت اتنے اونچے تھے کہ مالی بابا کا بیٹا ایک درخت پر چڑھا تو اللہ تعالیٰ سے ہاتھ ملا کر واپس آیا تھا۔“ وہ پرجوش معصومیت سے اسے بتا رہی تھی۔ اس نے لب لہجہ کراہتی بے ساختہ مسکراہٹ کو بمشکل روکا۔

”تمہیں کس نے بتایا؟“

”مالی بابا کے بیٹے نے بتایا تھا۔“

”اچھا اور کیا کیا تھا وہاں؟“ وہ دلچسپی سے پوچھ رہا تھا۔

”وہاں کیاریوں میں پھول ہوا کرتے تھے ہر رنگ کے، وہاں میوے ویل بھی تھا اور میرے دوست بھی۔“ وہ ایک دم بجھ گئی تھی۔ اسے اپنا گھر بہت یاد آ رہا تھا۔

ابا پیچرز ٹریننگ کالج میں پڑھاتے تھے اور اسی کالج کے ایک کونے میں کھڑے تین کوارٹرز میں سے ایک کوارٹر میں وہ لوگ رہا کرتے تھے۔ دو پختہ کمرے، کچن، باتھ روم اور کھلا ساجن، کہنے کو بس یہ ہی ان کا گھر تھا مگر وہ تو پورے کالج کو اپنی ہی ملکیت سمجھا کرتی تھی۔ جو بھی کالج میں پڑھائی کے اوقات ختم ہوتے کالج میں ملازمین کے بچوں کا راج ہوتا۔ وہ سب لوگ ایک ٹولی کی شکل میں اپنے گھروں سے باہر آجاتے۔ پھر وہ ہوتے اور کالج کا وسیع و عریض احاطہ ہوتا۔ جہاں ہر قسم کے پھل دار درخت تھے اور کیاریوں میں ہر رنگ کے چھوٹے بڑے پھول۔ بڑے بچے درختوں پر چڑھ کر پھل گراتے اور چھوٹے بچے پھلوں سے اپنی جھونپیاں بھر لیتے۔ پھر سب مل کر میوے ویل کی طرف جاتے، وہاں رگڑ رگڑ کر پھل دھوئے اور مزے لے لے کر کھاتے۔ ٹاپلی کی مضبوط شاخوں پر مالی بابا نے ان کے لیے ایک پینک بھی ڈال رکھی تھی۔ لڑکیاں جی بھر کے جھولا جھولتیں اور لڑکے چھپا چھپ میوے ویل کے پانی میں نہاتے۔ شام گئے تھک ہار کر گھر کو واپسی ہوئی اور گرمیوں کی سخت دوپہروں، ٹپس زدہ شاموں کے بعد وہ سرسراہٹ

ہوا میں کھلے آنگن میں اماں کے ساتھ لیٹی تھی تو نیند کیسی خوبصورت آیا کرتی تھی سردیوں کی کپکپاتی صحوں کے بعد کالج کے گراؤنڈ سوپ سے بھر جاتے تو وہ اپنے سارے کھلونے اٹھا کر وہاں چلی آتی تھی کیسے مزے کے دن ہوتے تھے۔ وہ اپنی جگہ چپ چاپ لیٹی اپنے ایک ایک دوست کے بارے میں سوچتی رہی۔ مالی کا موٹا سا بیٹا۔ جسے وہ سب ”گوگٹو“ کہتے تھے۔

چوکیدار کی زرد چہرے والی بیٹی جس کا نام انہوں نے ”ہلدی“ رکھ چھوڑا تھا۔ اور لیبارٹری اسٹنٹ کی بیٹی ”جھنڈی“ جو اپنا نام سن کر لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتی تھی اور اس کا پستہ قد بھائی ”کوڈو“۔

”یہ تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟“ غصیلی آواز نے سوچ میں گم ماہن کو بری طرح چونکایا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ نجمہ خالہ سرخ چہرہ لیے اس کے سر پہ کھڑی تھیں اور اس لڑکے پر ناراض ہو رہی تھیں جس کے نام سے وہ ابھی تک ناواقف تھی۔

”اول نمبر کے ڈھیٹ انسان ہو تم۔۔۔ تم اس قابل ہی نہیں کہ کوئی ذمہ داری تمہیں سونپی جائے۔“ اس نے کئی بار کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر نجمہ خالہ اسے کوئی موقع دینے کے لیے تیار نہ تھیں۔ ”کھا کر حرام کرنا تو تمہاری گھٹی میں پڑا ہے۔ مفت خوری کی عادت نے تمہیں محنت کے نام سے ہی بے زار کر دیا ہے مگر اتنا تو بتاؤ کہ بازار تک جانے میں کتنے ہل جوتے پڑتے ہیں تمہیں۔“

اس نے پھر کچھ کہنا چاہا مگر نجمہ خالہ کی قیاس آرائی ایک بار پھر اسے چپ کر وا گئی۔ ”ہاں، ہاں معلوم ہے مجھے۔ گھر میں سائیکل نہیں تھی مگر اللہ نے اتنی جی ٹائلیں جو دے رکھی ہیں، یہ کس واسطے ہیں۔ کیا دو قدم چل کر بازار تک بھی نہ جاسکتے تھے۔ اب بتاؤ کون سا دو پیٹ لے کر جاؤں گی میں نے سوٹ کے ساتھ۔“ انہوں نے تھک کر سانس لیا۔ اب کی بار اس لڑکے نے منہ کھولنے کی خاطر اس کی گھٹی۔

”اب جاؤ دفعان ہو جاؤ یہاں سے۔ اتنی مسکینی برستی ہے چہرے پہ کہ خواہ مخواہ ترس آ جاتا ہے۔“ وہ دل کی بھڑاس نکال چکیں۔ تب اس کے چہرے کی مسکینی پہ ترس آتا تھا انہیں۔

ماہین نے دیکھا، وہ لڑکا چاندھواں دھواں چہرہ لیے لمبے لمبے ڈنگ بھرتا وہاں سے چل دیا تھا۔ ”اور ہاں نواب صاحب! اگر زحمت نہ ہو تو آج شام تک دو پیٹ بازار سے لے آئیے گا۔“ نجمہ خالہ بہت طنز یہ انداز میں کہہ رہی تھیں۔ وہ جاتے جاتے ایک دم رک کر پلٹا تھا۔ ”میں آج صبح ہی دو پیٹ لے آیا تھا۔ آپ کے کمرے میں رکھ دیا تھا۔“

وہ بھڑائی آواز میں کہہ کر ان کی طرف دیکھے بغیر پلٹا تھا۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتا ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ ماہین نے نظروں کا زاویہ بدل کر نجمہ خالہ کو دیکھا۔ وہ کم صمی اپنی جگہ پر کھڑی تھیں اور نگاہیں اس طرف جمی ہوئی تھیں، جدھر سے ابھی انہی وہ گیا تھا۔ چند لمحوں بعد ان کے جسم نے حرکت کی تھی اور وہ دھیمے دھیمے قدموں سے چلتی ہوئی جا کر اپنی کرسی پہ ڈھسے گئی تھیں۔ ماہین نے ناگواری نظر ان پر ڈالی اور پھر سر جھٹک کر بڑبڑائی۔

”اب یقیناً بچہ تار ہی ہوں گی۔“ اس کی تمام تر ہمدردی اس لڑکے کے ساتھ تھی۔



آج کئی روز ہونے کو آئے تھے مگر اجنبیت تھی کہ ختم ہونے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ حالانکہ گھر میں اس کے ہم عمر کئی بچے موجود تھے۔ چھوٹے ماموں کے عہد بھیا اور بڑے ماموں کی سمیعہ آیا تو خیر عمر میں اس سے کافی بڑی تھیں لیکن محبت اور زرین کی آپس میں گاڑھی چھینتی تھی انہوں نے ماہین کو بھی کئی بار اپنے اندر شامل کرنا چاہا مگر ان کی سرگرمیاں ماہین کی طبیعت سے میل نہیں کھاتی تھیں سو وہ جلد ہی ان سے الگ ہو جاتی تھی۔ چھوٹے ماموں کا اسدان ہی دنوں اسکول میں داخل ہوا تھا سو وہ بے حد جھنجھلا یا ہوا رہتا، ادھر کسی نے چھیڑا، ادھر اس کا بابا جھنجھلا لگتا۔

چنانچہ اس عرصے میں وہ کسی سے نجی ٹھیک طرح سے گھل مل نہ پائی تھی۔ ہاں بس ایک وہ ہی تھا ”چاند“ جسے مذاق میں سب بچے اور نجمہ خالہ غصے میں ”چاند گرہن“ کہا کرتی تھیں۔ مگر وہ ناراض نہیں ہوتا تھا بس ہلکے سے مسکرا دیتا یا پھر یونہی اپنی سوچ میں گم رہتا جیسے سب لوگ اسے نہیں کسی اور کو ”چاند گرہن“ کہتے ہیں۔

پہلی رات سے لے کر اب تک صرف وہی تھا جو ماہین کو بہت اچھا لگا تھا۔ عمر میں وہ ان سب بچوں سے کافی بڑا تھا۔ عہد بھیا سے بھی سال چھ ماہ بڑا۔۔۔ مگر جب وہ ماہین سے بات کرتا تھا تو اسی کی طرح چھوٹا بچہ بن جاتا تھا۔ ماہین سب لوگوں میں سے صرف اسے ہی اپنا دوست مانتی تھی اور اس سے بات کرتے ہوئے ماہین کو کسی قسم کی گھبراہٹ بھی محسوس نہیں ہوتی تھی لیکن وہ گھر کے کاموں میں اس قدر مصروف رہتا تھا کہ ماہین کو اس سے بات کرنے یا اس کے پاس بیٹھنے کا بہت ہی کم وقت ملتا تھا۔ سو سارا دن وہ بیگانوں کی طرح بھی اس کمرے، بھی اس دالان میں گھومتی رہتی۔۔۔ اس کی اسی کیفیت کو دیکھتے ہوئے بڑے ماموں نے اسے جلد از جلد اسکول داخل کروانے کا سوچ لیا تھا۔ مگر ان ہی دنوں اس کی ملاقات ایک ایسی شخصیت سے ہوئی تھی جس سے ملنے کے بعد اس گھر میں رہنا اسے بہت آسان اور دلچسپ معلوم ہونے لگا تھا۔



صبح اس کی آنکھ کسی غیر معمولی احساس کے تحت کھلی تھی۔ وہ چند لمبے یونہی لیٹی چھت کو گھورتی رہی پھر اچانک اسے احساس ہوا جیسے گھر میں بھونچال سا آیا ہوا ہے۔ صحن عجیب ہے، ہنگامی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ وہ آنکھیں ملاتی اپنے کمرے سے نکل کر باہر کو بھاگی اور پھر حیران رہ گئی۔ وہ وہاں سے نقوش کی مالک ایک دہلی پتلی لڑکی تھی۔ کھلے پائنتھوں والی ٹخنوں سے اوپر شلو اور گھٹنوں سے اونچی ٹیٹھ، کریب کا بڑا سا دوپٹہ سر پہ لے کر باقی گردن کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ ایک پلو زمین کو چھو رہا تھا۔ گھر کے سب بچوں کے ساتھ ہمسائے کے ایک دو بچوں کو اکٹھا کیے وہ ان کے عین وسط میں اپنی کراڑی آواز میں نعت پڑھ رہی تھی۔

شاہ مدینہ، شاہ مدینہ
عطردوں سے بڑھ کر تیرا پسینہ
شاہ مدینہ

”اوسے میں نے تھپڑ لگاتا ہے تمہارے، ادھر سیدھے ہو کے کھڑے ہو۔“ اس نے کیاری کی

طرف جاتے بیچے کو بازو سے پکڑ کر اپنے سامنے کھڑا کیا۔
”چلو اب آگے بڑھو۔“

لب پہ آتی ہے دعابین کے تمنامیری

سارے بچے جوش و خروش سے اس کا ساتھ دینے لگے تھے۔
”اے ہیڈ ماسٹر! بند کر یہ ڈرامہ۔۔۔ ادھر ہزار کام پڑے ہیں کرنے کو۔“ نکی بوا باورچی خانے کی کھڑکی سے چلا میں۔

”چلو، چلو جلدی سے قومی ترانہ پڑھو۔“ اس لڑکی نے کوئی پروا نہ کی تھی۔

پاک سرزمین شاد باد کشور خستین

اس نے کشور کو جی بھر کے رگڑا دیا تھا۔ ماہین کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

”کیا مصیبت ہے؟ یہ گھر ہے یا بیلی دیواروں والا اسکول۔ کان پک گئے ہیں صبح سے یہ الٹی سیدھی بکواس سن کر خبردار جواب مجھے کسی کی آواز سنائی دی۔“

نجمہ خالہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلیں تو ماہین ایک لمحے کے لیے انہیں دیکھ کر ڈر سی گئی تھی، چہرے پہ بچانے کون سا ماسک تھوپ رکھا تھا۔ غصے سے لال ہوتی ہوئی آنکھیں۔ چیخنی، دھاڑنی وہ برآمد سے تک آئیں تو ماہین خواہ مخواہ ہی ڈر کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔ وہ حسبِ عادت خوب بول کر دھماکے سے دروازہ بند کرتے ہوئے اپنے کمرے میں غائب ہوئیں تب ماہین کی جان میں جان آئی۔

اس نے پلٹ کر دیکھا، صحن بالکل خالی تھا۔ سارے بچے غائب ہو چکے تھے بس ایک وہی لڑکی رہ گئی تھی جو ہونٹوں کی بے آواز جنبش سے نجمہ خالہ کی سب باتوں کے جواب دے رہی تھی آخر میں جب اس نے غصے کے اظہار کے لیے ”اونہہ“ کہہ کر سر کو زوردار جھٹکا دیا تو ماہین کی بے اختیار ہنسی نکل گئی ہے وہ لڑکی خشکیں نگاہوں سے گھورتی اس کی طرف آئی۔

”یہ تمہیں کس بات پر ہنسی آرہی ہے؟“ وہ کاٹ کھانے کو دوڑی تھی۔ ماہین کی ہنسی کو وہیں بریک لگ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ لڑکی مزید کچھ کہتی، لیکن اسے نکی بوا ایک بار پھر چلا آ گئی تھیں۔

”افوہ نکی بوا! تم اپنا ٹیپ بند ہی رکھا کرو۔ پتا ہے مجھے کون سے کام کرنے والے ہیں۔“

جواباً اس نے چمک کر کہا اور پھر ماہین کو سر تاپا دیکھنے کے بعد اس کے سامنے سے ہٹ گئی۔ ماہین وہیں تخت پر ٹپک گئی تھی۔ ذرا دیر بعد نکی بوا ناشتا بھی اس کے سامنے رکھ گئیں۔ تو وہ ناشتا کرنے کے ساتھ ساتھ اس لڑکی کو بھی دیکھتی گئی جو حیرت انگیز طور پر کام میں بہت پھرتیلی تھی۔ صحن میں بھی بڑی بڑی چار پائیاں اس نے بہت سہولت کے ساتھ اٹھا کر دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی تھیں۔ پھر بچوں کے جوتے، چپلیں اور کھلونے اٹھا کر ان کی جگہوں پر رکھے، باپ لگا کر کپاریوں اور پیری کے درخت کو پانی دیا اور پھر صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کر کے بڑی سی جھاڑواٹھا کر پھیرنے لگی تھی۔ تب ہی دروازہ کھلا تھا اور بڑے ماموں صبح کی سیر کے بعد واپس آئے تھے۔ وہ لڑکی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ان کی طرف لپکی، بڑے مودبانہ انداز میں سلام کیا جواباً بڑے ماموں نے بھی بڑے جوش انداز میں اس کے سر پہ پھکی دی تھی۔

”آگئی ہو تو! دل لگ گیا تھا تمہارا گاؤں میں؟“

”کہاں جی، بڑی مشکل سے دن پورے کیے۔ ادھر اماں بستر سے اٹھی ادھر میں بھاگی چلی آئی۔“

اس نے بڑی بے مروتی سے اپنی بیوی تیلی اماں کا ذکر کیا۔
”اچھا، تیری اماں ٹھیک تو تھی نا۔۔۔؟“

وہ اس سے باتیں کرتے کمرے میں چلے گئے تھے۔ ماہین کو غالباً انہوں نے دیکھا ہی نہیں تھا مگر جب ان کے پیچھے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے رتو نے فخریہ سی مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی تو وہ ایک دم جل سی گئی۔ اسے لگا تو اس سے زیادہ حق بڑے ماموں پر جہاں رہی تھی۔ وہ ناشتا وہیں چھوڑ کر بھاگتی ہوئی بڑے ماموں کے کمرے میں چلی گئی تھی۔ انہوں نے دیکھتے ہی فوراً اسے اٹھا کر اپنی گود میں بٹھالیا۔ تب ماہین نے شرارتی نظروں سے رتو کی طرف دیکھا، جو کن آنکھوں سے مسلسل اس کی طرف دیکھنے کے بعد بھی خود کو بے حد انجان اور بے نیاز ظاہر کرتے ہوئے ماموں کی اسٹڈی ٹیبل کو اپنے دوپٹے سے رگڑنے لگی تھی پھر ان کی عینک صاف کر کے میز پر رکھی اور ماموں سے ناشتے کا پوچھ کر باہر کی طرف بڑھی۔

”تم کو اپنا ناشتا کرلو۔ وہاں تخت پر پڑا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“ اس نے جاتے جاتے دانستہ پلٹ کر بلند آواز میں کہا تھا۔

”بھئی، ماہین کا ناشتا بھی یہیں لے آؤ۔ ہم دونوں اکٹھے کر لیں گے۔“ بڑے ماموں نے کہا تو رتو نے غصیلی نظروں سے اسے دیکھا اور پھر ہونٹوں کو بے آواز جنبش دے کر ”اونہہ“ کہتی سر کو جھٹکتی باہر نکل گئی۔ ماہین کو اس کے اس انداز پہ ایک بار پھر زور کی ہنسی آ گئی تھی۔
”ہاں میں کیا ہوا؟“ بڑے ماموں نے حیرت سے اسے دیکھا تو اس کی ہنسی خود بخود ختم گئی تھی۔



بڑے ماموں اسے اسکول میں داخل کروا آئے تھے۔ ابتدائی چند دن تو ویسے ہی گزرے تھے جیسے ہر بچے کے گزرتے ہیں یعنی روتے دھوتے، منہ بسورتے لیکن رفتہ رفتہ اسکول کے ماحول سے واقفیت ہو گئی تھی۔ وہ اسکول سے واپس آتی تو فوراً چاند بھیا کو تلاش کرنے لگتی۔

وہ ہمیشہ ہی کسی نہ کسی کام میں مصروف ہوتے، کبھی سودا سلف لارہے ہوتے۔ کبھی دھوبی کے پاس جانا ہوتا، کبھی پائیں باغ کی گھاس کاٹنے میں مشغول تو کبھی صحن کی کپاریاں ٹھیک کرنے میں لیکن وہ بھی سارے گھر میں انہیں ڈھونڈنی ڈھاڈنی بالآخر ان تک پہنچ ہی جاتی اور پھر انہیں سارے دن کی روداد سنانے لگتی۔ فلاں نیچر نے ایسے بڑھایا۔ فلاں نے ایسے ڈانٹا۔ اس دوست سے میری کٹی ہوئی۔ اس دوست کے ساتھ میں نے دوپہر کا کھانا کھایا۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی بات انہیں سناتے نہ ٹھکتی اور وہ سنتے نہ ٹھکتے۔ کبھی کبھی تو اسے وہم ہونے لگتا کہ وہ خود ہی بول رہی ہے۔ چاند بھیا تو اپنے کام میں مصروف ہیں۔ تب وہ ہر دوسری بات پر تصدیق کرتی۔

”چاند بھیا سن رہے ہیں نا؟“

”جے جاؤ گریا! کہے جاؤ، تمہارے چاند بھیا سن رہے ہیں۔“ وہ اسے دلاسا دیتے تو وہ ایک بار پھر فل اسپنڈ سے شروع ہو جاتی، اس روز بھی وہ خود ہی بولتے بولتے تھک گئی تو چاند بھیا سے پوچھنے لگی۔

”آپ ریتے کہاں ہیں؟“

”میں؟ اسی گھر میں رہتا ہوں؟“ انہوں نے کپاریوں سے خشک پتے اکٹھے کرتے ہوئے سر اٹھا

کردیکھا تو وہ حیران سی ہو گئی تھی۔
 ”اسی گھر میں کہاں؟“ وہ تو سر شام ہی اماں کے ساتھ کمرے میں گھس جاتی تھی۔ سو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ بھی اس گھر کا ایک حصہ ہیں۔
 ”یہ جو کھڑکی سامنے نظر آرہی ہے ناں۔ یہ میرے کمرے کی ہے۔ دیکھنے چلو گی میرا کمرہ۔“ انہوں نے پیش کش کی تو وہ فوراً مان گئی۔

”ہائے اللہ یہ ہے آپ کا کمرہ۔“ وہ حیرت سے چاروں طرف گھوم گئی۔ پلستر اکھڑی دیواروں والا سیلن زدہ کمرہ جس کے ایک طرف گندم سے بھری پوریاں پڑی تھیں۔۔۔ ٹوٹا پھوٹا فرنیچر پڑا تھا اور گھر کا بہت سا فالتو سامان، پس بائیں دیوار کے ساتھ چھٹی ایک چار پائی، اس پہ پڑا بوسیدہ سا بستر اور برابر میں رکھی ایک چھوٹی میز یہ بھی ان کی کل متاع جس کے بل بوتے پر وہ اس کمرے کو اپنا کمرہ کہتے تھے۔
 ”اس گھر میں اور کوئی کمرہ اتنا گندہ نہیں ہے۔ بو بھی آرہی ہے۔“ اس نے ناک سکوڑی تو چاند بھیا کی رنگت پھینکی پڑ گئی۔

”آپ کے کمرے میں بلب نہیں ہے کیا؟ کتنا اندھیرا ہو رہا ہے؟ ماہین کو اس نیم تاریک کمرے اور سائے کی طرح خاموش کھڑے چاند بھیا سے خوف آنے لگا تھا۔
 ”نہیں گڑیا! یہاں بلب نہیں ہے۔ بجلی کا کنکشن تو ہے لیکن۔۔۔“ وہ کچھ کچھ کہتے کہتے رک سے گئے تھے۔ پھر آگے بڑھ کر انہوں نے باغ میں کھلنے والی کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے سورج کی نارنجی شعاعوں کو کمرے میں آنے کا راستہ مل گیا تھا۔

”تمہیں پتا ہے ماہین! اس کمرے میں بہت ساری چیزیں ہیں جو دکھائی نہیں دیتیں۔ صرف محسوس ہوتی ہیں۔ بہت سے چہرے، بہت سی آوازیں ہیں۔ جو رفتہ رفتہ نمایاں ہونے لگتی ہیں۔ اس وقت جب رات کی تاریکی چپکے سے اس کمرے میں داخل ہونے لگتی ہے۔ تب میں یہ کھڑکی بند کر دیتا ہوں۔ مجھ میں اس کو کھولنے کی ہمت باقی نہیں رہتی۔ یہ درخت یہ پھول بوئے اس وقت اس ہیئت میں نہیں رہتے ان کی شکلیں بدلنے لگتی ہیں اور میں ان بدلتی ہوئی شکلوں سے خوفزدہ ہونے لگتا ہوں۔ مجھے ڈر لگنے لگتا ہے میں۔۔۔“

وہ کھڑکی کے پٹ سے سر نکائے جیسے بہت تھکے تھکے انداز میں بول رہے تھے۔ ماہین کو ان کی صرف آخری بات سمجھ میں آئی تھی۔

”چاند بھیا آپ کو ڈر لگتا ہے؟ کس چیز سے؟ اور آپ اتنے بڑے ہو کر بھی ڈرتے ہیں۔“ اس نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ ہلایا تو وہ چونک سے گئے۔

”کون میں؟ نہیں، میں تو نہیں ڈرتا۔ تم سے کس نے کہا۔“
 ”ابھی آپ نے خود ہی تو کہا؟“ وہ الجھ سی گئی

”تم۔۔۔ تم میری بات سن رہی تھیں۔“ وہ بچوں کے بل اس کے سامنے بیٹھ گئے۔
 ”ہاں۔“

”کمال ہے، میں تو بس خود سے بات کر رہا تھا لیکن تم کتنی اچھی ہو ماہین! تم میری باتیں کس قدر توجہ سے سنتی ہو۔ حالانکہ ان میں تمہاری دلچسپی کی تو کوئی بات نہیں ہوتی۔ اچھا چلو، آج سے میں تمہارا پکا پکا

بھیا بن جاتا ہوں۔ ابھی بازار جاؤں گا، تو تمہارے لیے چاکلیٹ لے کر آؤں گا، اتنی اچھی گڑیا کو چاکلیٹ تو ملنا چاہیے ناں؟“ انہوں نے کہا تو وہ خوش ہو کر اثبات میں سر ہلانے لگی۔ وہاں سے باہر نکلی تو رتو باغ میں جھولاجھول رہی تھی۔ اسے چاند کے کمرے سے نکلنے دیکھا تو فوراً اٹھ کر اس کی طرف بھاگی۔
 ”اے تم کیا کر رہی تھیں وہاں؟“ اس کا لہجہ غصیلا تھا۔ ماہین کو اچھا نہیں لگا تو وہ یونہی جواب دیے بغیر رخ موڑ گئی۔

”چلو بھیا گویاں سے، تمہاری اماں تمہیں بلارہی ہیں۔“ وہ اس کی کم عمری سے فائدہ اٹھا کر خوب ہی اس پر رعب جاتی تھی اب بھی ماہین وہاں سے جانا نہیں چاہتی تھی لیکن اس سے خوفزدہ ہو کر وہاں سے واپس آ گئی تھی۔



ماہین ابھی ابھی سو کر اٹھی تھی، اماں کمرے میں موجود نہیں تھیں۔ یوں بھی نجانے کیوں اماں اپنے ہی خیالوں میں گم رہنے لگی تھیں۔ وہ بولتی رہتی، انہیں خبر ہی نہ ہوتی۔ وہ سوال پوچھ پوچھ کر تھک جاتی اماں کی طرف سے جواب نہ آتا تب وہ چڑ جاتی اور اماں کے پاس سے اٹھ جاتی۔ اب بھی وہ ہمیشہ کی طرح انہیں ڈھونڈنے کے بجائے برآمدے کی سیڑھیوں پر آ بیٹھی تھی۔ وہ اسکول سے آ کر سو گئی تھی۔ اس لیے ابھی تک یونیفارم میں ہی تھی۔ کئی بوا صحن میں رکھی میز پر شام کی چائے کے برتن رکھ رہی تھیں۔ رتو غائب تھی اور چاند بھیا کمرے سے کرسیاں لا کر صحن میں رکھ رہے تھے۔ اسے وہاں بیٹھے دیکھا تو بے اختیار پوچھ بیٹھے۔

”یہاں کیوں بیٹھی ہو ماہین؟“ وہ ابھی جواب بھی نہ دے پائی تھی جب نجمہ خالہ کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ ٹنگ ٹنگ سینڈل بجاتی باہر آ گئیں۔

”ارے یہاں کیوں بیٹھی ہو ماہین اور یہ تم نے حلیہ کیا بنا رکھا ہے کپڑے بھی نہیں بدلے ابھی تک، چلو اٹھو شہناش۔ نہاد ہو کر اپنا حلیہ درست کرو۔ ایک تو آیا میری سمجھ میں نہیں آتیں، بھائی صاحب کی وفات کے بعد تو وہ زندگی گزارنے کا طور طریقہ بھی بھول گئی ہیں۔ اب بتاؤ بھلا کوئی مرنے والوں کے ساتھ مرنا ہے۔ انہیں اپنا نہیں تو ماہین کا تو خیال کرنا چاہیے۔“

وہ فل اسپیڈ سے بولتی صحن میں چلی گئیں۔ ماہین کو نجمہ خالہ کا اماں کے خلاف بولنا ایک آنکھ نہیں بھایا تھا، اسی لیے یونہی ٹھس سی اپنی جگہ بیٹھی رہی۔

”اے چاند! ذرا پاپ تو مل میں لگا دو اور اگر ہو سکے تو کبھی میرے کہے بغیر بھی ان کی طرف دیکھ لیا کرو کیسی خشک ہو رہی ہیں کیا ریاں۔“ چاند بھیا نے جھٹ پٹ پاپ ٹل میں لگا دیا اور وہ کیا ریاں میں پانی بھرنے لگیں۔

”ہاں، وہ تمہارا بیٹا ہے ساریڈیو بھی تو ہوا کرتا ہے۔ وہ تو لے کر آؤ ذرا۔“ نجمہ خالہ بہت کم اس موڈ میں چاند بھیا سے بات کیا کرتی تھیں۔ چاند بھیا بے چارے پہلے سے بھی زیادہ پھرتی سے اور گھبراتے ہوئے ان کے حکم کی تعمیل کر رہے تھے۔

”جتنا نہیں چاند بھیا، نجمہ خالہ سے اتنا ڈرتے کیوں ہیں؟“ ماہین نے چاند بھیا کو تقریباً بھاگ کر ریڈیو لاتے دیکھا تو چڑ کر سوچنے لگی۔

”آج تو ہمیں کوئی اچھا سا گانا سنوادو۔“

وہ خامسے خوشگوار موڈ میں تھیں۔ اسی لیے کیاری میں لگے گلابوں کو پانی کی باریک پھوار سے دھو رہی تھیں۔ چاند بھیا کچھ دیر تک ریڈیو کان سے لگائے سوئی گھماتے رہے اور پھر ایک جگہ سیٹ کر کے میز پر رکھ دیا اور پھر ماہین کو اشارے سے اپنی طرف بلاتے ہوئے کلیوں کے جھنڈ کے پاس جا بیٹھے تھے۔ ماہین سست سے انداز میں چلتی ہوئی ان کے پاس جا بیٹھی تھی۔ چاند بھیا فرش پر پھری کلیوں کو اپنے ہاتھوں میں اکٹھا کر رہے تھے۔

”کلیوں کا ہار بناؤ گی؟“ انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو ماہین نے جھٹ اثبات میں سر ہلا دیا۔

”چلو ٹھیک ہے۔ پہلے کلیاں جمع کرتے ہیں۔ بعد میں انہیں دھاگے میں پرو لیں گے۔“ وہ کلیاں سمیٹ سمیٹ کر اس کی فراگ میں رکھنے لگے۔

ناگن ناگن زہر پیا ہے بجا کے من کی بین
پیار نہ کرنے کی کرتے ہیں تبھی تو ہم تلقین
مغنیہ کی آواز سرسراہی ہوا کے ساتھ پورے صحن میں بھرنی جا رہی تھی۔ لفظوں کے معنی و مفہوم سے آگاہ نہ ہونے کے باوجود ماہین کو فضا میں پھیلے یہ سر بہت بھلے لگ رہے تھے۔

چھوڑ دیا بل بھر میں اس نے جنم جنم کا ساتھ
اتر گئی ٹوٹے سپنوں کی ہر دے میں سنگین
ماہین نے دیکھا، نجمہ خالہ یا پپ یونہی زمین پر پھینک کر ریڈیو کے پاس اکھڑی ہوئی تھیں۔
اب کے برس بستی میں آیا یہ کیسا موسم
آنکھوں آنکھوں گھٹی اداسی، ہر چہرہ غمگین
اس نے نجمہ خالہ کو ریڈیو اٹھا کر ہاتھ میں لیتے ہوئے دیکھا تھا۔

اتنا اچھا گانا چل رہا ہے، اب یہ سوئی گھمادیں گی۔“ اسے افسوس ہونے لگا مگر اگلے ہی پل نجمہ خالہ نے ریڈیو گھما کر پوری فوت سے زمین پر دے دیا تھا۔
”آ۔۔۔“ ماہین کی بے اختیار ہی چیخ نکل گئی تھی۔ چاند بھیا بجلی کی سی تیزی سے پلٹے اور پھر اپنی جگہ ساکت ہو گئے۔

ناگن ناگن زہر پیا ہے بجا کے من کی بین
ریڈیو سے آواز آنا ابھی بند نہیں ہوئی تھی۔ نجمہ خالہ بھر پور وحشت کے عالم میں آگے بڑھیں اور ریڈیو کو اٹھا کر زمین پر دے مارا، چاند بھیا تڑپ کر اس طرف بھاگے تھے، یہ ریڈیو ان کی تنہائی کا واحد ساتھی، جسے اب نجمہ خالہ اپنے سینڈلوں سے توڑنے پھوڑنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ریڈیو سے آواز آنا اب بند ہو گئی تھی۔

”نہیں ایسا مت کیجئے، آپ کو خدا کا واسطہ، اسے مت توڑیے۔“
چاند بھیا نے جتنی بار بھی ریڈیو اٹھانے کی کوشش کی۔ نجمہ خالہ کے سینڈل کی ہیل اتنی دفعہ ہی ان کا ہاتھ زخمی کر گئی تھی۔ ان کا چہرہ سرخ تھا اور وہ دونوں جڑے بھینچے شدید غصے کے عالم میں تھیں۔ ماہین وہیں

اپنی جگہ پر سمٹ گئی تھی۔ تب ہی نجمہ خالہ نے چاند بھیا کو کالر سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور پھر زنائے دار تھپڑا نہیں دے مارا پھر دوسرا اور پھر جیسے وہ چنونی انداز میں انہیں ماری چلی گئی تھیں۔ انہوں نے لمبے ناخن سے ان کے چہرے پر کھر و پچیں ڈال دی تھیں۔ پتھروں سے ان کا منہ سرخ کر ڈالا تھا۔ ماہین خوفزدہ سی ہو کر دونوں بازوؤں میں منہ چھپا کر چیخنے لگی تھی۔ پھر جیسے ایک دم ہی آگن میں ستا سا چھپا گیا تھا۔ اس نے دیکھا نجمہ خالہ وہاں موجود نہیں تھیں اور چاند بھیا گرتے پڑتے اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ کئی ہوا اور رتو اپنی اپنی جگہ ساکت کھڑی تھیں۔ ماہین کے رونے کے سوائے صحن میں اور کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ اس نے چاند بھیا کو پکارنا چاہا ان کے پیچھے جانا چاہا، مگر اس کی ہمت ہی نہ پڑ سکی۔ تب ہی کوئی اس کے نزدیک آکھڑا ہوا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے سر اٹھا کر دیکھا، وہ رتو تھی۔

”تم کیوں رو رہی ہو؟“ اس کے پوچھنے پر ماہین کے رونے میں شدت آگئی۔
”بتاؤ ناں، کیوں رو رہی ہو۔ انہوں نے نہیں تو کچھ نہیں کہا۔“
”لیکن خالہ نے چاند بھیا کو تو مارا ناں، وہ بھی اتنی زور سے۔“ وہ مزید رونے لگی۔

”تم اس وجہ سے رو رہی ہو؟“ رتو کے پوچھنے پر اس نے اثبات میں سر ہلایا تو رتو فوراً ہی اس کے نزدیک ہو بیٹھی۔ اس کے آنسو پونچھے، بال سنوارے۔

”سنو، مجھ سے دوستی کرو گی۔“ اس کی اس درجہ اپنائیت پر ماہین حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگی تھی۔



بڑی ممانی بیسن کے لڈو بنا رہی تھیں، وہ بھی سب سے چھپ کر صرف رتو کو راز دار بنایا تھا، وہ بھی صرف اس لیے کہ اس سے ڈھیروں ڈھیر کام لینا تھا۔ اسی لیے پہلے اسے نیچلے بورشن میں بھجوا کر معلوم کروایا تھا کہ اس وقت کون کون گھر میں موجود ہے۔ کون موجود نہیں ہے۔ کتنے لوگ دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولہ فرما رہے ہیں اور کتنے منحوس ہیں جو جاگ رہے ہیں۔ جگہ کی کمی کے باعث وہ حال ہی میں اوپر کے بورشن میں شفٹ ہو گئی تھیں جواباً رتو نے آکر بتایا تھا۔

”ایک منحوس کے سوا باقی سب سو رہے ہیں۔ کئی بوا گھر کی نگرانی کے لیے ڈیوڑھی میں بیٹھی ہیں مگر اونگھ رہی ہیں۔ چھوٹی صاحبہ کا پتا ہی نہیں چلا، سو رہی ہیں یا جاگ رہی ہیں۔ یوں تو پورا کمران کے خراثوں سے گونج رہا تھا مگر جو نبی میں نے پاؤں کمرے میں رکھا، فوراً سر اٹھا کر پوچھے لگیں۔ ”مسئلہ کیا ہے؟“

”مطلب تو یہ ہی ہوا ناں کہ اس وقت یہاں کسی کے آنے کا خطرہ نہیں۔ چلو تم جلدی سے کام شروع کرو، ہو سکتا ہے، آج شام کو محبت آجائے۔۔۔ بیسن کے لڈو اسے بہت پسند ہیں۔“ ممانی کے کہنے پر رتو فوراً ہی بیسن نکالنے لگی تھی۔

پھر سارا کام رازداری سے ہی ہوا تھا اور اس رازداری کے عوض رتو کو ایک نہ دو پورے تین لڈو ملے تھے وہ شکر یہ شکر یہ کہتی نیچے چلی آئی۔ مزے لے لے کر لڈو کھاتے ہوئے وہ کچھ دیر ادھر ادھر چکراتی رہی مگر جو نبی ماہین آنکھیں مستکی اپنے کمرے سے باہر نکلی وہ اس کے پاس بھاگی چلی آئی۔

”اے ایک مزے کی بات بتاؤں؟“
”ہاں بتاؤ۔“

”اچھا وعدہ کرو کہ بعد میں تم میری ایک بات مانو گی۔“
 ”ہاں مانوں گی۔“ مائین نے بڑے آرام سے وعدہ کر لیا۔ رتو اسے یونہی اپنی راہ پر چلا لیا کرتی تھی۔

”اچھا پھر اوپر جاؤ، بڑی صاحبہ بیسن کے لڈو بانٹ رہی ہیں۔“ اس نے مائین کے کان میں سرگوشی کی۔
 ”ہیں واقعی؟“ مائین کی آنکھیں چمکیں اور اگلے ہی پل وہ بڑی ممانی کے رو برو تھی۔
 ”بڑی ممانی! ہمیں بھی لڈو دیتے تھے ناں۔“ اس کے بھرپور مطالبے پر بڑی ممانی نے اسے یوں دیکھا تھا جیسے اس کے سر پہ سینگ اگ آئے ہوں۔

”جلدی دیں ناں۔ اتنی جھوک لگ رہی ہے۔“ وہ پاؤں پیچ کر بولی تھی۔ ممانی کو یقین تھا۔ نہیں دیں گی تو یہ آفت کی پرکالہ آسمان سر پہ اٹھالے گی۔ وہ دانت پیستی دل ہی دل میں رتو کو کوستی انھیں اور دو لڈو اس کے ہاتھ میں تھا کر چلتا کیا۔

”اب ادھر ہی بیٹھ کر کھالو۔ سارے زمانے کو مت خبر کرتی پھرنا۔“ انہوں نے تاکید کی مگر وہ سنی آن سنی کرتی نیچے چلی آئی۔ بڑی ممانی آرام کی خاطر کچھ دیر کے لیے لیٹ گئیں۔ کچھ دیر بعد مائین دوبارہ ان کے سامنے کھڑی تھی۔

”چھوٹی ممانی کہہ رہی ہیں، اوپر ہی اوپر لڈو بنا کر کھالیے۔ ہمیں بھی تو چکھائیے کیسے بنے ہیں؟“
 ”ہائیں! انہیں کیسے خبر ہوئی؟“ ممانی تڑپ اٹھی تھیں۔
 ”میں کیا جانوں؟“ اس نے حد درجہ معصومیت سے کندھے اچکائے، اب کیا بتاتی کہ اسے تو رتو نے سکھا پڑھا کر بھیجا تھا۔ یوں نہ کہنا یوں کہنا۔

”ارے پتا کیسے چلتا تھا۔ ہماری دیورانی صاحبہ کی ناک ہی بہت تیز ہے۔ خوشبو سونگھ لی ہوگی۔ خود تو کبھی اتنی زحمت کی نہیں کہ اپنے ہاتھ سے کوئی سوغات بنالیں۔ بس دوسروں کے ہاتھ کے کھانے کی عادت پڑ چکی ہے۔“ بڑی ممانی نے حسب تو یقین دل کی بھڑاس نکالی اور پھر چند لڈو پلیٹ میں رکھ کر اس کے ہاتھ میں دے دی۔

”کہہ دینا، تھوڑے سے بنائے تھے، ختم ہو گئے۔“ وہ تابعداری سے پلیٹ لے کر نیچے اتر آئی۔
 آخری سیڑھی پر رتو نے پلیٹ اس کے ہاتھ سے بھینٹ لی تھی۔

”شاباش مائین! تم تو بڑے کام کی نکلیں۔“ رتو نے خوش ہو کر ایک اور لڈو اسے دیا اور خود کچن میں چلی گئی۔ مائین نے ذرا سا کھایا۔ پھر دل بھر گیا تو باقی لڈو منڈیر سے بیٹھے کوئے کو ڈالا اور خود ہاتھ جھاڑتی ہوئی چاند بھیا کے کمرے میں آگئی۔ وہ بھی غالباً بڑھتے پڑھتے اوٹھنے لگے تھے۔ ذرا سا کھڑکا ہوا تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ سینے پہ دھری کتاب پھسل کر نیچے جا گری، مائین کھلکھلا کر ہنسی تو وہ سرخ سرخ آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے کتاب اٹھانے لگے۔

”کیا کرتی ہو مائین؟ ابھی تو میری آنکھ لگی تھی۔“ انہوں نے لمبی جمائی لی۔
 ”تم غالباً خود بھی نہیں سوئیں، ہے ناں؟“ انہوں نے استفسار کیا۔ تو وہ اچک کر کھڑکی پہ بیٹھے ہوئے نفی میں سر ہلانے لگی۔

”نہیں بھئی۔۔۔ میں نہیں سوئی، ہماری ٹیچر کہتی ہیں جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے۔“
 ”کھوتا۔۔۔“ چاند بھیا اس کے تلفظ پر ہی غور کرتے رہ گئے۔
 ”ہاں جسے پٹائی میں گدھا کہتے ہیں۔“ اس نے پوری سنجیدگی سے ان کی معلومات میں اضافہ کیا تھا جو اب چاند بھیا کھل کر مسکرا دیے تھے۔

”اری بیوٹو! اس سے مراد کھوتا ہے کسی چیز سے محروم رہنا۔“ انہوں نے وضاحت کی۔
 ”اوہ جیسے آپ نے بیسن کے لڈو کھو دیے۔ ہے ناں؟“ وہ فوراً ہی سمجھ گئی تھی۔
 ”بیسن کے لڈو۔۔۔؟“

”ہاں بھئی، بڑی ممانی نے بنائے ہیں۔“
 ”کیسے بنے ہیں۔۔۔؟“ یقیناً مزے کے ہوں گے۔“ چاند بھیا کے منہ میں سچ مچ پانی بھر آیا۔
 سردی کا موسم ہو یا گرمی کا وہ موسم کی ہر سوغات سے محروم ہی رہتے تھے۔

”ہاں مزے کے تھے، آپ نے کھانے ہیں، لے کر آؤں؟“ مائین کے پوچھنے پر انہوں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ لیکن مائین جھٹ سے کھڑکی سے نیچے اتر آئی تھی۔
 ”میں ابھی لے کر آئی ہوں آپ کے لیے“ وہ ان کے روکنے کے باوجود بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔

لیکن ممانی کے پاس پہنچی تو انہوں نے جواباً زبردست قسم کی جھاڑ پلا دی۔
 ”ارے دیسی گھی میں بنائے ہیں اپنے محبت کے لیے، اندر بیسیوں میوہ جات ڈالے ہیں۔ اب کیا ہر ایرے غیرے ٹٹ پونچھے پر لٹاتی پھروں۔ بھاگ جاؤ یہاں سے اور ہر وقت اس بد بخت کے کمرے میں مت کھسی رہا کرو۔“

”بد بخت کہاں بڑی ممانی! وہ تو میرے بھیا ہیں۔“ وہ ان کی ڈانٹ سے خائف ہو کر منمنائی۔
 ”ارے گئے بھتیوں کی کوئی کمی ہے تمہیں جو ادھر ادھر بیٹھے بناتی پھرتی ہو۔ لو بھئی، ہمارے بچوں نے تو کبھی اس کو منہ نہیں لگایا اور یہ چلی ہیں انہیں بھیا بنانے۔“ بڑی ممانی کے تیور جارحانہ تھے، وہ آنکھوں میں آنسو بھرے واپس بھاگ آئی۔

”خو! خواہ باتیں بناتی ہیں، بھلا ان جیسا کوئی دوسرا بھیا ہے اس گھر میں نہ کوئی کہانی سنانے والا نہ کوئی ٹافیاں لا کر دینے والا۔“ وہ بڑبڑاتی رہی۔ چاند بھیا کے پاس خالی ہاتھ جاتے ہوئے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ صحن میں آکر اس جگہ کودیکھا جہاں کوئے کے لیے بیسن کا لڈو پھینکا تھا۔ وہاں کسی چیز کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ اسے افسوس ہونے لگا۔

”خو! خواہ کوئے کو لڈو کھلا دیا۔ اگر پہلے خیال آ جاتا تو چاند بھیا کے لیے رکھ چھوڑتی۔“ وہ بائیں باغ میں آکر چاند بھیا کے کمرے کی کھڑکی کے عین نیچے آ بیٹھی، نجانے کتنی دیر تک وہاں بیٹھی بڑبڑاتی رہی تب ہی چاند بھیا نے کھڑکی سے جھک کر اسے دیکھا اور بصدا صرا اسے کمرے میں بلوایا۔

”بڑی ممانی نے لڈو دیے ہی نہیں۔“ اس نے جھکے سر کے ساتھ بتایا۔
 ”ارے تو اس میں اتنا فکر مند ہونے کی کیا بات ہے۔ لڈو تو مجھے مل گئے۔“
 ”ہائیں مل گئے مگر کیسے؟“ کس نے دیے۔“ وہ خوشگوار سی حیرت کے ساتھ چاند بھیا کو دیکھنے لگی۔

ان کے چہرے پہ یہ خوشی کا محسوس کیے جانے والا تاثر ابھر رہا تھا۔

”بس ہے کوئی ہمارا ہمدرد جو ہمارا بہت خیال رکھتا ہے۔ تم نے تو کوئے کو کھلا دیا ناں ہمارے حصے کا لڈو۔“ انہوں نے جان بوجھ کر اسے چھیڑا۔

”تو کیا ہیں آپ کا خیال نہیں رکھتی۔۔۔ اتنی ڈانٹ کھائی میں نے بڑی ممانی سے آپ کے واسطے۔“ وہ روہاکی ہو گئی تو چاند بھیا فوراً اسے تسلی دینے لگ گئے۔

”ارے میں تو یوں ہی مذاق کر رہا تھا۔ تم تو میرا سب سے زیادہ خیال رکھتی ہو۔“

”تو پھر بتائیے، ناں لڈو کس نے دیے آپ کو۔“

”گڑیا! اگر رازداری کا وعدہ نہ ہوتا تو ہم تم کو ضرور بتا دیتے۔ لڈوؤں کا بھی صرف اس لیے بتا دیا کہ تم میرے لیے فکر مند بنیں۔ لیکن وعدہ کرو۔ اب آگے تم کسی سے نہیں کہو گی ورنہ میری تو شامت آجائے گی۔“

انہوں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تو اس نے بھی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔



شام کو اپنا ہوم ورک ختم کرنے کے بعد وہ باہر نکلی ہی تھی جب ٹھک سے کوئی چیز آکر اس کے سر پہ لگی۔

”ہائے اللہ!“ وہ بری طرح خوفزدہ ہو کر چٹائی اور پھر بے اختیار ہی سر اٹھا کر اوپر دیکھا، وہ محبت تھا۔ دانت نکالتا منہ چڑاتا ہوا غالباً آج ہی ہاسٹل سے واپس آیا تھا مابین کو ہمہ وقت منہ پھاڑ کر ہنسنے اور وقت بے وقت کھانے والا اپنا یہ کزن بہت برا لگتا تھا۔ وہ اس سے محض دو جماعتیں آگے تھا مگر رعب اتنا جماتا تھا کہ وہ بری طرح خار کھانے لگی تھی اس سے۔ اس کی ان ہی بے تسلی حرکات سے تنگ آکر اسے سدھارنے کے لیے ہی بڑے ماموں نے اسے ہاسٹل میں بھجوا دیا تھا مگر لگتا تھا کہ ہاسٹل بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا۔ وہ جوں کا توں ویسا ہی تھا۔ اب بھی گاجر کھاتے کھاتے اس کے سر پہ دے ماری تھی۔ وہ غصے سے سر جھٹکتی کچن میں رتو کے پاس آگئی۔ کئی بوا امٹر کے دانے نکال رہی تھیں۔ رتو پیاز کاٹ رہی تھی اور دونوں کے بیچ مکالمہ حسب معمول جاری تھا۔

”اے بدھو! یہ پیاز اس طرح سے کاٹتے ہیں۔“ کئی بوا کو رتو کا ہر کام ناپسند تھا۔

”ہاں تو اور کس طرح کاٹتے ہیں، سر نیچے ٹانگیں اوپر کر کے۔“ رتو بھی کھی کر کے ہنسنے لگی۔ مابین نے برابر اس کا ساتھ دیا تھا۔

”ادھر لا۔۔۔ میں خود کاٹ لیتی ہوں۔۔۔ تو جا کے برتن دھو لے۔“

”لو میں کیوں دھوؤں۔۔۔ صبح میں نے دھوئے تھے۔۔۔ اب تمہاری باری ہے۔“

”آئے ہائے۔ شرم نہیں آتی کیا بوڑھی نانی سے مقابلہ کرتی ہو۔“ کئی بوا نے تاسف سے اسے

دیکھا۔

”بوڑھی نانی بھی تو مقابلے کے لیے ہر دمنٹ بعد باورچی خانے میں بھاگی آتی ہے۔ اتنی بار تو کہا ہے۔۔۔ سب کچھ مجھے یہ چھوڑ دو۔ کرلوں گی سب کھانا تیار۔۔۔“ رتو بھی جھنجھالی ہوئی تھی۔

”اے۔۔۔ دیکھ، دیکھ ذرا کیسے بکری کی طرح چرتی ہے۔“ رتو نے مٹر کے دانے اٹھا کر پھانکے تو

کئی بوا نے زوردار چیت اس کے ہاتھ پہ دے ماری۔ رتو نے پہلے ہی کہتے ہوئے اپنا ہاتھ کھینچا، غصے سے کئی بوا کو گھورا اور پھر کھٹکھٹا کر ہنس دی۔

”شکر کرو، بکری کی طرح چرتی ہوں۔ اونٹ کی طرح چرنے لگی تو تم کو بھی نگل جاؤں گی کئی بوا! وہ

بھی سالم۔“

”چل ہٹ مردوونی نہ ہو تو دفع ہو جا یہاں سے۔ میں خود کرلوں گی سب کام۔“ کئی بوا کنگیر لے کر اس کی طرف لپکیں تو وہ جھپٹ مابین کا ہاتھ تھام کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”جانی ہوں، لیکن رات کو ہڈیاں تھک کر چور ہو گئیں تو مجھ سے مت کہنا دبانے کو ہاں۔“

اس نے مٹھی میں پکڑے مٹر کے دانے پھانکتے ہوئے کہا اور باورچی خانے سے باہر آگئی۔ پیچھے کئی بوا بڑبڑاتی رہ گئی تھیں۔ وہ باورچی خانے سے نکل کر صحن میں آئیں تو محبت ممانی کی گود میں سر رکھے چار پائی پر آڑا تر چھالینا ہوا تھا۔ وہ فریب سے گزرنے لگیں تو محبت نے فوراً اپنی ٹانگ سامنے کر دی۔ مابین گرتے گرتے بچی۔

”کیا تکلیف ہے تم کو؟“ وہ غصے سے بولی۔

”کوئی تکلیف نہیں۔“ وہ بڑے آرام سے کہتے ہوئے کروٹ بدل گیا۔ پھر رات تک یہ ہی سلسلہ چلتا رہا۔ وہ ڈانٹنگ ٹیبل تک آرہی تھی جب اس نے دوبارہ یہی حرکت کی۔ وہ اتفاقاً ہی ایک بار پھر گرنے سے بچ گئی تھی اور اگر بڑی ممانی وہاں موجود نہ ہوتیں تو شاید مابین ان کے لاڈلے سپوت کو مزا چکھا دیتی۔ ڈانٹنگ ٹیبل تک آکر وہ بیٹھنے ہی والی تھی جب اس نے اچانک پیچھے سے کرسی اپنی طرف گھسیٹ لی۔ اب کی دفعہ بچاؤ ممکن نہ ہو سکا تھا۔ وہ دھڑام سے گری تو ہر فریاد پانی جگہ چونک گیا تھا۔ تکلیف سے زیادہ شرمندگی نے اسے رونے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور وہ تھا کہ ڈھیٹ بنا اسے اٹھانے کو سب سے پہلے بھاگا چلا آیا تھا۔

”معاف کرنا بھی مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ تم اس کرسی پر بیٹھنے والی ہو۔“

”جھوٹ مت بولو، تم نے جان بوجھ کر۔“ وہ روتے روتے چلائی، بڑے ماموں نے محبت کو ڈانٹنا چاہا مگر نجمہ خالہ نے فوراً ٹوک دیا۔

”اب خواخواہ اسے پریشان مت کریں۔ کہہ تو دیا اس نے کہ وہ لاعلم تھا۔“

بڑے ماموں خاموش ہو رہے لیکن مابین اٹھ کر باہر بھاگ آئی۔ اسے معلوم تھا اب وہ ”لمبو“ چان بوجھ کر کھانے کے دوران اسے چڑائے گا۔ رتو باورچی خانے میں بیٹھی کھانا کھا رہی تھی وہ بھی آنسو پونچھتی اسی کے ساتھ کھانے بیٹھ گئی۔

”کئی بوا! اس چاند گرہن یہ بھی تھوڑا سا ترس کھا لو، بے چارہ تیسری مرتبہ بھی کھٹکھارتا ہوا یونہی لوٹ گیا ہے۔“ رتو نے مصروف سی کئی بوا کو ٹوکا۔

”ہاں، اس نواب زادے کو بٹھا دوں پہلے کھانے کو اور وہ جو سارا کنبہ میز پہ بیٹھا کئی بوا کی راہ تک رہا ہے۔“ کئی بوا نے اسے جھڑکا اور نرے میں ڈونگے رکھ کر ڈانٹنگ روم کی طرف لپکیں۔ رتو کندھے اچکا کر مابین کے لیے سالن نکالنے لگی تھی۔ اور پھر جب تک محبت یہاں رہا،

وہ اس کے سائے سے بھی بچتی رہی۔ ادھر وہ چھٹیاں گزار کر ہاسٹل کی طرف روانہ ہوا ادھر ماہین نے شکر کا کلمہ ادا کیا۔



ماہین کا پانچویں کارزلٹ آؤٹ ہو گیا تھا۔ کلاس میں اس کی دوسری پوزیشن تھی اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح اڑ کر گھر پہنچ جائے۔
”سب سے پہلے اماں کو بتاؤں گی پھر چاند بھیا کو اور پھر تو کو، باقی گھر والوں کو اماں خود ہی بتا دیں گی۔“

وہ دل ہی دل میں منصوبہ بناتی رہی مگر جب گھر پہنچی تو وہاں گھسمان کارن پڑا تھا۔ نجمہ خالہ کی چیخ و پکار سن کر وہ ڈیوڑھی میں ہی دیک گئی تھی۔ بھرے بال، وحشت زدہ چہرہ، منہ سے کف اڑاتے وہ صحن کے عین وسط میں کھڑی نجانے کیا کچھ بول رہی تھیں۔ ماہین تو ایک لفظ بھی سمجھ نہ پائی تھی۔ غصے میں بولتے بولتے نجمہ خالہ نے چار پائی کے پاس بڑی چھوٹی سی میز بھی الٹ دی تھی۔ میز پر بڑے چائے کے برتن اور جگ گلاس کرجیوں کی صورت پورے صحن میں بکھر گئے تھے۔ وہ تو خوفزدہ ہو کر کئی بوا کی گود میں چھپ گئی۔ چھوٹی ممانی کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کمرے میں گھس گئیں۔ بڑی ممانی دونوں ہاتھوں میں سر دیے بیٹھی تھیں۔ اماں گاہے گاہے نجمہ خالہ کو پکارتے ہوئے انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نجمہ خالہ کبھی جھپکتی اپنے کمرے میں بند ہو گئیں۔ ماہین کی بوا کی گود سے نکل کر اماں کے کندھے سے چپک گئی۔ تب ہی چھوٹی ممانی کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔

”اللہ میری توبہ، زبان ہے کہ بیٹی۔ کیسی کتر کتر چلتی ہے۔ اے آبا تمہاری بہن ہے۔ ہو سکتا ہے، تمہیں برا لگے لیکن میں تو کہتی ہوں اس کا دماغ ٹھکانے نہیں۔ اچھا ہوگا کہ کسی نفسیات کے ڈاکٹر کو دکھا کر اس کا علاج معالجہ کروائیے۔ بھلا کوئی یوں بھی ذرا سی بات پر مرنے مارنے پر تزل جاتا ہے، ذرا مزاج کے خلاف بات ہوئی اور محترمہ سارے ادب آداب بھول گئیں۔ اس یتیم کا خون الگ چوسے رکھتی ہیں۔“

چھوٹی ممانی اپنی بے گناہی ثابت کرنے کو بلکان ہوئی جارہی تھیں۔
”اے بات کیا ہوئی اصل میں؟“ بڑی ممانی، نجمہ خالہ کی چیخ و پکار سن کر نیچے آئی تھیں، لہذا اصل بات سے لاعلم تھیں۔

”ارے بات کیا ہوئی تھی۔۔۔ بھلائی کا تو آج کل زمانہ ہی نہیں رہا۔ یہ اپنا چاند ہے ناں؟“
ماہین کو حیرت ہوئی۔ آج چھوٹی ممانی کو نجانے کیسے چاند میں اپنا پن نظر آ گیا تھا۔ تاہم وہ اپنے خیال کو جھپٹتی ہوئی دوبارہ ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

”بے چارہ سارا دن بازار کی خاک چھان کر اناج کے تیلے بھر بھر کے لایا تھا۔ ابھی سانس بھی نہ لے پایا ہوگا کہ ہماری نند کو یاد آیا کہ انہیں بازار سے کچھ کتابیں منگوائی ہیں۔ کوئی پوچھنے والا ہو تو پوچھ کہ ابھی گھڑی بھر پہلے تو چاند سب سے پوچھ کر گیا تھا کہ اگر کسی کو بازار سے کوئی چیز منگوائی ہو تو بتا دے۔ اس وقت کیوں منہ میں گھنٹھنیاں ڈال کر بیٹھی رہیں۔ خیر وہ کتابیں لینے بازار چل دیا۔ وہاں سے لوٹا تو سینڈل کی مرمت کروانے کو بھجوا دیا۔ وہ بیچارہ حکم کا غلام سینڈل کی مرمت بھی کروا کر لایا۔ اب خدا جانے اچھے بھلے کام میں کیا نقص نظر آیا کہ لے کے چاند کے پیچھے ہی پڑ گئیں۔ اتنی جھاڑ پلائی اس بے زبان کو کہ بس

کچھ نہ پوچھو۔ میری غلطی جو میں نے اس کی طرف داری میں دو جملے بول گئی۔ ارے وہ تو ہتھے سے ہی اکھڑ گئیں۔“

”ارے کنیز! تم نے بھی تو بھڑوں کے چھتے مس ہاتھ ڈالنے والی بات کی تھی۔ جانتی تو ہو سارا معاملہ۔ مٹ ٹانگ اڑا کر واس کے کاموں میں۔“ بڑی ممانی نے نصیحت کی۔ اماں چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی رہیں۔

”بس کیا کروں، اس یتیم بے آسرا کی درگت بننے دکھ کر یونہی دل پہنچ گیا۔ کیا معلوم تھا، قیامت کا رخ میری طرف ہو جائے گا۔“ چھوٹی ممانی نے گویا اپنے غلطی پر پچھتاتے ہوئے ہاتھ مسلتے تھے۔

”اللہ بخشے! میاں جی زندہ تھے تو کسی کی زبان اتنی آزاد تھی نہ ہاتھ اب روکنے والا کون ہے۔ بھائی سمجھا سمجھا کر تھک گئے۔ ہم کچھ کہیں تو انا ہم ہی بدنام۔ میں تو بس ڈرتی ہوں، کبھی جو اس غریب کے دل سے نجمہ کے لیے آہ نکل گئی تو ساری عمر گئے وقتوں کو روئے گی۔ خدا ہی اسے ہدایت دے۔“ چھوٹی ممانی طویل سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

ماہین بھی جیکے سے وہاں سے اٹھ گئی۔ کچن میں جا کر تو کو دیکھا مگر وہ وہاں نہیں تھی۔ چاند بھیا کے کمرے تک آئی تو ان کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس کی بار بار کی دستک کے جواب میں بھی نہ کھلا۔ زلٹ کی ساری خوشی ہوا ہو گئی تھی۔ وہ مرے مرے قدم اٹھائی کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔ شام تک گھر کی فضا یونہی مکدر رہی۔ نجمہ خالہ کسی طور کمرے سے باہر نکلنے پر رضامند نہ تھیں۔



ماہین بڑی ممانی سے سوٹ سینا سیکھ رہی تھی۔ ابھی بھی وہ ان سے اپنا کرتا کٹوا کر دو، دو سیڑھیاں پھلانگی ہوئی نیچے آ رہی تھی۔ اتفاقاً عین اسی وقت محبت نے اوپر جانے کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تھا۔ حسب معمول رگ شرارت ابھری تو وہ تیزی سے دو سیڑھیاں اوپر چڑھ گیا اور جوہی ماہین اس کے پاس آئی۔ اس کی ٹانگ فوراً حرکت میں آ گئی تھی۔ ماہین کے لیے یہ رکاوٹ انتہائی غیر متوقع تھی۔ وہ تیسری سیڑھی سے لڑکھڑائی تو سیدھی پکی اینٹوں کے فرش پر جا گری۔ اگلے ہی لمحے سارا گھر اس کی چیخوں سے گونج اٹھا تھا۔ سیڑھیوں پر کھڑے محبت کا رنگ یک لحظ ہی زرد ہو گیا تھا۔ ماہین کو سیڑھیوں سے لڑکھڑاتے اور گرتے دیکھ کر ہی اسے احساس ہوا کہ اس کی اس حرکت کا نتیجہ کتنا خوفناک ہو سکتا ہے اور پھر وہی ہوا، ماہین بری طرح روتی اور چیختی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھی تو ٹھوڑی پہ رکھا اس کا ہاتھ خون سے بھر چکا تھا۔ محبت کا دل ایک لمحے کے لیے رک سا گیا۔ وہ اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ تب ہی برآمدے میں کرسی پہ بیٹھے عبید بھیا اپنی کتابیں پھینکتے ہوئے کئی کی سی تیزی سے اس تک آئے تھے۔

”اوہ میرے خدا! ہاتھ پیچھے ہٹاؤ۔“ عبید بھیا نے سختی سے اس کے دونوں ہاتھ ہٹا کر اپنا رومال اس کی ٹھوڑی پر رکھ دیا تھا۔ لیکن اس دوران ایک لمحے میں محبت کا ڈھس سرخ خون کو ٹھوڑی سے بہہ کر گردن تک آتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ عبید بھیا روتی ہوئی ماہین کو ساتھ لیے غلت میں ڈاکٹر کے پاس بھاگ گئے تھے۔ محبت مرے مرے قدموں سے بقیہ سیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔ پچھتاوے کا شدید احساس اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو رہا تھا۔ وہ اب اتنا جھوٹا نہیں تھا کہ یہ جرتیں اسے زیب دیتیں یا وہ اس قسم کی حرکتوں کے خطرناک نتائج سے ناواقف ہوتا۔ لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ ماہین کے رستے میں ٹانگ اڑاتے ہوئے

اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ صورت حال اس قدر سنگین بھی ہو سکتی ہے۔ اس سے پہلے تو وہ ہمیشہ ہی اپنے گھٹنے جھاڑتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوتی۔۔۔ ناراضی کا شدید اظہار کرتی یا پھر اسی پہ پل پڑتی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں لیٹا خود کو اس حرکت کے لیے لعنت ملامت کرتا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد اسی کو بھی خبر ہو گئی صرف چوٹ لگنے کی۔۔۔ کیسے لگی؟ یہ انہیں بھی نہیں بتاتا تھا کیونکہ عبید بھیا کو بھی اتنا ہی معلوم تھا کہ وہ میٹر ہیوں سے گری ہے اور جو گرنے کی وجہ سے باخبر تھی۔ وہ انجکشن کے زیر اثر سو رہی تھی۔

”ہائے ہائے۔ تین ٹانگے لگے ہیں بپاری کے۔ رنگ بھی کیسا زرد پڑ گیا ہے۔“

بڑی ممانی کہہ رہی تھیں۔ وہ شرمندگی میں ڈوبا جا رہا تھا۔ پھر اس کی ہمت ہی نہ پڑی تھی نیچے جا کر اس کی خیریت معلوم کرنے کی اور کچھ دن گزرنے کے بعد وہ یونہی چپکے سے ہاسٹل واپس چلا آیا تھا۔

اگلی دفعہ اس کی آمد ہوئی تو اس کے زخم پر کھر نڈا چکا تھا اور ناراضی بھی غائب تھی۔ وہ نارمل انداز میں اس سے بات کرتی رہی مگر اس کے اپنے دل میں ہی چور تھا کہ وہ اس سے نگاہ ملا کر بات نہیں کر سکا تھا۔ پھر زخم پر سے کھر نڈ بھی اتر گیا لیکن نشان مستقل رہ گیا جو اس کی صاف و شفاف رنگت پہ بد نما لگنے کے بجائے خوب صورت لگنے لگا تھا۔ کم از کم محبت کو تو خوب صورت ہی لگتا تھا۔

اور پھر ایک دفعہ جب وہ اپنا ایف اے کا امتحان دے کر آیا تو وہ اس کے عین سامنے کھڑی اسے چڑا رہی تھی۔

”میٹرک میں میرا اے پلس آیا ہے۔ تم نے تو اے گریڈ لیا تھا ناں۔“

اور وہ جواب دینے کے بجائے اس کی ٹھوڑی پہ لگے نشان کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل چاہتا تھا وہ اسے بتائے۔ ”یہ نشان مجھے بہت تنگ کرنے لگا ہے۔ میں چاند کو دیکھوں تو اس کے داغ مجھے اس داغ کی یاد دلا دیتے ہیں جو میری وجہ سے تمہارے چہرے پہ لگا اور یہ داغ اب میری رات کی گھورتا ریکیوں میں آکر چاند کی طرح ہی جگمگانے لگتا ہے اور میری آنکھوں سے نیند اڑ جاتی ہے۔“

”اب خاموش کیوں ہو گئے؟“ وہ اس کے مقابل کھڑی اسے چڑا رہی تھی۔ وہ بہت خاموشی سے آگے بڑھ کر اس کے نزدیک ہوا تھا اور ہاتھ بڑھا کر زخم کے اس نشان کو چھونے لگا تھا۔

”خدا کی قسم۔ اس نشان کو ساری عمر پوچوں گا میں۔“ اس نے دل میں عہد کیا تھا۔

”کیا ہوا؟“ ماہین کو اس کے کم صم سے انداز پر حیرت ہوئی۔

”آئی ایم سوری ماہین۔“ اس نے ہاتھ ہٹا کر کہا تھا اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا تھا۔ ماہین نے ٹھوڑی پہ لگے نشان کو اپنی پوروں سے چھوا اور پھر حیرت سے کندھے اچکا کر رہ گئی۔ وہ محبت کے اس انداز کو کچھ سمجھ نہ پاتی تھی۔



آج صبح سے ہی بادلوں نے آسمان پہ ڈیرا جما رکھا تھا۔ ماہین کا ارادہ کالج سے چھٹی کا تھا۔ مگر بڑے ماموں اس معاملے میں کافی سختی کرتے تھے۔ ادھر انہوں نے ذرا ڈپٹ کر بات کی، ادھر وہ جھٹ پٹ تیار ہو کر عبید بھیا کی گاڑی میں جا بیٹھی۔ یہ اور بات کہ کالج میں سارا دن بارش نہ ہونے کی دعائیں اس کے لبوں سے جاری ہوتی رہیں۔ بارش کے ساتھ بجلی کی کڑک کا تصور ہی اس کے اعصاب پر کوڑے

کی طرح لگتا تھا۔ اللہ اللہ کر کے چھٹی ہوئی تو وہ کالج سے آتے ہی سیدھی اپنے کمرے میں گھس گئی اور پھر روتے روتے لاکھ اکسائے پر بھی ہاتھ نہیں نکلی، کھانا بھی وہیں منگوا کر کھایا اور پھر لیٹ گئی۔ تو کچھ دیر تک اس کا سر کھاتی رہی۔ پھر اکتا گئی تو مجھ بھلا کر اس پہ پل پڑی۔

”اس سے تو اچھا ہے، کوئی گنبد بنا لو اور اس موسم میں قید ہو جایا کرو۔“ تو اس کی مسلسل جوابی مسکراہٹ سے چڑ کر باہر نکل گئی۔

اماں کی کام سے کمرے میں آئیں تو وہ چھلانگ لگا کر چار پائی سے اتری اور اپنی سے لپٹ گئی۔ لاکھ انہوں نے مصروفیت کا بہانا بنایا۔ پیار سے سمجھایا۔ ٹکھو کا بھی مگر وہ چھوڑنے کو تیار ہی نہ تھی۔ مجبوراً انہیں اس کے ساتھ لیٹنا ہی پڑا۔ جانے کیسا خوف مایا تھا بچپن سے اس کے دل میں جو کسی صورت پیچھا چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ وہیں لیٹے لیٹے وہ سو گئی تو اماں آہستگی سے اٹھ کر وہاں سے چلی آئیں۔ نئی بوا کی طبیعت آج ٹھیک نہیں تھی۔ انہیں باورچی خانے میں رتو کا ہاتھ بٹانا تھا۔

ماہین کمرے میں مزے سے کھل اڑھے سوئی رہی۔ باہر سب خرام ہوا میں تیزی آگئی تھی۔ بارش پہلے ہلکی ہلکی پھوار کی صورت برسی اور پھر آنا فانا ہی آسمان سے زمین تک پانی کی ایک چادری تن گئی تھی۔

”رتو! ذرا جا کر ماہین کو تو اٹھا لا۔۔۔ لاؤنچ میں آکر سب کے ساتھ بیٹھ جائے ورنہ خواہنا وہ ہی وہاں اکیلی ڈرتی رہے گی۔“ اماں نے برتن صاف کر کے رتو کو تاکہ کی تھی۔

”اچھا ابھی جاتی ہوں۔ بس یہ ایک دو پلیٹیں رہ گئی ہیں۔“ رتو کو کام نمٹانے کی جلدی تھی۔۔۔ ذرا سی دیر میں وہ بھول بھی گئی کہ اماں نے اس سے کوئی کام کہا تھا۔



ٹھک کی زوردار آواز سے کھڑکی کھلی تو ماہین کی آنکھ فوراً ہی کھل گئی۔ چند لمحوں کے لیے اسے سوچنا پڑا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ تب ہی کھلی کھڑکی سے سردی آلود ہوا کا جھونکا کمرے میں داخل ہوا تو وہ جھرجھری میتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ سوئے سوئے اعصاب میں تحریک ہوئی تو بارش کا شور۔۔۔ بادلوں کی کھن گرج اس کے لاشعور میں ڈوبے بچپن کے کسی انتہائی خوفناک لمحے کو یکدم ہی اچھال کر شعور کی سطح پر پھینک گئی۔

”اماں۔“ اس نے سرسراہٹ آواز کے ساتھ اماں کو پکار تے ہوئے چار پائی پہ ادھر ادھر ہاتھ مارا۔

ان کی غیر موجودگی کا احساس اسے لمحہ بھر میں پانچ سالہ ماہین میں بدل گیا تھا۔ تاریک کمرے سے ایک اندھیری قبر کی مانند لگ رہا تھا۔

”اماں۔“ وہ برق رفتاری سے چار پائی سے اتر کر برابر والی چار پائی پہ ہاتھ مارنے لگی۔ اچانک نیند سے اٹھنے اور کمرے میں گھپ اندھیرے کے باعث وہ نہ سمت کا تعین کر پار ہی تھی نہ مقام کا۔ اسے لگا وہ واقعی ایک گنبد میں قید ہے جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

”اف میں مر جاؤں گی۔ میرا سانس گھٹ رہا ہے۔“ اسے اپنی آواز حد درجہ اجنبی محسوس ہوئی تھی۔ لمبے لمبے سانس لیتی وہ دروازے کی تلاش میں اندھا دھند آگے بڑھی تو ایک سپاٹ دیوار سے ٹکرائی۔ وہاں سے پلٹی تو پاؤں غالباً میز کے پائے سے ٹکرا گیا۔ درد کی ایک شدید لہر پاؤں کے انگوٹھے سے ہو کر جسم میں پھیلتی چلی گئی۔ منہ سے نکلنے والی بے اختیار کراہ نے اسے روہانسا کر دیا تھا۔ یونہی دیواروں کو ٹٹوتے ہوئے اچانک اس کا ہاتھ دروازے سے ٹکرایا تو ایک لمحے کی بھی دیر کے بغیر وہ جھٹکے سے دروازہ

کھول کر باہر نکل آئی تھی۔

”اماں! رتو!“ اس نے برآمدے میں آتے ہوئے زور سے پکارا۔ لاؤنج کے دروازے سے روشنی کی ننھی منی کرنیں باہر نکل رہی تھیں وہ خود کو تسلی دیتی تیزی سے آگے بڑھی۔ برآمدے میں آنے والی بارش کی بو چھاڑنے سے ایک منٹ میں بھگودیا تھا۔ تب ہی دور کہیں بجلی کڑکی تھی۔ وہ سر تا پا کانپی تو پاؤں خود بخود ہی کھیلنے لگے فرش سے پھسل گیا۔

”آہ۔“ ہلکی سی چیخ کے ساتھ اس نے بے اختیار ہی ستون کو تھام کر خود کو گرنے سے بچایا۔

”کون۔۔۔؟ کون ہے ادھر۔۔۔؟“ کوئی اس کے آس پاس ہی بولا تھا۔ پھر برآمدے کی سیڑھیوں پر قدم رکھنے کی آواز آئی۔ آنے والا بارش سے بچنے کی خاطر بہت عجلت میں قدم اٹھا رہا تھا۔ ”کون ہے جی یہاں؟“ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کی طرف آیا۔ مابین اسے پہچان سکی تھی۔ ”محبت! میں۔“

”کون مابین۔۔۔ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ وہ حیرت زدہ سا اس کے نزدیک آیا تو مابین نے فوراً ہی اس کا بازو دو بونچ لیا۔

”وہ مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔“ مابین کو احساس ہوا کہ اس کی آواز اور جسم دونوں بری طرح لرز رہے تھے۔

”دشش۔۔۔ شاید لائٹ نہیں ہے۔۔۔ بہت اندھیرا ہو رہا تھا۔“ اس نے انک انک کر بتایا۔ ”نہیں۔ لائٹ تو ہے لیکن برآمدے میں لائٹ جلانے کی کسی نے زحمت نہیں کی ہوگی۔“ وہ اس کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھا تھا پھر اندازے سے ہی دیوار پر سوچ بورڈ کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر اس نے دو چار بٹن اکٹھے ہی دبا دیے۔ برآمدے میں ایک تیز روشنی پھیل گئی تھی۔

مابین کی جان میں جان آئی تب ہی اسے احساس ہوا کہ اس کے پاس نہ دوپٹہ تھا نہ پیروں میں چپل۔ عام سادہ سے سوٹ میں وہ اب ڈر، خوف سے زیادہ ہوا کے سرد جھونکوں سے کانپ رہی تھی۔ ”تمہارے کمرے میں لائٹ تو ہے ناں؟ شام کو ہی جلا لیا کرو۔“ وہ اس کی حالت پر توجہ دیے بغیر اس کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔

”جی کہاں ہے سوچ بورڈ، مجھے تو نہیں مل رہا۔“ وہ ایک دیوار پر اندازاً ہاتھ مارنے کے بعد اس کی طرف پلٹا تو اس نے آگے بڑھ کر لائٹ آن کر دی تھی۔

”تھینک گاڈ! تھوڑی روشنی تو ہوئی ورنہ تمہارا کمر اتنا اندھیرا غار کا منظر پیش کر رہا تھا۔“ وہ پلٹ کر عین وسط میں کھڑا ہو کر باہر جھانکنے لگا۔

”محبت رکو! جانا نہیں۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہی لاؤنج تک چلتی ہوں۔“

وہ اسے دروازے کی طرف جاتا دیکھ کر گھبرا سی گئی تھی۔ جلدی سے اپنی چارپائی سے دوپٹہ اٹھا کر کندھے پر رکھا پھر چارپائی کے نیچے سے چپل نکال کر عجلت میں پہننے لگی تو پیر کے انگوٹھے کا ٹوٹا ہوا ناخن چپل میں پھنس کر مزید ادھر گیا۔ بے اختیار ہی ایک ہلکی سی سسکاری نے اسے پیر واپس کھینچ لیا تھا۔ ”میں ابھی یہیں کھڑا ہوا ہوں۔ جیسی تم آرام سے۔ ارے۔“ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اس کی طرف آیا اور پھر انگوٹھے کے ناخن سے رستا خون دیکھ کر اپنی جگہ ٹھک سا گیا اور وہ خواہواہ اتنا شرمندہ

ہوئی کہ جھک کر دوپٹے کے کونے سے ہی انگوٹھے کو دبا دیا۔

”یہ کیا کر رہی ہو تم؟“ محبت نے حیرت سے پہلے اس کے چہرے کی اڑی اڑی رنگت کو دیکھا اور پھر آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ روکتے ہوئے دوپٹے کو زخم سے ہٹا دیا۔

”اس کو ڈیٹول سے صاف کر کے اس پر پٹی باندھ لو۔ آخر کیوں اتنا گھبرا رہی ہو۔ پہلے اندھیرے سے ڈر لگ رہا تھا مگر اب تو اندھیرا نہیں ہے بلکہ یہ لو، میں یہیں بیٹھا ہوں۔ تم بے فکر ہو جاؤ۔ ہمیں تنہا اس غار میں چھوڑ کر ہرگز نہیں جاؤں گا۔“ وہ آرام سے چارپائی پر دروازہ ہو گیا تھا۔

مابین خاموشی سے پلٹ کر کچپاتے ہاتھوں سے نئی پلاسٹ نکالنے لگی۔ اب اسے کیا بتاتی کہ ڈر اور خوف تو اسے دیکھتے ہی ختم ہو گیا تھا۔ اب تو بس شرمندگی ہی شرمندگی تھی۔ وہ جانتی تھی، صبح یہ محبت جب شرافت کا لبادہ اتار چھینے گا تو اس کی اس کمزوری پر اس کا کس قدر مذاق بنائے گا اور ہوائے گا۔

وہ انہی اپنے کام سے فارغ ہوئی ہی تھی جب رتو آدھسکی۔

”لو جی۔ تم تو بہت آرام سے بیٹھی ہو۔ وہاں تمہاری اماں نہ صرف خود ہول رہی تھیں بلکہ مجھے بھی ہولائے دے رہی تھیں۔ مابین اندھیرے سے ڈرتی ہے۔ بجلی سے خوفزدہ ہو جاتی ہے۔ بارش سے گھبرا جاتی ہے اور اگر مجھے پتا ہوتا محبت صاحب ادھر بیٹھے ہیں تو جی بھئی، میں نے آرام سے وہاں ڈراما دیکھنے بیٹھ جانا تھا۔“

”تو دیکھ لیتیں ناں ڈراما۔۔۔ کس نے بلایا تھا تمہیں جو یوں بھاگی چلی آئی ہو؟ کوئی مرے یا جیے تمہاری بلا سے۔“ اسے اپنی شرمندگی مٹانے کا اور کوئی طریقہ سمجھ میں نہ آیا تو رتو پر ہی ٹوٹ پڑی۔ وہ بے چاری ہلکا سا اس کا منہ دیکھنے لگی۔ جبکہ محبت بے اختیار ہنس دیا تھا۔

”چھپا بھی رتو! اب تم آگئی ہو تو میں چلتا ہوں۔“

”ارے بیٹھو ناں؟“ رتو نے اسے اٹھتا دیکھ کر فوراً کہا تو اس نے نفی میں سر ہلادیا۔

”نہیں۔ گرم گرم بستر چھوڑ کر آیا ہوں اور ہاں۔۔۔“ وہ دروازے کی طرف جاتے جاتے پلٹا۔ ”اب اسے تنہا چھوڑ کر مت جانا۔ ضروری نہیں کہ ہر بار میرا دل درست کٹل ہی دے۔“ وہ معنی خیز انداز میں کہتا کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

رتو نے الجھن آمیز نگاہوں سے مابین کی طرف دیکھا۔

”کچھ نہیں۔ اس کی تو عادت ہے خواہواہ بولنے کی۔ تم بتاؤ! اماں کہاں ہیں۔“ اس نے جان بوجھ کر بات بدل دی کہ محبت کے بدلتے تیوروں نے خود اسے بھی الجھا کر رکھ دیا تھا۔

”جی ظاہر ہے، اس برسی بارش میں رات کے وقت وہ کہاں ہو سکتی ہیں، لاؤنج میں ہوں گی یا کچن میں۔ ویسے جب میں یہاں آئی تو بڑی صابہ انہیں اپنے کمرے میں بلا رہی تھیں۔“ رتو نے وضاحت کی تب ہی زوردار طریقے سے بجلی کڑکی تھی۔ مابین ہلکا سا کچپا کر فوراً ہی رتو کے پاس بیٹھ گئی تھی۔

”سنو، دروازے پر دستک ہو رہی ہے کیا؟“ رتو نے اچانک ہی کہا تو وہ بھی سن گن لینے لگی۔

”نہیں جی، وہم ہے تمہارا۔ اس بارش میں بھلا کون دستک دے گا۔“ مابین نے اسے جھٹلانا چاہا مگر وہ ایک دم ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”میں دیکھتی ہوں جا کر۔“ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی باہر نکل گئی اور اس کو روکنے کی مابین کوشش بھی نہ کر سکی۔

”کتنی بے وقوف ہے۔ گھر کے کسی مرد کو کہنے کے بجائے خود چل دی ہے۔“ وہ کھلی کھڑکی سے رتو کو بارش میں بھاگ کر دروازے کی طرف جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ ذرا دیر بعد وہ واپس لوٹی تو ایک اور بیولا سا اس کے ساتھ تھا۔

”یہ کون ہو سکتا ہے؟“ اس نے تعجب سے تاریک صحن میں رتو کے برابر آتے اس سائے کو دیکھ کر سوچا۔

”ارے چاند بھیا۔“ برآمدے کی زرد روشنی میں وہ بھیگا سر اپا واضح ہوا تو وہ چار پائی سے اتر کر احتیاط سے چپل پہنتے ہوئے باہر کی طرف لپکی۔

”آپ اس موسلا دھار بارش میں کہاں سے آرہے ہیں؟“

چاند بھیا نے گیلی بالوں کو انگلیوں سے جھٹکتے ہوئے ایک دم رک کر اس کو دیکھا۔

”کسی کام سے گیا تھا۔“

”ایسا کون سا کام تھا جو صبح نہیں ہو سکتا تھا۔“ ہوا کے جھونکے پر اس نے کپکی لیتے ہوئے دونوں بازوؤں کو سینے پر لپیٹا۔

”نجمہ خالہ نے اپنی دوست سے قمیص کا کوئی ٹیڈیز این منگوانا تھا۔“ انہوں نے مختصر آیتایا۔

”پھر لے آئے۔۔۔؟“ ماہین نے ان کے خالی ہاتھوں کو دیکھا۔

”ان کی دوست گھر نہیں تھیں۔“ چاند بھیا نے قمیص کا دامن نیچڑتے ہوئے جواب دیا۔

”چنانچہ۔۔۔ نجمہ خالہ کی یادداشت کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔ خالہ کی یہ دوست ابھی کل ہی تو ان سے ملنے آئی تھی اور بتا کر گئی تھی کہ وہ ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جا رہی ہے۔“ رتو کا لہجہ کسی حد تک طنزیہ تھا۔

”ارے نجمہ خالہ! کبھی تو بے چارے چاند بھیا پر رحم کھالیا کریں۔ معلوم نہیں انہیں ایذا پہنچانے سے کون سی تسکین ملتی ہے آپ کو۔“ ماہین ان دونوں کے سامنے نجمہ خالہ کو برا بھلا تو نہیں کہہ سکتی تھی بس دل ہی دل میں ان کی بے بسی پر تاناؤ کھا کر رہ گئی تھی۔

”چاند بھیا! آپ کوئی سواری ہی لے لیتے۔“ وہ ان کی ہمدردی میں بس اتنا ہی کہہ سکی۔

”اس بارش میں سواری کہاں سے ملتی۔ دیے ان کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔“ چاند بھیا نے اسے متفکر دیکھ کر جھوٹی سلی دی ورنہ وہ دیکھ تو رہی تھی کہ چاند بھیا بری طرح بھیگ گئے تھے اور اب بار بار سردی کی وجہ سے جھرجھریاں لے رہے تھے۔

”رتو! تم کھڑی کیوں ہو؟ جا کر کھانا گرم کر دو ناں چاند بھیا کے لیے اور چائے بھی بناؤ۔“ وہ رتو کی طرف پلٹی مگر جواباً رتو نے ڈھیٹ بن کر صاف انکار کر دیا۔

”ہم سے نہیں بار بار کھانا گرم کیا جاتا جسے کھانا ہو وقت پر آ کے کھایا کرے ورنہ جیسا تپسا بھی ہو، کھاپی کر سوز رہے گی چائے تو وہ اسی وقت بنے گی جب سب گھر والوں نے پینی ہوگی، تب انہیں بھی مل جائے گی۔“

”اف کتنی بدتمیز ہو تم رتو۔“ اسے ج مچ رتو کا جواب بہت برا لگا تھا۔ چاند بھیا نجانے کیسے مروت

میں آ کر مسکرا دیے تھے۔

”ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔ ایسی خاطر میں ہم سے نہیں کی جاتیں۔ آپ کو زیادہ ہمدردی ہے تو جائے کچن میں ہم نے روکا تھوڑی ہے۔“ وہ بڑے مہذب انداز میں بدتمیزی کرتے ہوئے چلی تو سیدھا لاؤنج میں جا کر ہی دم لیا۔

”اس کا بھی کوئی علاج نہیں۔ خیر آپ تو جا کر جلدی سے کپڑے بدل لیں۔ اس بری طرح بھیگ گئے ہیں۔ ٹھنڈ لگ گئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ میں جا کر رتو کو دیکھتی ہوں۔ وہ کھانا آپ کے کمرے میں ہی دے جائے گی۔“ اس کے متفکر لہجے پر وہ زیر لب مسکراتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھے تو وہ بھی تیز قدم اٹھاتی کچن کی طرف آ گئی۔



صبح اٹھتے ہی اسے عجیب و غریب صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ آج چھٹی کا دن تھا اور چھٹی کے دن عموماً نگڑا سنا شتا تار کیا جاتا تھا۔ کبھی حلوہ پوری، کبھی نان بننے، کبھی کباب پر اٹھے اور اگر کچھ بھی نہ ہو تو ہر فرد اپنی پسند کا ناشتا کرتا تھا۔ لہذا کچن میں صبح سے ہی گہما گہمی اور ہانپل سی جج جایا کر رہی تھی۔ کھانے والے تو اپنے وقت پر ہی اٹھتے مگر بنانے والے ان گھڑیوں میں بہت مستعد نظر آیا کرتے تھے۔ مگر آج نہ تو کئی بوا کی ڈانٹ ڈپٹ سنائی دے رہی تھی نہ رتو کے جوابی حملے تھے اور تو اور چاند بھیا بھی منظر سے غائب تھے جو اس وقت عموماً ناشتے کا سامان لاتے، پودوں کی کاٹ چھانٹ کرتے اور کیار یوں کو پانی دینے میں مصروف نظر آیا کرتے۔

اس نے حیران ہوئے ہوئے باورچی خانے میں جھانکا۔ رتو گھٹنوں پہ ٹھوڑی رکے سکڑی بیٹھی تھی۔ کسی گہری سوچ میں گم۔ اس نے دو مرتبہ پکارا تب اس کے ساکت وجود میں حرکت ہوئی۔

”خیریت؟“ اس نے خاصی تشویش سے رتو کی خد درجہ فراغت کو دیکھا۔

”ہاں خیریت ہی خیریت۔“

”کئی ہوا؟“

”ناشتے کا سامان لینے گئی ہیں۔“ رتو نے بتایا تو وہ حیران حیران ہی اس کے سامنے آ بیٹھی۔

”کیوں بھی؟ وہ چاند بھیا کہاں گئے؟“ ماہین عرصہ دراز سے چاند بھیا کو بلا ناغہ یہ فریضہ سرانجام دیتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

”انہوں نے کہاں جانا تھا۔ بس گرہن لگ گیا انہیں۔“ رتو ذرا سانسہ لی۔

”مطلب۔۔۔؟“

”مطلب یہ کہ انہیں بخار ہو گیا ہے۔“ رتو نے بتایا تو وہ طویل سانس لے کر رہ گئی۔

”تو گویا رات کو بارش میں بھیگنا اپنا اثر دکھا گیا۔“ وہ دل ہی دل میں سوچتی ہوئی اٹھ کر چاند بھیا کے کمرے کی طرف آ گئی۔

”ارے چاند بھیا! یہ کیا ڈھونگ رچائے بیٹھے ہیں؟“ وہ بلند آواز میں کہتی ہوئی دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو گئی۔ چاند بھیا اس کی آواز سن کر اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے مگر ماہین نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر انہیں لیٹے رہنے پر مجبور کر دیا۔ بخار خاصا تیز لگ رہا تھا۔ تپا تپا سا چہرہ اور تیز ہونی

ہوئی سانسیں، چاند بھی آنکھیں بند کیے لیٹے تھے۔ وہ فوراً اپنے کمرے سے تھرما میٹر اٹھالائی۔
”کوئی دوا لی ہے کیا؟“ بخار چیک کرنے کے بعد اس نے پوچھا تو جواب حسب توقع نفی میں ملا تھا۔

”کوئی بات نہیں۔ میں ناشتا بھجواتی ہوں اور بخار کی گولیاں بھی کھا لیجئے گا۔ دومنٹ میں ٹھیک ہو جائیں گے۔“

وہ کہتی ہوئی باہر آگئی۔ صحن میں چہل قدمی کرتی نجمہ خالہ نے حد درجہ ناگواری سے اسے چاند بھیہا کے کمرے سے نکلتے دیکھا اور ٹھٹھک کر رک گئیں۔ ماہین نے جان بوجھ کر چاند بھیہا کی خرابی طبیعت کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا مگر وہ توجہ دے بغیر کیاریوں کا جائزہ لینے لگی تھیں۔ ماہین نے رتو کو چاند بھیہا کے لیے ناشتا بنانے کی آواز لگائی تب نجمہ خالہ نے جھٹ اسے ٹوک دیا۔

”پہلے میرے لیے ناشتا بنالینے دو پھر جس کی دل چاہے خاطر میں کرتی رہنا۔“ دلیہ کی طرف ہاتھ بڑھائی رتو پلٹ کر ایک بار پھر آملیٹ کے لیے پیاز کاٹنے لگی تھی۔

ماہین کو ایک دم ہی غصہ آ گیا تھا۔

”جی ہاں! پہلے انہیں ناشتا بنا دو۔ ان کی ٹرین چھوٹ رہی ہے۔ پتا نہیں کیسا پتھر دل ہے خالہ آپ کا۔ کوئی مرتے مرجائے مگر آپ کے معمولات میں فرق نہ آئے۔“

”شٹ اپ! زیادہ بات کی تو میں منہ توڑ دوں گی تمہارا۔“ نجمہ خالہ کی سرد آواز پر وہ خود بخود خاموش ہو گئی تھی۔ لیکن وہاں ٹھہرنا مشکل ہو گیا تھا یونہی جھنجھلائی ہوئی دھپ دھپ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ سامنے سے محبت دو، دو چار، چار سیڑھیاں پھلانگتا ہوا آرہا تھا۔

”کدھر کے ارادے ہیں بھئی؟ اوپر ای تو اٹھنے پر آمادہ نہیں۔ لہذا وہاں جانا بے کار ہے۔“

اس نے سیڑھی پر اس کے برابر آتے ہوئے انکی موڑ کر زبردست ٹھونگ اس کے سر پہ لگایا اور پھر قہقہہ لگا کر نیچے اتر گیا۔ بے وقت کی ہنسی۔۔۔ اس نے چڑ کر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر خیال آیا وہ بھی مقابلے پر اتر آیا تو رات کے واقعہ کی خوانخواہ ہی تشہیر کرتا پھرے گا۔ لہذا خاموشی ہی بہتر تھی۔ وہ وہیں سے پلٹ کر کچن میں آگئی۔

جلد ناشتے کے شوقین عبید بھیہا، محبت اور اسد ڈانٹنگ ٹیبل پر بیٹھے ہوئے تھے۔ زین آج کل گھر پہ کم کم ہی نظر آتا تھا۔ غالباً پڑھائی میں مصروف رہتا تھا۔ وہ باورچی خانے میں آئی تو رتو ڈبل روئی سینک رہی تھی۔

”چاند بھیہا کے لیے ناشتا بنا؟“

”کیا بچکی سے چلتی ہوں میں؟“ رتو اس سے بھی زیادہ جھنجھلائی ہوئی تھی۔ وہ بس دانت پیس کر رہ گئی تھی۔ دوسرے چوہے پر کی بوا پر اٹھنے بنا رہی تھیں۔ وہ وہیں اسٹول کھینچ کر بیٹھ گئی رتو نے انڈے فراکی کیے تو بڑے ماموں نے ابلے انڈوں کی فرمائش کی۔ انڈے لگے ساتھ ساتھ ماہین بھی کھولنے لگی۔

”ارے زمانے کو فارغ کر دو، انہیں یونہی بھوکا مرنے دو، یہاں کون سا کوئی پوچھنے والا ہے۔“ وہ تلملا کر وہاں سے اٹھ گئی۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد رتو نے آکر اطلاع دی۔

”دے آئی ہوں ناشتا تمہارے چاند بھیہا کو۔“

”اب بھی نہ دیتیں میری بلا سے۔۔۔“ وہ ناراضی سے بولی تو رتو بے اختیار ہنس دی۔
”چلو آؤ ناشتا کریں۔ صبح سے بڑی بھوک لگ رہی ہے۔“ اس نے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔
”چلتے ہیں، پہلے یہ گولیاں دے آؤ چاند بھیہا کو۔“ اس نے بخار کی گولیاں نکال کر رتو کو دیں۔
”میں باورچی خانے میں ہوں، وہیں آ جانا۔“ وہ رتو سے کہتی ہوئی باورچی خانے میں آگئی۔
”رتو! آخر کیوں کرتے ہیں سب لوگ ایسا؟ کیا چاند بھیہا انسان نہیں ہماری اور تمہاری طرح۔ پھر ان کی تکلیف پر کسی کا دل کیوں نہیں دکھتا۔“

وہ جلے دل سے بولتی رہی۔ رتو مزے سے اپنا ناشتا کرنے کے بعد اس کے ناشتے پر پل پڑی۔ خوب ڈھیر سا رابول چکنے کے بعد اسے احساس ہوا، تب تک وہ اس کے حصے کا ابلہ ہوا انڈہ اور آلو کے قتلے کھا چکی تھی۔

”بد تمیز۔“ کھلکھلاتی ہوئی رتو کوس گھور کر رہ گئی تھی۔

ناشتے کے بعد دوبارہ چاند بھیہا کے کمرے میں گئی تو وہ سو رہے تھے، وہ یونہی خاموشی سے باہر نکل آئی۔ بڑی ممانی نہ صرف اٹھ چکی تھیں۔ بلکہ اس کی تلاش میں نیچے آگئی تھیں۔ انہیں بازار جانا تھا اور وہ ماہین کو ساتھ لے جانے پر بضد تھیں۔ اس نے کمرے میں آکر اماں سے اجازت لی اور پھر رتو کو چاند بھیہا کا خیال کرنے کی تاکید کرتی ہوئی ممانی کے ساتھ بازار چلی گئی۔ ممانی نے سمیعہ کو کچھ چیزیں بھجوائی تھیں اور یہ تمام چیزیں انہوں نے اتنی دیکھ پرکھ، جانچ پڑتال کے بعد خریدی تھیں کہ واپسی پر شام تو ہو ہی گئی تھی۔ وہ آکر جو بستر پر گری تو پھر رات کو ہی اُسی تب خیال آیا، کل اس کا ایک بہت ضروری ٹیسٹ تھا۔ رات کا کھانا بھی اس نے یونہی جلدی میں کھایا۔ رتو سے چائے بنانے کا کہنا چاہا مگر وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ نکی ہوا سے کہہ کر وہ اسٹڈی میں آگئی۔ کچھ نکات سمجھنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔ اس نے چھوٹے ماموں سے مدد طلب کی۔ جواباً وہ اسے سمجھانے بیٹھے تو بات سے بات نکلتی چلی گئی اور جب وہ مطمئن ہو کر اسٹڈی روم سے باہر آئی تھی تو آنکھیں نیند سے بند ہو رہی تھیں، چاہنے کی باوجود بھی وہ چاند بھیہا کی خیریت معلوم کرنے ان کے کمرے میں نہ جا سکی۔



صبح وہ حسب عادت فجر کے وقت ہی اٹھی تھی۔ نماز پڑھنے کے بعد یونیفارم استری کیا اور باہر نکل آئی۔ کچن میں پھیلی تاریکی اور خاموشی بتا رہی تھی کہ رتو اور نکی بوا ابھی تک نہیں جا گئیں۔

وہ سیدھی اوپر چلی آئی۔ بڑی ممانی بہت دیر سے اُٹھتی تھیں۔ محبت ناشتا جلدی کرنے کا عادی تھا بلکہ ہاسٹل لائف نے عادی بنا دیا تھا۔ لہذا وہ صبح ہی اٹھ کر ممانی کے بیڈ روم کے چکر لگانے لگتا اور بالآخر جھنجھلاتا ہوا نیچے اتر آتا اور آج تو ممانی تھکاوٹ کے مارے یقیناً بہت دیر سے اُٹھیں گی۔ محبت کو واپس بھی جانا تھا، لہذا اس کے لیے ناشتا تیار کرنے کے خیال سے ہی وہ اوپر آگئی تھی۔

بڑے ماموں بھی نماز پڑھ کر واپس آ رہے تھے۔ اس کے سلام کا جواب نہایت خوش دلی سے دیتے ہوئے انہوں نے اس کے سر پر تھپکی دی اور ساتھ ہی چائے کی فرمائش بھی کر دی۔

”جب سے سمیعہ کی شادی ہوئی ہے، تمہاری ممانی نے تو ہمیں چائے کے لیے بھی ترسا دیا ہے۔“
”میں ابھی تیار کرتی ہوں ماموں جان۔“ وہ کچن میں آگئی۔ چائے کے لیے پانی چوہے پہ رکھا تو

خود آملیٹ کے لیے پیاز کاٹنے لگی۔
”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ وہ چائے کے لیے فرنیج سے دودھ نکال رہی تھی جب وہ اچانک پیچھے سے آکر بولا۔

”اوہ اب سمجھا، مستقبل کی پریکٹس ہو رہی ہے۔“ اس نے خود ہی فرض کر لیا جبکہ ماہین نے ہمیشہ کی طرح اس کی بات پر بالکل بھی توجہ نہیں دی تھی۔
”میں تو صرف ناشتا تیار کر رہی ہوں، آپ جو مرضی سمجھیں۔“
”سوچ لو، میں کچھ بھی سمجھ سکتا ہوں۔“ اس نے بے حد معنی خیز انداز میں کہتے ہوئے فرنیج سے انڈے نکال کر اس کے سامنے رکھے۔

”محب! تم اتنا فضول کیوں بول رہے ہو۔ بتاؤ، چائے میں چینی کتنی لوگے۔“
”لو جی، ابھی تک تمہیں اتنا بھی نہیں معلوم۔ آخر مستقبل میں۔۔۔“
”فارگاڈ سیک محب! میں یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلی جاؤں گی۔“ وہ درمیان میں چڑک بولی تو وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔ پھر چند ثانیے کے بعد بولا۔
”چلو ٹھیک ہے۔ میں چینیج کر کے آتا ہوں۔ تم تب تک آملیٹ بنا لو۔“ اس کا لہجہ ٹیکس بدل گیا تھا۔
ماہین نے بھی واضح طور پر محسوس کیا تھا۔

”سنو، یہ یاموں کے لیے چائے لیتے جاؤ۔“ اس نے روک کر چائے کا کپ اسے تھمایا۔
”محب! میں جانتی ہوں، تم میرے رویے سے بہت ہرٹ ہوتے ہو لیکن مجھے لگتا ہے کہ تم یہ سب قبل از وقت سوچ رہے ہو۔ ایک عمر بڑی ہے ایسی باتیں سوچنے کے لیے۔ ابھی تمہیں اپنا کیریئر بنانا ہے۔ مجھے بڑھنا ہے اور ابھی تو ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ۔۔۔“
”ماہین! میں تمہیں ابھی شادی کی آفر تو نہیں کر رہا۔ میں تو صرف تمہاری رائے جاننا چاہتا ہوں۔“
”میں کسی بھی رائے کا اظہار کرنے سے قاصر ہوں محب! میں نہیں چاہتی کہ کل کو فیصلہ میری رائے کے برعکس ہو تو مجھے کسی شرمندگی یا الزام کا سامنا کرنا پڑے۔“
”کیا مطلب ہے تمہارا ماہین؟ جانتی ہو، محض کسی شرمندگی یا الزام سے بچنے کی خاطر تم مجھے کتنی اذیت دیتی ہو۔“ وہ ایک دم اس کے سامنے آ گیا۔

”محب! چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ ماموں انتظار کر رہے ہوں گے۔“ وہ خست لہجے میں کہہ کر ریخ موڑ گئی تو محب سر جھٹک کر باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد اس نے تیزی سے کام مکمل کیا۔ جانتی تھی وہ تیار ہو کر آئے گا اور دوبارہ اس کا سر کھائے گا۔ لہذا اس کے واپس آنے سے قبل ہی وہ ناشتا تیار کر کے نیچے آ گئی تھی۔ اس کی باتوں میں یونہی الجھتی ہوئی وہ چاند بھیا کے کمرے کے سامنے سے گزری تو ان کی کراہوں کی آواز سن کر وہ ایک دم ہٹک گئی۔

”یا اللہ، کہیں تکلیف زیادہ تو نہیں ہو گئی۔ وہ تو بہت برداشت کرنے والے انسان ہیں۔“
وہ ان کی کراہوں سے گھبرا کر فوراً ان کے کمرے میں داخل ہو گئی اور پھر ان کی حالت دیکھ کر ہکا پکا رہ گئی۔ گھٹے ٹھوڑی سے لگے۔ سردی سے بچاؤ کے لیے ناکانی بوسیدہ مکمل۔ نیم بے ہوشی اور ہر آتی جانی سانس کے ساتھ نکلتی آہیں اور کراہیں۔ انہیں اس طرح بے سدھ پڑے دیکھ کر اس کے ہاتھ پاؤں پھول

گئے تھے۔

”چاند بھیا، چاند بھیا۔“ اس نے ایک دم انہیں جھنجھوڑ ڈالا۔
”غضب خدا کا اتنا تیز بخار۔“ ماہین نے ان کی جلتی پیشانی کو چھوا تو ٹھنڈے ٹھار ہاتھ کے لمس سے جھرجھری لیتے ہوئے چاند بھیا نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔
”اتنا تیز بخار ہے۔ چاند بھیا! دوا نہیں لی تھی کیا؟ اٹھیے میں آپ کے لیے دودھ لے کر آتی ہوں۔“ وہ بجلت میں کمرے سے باہر نکل گئی اور پھر جلد ہی بسکٹ اور نیم گرم دودھ کا گلاس لے کر واپس آ گئی پھر چاند بھیا کو آواز دی مگر ان کی پلکیں خود بخود بند ہوتی جا رہی تھیں۔
”چاند بھیا! اٹھیے ناں دوا لے لیجیے۔ بخار کم ہو تو کسی ڈاکٹر کو دکھانے چلتے ہیں۔“ اس نے ایک بار پھر چاند بھیا کو جھنجھوڑ ڈالا۔

”اماں! اماں۔“ چاند بھیا کے لبوں سے بے اختیار نکلنے والے یہ الفاظ بالکل واضح تھے۔ وہ اپنی جگہ رک سی گئی۔
”اماں! مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے۔ سارا بدن ٹوٹ رہا ہے۔ حلق میں کانٹے چھپ رہے ہیں۔ میں مر رہا ہوں! اماں میں مر جاؤں گا۔“ ان کی آواز کی تڑپ اور نقامت ماہین کا دل دہلا گئی تھی۔
”چاند بھیا۔“ اب کے اس نے آہستگی سے انہیں پکارا تو فوراً ہی آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگے تھے۔

”اٹھیے دودھ پی لیجیے۔“ وہ انہیں سہارا دینے کو آگے بڑھی۔ چاند بھیا نے اپنا کانٹا ہوا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا اور اگلے ہی پل ان کی لرزنی پر جدت انگلیاں اس کی کلائی سے لپٹ گئی تھیں۔ ماہین نے ایک دم سر اٹھا کر انہیں دیکھا وہ ڈبڈبائی آنکھوں میں سرخی لیے اس پر نظریں گاڑے ہوئے تھے۔ ان کی گرفت کی غیر معمولی سختی اسے لمحہ بھر میں سراسیمہ کر گئی تھی۔
”اٹھیے چاند بھیا۔“ اس نے اصرار کیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے تھے۔

”ماہین! میں کون ہوں؟ کیوں ہوں؟ اس پوری کائنات میں مجھ سے بے کار کوئی اور بھی ہوگا کیا۔“ ان کا لہجہ بھی غیر معمولی تھا اور انداز بھی عجیب۔ ماہین ایک لمحے کو خوفزدہ سی ہو گئی۔
”میں کبھی بھی سمجھ نہیں پایا۔ میرا جرم کیا ہے۔ کون سا قصور سرزد ہوا ہے مجھ سے۔ سب لوگ مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے۔ میری ماں کیوں مر گئی؟ میرا باپ کیوں مر گیا؟“ وہ اب اٹھ بیٹھے تھے اور اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں جکڑے ہذیانی کیفیت میں بول رہے تھے۔

”تم جانتی ہو، رات بھر سرد ہوا میں میرے بدن کو چیرتی رہیں۔ کسی نے آکر مجھے اپنی آغوش کی گرمی نہیں بخشی۔ بھوک میری آنتوں میں پختے گاڑے بیٹھی ہے مگر کسی کو اس کی فکر نہیں، میرے سر پہ ہتھوڑے برس رہے ہیں مگر کوئی میچا لیس اس درد کو سمیٹنے کے لیے میری پیشانی پر نہیں اترا۔ کیوں؟ ماہین! میں جیوں یا مر جاؤں، کوئی میرے لیے تردد کرنے والا نہیں ہے۔ کیوں نہیں ہے ماہین؟“ وہ کسی نوعمر بچے کی سی عاجزی سے اس سے سوال کر رہے تھے۔

”اگر میری ماں یہاں ہوتی تو کیا وہ اس اندھیری کوٹھری میں مجھے یوں مرنے کے لیے چھوڑ دیتی۔ میرا باپ ہوتا تو کیا میں یونہی بخار میں جلتا رہتا۔ میں بھوکا رہتا تو کیا وہ دونوں پیٹ بھر لیتے۔ نہیں

وہ کبھی ایسا نہیں کرتے۔ ماں باپ ایسا کر ہی نہیں سکتے۔ جاؤ ماہین! کسی کو بلاؤ۔ کسی اپنے کو، میری ماں کو، اسے کہو، مجھے اس کی ضرورت ہے۔“ چاند بھیا کی آواز بلند ہوئی جا رہی تھی۔ ماہین کے لیے انہیں سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

”اماں! اماں! آجاؤ، میرا جسم، میری روح تھکن سے چور چور ہے۔ پیاس بہت ہے، درد بہت ہے۔ میں مر رہا ہوں، مجھے بچاؤ۔“ وہ اس کے ہاتھ کی پشت پر سر کرائے پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ ”کوئی نہیں جانتا۔ اس طرح سے زندگی جینا کتنا دشوار ہے۔ میں اپنی آنکھوں سے خود کو کئی بار مرتے دیکھتا ہوں۔ میں یہاں نہیں رہ سکتا ماہین، میں یہاں رہنا ہی نہیں چاہتا۔ یہاں انسان نہیں رہتے، بھیڑے رہتے ہیں جو روز اپنے نوکیلے پنجوں سے ادھیڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ جو روز زندہ کرتے ہیں، روز مار دیتے ہیں۔ روز ٹھوکر لگا کر دو کو ریزہ ریزہ کر دیتے ہیں۔ چل دیتے ہیں۔ پامال کر دیتے ہیں۔ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں ماہین، بتاؤ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں۔“

”چاند بھیا! آپ۔۔۔“ ماہین بے بس سی ہو کر اپنے ہونٹ کاٹنے لگی تھی اس کی کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کس طرح ان کے اضطراب کو سکون میں ڈھالے۔

”میں کل سے بھوکا ہوں ماہین! میں نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ کوئی مجھے رات کے کھانے پر بھی پوچھنے نہیں آیا۔ تم بھی نہیں آئیں ماہین! میں انتظار کرتا رہا، بہت دیر تک منتظر رہا تمہارا، رتو کا۔ میں کئی بار اس چارپائی سے اٹھا تھا اور ہر بار ہی دروازے پر پہنچنے سے پہلے گر گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم، میں کتنے پہرے ہوش رہا ہوں۔ میں اس قدر بے بس کیوں ہو گیا ہوں؟ مجھے اپنی کمزوری سے، اپنی بے بسی سے نفرت محسوس ہو رہی ہے۔ مجھے ہر چیز سے نفرت محسوس ہو رہی ہے۔ اپنے آپ سے، تم سے، اس کرے سے، اس گھر سے اس پوری کائنات سے۔“

انہوں نے دشت کے عالم میں ماہین کو دھکا دے ڈالا، اپنے اوپر سے کبل نوج پھینکا۔ ماہین خوفزدہ سی ہو کر دیوار کے ساتھ لگی کھڑی رہ گئی تھی۔ وہ چارپائی سے اٹھنے کی کوشش میں لہرا کر دوبارہ چارپائی پر ہی گر گئے اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

”میں، میں کسی کو بلا کر لاتی ہوں۔ آپ ابھی ڈاکٹر۔۔۔“ وہ دروازے کی طرف لپکی مگر چاند بھیا نے روک دیا۔

”نہیں۔۔۔ کسی کو مت بلانا۔ مجھے کسی کی ضرورت نہیں۔ نفرت ہے مجھے اس نام نہاد ہمدردی سے۔“ ان کا نحیف لہجہ اتھا گہرائیوں میں ڈوب رہا تھا۔

”ہاں، کسی کو بلانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تیمارداری کے لیے یہ باندی جو حاضر ہے۔“ چاند بھیا کے کمرے کی خنک خاموشی میں یہ سخت گیر آواز کسی چابک کی طرح ان کی سماعتوں پر لہرائی تھی۔ ماہین یک لخت پلٹی بھی اور پھر نجمہ خالہ کو دروازے کے عین وسط میں کھڑے دیکھ وہ فوراً ان کی طرف بڑھی تھی۔

”نجمہ خالہ! دیکھیے ذرا بھیا کی طبیعت کتنی بگڑ گئی ہے؟“ لیکن نجمہ خالہ اسے بری طرح نظر انداز کر کے چاند کی طرف بڑھی تھیں۔

”کیا تماشا لگایا ہے اب کے تم نے۔ چلے ہو تم بھی اپنے باپ کی طرح ایک لڑکی کو پھانسنے۔ اپنی

مظلومیت اور بے چارگی کا ڈھونگ رچا کر کر اس کی معصومیت سے فائدہ اٹھانے کی خوب سوچی ہے تم نے۔ مگر میاں! یاد رہے، میں ابھی زندہ ہوں تاریخ اپنے آپ کو دہرانا چاہتی ہے مگر میں ایسا ہونے نہیں دوں گی۔“ ان کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔

”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ ماہین تیر کی طرح ان کی طرف لپکی تھی۔ ”تھیک کہہ رہی ہوں میں اور تم؟“ وہ پھنکارتی ہوئی اس کی طرف پلٹیں ”تمہیں ذرا بھی شرم نہیں آتی، یوں تنہا اس کے کمرے میں آتے ہوئے۔“

”اوہ میرے خدا۔“ خالہ کی صاف اور سیدھی بات اس کے ہوش اڑا لے گئی تھی۔

”کیا ہو گیا ہے خالہ آپ کو، میں تو صرف۔۔۔“

”ہاں تم صرف بیماری کی تیمارداری کے لیے آئی تھیں۔۔۔ ہے ناں؟ مگر کیوں؟ کس لیے؟ کیا لگتا ہے یہ تمہارا، کس تعلق۔۔۔ کس رشتے سے تم اتنی ہلکان ہوئی جا رہی ہو؟ اس گھر کے باقی سب لوگ مر گئے ہیں کیا؟ رتو، مکی بوبیا اس گھر کا کوئی اور فرد صرف تم ہی کو ہمدردی کا بخار کیوں چڑھا ہوا ہے؟“ ان کی بلند آواز ماہین کو زمین میں گاڑ گئی تھی۔

”خالہ! چپ ہو جائیں۔ شاید آپ کو معلوم نہیں، آپ کتنی گھٹیا بات کر رہی ہیں۔“

”مجھے معلوم ہے سب۔ تم نہیں جانتیں۔ کم عقل اور نادان ہو تم وہ تمہیں کس کس طرح اپنے حال میں پھنسا رہا ہے۔ تمہیں اندازہ تک نہیں۔ اس طرح ششے میں اتارتے ہیں یہ بد بخت۔“ نجمہ خالہ کی آواز اور الفاظ ماہین کو آج سے پہلے کبھی اتنے غلیظ اور کریمہ نہیں لگے تھے۔

وہ چاند بھیا کے بارے میں کتنی مقدس سوچ رکھتی تھی اور نجمہ خالہ کتنی گری ہوئی باتیں کر رہی تھیں، خود چاند بھی دم بخود سے بیٹھتے تھے۔

”دیکھیے آپ، آپ ایسا مت کہیے۔ میرے لیے ایسا سوچنا بھی کفر ہے۔ ماہین میرے لیے۔“ چاند بھیا کے پورے بدن پر لرزہ سا طاری ہو گیا تھا وہ بمشکل سنبھلتے ہوئے خالہ کے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔

”تم اپنی بکواس بند کرو۔۔۔ باپ کی طرح جھوٹے اور مکار۔“ انہوں نے پوری قوت سے چاند بھیا کو اپنے سامنے سے دھکیلا تو وہ بری طرح لڑکھڑا کر گر گئے تھے۔ ان کا سر زردار طریقے سے لوہے کی چارپائی سے ٹکراتے دیکھ کر ماہین کی چیخ نکل گئی تھی۔ قطعی غیر ارادی طور پر وہ انہیں سہارا دینے کے لیے آگے بڑھی تھی مگر نجمہ خالہ نے اسے بازو سے پکڑ کر واپس گھسیٹ لیا تھا۔

”خبردار جو تم آگے بڑھیں۔ بڑے بھیا سے کہہ کر ایسی مار لگواؤں گی تمہیں کہ ساری ہمدردی ہوا ہو جائے گی۔ چلو نکلو باہر۔“ نجمہ خالہ نے اس کو باہر کی طرف دھکیلا اور وہ نجانے کیسے کمزور پڑ گئی۔ شاید یہ خوف کہ اگر یہ جھوٹ موٹ کی بات سچ سچ کسی کے کانوں تک پہنچ گئی تو کیا ہوگا؟

”نجمہ خالہ! آپ اچھا نہیں کر رہیں۔ چاند بھیا کے خون نکل آیا ہے اتنی خالام مت پیئے۔“ وہ تڑپی تھی مگر نجمہ خالہ نے ایک دھکے سے اسے کمرے سے نکال باہر کیا تھا۔

”بد بخت! کیوں اپنی عزت گوانے کے درپے ہو چلا اپنے کمرے میں۔“ وہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت آئی تھیں۔ ماہین کو چاروں طرف سے گھیرا تھا۔

”ارے۔۔۔ یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟“ بڑے ماموں بیڑھیاں اترتے ہوئے آرہے تھے، انہیں صحن کے عین وسط میں کھڑے دیکھ کر پوچھتے بنائیں رہ سکے تھے۔

”اپنی بھانجی سے پوچھیے۔“ ان کے لہجے میں طنز ہی طنز تھا۔ اس سے پہلے کہ ماموں اس سے استفسار کرتے، وہ چیخ اٹھی تھی۔

”مجھ سے کیا پوچھنا ہے۔ پوچھیے اپنی اس بہن سے جو انسانیت کے نام پر دھتیا ہیں۔ صرف دھتیا اور کچھ بھی نہیں۔“

وہ بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ ہکا بکا سے بڑے ماموں کو کچھ اندازہ نہ ہوا تو وہ حیرت کے عالم میں کندھے اچکاتے نجمہ کی طرف پلٹے، وہ بھی بغیر جواب دیے غصے سے سر جھٹکتے ہوئے ایک طرف بڑھ گئی تھیں۔



صبح سے دوپہر ہو گئی تھی مگر اس نے اپنے کمرے کا دروازہ نہیں کھولا۔ اماں نے کئی بار آکر دروازہ کھٹکھٹایا مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ سخت جانے سے قبل اسے خدا حافظ کہنے آیا تب بھی وہ یونہی چپکی رہی، بھوکی، پیاسی روٹی رہی اور کھلتی رہی۔ نجمہ خالہ کی باتیں رہ رہ کر یاد آتیں اور اسے نئے سرے سے جلاتیں، کتنی بار دل چاہا نجمہ خالہ کے سامنے جائے اور انہیں کھری کھری سنا کر آئے۔ اسے اپنے مضبوط کردار پر فخر تھا۔ اماں اس چھوٹی سی عمر میں اسے اپنے لیے اس قدر محتاط دیکھتیں تو سیدہ فخر سے تن جاتا۔ اکثر سب کے سامنے ہتھی تھیں۔

”میری بیٹی اپنے باپ کی عزت کا علم ہمیشہ سر بلند رکھے گی۔“
اور یہ نجمہ خالہ ایسی گھٹیا باتیں کہہ گئی تھیں کہ اس سے کسی طور پر ہضم نہیں ہو رہی تھیں۔ کئی بار چاند بھیا کا خیال بھی آیا۔ اتنا تیز بخار اس پر وہ گہری جوٹ، اس نے اپنی آنکھوں سے ان کے سر سے خون بہتا دیکھا تھا۔

”یا اللہ! اس گھر کے مکیمنوں کے دل تھوڑے سے نرم کر دے۔“ وہ بے اختیار دعا کرنے لگی۔
کئی بار قدم غیر ارادی طور پر دروازے کی طرف اٹھ گئے۔ جی چاہا تمام باتیں پس پشت ڈال کر چاند بھیا کی خیریت معلوم کرنے کا بیج۔ مگر کوئی ڈر، خوف تھا جو اسے ایسا کرنے سے روک رہا تھا۔
”کہیں خالہ دوبارہ جنون میں آگئیں تو لینے کے دے بڑ جائیں گے۔ خواہ وہ اپنی بات کو سچا بنا دیں گی۔“ بات جھوٹی تھی، بے سرو پا بھی مگر اس کے لیے شرمندگی کا باعث تھی۔

”اور یہ رتو بھی خدا جانے کہاں مر گئی ہے۔ آجانی تو چپکے سے کہتی، چاند بھیا کو کچھ کھانے کو دے آؤ اور کسی سے کہہ کر ڈاکٹر کو بلاؤ۔“ وہ بے حد فکر مند تھی۔

”خیر بسکٹ اور دودھ تو وہ ہیں کمرے میں ہی پڑے تھے، چاند بھیا ذرا سی ہمت کریں تو کھا ہی لیں گے۔ لیکن یہ نمخت رتو آئے تو پوچھوں تو سہی میں جو کل بازار جانے سے قبل اسے چاند بھیا کا خیال رکھنے کا کہہ گئی تھی تو پھر وہ سارا دن بھوکے کیوں رہے۔“ رتو کا سوچ کر اسے مزید غصہ آگیا تو بند کمرے میں ٹھنڈا شروع کر دیا۔

کچھ وقت اور گزر گیا۔ وہ یونہی خود سے لڑتی جھگڑتی رہی اپنی بزدلی پر تاؤ کھاتی رہی۔

”مجھے اسی وقت ماموں جان کو ساری حقیقت بتا دینی چاہیے تھی وہ خود ہی نجمہ خالہ کے ہوش ٹھکانے لگا دیتے۔ لیکن کہاں؟ نجمہ خالہ تو جیتی ہیں سب کی، الٹا مجھے ہی سمجھانے بیٹھ جائیں گے۔“
اس نے فکر مندی سے سر ہٹا لیا، تب ہی بھوک کا احساس ہر سوچ پر غالب ہو گیا۔ پیٹ میں آگ سی جلنے لگی۔ تب وہ سیدہ ٹھونک کر ہر صورت حال کے مقابلے کے لیے تیار ہو کر کمرے سے باہر آگئی۔ وہاں سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ اسے کسی غیر معمولی صورت حال کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ غالباً نجمہ خالہ نے کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ بڑی ممانی ساگ بنارہی تھیں۔ اسے دیکھ کر خوش دلی سے مسکرا دیں۔

”آج تو سونے کے ریکارڈ قائم ہو گئے ماہین۔“
وہ جواباً مسکرا بھی نہ سکی۔ سیدھی باورچی خانے میں آگئی۔
”اے آبا! ذرا پوچھ کر تو دیکھو، مسئلہ کیا ہے۔ صبح نجمہ بھی ناشتا کیے بغیر ہی اسکول گئی ہے۔ لگتا ہے خالہ بھانجی میں کچھ ٹھن گئی ہے۔“ اس نے اپنے پیچھے ممانی کو کہتے سنا تھا۔ لیکن اماں نے فوری طور پر اس کے پیچھے آنا غالباً مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اس لیے اپنی جگہ بیٹھی رہیں۔
پچن میں مکی بواد پوچھ رہا کہ کھانا تیار کر چکی تھیں۔ اس نے وہیں بیٹھ کر گرم گرم چپاتی ہاٹ پاٹ سے نکالی اور تھوڑا سا سالن نکال کر کھانے بیٹھ گئی، مکی بوا کہتی رہیں۔

”رائیہ بن رہا ہے۔ سلا دین جانے دو۔ گھڑی بھرا انتظار کر لو، چاول دم پہ ہیں۔“ مگر وہ سنی ان سنی کر کے کھاتی رہی۔ تنگ آ کر مکی بوا خاموش ہو گئیں۔ سارا غصہ برتنوں کی اٹھان پر نکلا، وہ ابھی کھا ہی رہی تھی جب باہر سے رتو کی چمکتی ہوئی آواز سنائی دی اور ماہین ہاتھ میں پکڑا نوالہ وہیں پلیٹ میں رکھ کر کھانٹھ گئی۔ رتو کی ہنسی اسے آج سے پہلے کبھی اتنی بری نہیں لگی تھی۔ تیز رفتاری سے قدم اٹھاتی وہ باہر صحن کی طرف آئی اور اگلے ہی لمحے ٹھٹھک کر گر گئی۔ وہ غالباً کہیں باہر سے آ رہی تھی۔ کپڑوں کی ایک گھڑی ابھی بھی اس نے بازو میں دبائی ہوئی تھی ماہین وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

”ہاں بھئی رتو! بھٹکتا آئی منگنی کا فتنشن۔“ چھوٹی ممانی جتیس سے پوچھ رہی تھیں۔
”ہاں جی۔ بس کیا بتاؤں، بڑھی گھوڑی لال لگام۔ جبریوں بھرا چہرہ بندہ پوچھے اب اس عمر میں منگنی جیسے چونچلوں کی ضرورت ہی کیا تھی، سیدھے سیدھے نکاح پڑھوا کر رخصت کر دیتے۔“ وہ اپنے مخصوص بے ساختہ انداز میں بولے جا رہی تھی۔

”اب تو بس یہ ہی دعا ہے کہ اللہ ہماری۔“ اس نے دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے تب ہی نظر ماہین پر پڑی تو جلدی سے دونوں ہاتھ گرا کر کھڑی ہوئی۔
”اچھا چھوٹی صاحب! باقی تفصیل تو میں آپ کو شام کو بتاؤں گی۔ ابھی تو میں ماہین سے سلام دعا کر لوں۔“

”ہاں ہاں کر لو، تمہارے بغیر اس کا بھی گھر میں دل کہاں لگا؟ سارا دن اپنے کمرے میں ہی گھسی رہی۔“ ممانی کے کہنے پر رتو نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ نظریں جرای گئی۔
”ماہین! خیریت تو ہے نا؟“ وہ فوراً اس کے پاس پہنچ گئی۔ وہ تو اس کے چہرے کے رنگوں کو پہچان لیتی تھی اب بھی اسے غیر معمولی طور پر سنجیدہ دیکھ کر وہ گھبرا سی گئی تھی۔

”رتو۔۔ کہاں گئی تھیں تم؟“

”لوجی، ہمیں خبر ہی نہیں۔“ رتو نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”خبر ہوئی تو کہاں تم سے پوچھتی۔“ وہ چڑ کر بولی تو رتو خواخواہ ہی خفا ہو گئی۔

”کل سے میں گھر سے غائب تھی اور تمہیں خبر ہی نہیں۔ بس اتنا ہی خیال ہے ناں میرا۔“

”رتو! میں اس وقت بہت پریشان ہوں۔ مجھے تنگ مت کرو۔“ وہ ستے ستے انداز سے کہتی وہیں

دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”نجمہ خالہ کی سہیلی کی مٹکی بھی ناں تو کل وہ مجھے اپنے ساتھ اس کے گھر لے گئی تھیں۔ کہہ رہی

تھیں۔ کچھ کام وغیرہ کروانا ہے۔ کام تو کیا تھا وہاں سارا انتظام ہوٹل کے بندوں نے سنبھال رکھا تھا۔

میں تو بس اتنا تھا کہ پتہ دھڑے بیٹھی رہی۔ رات کو واپسی کا وقت ہوا تو نجمہ خالہ نجائے کیسے چپکے سے وہاں

سے چلی آئیں۔ میں تو بچ پرانے گھر میں بڑا گھبرائی، خیر ایک بوڑھی ملازمہ کے کوارٹر میں رات بسر کی،

صبح سارا پھیلا واسمیں اور اب جوں ہی ان کی سہیلی کا بھائی فارغ ہوا۔ اپنی گاڑی میں مجھے یہاں چھوڑ گیا۔

وہ تو میرے کام سے بہت خوش ہوئے۔ آتے ہوئے ایک نیا جوتا بھی دے رہے تھے مگر میں نے لیا نہیں

کہہ دیا کہ نجمہ خالہ کی سہیلی سمجھ کر آپ کے کام میں مدد کروادی ہے ورنہ میں اجرت پڑیوں گھر گھر کام نہیں

کرتی۔“

”تو نجمہ خالہ! یہ آپ کی ہی کارستانی تھی۔ ایک سوچی سمجھی اسکیم، آپ کو معلوم تھا۔ اس گھر میں جان

بھیا کے ایک نہیں دو ہمدرد ہیں ایک کو آپ نے گھر سے ہی دور کر دیا۔ دوسرے یہ الزامات کی بوچھاڑ کر

دی، ایک بیمار اور لاغر شخص کو اذیت دے کر بھلا کتنی راحت ملی آپ کو۔“ رتو اپنی ہی باتوں میں گم تھی۔

ماہین اپنی سوچوں میں غلطاًں۔

”اے کیا سوچ رہی ہو؟“ درمیان میں رتو نے اسے ٹوکا۔

”رتو ذرا چاند بھیا کے کمرے میں تو جاؤ، صبح ان کی طبیعت بے حد خراب تھی، معلوم کرو۔“

”طبیعت زیادہ خراب تھی۔“ رتو ایک دم مضطرب سی ہو گئی اور اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی

ان کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ ماہین طویل سانس لے کر کمرے میں آگئی۔ وہاں اماں پہلے ہی اس کی

منتظر تھیں۔ اس نے ان کے پاس بیٹھ کر تمام صورت حال ان سے کہہ ڈالی تھی اماں اڑی اڑی رنگت کے

ساتھ چپ بیٹھی رہیں پھر کتنی ہی دیر بعد گویا ہوئیں۔

”میں تو پہلے ہی تم سے کہا کرتی تھی ماہی کہ چاند کی طرف زیادہ دھیان مت دیا کرو۔ مکی بویا رتو

سے کہہ دیا کرو۔ تم نجمہ کو نہیں جانتیں سانپ سے زیادہ زہریلی ہے یہ، اب یہ ہی دیکھ لو، اتنے برس بیت

گئے۔ اس کے انتقام کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ نجائے کیسا پتھر دل ہے اس کا۔ کسی صورت کچھلتا ہی

نہیں، گھر بس جاتا شاید کوئی تبدیلی آجاتی۔ مگر اللہ بخشے ہمارے اماں باوا نے سب سے چھوٹی جان کر لاڈ

بھی ضرورت سے زیادہ ہی اٹھائے تھے۔ اسی لیے تو آج تک بڑے بھیا بھی دبتے آئے ہیں۔ خیر

آئندہ تم ذرا احتیاط ہی کرنا اس کے منہ نہ ہی لگو تو بہتر ہے۔ یہاں تمہارا باپ نہیں بیٹھاسر پرستی کرنے

والا، میں نجمہ سے بات کروں گی۔“

اماں بے چاری فکر مند سی ہو کر اٹھ گئی تھیں۔ تب ہی رتو بھاگی چلی آئی تھی۔ غیر معمولی طور پر گھبرائی

ہوئی، ماہین کا دل ایک لمحے کے لیے ڈوب سا گیا۔

”نجانے کیا خبر سنائے گی یہ۔“ وہ دم بخود سی اسے دیکھے گئی۔

”سنو ماہین! وہ۔۔۔ وہ چاند گرہن کے کمرے میں خون۔“ وہ ماہین کے پاس آ کر گرنے کے

سے انداز میں بیٹھ گئی۔

”ہاں، ان کے چوٹ لگی تھی۔ وہ خود تو ٹھیک ہیں ناں؟“ اس نے بے قراری سے پوچھا۔

”وہ، وہ خود تو کمرے میں نہیں ہیں۔“

”کیا؟ کہاں چلے گئے وہ؟“ وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”م۔۔۔ میں کیا جانوں؟ سب سے پوچھ آئی ہوں۔ کسی نے کام سے بھی نہیں بھیجا۔“ رتو بس رو

دینے لگی تھی۔

”کام سے کس نے بھیجا تھا رتو! اور وہ اس قابل ہی کہاں تھے کہ۔۔۔ خیر تم جاؤ، جا کر ادھر ادھر

دیکھو بلکہ آس پاس جو ڈاکٹرز کے کلینک ہیں۔ وہاں پتا کر کے آؤ، ہو سکتا ہے۔“ اس نے کسی امید کے

تحت رتو کو باہر بھگا دیا اور خود گھر کا ایک ایک کونا چھان مارا۔ گھر کے تمام افراد بھی لاعلم تھے۔

”اس نے کہاں جانا ہے بھئی۔۔۔ یہیں نہیں ہوگا، آجائے گا۔“ اکثریت کا خیال یہ ہی تھا مگر اس

کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اب کی بار کچھ غیر معمولی ہو کر رہے گا۔

رتو کو گئے ہوئے ایک گھنٹہ ہونے کو آیا تھا۔ وہ مرے مرے قدم اٹھاتی صحن سے ڈیوڑھی اور

ڈیوڑھی سے صحن تک چکر لگاتی رہی تب ہی بڑی ممانی نے اوپر سے جھانکا۔

”ماہین! آج کالج نہیں گئیں یا پھر جلدی واپس آگئی ہو؟“

”آج چھٹی کی ہے ممانی۔“ وہ بمشکل خود کو جواب دینے پر آمادہ کر پائی تھی۔

”اچھا، اچھا سنو، صبح محبت کو ناشتا تم نے بنا کر دیا تھا۔“ کھوجتا ہوا انداز، ماہین کے لیے قدم اٹھانا

دوبھر ہو گیا۔

میری توبہ جو آج کے بعد کسی کی مدد یا ہمدردی کا خیال بھی میرے دل میں آیا۔ ہر نیکی ہی گلے پڑ

رہی ہے۔

”ماموں نے چائے بنانے کے لیے کہا تھا۔ ساتھ میں ناشتا بھی تیار کر دیا۔ معلوم نہیں محبت نے

کھایا یا ماموں نے۔“

اس نے ٹالنے کے سے انداز میں بات کی تو ممانی کی پرسکون سی طویل سانس اسے یہاں تک

سنائی دے گئی۔ وہ محبت کے لیے اپنی بھانجی پر نظر رکھے بیٹھی تھیں اور سارا خطرہ انہیں صرف اور صرف

ماہین کی طرف سے ہی تھا کہ بیٹے کے تیور وہ خود تو دیکھ رہی تھیں۔

کچھ وقت مزید گزر گیا تو وہ تھک کر وہیں بیٹھیں۔ تب ہی دروازہ کھلا اور رتو دھیرے

دھیرے اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ ماہین اس سے کچھ پوچھ بھی نہ سکی کہ اس کے بپتے آنسوؤں نے

ساری بات اسے سمجھا دی تھی اور پھر شام سے رات ہو گئی۔ وہ دونوں یونہی چپ چاپ بوکھلائی بوکھلائی سی

پھرتی رہیں۔ ماہین نے کئی بار چوری چھپے ان کے کمرے میں جا کر جھانکا، رتو کے آنسوؤں کے کا نام ہی نہ

”اور مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ کسی جیتے جاگتے انسان کا وجود اس قدر ارزاں بھی ہو سکتا ہے۔“ اس نے کھڑکی کھول کر باہر تارکی کو دیکھا۔

کوئی بھی تو نہیں تھا جو فکر مند ہوا ہو، جو بے قرار ہو کر انہیں ڈھونڈنے نکلا ہو۔ بڑے ماموں نے کہا تھا۔ ”ہاں بھئی، پتا کرو اتے ہیں۔ اس کا، کہاں چلا گیا ہے۔“ مگر وہ جانتی تھی، انہوں نے کہیں پتا نہیں کروایا کسی سے نہیں پوچھا، کہیں نہیں کھوجا۔

اور چھوٹے ماموں تڑخ کر بولے تھے ”وہ کوئی بچہ تو نہیں جو کھوجائے گا۔“

بڑی ممانی کو سرے سے جیسے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔ عبید بھیا جاب کے سلسلے میں اسلام آباد گئے ہوئے تھے۔ اسد اور زین نے تو بھی زندگی میں شاید اس سے کلام کیا ہو۔ ہاں محبت ہوتا تو شاید۔۔۔ مامین نے طویل سانس لے کر کھڑکی بند کی اور رتو کے برابر آ بیٹھی وہ بالکل خاموش بیٹھی تھی۔

”بہت برا ہوا ہے رتو! بہت برا۔“ وہ خود کو روک نہ پائی۔ چاند بھیا کے بارے میں بتاتی چلی گئی۔

”بنیاری، بھوک اور موسم کی شدت نے انہیں کیا کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں انہیں پہلی مرتبہ اپنے ماں باپ کے لیے روتے دیکھا تھا۔ ذرا سوچو رتو! وہ بائیس سالہ نوجوان جس کی آنکھ میں تم نے بھی آنسو بھی نہ دیکھا ہو، وہ بول پھوٹ پھوٹ کر رو دے تو تمہیں کیا محسوس ہوگا۔

میرا دل چاہ رہا تھا، میں انہیں کسی ننھے بچے کی طرح اپنی آغوش میں سمیٹ لوں۔ ان کے بال سنواروں، انہیں بہلاؤں، اپنے ہاتھوں سے ان کے آنسو صاف کروں۔ بالکل ایسے ہی رتو جیسے ایک ماں اپنے بچے کو خاموش کرواتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے بچپن سے چاند بھیا مجھے بہلاتے آئے ہیں لیکن میں تو ان کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکی رتو! وہ بیمار تھے۔ بھوکے تھے۔ زخمی تھے۔ کہاں گئے ہوں گے وہ۔ یونہی شہر کی کسی سڑک پر لاوارثوں کی طرح پڑے ہوں گے یا کوئی سہارا دینے والا بھی ہوگا؟ لیکن کون دے گا سہارا رتو، سہارا دینے والے کون ہوتے ہیں، کہاں ہوتے ہیں؟“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

رتو اسے چپ کرانے کے بجائے خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل گئی تھی۔

”اللہ سہارا دینے والا ہے بیٹی! وہی آسرا دے گا۔ تو فکر نہ کر۔“ یہی بوا تھیں اسے تسلی دینے والی۔

”کی بوا! آپ نے بھی تو ان کا خیال نہ کیا۔“ وہ شکوہ کیے بغیر نہ رہ سکی۔

”کیا خیال کرتی بیٹی! پہلے بھی کبھی وہ گھر پہ نظر آیا تھا؟ کبھی اس کا کام، تو کبھی اس کا کام، یہ سوچا کہ کسی کام سے لگا ہوگا جو دکھائی نہیں دیا۔ پہلے بھی خود ہی آ کر بچا کھچا کھا جایا کرتا تھا۔ کبھی اس کے کمرے تک لے جانے یا اسے پکارنے کی نوبت ہی نہ آئی تھی۔ اس روز بھی میں یہ ہی سمجھی کہ مجھے کام میں مصروف دیکھ کر خود ہی کھاپی گیا ہوگا۔ معلوم ہوتا تو وہیں اس کی کھڑکی میں جا کر اس کی خبر لے آئی۔ بن ماں کا بچہ

تھا۔ کیا ہمارا دل نہ دکھتا ہوگا۔“ کئی بوا بڑی وضاحت سے بری الذمہ ہو گئی تھیں۔ مامین خود کو کوستی رہ گئی۔ رات بھر یونہی کر ویں بدلتی رہی، ذرا سی آہٹ پر کھڑکی میں سے جھانکنے لگتی، ہو سکتا ہے پلٹ آئے ہوں مگر امید امید ہی رہی انہیں نہ آتا تھا نہ آئے۔ صبح تک صبر جواب دے گیا تھا، وہ یونہی ٹھنڈاتی ہوئی نجمہ

خالہ کے کمرے میں جا بیٹھی اور پھر اس کے جومنے میں آیا تھا اس نے کہا تھا۔

”بہت بہت مبارک ہو نجمہ خالہ! تاہم اب میں آخری کیل بھی ٹھونک دی آپ نے۔ انتقام کی آگ

اب تو سرد ہو گئی ہوگی ناں۔ دل میں گڑا کاٹنا آج نکل جو گیا۔ بہت پرسکون ہوں گی آپ لیکن یاد رکھیے،

یہ سکون محض چند روزہ ہے، اسی سکون، اسی اطمینان سے ایسا اضطراب اٹھے گا جو آپ کو جینے دے گا نہ مرنے دے گا کتنا ستایا تھا خالہ آپ نے اس غریب کو لمحہ تڑپایا، اذیت دی لیکن اب آپ اس سے زیادہ تڑپیں گی۔ یونہی سسکیں گی۔“

نجمہ خالہ اس کی بات سن کر آگ بگول ہو گئی تھیں۔ پہلے اسے گھورتی رہیں پھر ڈپٹ کر چپ کرانا چاہا مگر اس کی آگ لگتی زبان خاموش نہ ہوئی تھی۔

”آپ نے ایک سوچا سمجھا منصوبہ بنایا تھا خالہ! چاند بھیا کے خلاف سازش تیار کی تھی آپ نے۔

چاند بھیا کے سارے ہمدردان سے دور کر دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ آپ انہیں تنہا کر دینا چاہتی تھیں جس طرح آپ نے اس رات انہیں کر دیا تھا۔ کبھی سوچا آپ نے اس وقت جب انہیں بھوک لگی ہوگی اور انہیں کھانا نہیں ملا ہوگا تو انہوں نے کیا سوچا ہوگا ہم سب کے بارے میں اور اس وقت جب ان کے بوسیدہ کمبل میں سے سردی نوکیلے کانٹوں کی طرح ان کے لرزتے وجود میں گھس گئی ہوگی تب ان کے پاس ہمارے لیے کیا ہوگا اور تاریک کھڑکی میں جلتے بدن کے ساتھ انہوں نے تنہائی کا عذاب سہا ہوگا تو

تب ان کے ہونٹوں پر، ان کے دل میں ہمارے لیے کیا ہوگا، صرف بددعا میں ہوں گی، ان کی ایک ایک آہ بددعا بن کر عرش تک گئی ہوگی بلکہ وہ تو سرتاپا بددعا بن گئے ہوں گے۔ آپ کے لیے، میرے لیے، رتو کے لیے انہوں نے اللہ سے ہمارے لیے تباہی و بربادی مانگی ہوگی، ہمارے لیے تکلیف اور اذیت کی خواہش کی ہوگی، انہوں نے ہمارے لیے ہر اس ظلم و زیادتی کو چاہا ہوگا جس کا وہ خود شکار

ہوئے تھے۔ وہ ایک رات، وہ ایک کوتاہی مجھے ہمہ وقت ڈرائے رکھتی ہے میں کانپ جاتی ہوں، یہ سوچ کر کہ جب خدا کی بے آواز لاٹھی حرکت میں آئے گی تو ہم سب کو کہاں پناہ ملے گی مجھے تو وہ ایک رات ہی مضطرب کیے رکھتی ہے خالہ۔ پھر آپ کے دل میں اتنا سکون کیسے بھرا ہے؟ آپ کس طرح ایک ظلم کے بعد دوسرے ظلم پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ اتنے اطمینان سے اتنا ظلم کیسے کیا خالہ؟

لیکن اب آئندہ کیا ہوگا؟ سوچا ہے آپ نے۔ وہ تو چلا گیا شاید ہمیشہ کے لیے، آپ کی آرزو پوری ہو گئی۔ اسی خواہش کے تحت وہ منصوبہ بنایا تھا جس میں بھانجی کی عزت کی پروا بھی نہیں کی آپ نے اور اس کے کردار پر بھی حرف گیری کی مگر ہوا کیا؟ وہ آپ کے منہ پر طمانچہ مار کر چلا گیا ہے خالہ! اس نے ثابت کیا کہ وہ ایک با کردار شخص ہے، مجھے بھانسا ہوتا تو یہیں رہتا، اسی گھر میں۔ اپنے شیشے میں اتارنے کی کوشش جاری رکھتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ ظلم، ہر مار برداشت کرنے والا اپنے کردار پر انگلی اٹھتے نہیں دیکھ سکا۔ مجھے نہیں معلوم وہ اس وقت کہاں ہوگا، کس حال میں ہوگا؟ زندہ ہوگا یا کسی ٹرک تلے آ کر پکلا گیا ہوگا۔ لیکن دعا کیجیے خالہ کہ وہ زندہ ہو، کم از کم اس وقت تک جب

تک ہم اس سے اپنے گناہ نہ بخشو لیں کہ اس کی معافی کے بغیر تو اوپر بھی چھوٹ نہیں ملے گی اور آپ کو تو اس کی ضرورت سب سے زیادہ پڑے گی کیونکہ میں جانتی ہوں آپ کی زندگی میں پیچھتاوا آئے گا اور بہت بری طرح آئے گا۔“

کاٹ دار، سرد طنزیہ، لہجہ لفظوں کے نشتر، نہیں معلوم نجمہ خالہ نے یہ سب کیسے برداشت کیا تھا۔ مامین بہتے آنسوؤں کے ساتھ دیکھ نہیں پائی تھی۔ جس طرح آئی تھی۔ اسی طرح کمرے سے باہر نکل گئی اور نجمہ خالہ اس کے جانے کے بعد بھی کبھی ہی دیر تک یونہی ساکت و صامت کھڑی رہ گئی تھیں۔ پھر ہلکی

کاٹ دار، سرد طنزیہ، لہجہ لفظوں کے نشتر، نہیں معلوم نجمہ خالہ نے یہ سب کیسے برداشت کیا تھا۔ مامین بہتے آنسوؤں کے ساتھ دیکھ نہیں پائی تھی۔ جس طرح آئی تھی۔ اسی طرح کمرے سے باہر نکل گئی اور نجمہ خالہ اس کے جانے کے بعد بھی کبھی ہی دیر تک یونہی ساکت و صامت کھڑی رہ گئی تھیں۔ پھر ہلکی

کاٹ دار، سرد طنزیہ، لہجہ لفظوں کے نشتر، نہیں معلوم نجمہ خالہ نے یہ سب کیسے برداشت کیا تھا۔ مامین بہتے آنسوؤں کے ساتھ دیکھ نہیں پائی تھی۔ جس طرح آئی تھی۔ اسی طرح کمرے سے باہر نکل گئی اور نجمہ خالہ اس کے جانے کے بعد بھی کبھی ہی دیر تک یونہی ساکت و صامت کھڑی رہ گئی تھیں۔ پھر ہلکی

کاٹ دار، سرد طنزیہ، لہجہ لفظوں کے نشتر، نہیں معلوم نجمہ خالہ نے یہ سب کیسے برداشت کیا تھا۔ مامین بہتے آنسوؤں کے ساتھ دیکھ نہیں پائی تھی۔ جس طرح آئی تھی۔ اسی طرح کمرے سے باہر نکل گئی اور نجمہ خالہ اس کے جانے کے بعد بھی کبھی ہی دیر تک یونہی ساکت و صامت کھڑی رہ گئی تھیں۔ پھر ہلکی

کاٹ دار، سرد طنزیہ، لہجہ لفظوں کے نشتر، نہیں معلوم نجمہ خالہ نے یہ سب کیسے برداشت کیا تھا۔ مامین بہتے آنسوؤں کے ساتھ دیکھ نہیں پائی تھی۔ جس طرح آئی تھی۔ اسی طرح کمرے سے باہر نکل گئی اور نجمہ خالہ اس کے جانے کے بعد بھی کبھی ہی دیر تک یونہی ساکت و صامت کھڑی رہ گئی تھیں۔ پھر ہلکی

کاٹ دار، سرد طنزیہ، لہجہ لفظوں کے نشتر، نہیں معلوم نجمہ خالہ نے یہ سب کیسے برداشت کیا تھا۔ مامین بہتے آنسوؤں کے ساتھ دیکھ نہیں پائی تھی۔ جس طرح آئی تھی۔ اسی طرح کمرے سے باہر نکل گئی اور نجمہ خالہ اس کے جانے کے بعد بھی کبھی ہی دیر تک یونہی ساکت و صامت کھڑی رہ گئی تھیں۔ پھر ہلکی

کاٹ دار، سرد طنزیہ، لہجہ لفظوں کے نشتر، نہیں معلوم نجمہ خالہ نے یہ سب کیسے برداشت کیا تھا۔ مامین بہتے آنسوؤں کے ساتھ دیکھ نہیں پائی تھی۔ جس طرح آئی تھی۔ اسی طرح کمرے سے باہر نکل گئی اور نجمہ خالہ اس کے جانے کے بعد بھی کبھی ہی دیر تک یونہی ساکت و صامت کھڑی رہ گئی تھیں۔ پھر ہلکی

تھا۔ ”ٹھیک ہے، بھئی ٹھیک ہے۔“ وہ اس کے سر پہ چپت لگا کر وہاں سے چل دیا۔ وہ روہانسی ہو کر وہاں بیٹھی رہ گئی۔

”یہ بھی تو ان ہی لوگوں میں سے ایک ہے۔ میں نجانے کیوں امید لگا بیٹھی تھی۔“ وہ محبت کے اس طرح بات ماننے سے خفا تھی۔

پھر رات تک وہ اسے کہیں نظر نہیں آیا اور اگلی صبح جب وہ کالج جانے کے لیے تیار ہو کر ناشتے کے لیے کچن میں آئی تو محبت اس سے بھی پہلے بیٹھا کباب اور پرائیڈ اڑا رہا تھا۔

”جیو، کئی بوا، جیو۔“ وہ ہرنوالے کے ساتھ ہنسنے لے کر کہہ رہا تھا۔

”خدا کی قسم، ترس گیا میں اس ذائقے کو۔ ہاسٹل کے پھیکے سیٹھے کھانے کھا کر تو لگتا تھا، دنیا سے ذائقہ ختم ہو گیا ہے۔ لذت نامی چیز تو شاید عنقا ہو چکی ہے اور مابین صاحب! آپ یوں کھڑی کھڑی میرے کھانے کو نظر کیوں لگا رہی ہیں۔ آئیے، آپ بھی شریک طعام ہو جائیے۔“

وہ شرارت سے کہہ رہا تھا۔ مابین سوچی آنکھوں اور ستے ستے چہرے کے ساتھ اسے مکمل طور پر نظر انداز کر کے ہاٹ ہاٹ سے پرائیڈ نکالنے لگی تھی۔ بقیہ چیزیں پہلے ہی ٹیبل پر موجود تھیں۔ وہ اس سے کافی ہٹ کر کرسی پر بیٹھی تو محبت خواہ مخواہ ہی ہنس دیا۔ اس نے کڑوے تیوروں سے گھورا مگر وہ مکمل طور پر ناشتے کی طرف متوجہ تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ بدستور کھیل رہی تھی۔ وہ سر جھٹک کر ناشتا کرنے لگی۔ چند لمحوں کے بعد وہ انہی تو محبت کی لمبی ٹانگیں راہ روکے ہوئے تھیں۔

”کیا تکلیف ہے تمہیں۔۔۔“ وہ چائے کے گھونٹ پیتا ہوا یوں چونکا جیسے کسی بات کی خبر ہی نہ ہو۔

”کے مجھے کوئی تکلیف نہیں۔“ وہ کچھ لمحے بڑے ضبط سے اسے گھورتی رہی تب وہ کندھے اچکا کر قدرے سنجیدگی سے سیدھا ہو بیٹھا تھا۔

”بیٹھو ذرا۔“ اس نے برابر کی کرسی کی طرف اشارہ کیا وہ نہ چاہنے کے باوجود بھی کچھ سوچ کر وہاں بیٹھ گئی تھی۔

”تمام بڑے ہاسٹل میں پتا کروا چکا ہوں۔ چاند بھیا کا کہیں پتا نہیں چلا۔ برائیوٹ کینٹنس میں بھی وہ موجود نہیں ہیں، رتو سے ان کا شناختی کارڈ لے کر قریبی تھانے میں جمع کروا کے گمشدگی کی رپورٹ بھی درج کروادی ہے۔ چند ایک بڑے اخبارات میں بھی اشتہار دے دیا۔ اگر کسی کو معلوم ہوا یا خود انہوں نے پڑھا تو سیدھے یہاں چلے آئیں گے۔ یقین مانو، اشتہار کا مضمون اتنا دردناک ہے۔ میں اپنے طور پر بس اتنا ہی کر سکتا تھا۔ اب گلی گلی گھوم کر انہیں تلاش کرنا میرے بس میں نہیں، ہاں اگر تم کہو تو۔“

یہ پہلا موقع تھا کہ محبت کا معنی خیز انداز اسے برا نہیں لگا تھا۔

”تھینک یو محبت! تمہاری اتنی مدد بھی بہت ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی تدبیر کارگر ہو جائے۔ وہ لوٹ آئیں اور۔۔۔“ اس کا دل فوراً ہی بھر آیا تو وہ پلکیں جھپک جھپک کر اپنے۔۔۔ آنسو روکنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

”تمہیں بہت دکھ ہوا ہے چاند بھیا کے جانے کا؟“ وہ بغور اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے لمحہ بھر

سی جھرجھری لے کر انہوں نے ادھر ادھر دیکھا اور آہستگی سے ہنڈ پر بیٹھ گئی تھیں۔ ان کی نظریں کمرے کے بند دروازے پر جمی ہوئی تھیں جہاں سے ابھی ابھی مابین نکل کر گئی تھی۔



بالکل غیر ارادی طور پر ہی وہ محبت کے آنے کی دعا کرتی رہی تھی اور سر شام جب چھوٹی ممانی کی کھٹارا سی سلائی مشین کی آواز سے پورا گھر گونج رہا تھا۔ وہ اچانک کہیں سے نکل کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا تو وہ حیرت سے گنگ کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔

”اے پتھر کی ہو گئی ہو کیا؟“ وہ اس کے چہرے پر گری بالوں کی لٹ کھینچنے ہوئے اسے اپنے مخصوص لاابالی انداز میں کہہ رہا تھا۔ وہ بس ایک طویل سانس لے کر اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے بال کانوں کے پیچھے اڑنے لگی تھی۔

”اور اگر مجھے معلوم ہوتا کہ کوئی گھڑی قبولیت کی تھی تو میں چاند بھیا کی واپسی کی دعا مانگ لیتی۔“ اس نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور پھر محبت کا ہاتھ پکڑ کر اس کو باغ میں لے آئی۔

”مجھے تمہاری مدد چاہیے۔“ اس نے بچوں کے ہن کھڑے ہو کر درخت کی اوپری شاخوں سے دوپکے ہوئے امرود توڑے اور اس کے عین سامنے بیٹھتے ہوئے نگاہیں اس کے چہرے پہ گاڑ دیں۔

”تمہیں معلوم ہے، چاند بھیا کہیں چلے گئے ہیں۔“

”کہاں چلے گئے ہیں؟“ اس کی حیرت بتا رہی تھی کہ وہ اس واقعہ سے نیکر لاعلم ہے۔

”مجھے نہیں معلوم بلکہ کسی کو کچھ بھی نہیں معلوم اور نہ کسی نے معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ جس حالت میں گھر سے نکلے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ۔“

”مابین! مجھے تفصیل سے بتاؤ۔“ وہ ادھ کھایا امرود ایک طرف اچھالتے ہوئے سیدھا ہوا تھا اور مابین نے اسے تفصیل سے بتانا شروع کیا تو پھر ہر بات بتاتی چلی گئی۔ وہ سب باتیں بھی جو اماں نے اسے کسی سے بھی کہنے سے منع کیا تھا اور ساری بات سن کر محبت کچھ دیر سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد اس سے گویا ہوا تھا۔

”اب تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“

”میں تم سے کیا چاہتی ہوں؟“ وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔

”تم میرے چاہنے کی بات کیوں کر رہے ہو محبت! کیا تم اپنے طور پر کچھ نہیں کرو گے۔“ اس کی بات سن کر وہ قدرے سنجیدگی سے آگے کو جھکا تھا۔

”میں اپنے طور پر بہت کچھ کر سکتا ہوں لیکن اس وقت تک نہیں کروں گا جب تک تم نہیں چاہو گی۔“

”لیکن؟“ وہ جھنجھلا کر کچھ کہنے والی تھی کہ اس کی آنکھوں سے عیاں شوخی و شرارت اور ہونٹوں پہ پھیلا مسکراہٹ نے اسے سمجھایا کہ وہ بات کا مفہوم کس حد تک بدل گیا ہے اور اس بات کا ادراک ہوتے ہی اس کے چہرے کی رنگت ایک دم سرخ ہو گئی تھی۔

”محب تم۔“ اس نے اپنی بے اختیار کیفیت چھپانے کے لیے رخ موڑا تو محبت قہقہہ لگا کر ہنس دیا

کے لیے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”تمہیں نہیں ہوا ان کے اس طرح چلے جانے کا دکھ۔“

”وہ اچھے انسان ہیں اور ان کے ساتھ زیادتی بھی ہوئی ہے۔ افسوس تو ظاہر ہے ہوتا ہے۔“ وہ کندھے اچکا کر نارمل سے لہجے میں بولا تھا۔

”تم لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ سب کے لیے بظاہر یہ عام سی بات ہے۔ ان کے چلے جانے سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑا۔ لمحاتی اور وقتی افسوس کے بعد سب نارمل ہو جاتے ہیں۔ مگر مجھ سے تو بہت کچھ چھن گیا ہے۔ محبت! اتنا کچھ کہ میں تو وضاحت بھی نہیں کر سکتی۔ ایک باپ کی طرح مجھ سے محبت کی تھی انہوں نے۔ بھائی بن کر لاڈ اٹھائے۔ ہر خواہش پوری کی دوست بن کر ہر خوشی، ہر دکھ میں میرا ساتھ دیا تھا انہوں نے لیکن تم لوگ کس طرح بھگو کے محبت! کہ یہ سارے تعلق یہ سارے رشتے تو صرف مجھ سے قائم کیے تھے انہوں نے۔ تم لوگوں کے لیے تو وہ صرف چاند گرہن تھے۔ اسکول لانے لے جانے والا ایک ڈرائیور۔ ادھر ادھر بھاگ بھاگ کر کام کرنے والا ایک ملازم۔ ایک فالتو پرزہ جس کی موجودگی تو فائدہ مند تھی لیکن غیر موجودگی بھی نقصان دہ نہیں۔“

وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے آنسو بہانے لگی تھی۔ محبت اسے تسلی دینے کے لیے لفظ ڈھونڈنے لگا تھا۔ مگر اس کے کچھ کہنے سے قبل ہی وہ آنسو صاف کرنی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”تم کب تک ہو یہاں؟“

”آج شام کو چلا جاؤں گا۔“ اس نے مختصر آہٹایا تھا۔

”اور ہاں، تمہیں تو شاید اگلے ہفتے آنا تھا۔ کل اچانک کیسے آگئے؟“ وہ یونہی خیال آنے پر پوچھ بیٹھی۔

”بس دل نے گواہی دی، کوئی اداس ہے، پریشان ہے، سو میں چلا آیا۔“ اس کے معنی خیز انداز پر وہ پھیکے سے انداز میں ہنس دی تھی، تب وہ شرٹ کا کارڈ درست کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”سنو، کسی وقت اوپر جا کر اماں کی خاطر مدارات بھی کر آیا کرو، میرا بھلا ہو جائے گا۔“ وہ شرارت کر رہا تھا مگر ماہین نے بالکل سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلادیا تھا۔

”ویسے تمہیں کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ماموں اور ممانی کی تنہائی کے خیال سے میں اکثر ان کے پاس چلی جایا کرتی ہوں اور تم اتنی فکر مت کیا کرو کیونکہ اب تو ممانی اپنی بھانجی کو مستقل یہاں لانے کا پروگرام بنا رہی ہیں تاکہ وہ جی بھر کے ان کی خاطر مدارات کر سکے۔“

اس نے بہت عام سے انداز میں جتاتے ہوئے اس پر بڑی ممانی کا نقطہ نظر واضح کیا تھا۔

”تمہیں کس نے بتایا؟“

”خاص طور پر تو کسی نے نہیں لیکن بات اڑتے اڑتے پہنچ ہی جاتی ہے ناں۔۔۔“

اس کے جواب پر محبت کچھ دیر تک لب سنجینے سے دیکھتا رہا تھا اور پھر سر جھٹک کر باورچی خانے سے باہر نکل گیا تھا۔ اس کے انداز بتا رہے تھے کہ وہ خود بھی ممانی کی اس خواہش سے بے خبر نہیں تھا۔



چاند بھیا کی گمشدگی کا واقعہ ایسا تھا کہ جس نے اس کے دل و دماغ کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ دن

کا بیشتر حصہ وحشت اور اضطراب میں گزر جاتا۔ اخبار آتا تو اس کا ایک ایک صفحہ کھنگال ڈالتی۔ کالج آتے آتے ایک ایک چہرے کو بغور دیکھتی اور کبھی یونہی رونے بیٹھ جاتی تو اماں نوک دیتیں۔

”مت یوں آنسو بہانے بیٹھ جایا کرو۔ دعا مانگا کرو، جہاں بھی ہو، ٹھیک ہو، خوش حال ہو۔“

”کیسے ہوں گے ٹھیک اور خوش حال۔ گھر سے نکلے تھے تو بخار سے پھنک رہے تھے۔ سر پہ زخم، جیب میں دھیلا نہیں۔ شہر میں کوئی دوست، رشتے دار نہیں۔ کہاں سے دوا لی ہوگی؟ کہاں سر چھپانے کو جگہ ملی ہوگی۔“

وہ دل کے سارے خدشے زبان پر لے آتی اور جب کبھی چھوٹی ممانی اسے روتا ہوا دیکھ لیتیں تو فوراً اسے اپنے سینے سے لگا لیتیں۔

”دل تو دکھتا ہے ناں آیا! آخر چاند نے گودوں کھلایا ہے اسے۔ اس کے ہاتھوں میں پلی بڑھی ہے۔ بھائی صاحب کی وفات کے بعد تمہیں تو اپنا ہوش بھی نہ تھا۔ ماہین کہاں ہے؟ کیا کر رہی ہے؟ کیا کھایا، پیا ہے، تمہیں خبر بھی نہ ہوتی تھی اور یہ سارا دن چاند کے کندھوں پر سوار پورے گھر میں مشرگت کیا کرتی تھی۔ وہ بھی سب بچوں میں سے اسی کا خیال زیادہ رکھتا تھا۔ کبھی سودا سلف لاتے ہوئے روپوں میں ڈنڈی مار جاتا اور ماہین کے لیے چاکلیٹ، ٹافیاں لے آتا۔ میں جانتی تھی۔ اپنی ذات پر تو کبھی ایک روپیہ بھی خرچ نہ کرے گا۔ اس لیے خاموش رہتی۔ آہا لیکن خیر اب کیا ہو سکتا ہے؟ تو فکر نہ کیا کر ماہین! وہ نیک بچہ ہے، اللہ نے چاہا تو سیدھی راہ پہ ہی چلے گا۔ تو اپنی پڑھائی پڑھیاں دیا کر۔“ ممانی زبردستی اسے پڑھنے کے لیے بٹھا دیتیں۔

رتو کا اس سے بھی بڑھ کر برا حال تھا۔ ہنسنا بولنا، کھانا، پینا نگی بوا سے لڑنا جھگڑنا کچھ بھی تو سہل جیسا نہیں تھا۔ وہ بس سرخ سرخ آنکھیں لیے ادھر سے ادھر بے چین روح کی طرح گھومتی رہتی یا پھر گھنٹوں نظر ہی نہ آتی، تب تنگ آکر ماہین نگی بوا سے استفسار کرتی۔

”اے کیا معلوم اس اللہ ماری کو کیا بیماری ہے۔ نہ نہانے دھونے کا پتا ہے نہ کپڑے بدلنے کا ہوش، دل چاہے تو اٹھ کر ایسی کام میں لگتی ہے کہ گھنٹوں نہیں تھکتی نہ دل چاہے تو لاکھ بتی رہوں۔ پس سے مس نہیں ہوتی۔ اللہ جانے کیا روگ لگ گیا ہے اس کو۔“ نگی بوا اس کے معمولات سے عاجز آ چکی تھیں۔

”بوا! ایسے مت کہو، ظاہر ہے چاند بھیا کے جانے کا اسے بھی افسوس تو ہوا ہوگا ناں۔“ وہ افسردگی سے کہہ دیتی مگر نگی بوا کو اس کی بات پر یقین ہی نہیں آتا تھا۔

”اے! جب وہ یہاں تھا تو اس نے بھی سیدھے منہ اس سے بات نہ کی تھی۔ اب کیا غم لگا ہے کجخت کو۔“

”کوئی کچھ بھی کہے، رتو اور ماہین کے سوا اور کوئی نہیں جو اس حادثے سے سب سے زیادہ متاثر ہوا ہو۔“ یہ ماہین کا خیال تھا جسے آنے والے وقت نے مکمل طور پر غلط ثابت کر دیا تھا۔ ان دونوں کے علاوہ یقیناً کوئی تیسرا فرد تھی تھا جو ان دونوں سے کہیں زیادہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا تھا۔



نجمہ خالہ کے انداز کتنے دنوں سے ہی بدلے بدلے لگ رہے تھے، ان کے معمولات میں اس قدر فرق آ گیا تھا کہ ماہین کے ساتھ ساتھ گھر کے باقی افراد بھی نوٹ کیے بغیر نہ رہ سکے تھے۔ معلوم نہیں کیوں

لیکن اب وہ خلاف عادت زور زور سے بولنے لگی تھیں۔ جہاں صرف مسکرانے کی ضرورت ہوتی وہاں بھی قہقہہ لگانے لگتیں۔ ایک دم مصنوعی اور کھوکھلا قہقہہ اور بھی تو یوں ہوتا کہ بیٹھے بیٹھے اچانک چونک جاتیں سب خاموش بیٹھے ہوتے اور وہ بوچھٹیں۔

”کسی نے کچھ کہا کیا؟“ کبھی بیٹھے بیٹھے خود ہی بوڑھانے لگتیں۔ لباس پر بھی پہلے ہی توجہ نہ رہی تھی ہر دوسرے روز کلف لگا کر سوٹ پہننے والی نجمہ خالہ اب اکثر ملگجے سے سوٹ میں دکھائی دے جاتی تھیں۔ گھر کے ہر کام میں مداخلت اور بے جا روک ٹوک میں بھی کسی حد تک کمی آگئی تھی۔ ماہین سے ان کی پول چال چاند بھیا کے جانے سے لے کر اب تک تقریباً بندھی لیکن اس روز ماہین کی حیرت کی انتہا نہ رہی تھی جب وہ اپنی کتابیں اٹھائے اس کے پاس آ بیٹھی تھیں اس نے کن آنکھوں سے انہیں دیکھا اور پھر کچھ بولے بغیر اپنی کتاب کی طرف متوجہ ہو گئی تب وہ خود ہی اس سے مخاطب ہوئی تھیں۔

”ماہین وہ چاند گرہن کتنا عجیب انسان تھا نا؟“

ماہین چونک کر ان کی شکل دیکھنے لگی۔ بات کا جواب تو کیا دینا تھا وہ ان کے منہ سے چاند بھیا کا نام سن کر ہی حیرت زدہ رہ گئی تھی۔

”میں اسے کتنا ڈانٹا کرتی تھی۔ مارتی بھی تھی لیکن تعجب ہے کہ اس نے مجھے کبھی بھی روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ حالانکہ وہ مجھ سے دو گنی قوت رکھتا تھا۔ میرا اٹھایا ہوا ہاتھ پکڑ کر مجھے روک سکتا تھا۔ پلٹ کر جواب دے سکتا تھا مگر اس نے بھی ایسا نہ کیا تھا۔ وہ ہمیشہ ہر بار باادب ہو کر میرے سامنے آیا کرتا تھا۔ جھکی آنکھوں اور جھکے سر کے ساتھ، بھی نگاہ اٹھاتا بھی تو اس کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت، حقارت، غصہ نہیں بلکہ نرمی کا ایک تاثر ابھر آتا تھا مگر کیوں ماہین؟ کسی جانور پر بھی ظلم کرو تو وہ پلٹ کر ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے تو پھر وہ کیوں نہیں؟“ وہ اچھے اچھے سے انداز میں بول رہی تھیں۔

”اس لیے نجمہ خالہ کہ وہ معاف کر دینے کا وصف رکھتا تھا اور جہاں معاف نہیں کر سکتا تھا۔ وہاں معاملہ خدا کے سپرد کر دیتا تھا۔“ اس نے دل ہی دل میں جواب دیا تھا۔

”لیکن سوال یہ ہے کہ آخر میں اتنی دیر سے اس کی باتیں کیوں کر رہی ہوں بلکہ میں اس کے بارے میں سوچ بھی کیوں نہ رہی ہوں؟“

وہ ہنکے ہنکے سے انداز میں بول رہی تھیں پھر یکا یک ہی کتابیں اٹھا کر تیز رفتاری سے چلتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں، ماہین حیران پریشان ہی کتاب پر نظریں جمائے بیٹھی تھی اور کچھ روز بعد اسے حیرت کا شدید جھکا اس وقت لگا تھا جب اس نے نجمہ خالہ کو چاند بھیا کے کمرے میں جاتے ہوئے دیکھا وہ بجلی کی سی تیزی سے ان کے پیچھے لپکی تھی۔ خلاف توقع اسے دیکھ کر انہوں نے کسی ناگوار رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا بلکہ بہت ہی نرم لہجے میں اس سے بات کرنے لگی تھیں۔

”دیکھو ذرا یہ کرا، یہ کسی انسان کے رہنے کے لائق ہے۔ تو یہ اس نے کس طرح اپنی زندگی کے بائیس سال یہاں اس اصطبل میں گزارے ہوں گے اور بلب بجی تو نہیں ہے یہاں، لیکن نہیں۔“ انہوں نے جیسے کچھ سوچا تھا۔

”بلب تو تھا یہاں لیکن میں نے اتر دیا تھا۔ ایک، دو بار نہیں جتنی بار اس نے لگایا تھا، اتنی دفعہ میں نے بلب توڑ دیا تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ اس کمرے میں روشنی ہو۔۔۔ مجھے اس کمرے میں پھیلا

اندھیرا سکون دیتا تھا لیکن ماہین! وہ، وہ اس اندھیرے میں کیسے رہتا ہوگا، تاریکی میں تو دم گھٹنے لگتا ہے نا۔“

وہ روہانے لہجے میں بولے چلی جا رہی تھیں۔ ماہین قدرے خوفزدہ سی ہو کر بھاگی بھاگی اماں کے پاس آئی۔ اس کے کہنے پر اماں فوراً نجمہ خالہ کے پاس چلی گئیں۔ ذرا دیر بعد آئیں تو اٹا اسے ہی ڈانٹنے لگیں۔

”وہ تو اچھی بھلی باتیں کر رہی ہے ماہین! تم نے تو مجھے خواہ مخواہ ہی ڈرا دیا۔“

اماں نے گویا سکھ اور سکون کا سانس لیا تھا لیکن یہ سکون اس وقت غارت ہو گیا تھا جب نجمہ خالہ کی ایک دوست نے آ کر بتایا۔

”معلوم نہیں اسے کیا ہو گیا ہے اسکول میں خراب کارکردگی کے باعث اسے دو مرتبہ نوٹس دینے کے بعد بالآخر خارج کر دیا گیا ہے۔“ یہ خبر سن کر گھر بھر کے افراد میں تشویش کی ایک لہر دوڑ گئی تھی نجمہ خالہ البتہ اس کے بعد اپنے کمرے میں تقریباً بند ہو کر رہ گئی تھیں۔



محبت اس دفعہ پورے ڈیڑھ ماہ بعد آیا تھا اور اس نے آتے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ اس بار ڈھیر سارا سونے، کھانے اور رہنے کے لیے آیا ہے۔ چنانچہ پہلے کئی دن تک تو اس کی شکل ہی دکھائی نہ دی تھی ہر بار استفسار کرنے کے بعد معلوم ہوتا کہ سو رہا ہے۔ کچھ روز جی بھر کے سولینے کے بعد کھانے کی باری آئی تھی۔

نتیجتاً وہ چوبیس گھنٹے کچن میں نظر آنے لگا تھا۔ کئی بوا کی الگ شامت آئی ہوئی تھی۔ وہ خود بھی نت نئے تجربے کرتا اور ان سے بھی کرواتا۔ اس کی اس روئین سے باقی سب کا تو پتا نہیں، چھوٹی ممانی البتہ بہت تنگ آگئی تھیں۔ ایک روز چڑ کر کہہ دیا۔

”یہاں میرا راشن ختم کرنے سے بہتر ہے، کئی بوا کو اوپر لے جاؤ۔“ اور وہ ان کی بات سن کر برا ماننے کے بجائے ہنستا ہوا پیچھے سے آ کر ان سے لپٹ گیا تھا۔

”ارے واہ چچی! اتنے بڑے وجود میں اتنا چھوٹا سادل اور پھر میں تو اپنے چچا کا کھانا ہوں۔“

”کھاؤ بیٹا! چچا کا جس طرح چاہے کھاؤ مگر میں کہتی ہوں۔ کبھی کبھی باپ کا بھی کھالینا چاہیے۔“ چھوٹی ممانی جان بوجھ کر چوبیس کر تیں اور اس کے قہقہے بلند سے بلند ہوتے چلے جاتے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اس کی آمد سے نہ صرف اوپر بلکہ نیچے کے پورشن میں بھی رونق سی آگئی تھی۔

اس کے قہقہوں نے گھر میں پھیلے سناٹے کو چٹخا دیا تھا۔ پہلے بھی ماہین اور تو کو ساکون تھا گھر میں جو اوہم مجائے رکھتا۔ ان دونوں کے دم سے رونق تھی مگر چاند بھیا کے جانے کے بعد تو کو تو چپ سی لگ گئی تھی۔ چنانچہ بات پوچھو، اتنا جواب آ جاتا تھا۔ ماہین ہی تو وہ چاند بھیا کے لاپتا ہونے کے بعد نجمہ خالہ کی بگڑی ہوئی حالت دیکھ کر گم صم ہی رہنے لگے تھے۔ اس دن بھی وہ صحن میں بیٹھی کتاب سامنے رکھے نوٹ بک پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی جب وہ دھڑ دھڑ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کے پاس آ بیٹھا۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“

”کچھ نہیں۔“ اس نے آہستگی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

”پڑھائی کیسی ہو رہی ہے، او، ہورتو بی بی! آپ کا یہ ہتھوڑا تھوڑی دیر کے لیے خاموش نہیں ہو سکتا۔“ اس نے پلٹ کر رتو سے کہا جو چھوٹی ممانی کے کہنے پر سارے بادام لیے چھوٹے سے ہتھوڑے سے توڑ رہی تھی اور اس کی بات پر یو بھی ہتھوڑا روک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

”میرا مطلب ہے اگر ایک کپ کافی۔“ اس کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی رتو اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”رتو! میرے لیے بھی بنالینا۔“ ماہین نے کہا تو محبت حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

”یہ تم نے کب سے کافی پینی شروع کر دی؟“

”آج سے بلکہ ابھی بھی یو بھی دل چاہ رہا ہے پیئے کو۔“

”ہوں دیری انٹر سٹنگ۔“ وہ کرسی بٹھلانے لگا تھا۔

میرے رنگ میں رنگنے والی پری ہو یا پریوں کی رانی

اس نے یو بھی لیکریں کھینچتے ہوئے نگاہ اٹھا کر دیکھا، وہ اسی پر نظریں جمائے گنگنا رہا تھا۔

”رتو! میرے لیے کافی مت بنانا، میں نہیں پیوں گی۔“ اس نے وہیں سے تملکا کر ہانک لگائی تو وہ بے اختیار ہنس دیا۔

”بائی واوے، تم اتنا چڑتی کیوں ہو؟“ وہ اسے دلچسپی سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”تمہاری حرکتیں ہی اتنی خوفناک ہوتی جا رہی ہیں کہ۔۔۔“

ایک دم عجیب و غریب قسم کی آوازیں سنائی دیں تو وہ فوراً خاموش ہو گئی اور اسی دم چہرے کی بدلتی رنگت کے ساتھ نجمہ خالہ کے کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھنے لگی جہاں سے چیخ و کار کی آوازیں بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ محبت نے پلٹ کر ایک نظر چھوٹی ممانی کو دیکھا جو اپنے کمرے سے نکل کر نجمہ خالہ کے کمرے کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ وہ تاسف سے سر ہلاتے ہوئے سیدھا ہاتھوں ماہین اضطرابی انداز میں اپنے ناخن چبا رہی تھی۔

”میرا خیال تھا، میں اس دفعہ گھر آؤں گا تو سب کچھ پہلے کی طرح ٹھیک ہو چکا ہوگا۔“ اس نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑا اور ٹوٹے پھوٹے ناخنوں کا جائزہ لینے لگا۔ ماہین نے شرمندہ ہوتے ہوئے فوراً اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا تھا۔

”پتا ہے محبت! نجمہ خالہ کی یہ حالت بعض اوقات مجھے خوفزدہ کر دیتی ہے۔ اتنی شدت سے انہیں دورے پڑنے لگتے ہیں کہ لگتا ہے اب یہ خود کو زندہ نہیں چھوڑیں گی۔ اپنا چہرہ نوج لیتی ہیں، بال کھینچتی ہیں۔ وہ لا شعوری طور پر اپنے ساتھ ہر وہ ظلم کرتی ہیں جو کبھی انہوں نے چاند بھیا پر کیا تھا۔ کبھی خود کو اندھیرے کمرے میں بند کر لیتی ہیں۔ اور پھر خود ہی خوفزدہ ہو کر چلائے لگتی ہیں، کبھی پہروں بھوکی بیٹھی رہتی ہیں کھانے کو ہاتھ نہیں لگاتیں۔ اتنی عجیب سی حالت ہو گئی ہے ان کی۔ یقین مانو میں تو سب کچھ بھول کر دن رات یہی دعا کرتی ہوں کہ کاش ایک۔۔۔“

”کسی سائیکا ٹرسٹ کو نہیں دکھایا۔۔۔؟“

”ماموں کے جاننے والے ہیں ایک سائیکا ٹرسٹ ان ہی سے رابطہ کیا ہے ابھی تو وہ گھر آ کر نجمہ

خالہ کو دیکھ گئے تھے۔ آئندہ شاید ان کے کلینک پر لے جانا پڑے گا۔ لیکن سائیکا ٹرسٹ کیا کرے گا۔ محبت! یہ تو ان کا احساس جرم ہے جو اب پچھتاوے میں بدل چکا ہے۔ تمہیں پتا ہے جب بچپن میں، میں چاند بھیجا کو نجمہ خالہ کی کسی زیادتی کا شکار ہوتے دیکھتی تو کہتی۔

”اللہ انہیں ضرور سزا دے گا۔“ اور چاند بھیجا فوراً مجھے ٹوک دیا کرتے تھے۔

”نہیں گڑیا! ایسے نہیں کہتے۔ دعا کیا کرو، اللہ ہر کسی کو اپنی رحمت کے سائے میں جگہ دے۔ کسی انسان کی کیا مجال کہ اللہ کی ناراضی کا سامنا کر سکے۔“

اس وقت ان کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی لیکن اب نجمہ خالہ کو دیکھتی ہوں تو رورور کر یہی دعا کرتی ہوں کہ اللہ ہر کسی کو اپنی رحمت کے سائے میں جگہ دے۔“

”آمین۔“ محبت نے فوراً ہی اس کی بات کے جواب میں کہا تھا اور پھر نجمہ خالہ کی خیریت معلوم کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔



وہ نکی ہوا کے کہنے پر رتو کو سارے گھر میں تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ چاند بھیجا کے کمرے کا دروازہ کھلا دیکھا تو سیدھی ادھر ہی چلی آئی رتو نے آہٹ پر گھبرا کر پلٹ کے دیکھا لیکن پھر اسے دیکھ کر اطمینان کا سانس لیتی ہوئی دوبارہ جیکے جیکے صفائی کرنے لگی۔

”کیوں بلکان کرتی رہتی ہو خود کو، اب کون آئے گا یہاں اس آلاش سے پاک کمرے میں رہنے کے لیے۔“ پیچھی تو کسی اور ہی دلس کی جانب اڑ گیا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی کھڑکی میں آکھڑی ہوئی تھی۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور اس کی سرخی مائل زرد شعاعیں براہ راست کھڑکی کے ذریعے کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔

رتو اب جھاڑو چھوڑ کر جھاڑن پکڑ چکی تھی۔ اسے اتنے انہماک سے صفائی ستھرائی میں مصروف دیکھ کر اسے ہلکے سے افسوس نے آگھیرا۔

”کیا ہوتا تو بی بی! جو تم اتنی زحمت ان کی موجودگی میں کر لیا کرتیں اور کچھ نہیں تو بے چارے چاند بھیجا اس کے احسان مند ہی ہو جاتے۔“

وہ چاند کی ایک کتاب اٹھا کر کھڑکی میں بیٹھ گئی تھی اور یو بھی اس کی ورق گردانی کرتی رہی۔ کتاب میں جگہ جگہ چاند بھیجانے سیاہ روشنائی سے اپنے دستخط کیے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں ادھورا چاند بنا ہوا تھا۔

”تمہیں کیا لگتا ہے رتو! چاند بھیجا لوٹ کر آئیں گے؟“ اس نے کتاب بند کر کے گود میں رکھی اور نارنجی آسمان پر اڑتے پرندوں کو دیکھتے ہوئے رتو سے پوچھا۔

”پتا نہیں۔“ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد رتو کا جواب ملا تو وہ بے اختیار ہی پلٹ کر اسے دیکھنے لگی۔ زرد شعاعوں کی زد میں کھڑی رتو بہت مضطرب اور اداس لگ رہی تھی۔ ماہین سر جھٹک کر ہلکا سا مسکرا دی۔

”تم ہمیشہ سے ہی گھٹی اور سسینی ہو، دل کے معاملات کی خبر ہی کہاں ہونے دیتی ہو۔“ رتو حسب توقع خاموشی سی رہ گئی تھی اور ماہین سوچ میں ڈوب گئی۔

کتنا بدل گئی تھی رتو چاند بھیجا کے جانے کے بعد۔ بالکل خاموش ادا اس مٹی کی کسی صورت کی طرح

اور اس کی اس تبدیلی پر سب ہی حیران تھے۔ اب نہ محلے کی خبریں سننے کو ملتی تھیں نہ مکی بوا کے ساتھ جھگڑنے کی۔ چھوٹی ممانی اس کی دلچسپ اور چکنی چپری باتیں سننے کو ترس گئی تھیں۔ بڑے ماموں آتے جاتے اس سے پوچھتے کہ اب وہ گھر بھری شکایتیں لے کر ان کے پاس کیوں نہیں آتی اور اس کی اسی حالت نے تو مامین کو سمجھایا تھا کہ اس کا چاند بھیا کے ساتھ کیا رشتہ، کیا حلق تھا اور تو کے خاموش بہتے آنسوؤں نے ہی اس ہمدرد کا نام مامین پر عیاں کیا تھا اور اتنے عرصے کے بعد ہی تو مامین سمجھ پائی تھی کہ چاند بھیا کو مین کے لڈو کن پہنچا تھا؟ ان کے تنیکے کے نیچے رنگ برنگے دھاگوں سے کڑھے رومال کون رکھتا تھا اور کون تھا جو سردی کی راتوں میں اندھیری کوٹھری میں بیٹھ کر چاند کی کرنوں میں ان کے لیے سویر بنا کرتا تھا اور جب اس نے اپنے شک کی تصدیق کے لیے رتو سے پوچھا تھا۔

”رتو! تم چاند بھیا سے محبت کرتی تھیں۔“

تو رتو نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا، بس اس کے کاندھے سے سر ٹکا کر بے آواز رونے بیٹھ گئی تھی اور اس کے جدائی کی بے قرار خوشبو سے مہکتے آنسوؤں نے اس کے دل کی ساری خبر مامین کو کر دی تھی۔

”چاند بھیا تمہاری محبت سے بے خبر نہیں تھے۔ بے ناں رتو! اپنے ہمدرد کا ذکر کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک اتر آتی تھی اور محبت میں تو بہت کشش ہوتی ہے ناں رتو! تم دعا کیا کرو دیکھ لینا اگر کبھی وہ لوٹے تو صرف اور صرف اسی محبت کی خاطر لوٹیں گے۔“

اس نے رتو سے کہا تھا۔ حالانکہ رتو سے کہنے کی ضرورت ہی کب تھی وہ تو سر تا پا دعا بن کر رہ گئی تھی۔



معلوم نہیں کتنا عرصہ بیت گیا تھا۔ چاند بھیا کو اس گھر سے گئے ہوئے۔

دو سال، تین سال، چار سال یا شاید اس سے بھی کچھ زیادہ۔ مامین نے تو حساب کتاب ہی رکھنا چھوڑ دیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زندگی بہر حال اپنی ڈگری پہنچ گئی تھی۔ لیکن ان کی یادھی کہ اب بھی کسی صورت بھلائے نہیں بھولتی تھی اور وہ جو ایک سلسلہ تھا ہر آتی جانی سانس کے ساتھ ان کے لوٹ آنے کی دعاؤں کا تو اب اس میں بھی وہ شدت اور باقاعدگی کہاں رہی تھی۔

”آجائیں گے خود ہی اگر آنا ہوا؟“ وہ اپنی دعاؤں کے رد ہونے پر چڑ جاتی۔ سوچ لیتی، اب ان کے آنے کی کبھی دعا نہیں مانگے گی۔ لیکن پھر بھی امید کا دوسرا سرا ہمیشہ دعا سے جڑا رہتا تھا۔ تھکتی نہیں تھی۔ اور ایک وہ رتو بھی جو اب بھی انگلیوں پر دن سنتی تھی اور ہر بار سنتی میں اضافے پر بھی تھکتی نہیں تھی۔ پہلے سے زیادہ ہر امید ہو جاتی تھی۔ دعاؤں میں کچھ اور شدت آنے لگتی اور زندگی میں بھی نماز نہ پڑھنے والی رتو کو وہ تہجد کی نماز کے لیے اٹھتے دیکھتی تو حیران رہ جاتی۔

”یا اللہ! کیسی لگن ہے؟ جو کسی طور کم ہونے میں نہیں آتی۔“

اور پھر رتو کی ریاضتوں کو دیکھ کر وہ دل ہی دل میں چاند بھیا سے شکوہ کرنے بیٹھ جاتی۔ ”کس دیس ٹھکانہ کر لیا چاند بھیا؟ کیا ایک بار بھی پلٹ کر آنے کو دل نہیں چاہا۔؟“ اور پھر ایک وہم سادل میں کنڈلی مارے بیٹھ جاتا۔ وہ گھر اگر رتو سے پوچھتی۔

”رتو! چاند بھیا زندہ تو ہوں گے ناں؟“ اور جواباً رتویوں دہل کر اس کی طرف دیکھتی کہ وہ بری

طرح شرمندہ ہو کر رہ جاتی۔

”اب بھی چاند بھیا ادھر آئے تو وہ بہت حیران ہوں گے اس گھر کو دیکھ کر، اس کے درود یوا کو دیکھ کر اور سب سے بڑھ کے اس گھر کے مینوں کو دیکھ کر سب ہی کچھ تو پہلے سے بہت بدل گیا ہے ناں؟“ وہ بات بدل دیتی اور واقعی سب ہی کچھ تو پہلے سے بدل گیا تھا۔ خود مامین بھی پہلے جیسی کب رہی تھی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا، چاند بھیا گئے تو اس وقت وہ فرسٹ ایر میں تھی۔ کاندھوں پر چھوٹے بالوں کی دو پونیاں بنا کر رکھتی تھی اور اب وہ بی اے کے بعد گھر میں بیٹھی تھی بالوں کی چوٹی گھٹنوں کو چھونے لگی تھی اور اماں اس کے رشتے کے لیے چوبیس گھنٹے فکر مند رہنے لگی تھیں۔

بڑی ممانی کے جوڑوں کا درد بڑھ گیا تھا۔ اب وہ نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے کے چکر محض خواب بن کر رہ گئے تھے، ان کی تنہائی کے خیال سے مکی بوا سارا دن ان کے پاس رہتیں۔

بڑے ماموں کی اپنی کاروباری مصروفیات تھیں۔ چھوٹے ماموں اللہ مزے میں تھے۔ عید بھیا کی جاب کے بعد انہوں نے ریٹائرمنٹ لے لی تھی اور آج کل دوستوں کی محفل ہی ان کا مستقل ٹھکانا تھا۔ عید بھیا کی شادی کے بعد نہ صرف سیمابھیا بھی اس گھر میں آچکی تھیں بلکہ اب تو ننھا فراز بھی اس گھر کی رونق میں اضافہ کر چکا تھا۔ زین کو اسلام آباد میں جاب مل گئی تھی۔ چھوٹی ممانی سب کچھ سیمابھیا بھی کے سپرد کر کے اسلام آباد کے موسموں سے لطف اندوز ہونے کو زین کے پاس جا پہنچی تھیں۔ اسدا پنا باکسنگ کلب کھول چکا تھا اور اس کی غیر مستقل مزاجی اور آوارہ گردی ہنوز وہی تھی۔

نجمہ خالد مثال عبرت بنی اپنے کیے کی سزا کاٹ رہی تھیں۔ مسلسل نفسیاتی علاج سے ان کے دوروں میں کمی تو آگئی تھی مگر پھر بھی ان کی حالت کو نارمل ہرگز نہیں کہا جاسکتا تھا۔

بانی رہ گیا محبت تو وہ ایم بی اے کی ڈگری لینے یونیورسٹی جا پہنچا تھا مگر اس کے انداز و اطوار میں اب بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ مامین کا کتڑا کتڑا سا انداز بھی اس کی دارنگی میں کمی کا باعث نہیں بن سکا تھا۔ مامین چونکہ بڑی ممانی کے تیور پہنچاتی تھی۔ اس لیے وہ کسی صورت اس کی پذیرائی کے لیے تیار نہیں تھی۔ ”امی صرف اس لیے اپنی بھانجی کے لیے کہہ رہی ہیں کیونکہ ابھی تک میں نے انہیں اپنی پسند کے بارے میں آگاہ نہیں کیا۔ تم اگر ذرا سا اشارہ دے دو تو میں آج۔“

ایک بار ممانی نے واشگاف انداز میں محبت اور اپنی بھانجی کی شادی کا ذکر کیا تو محبت نے وضاحت کی تھی، وہ تب بھی بات کو مذاق میں ٹال گئی تھی۔

”کیسے دے دوں اشارہ اگر کل کلاں تم سے بہتر شخص مل گیا مجھے تب۔۔۔“ اور اس کی بات سن کر محبت کا چہرہ ایک دم سرخ پڑ گیا تھا۔

”اور تو ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔“ وہ بظاہر بڑے ضبط سے بولا تھا۔ ”اور بالفرض ہو بھی گیا تو کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔ میں جان لے لوں گا اس ”بہتر شخص“ کی اور شاید تمہاری بھی۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہتا راہ میں آنے والی ہر چیز کو ٹھوکر لگا کر وہاں سے چلا گیا تھا اور وہ خوف زدہ سی اپنی جگہ پر بیٹھی رہ گئی تھی۔



سمیعہ کا جدہ سے خط آیا تھا۔ وہ لے کر اوپر ممانی کے پاس گئی تو انہوں نے وہیں بٹھا لیا۔

”پڑھ کر سنا دو، اب پہلے جیسی نظر نہیں رہی۔“ انہوں نے کہا تو وہ خط پڑھنے لگی۔ خاصا طویل خط تھا جس میں بچوں کی شراوتوں سے لے کر اکویتی نند کی چالاکیوں اور میاں صاحب کی نا انصافیوں پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا تھا۔ آخر میں البتہ چند سطرں لکھ کر یقین دہانی کرا دی گئی تھی کہ یہ خط اس وقت لکھا گیا تھا جب کھانا کھینے میں دیر ہوئے پر میاں سے جھگڑا ہوا تھا۔ لیکن اب سب خیریت ہے۔ دوبارہ خط لکھنے کا وقت نہ ہونے کی وجہ سے یہ ہی خط بھیجا جا رہا تھا جیسے تیسے مایین نے تین پرچوں پر مشتمل یہ خط مکمل کیا تھا مگر ممانی کی نجانے کیوں تشفی نہ ہو سکی تھی۔ مجبوراً اسے دوبارہ یہ عمل سرانجام دینا پڑا۔ وہ تو شکر ہوا کہ تیسری مرتبہ فرمائش نہیں کی گئی صرف اتنا کہا۔

”جانے سے پہلے میری عینک ڈھونڈ کر مجھے دے جاؤ۔“

اسے معلوم تھا۔ اب تیسری دفعہ یہ خط وہ خود پڑھیں گی، لہذا عینک ان کے ہاتھ میں تھا کہ وہ فوراً نیچے چل آئی تھی۔ ارادہ اپنے کمرے میں جانے کا تھا مگر برآمدے میں نجمہ خالہ کو ٹپکتے دیکھ کر وہ بے اختیار ہی تھٹک کر رک گئی تھی۔ تنگے پاؤں، عام سے لباس میں کسی بھی سوٹر، جری کے بے نیاز وہ برآمدے میں دیوانوں کی طرح ادھر سے ادھر گھوم رہی تھیں۔ وہ بے اختیار ہی ان کی طرف بڑھی۔

”نجمہ خالہ! نجمہ خالہ!“ اس کے پکارنے پر بھی وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئیں تو وہ فوراً ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

”نجمہ خالہ کیا کر رہی ہیں یہاں؟“ اس نے پوچھا تو وہ بغیر جواب دیے اسے ایک طرف دھکیل کر آگے بڑھنے لگیں تب اس نے دونوں ہاتھ ان کے کاندھوں پر رکھ کر انہیں روک دیا تھا۔

”کیا ہو گیا ہے خالہ آپ کو، اتنی سردی ہے اور آپ۔۔۔ آئیے میرے ساتھ کمرے میں چلیں۔“

وہ زبردستی ان کا بازو تھام کر انہیں کمرے میں لے آئی پھر دروازہ بند کر کے پلٹ کر وہ مضطرب سے انداز میں کمرے میں یوں گھوم رہی تھیں جیسے کسی گمشدہ چیز کو تلاش کر رہی ہوں۔

”ادھر بیٹھیں۔ آپ مجھے بتائیں، کیا ڈھونڈ رہی ہیں؟“ اس نے انہیں بیڈ پر بٹھا کر لحاف ان پر ڈالا۔

”ماہین! ماہین! وہ کہاں چلا گیا؟“ وہ ایک دم ہی اس کا ہاتھ تھام کر روہانے لہجے میں بولیں تو

ماہین بے اختیار ہی ایک طویل سانس لے کر رہ گئی تھی۔

”وہ اب آ کیوں نہیں جاتا، پہلے تو بھی اتنا ناراض نہیں ہوا تھا مجھ سے۔ میں اسے مارتی تھی۔ برا

بھلا کہتی تھی گروہ بھی نہیں گیا تھا۔ پھر اب کیوں چلا گیا اور چلا گیا ہے تو آ کیوں نہیں جاتا۔“

وہ بے قراری سے اپنا ہاتھ بستر پر مار رہی تھیں۔ ماہین بس چپ چاپ انہیں دیکھ گئی۔ وہ جانتی

تھی، نجمہ خالہ کس کے بارے میں بات کر رہی ہیں مگر پھر بھی اس کے پاس کہنے کے لیے کوئی لفظ نہیں

تھا۔

”چتا نہیں ماہین! میں رات کو ٹھیک طرح سے سو نہیں پاتی۔ طرح طرح کے دہم ستاتے ہیں مجھے،

اس کا چہرہ دنگ ہوں کے سامنے حکومتا رہتا ہے۔ میں خوفزدہ ہو جاتی ہوں ماہی! ڈرنے لگتی ہوں، تب وہ

تھقب لگانے لگتا ہے۔ میں روئے لگوں تو وہ بھی رونے لگتا ہے اور پھر اس کی سسکیوں کی آواز رات بھر

میرے کمرے میں گونجتی رہتی ہے۔“ نجمہ خالہ اب بے آواز رو رہی تھیں۔

”میں نے اس پر بہت ظلم کیے تھے ناں۔ بہت زیادہ لیکن اب میں رات رات بھر اس کی سلامتی کی، واپسی کی دعا میں کرتی ہوں۔ لمحہ لمحہ انتظار کرتی ہوں اس کا۔ وہ بس ایک بار آ جائے، صرف ایک بار، میں اس سے معافی مانگ لوں پھر اس کا جہاں دل چاہے وہ چلا جائے اور اگر وہ نہ آیا۔۔۔ اگر وہ نہ آیا مایین! تو خدا کی قسم نہ میں مرسکوں گی نہ جی سکوں گی۔“ نجمہ خالہ کے بدن پر لرزہ طاری تھا اور مایین گنگ بیٹھی تھی۔

”جاؤ اسے کہیں سے ڈھونڈ لاؤ۔ میں نے اس کے ساتھ بہت برا، کہا تھا۔ بہت برا معلوم نہیں وہ

کہاں گیا ہوگا۔ کس حال میں ہوگا۔ معلوم نہیں وہ زندہ بھی ہوگا یا۔“ نجمہ خالہ خود ہی پھوٹ پھوٹ کر رودی

تھیں۔

”وہ تمہاری ہر بات مانتا تھا مایین! خدا کا واسطہ ہے جاؤ اور اسے ڈھونڈ لاؤ۔ میں تمہارے آگے

ہاتھ جوڑتی ہوں۔ دامن پھیلاتی ہوں۔ اس سے کہو صرف ایک بار آ جائے۔ صرف ایک بار آ کر مجھے

معاف کر دے۔ صرف ایک بار۔“

وہ روتے روتے نڈھال ہو گئی تھیں۔ مایین لب بھینچے انہیں بازوؤں میں لیے تھپکتی رہی۔ نجانے

کتنی دیر گزر گئی، تھک کر نجمہ خالہ نے خود کو بستر پر گرادیا۔ وہ پُر شفقت انداز میں ان کے بالوں میں

انگلیاں چلاتی رہی۔ بند آنکھوں سے پھسلتے بے رنگ آنسوؤں کو اپنی انگلیوں میں سمیٹتی رہی۔ جب نجمہ

خالہ کی بو جھل پلکیں ایک دوسرے میں پیوست ہو گئیں تب وہ ان کا لحاف درست کر کے باہر نکل آئی۔

انہیں اب بہت دیر تک سونا تھا۔



محبت اپنے فائل ایگزام سے قبل گھر آیا تھا۔ مایین لاشعوری طور پر اس کے نیچے آنے کی منتظر رہی

مگر اسی شام ہی بوا کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ واپس بھی چلا گیا ہے۔ مایین حیران ہی رہ گئی۔ اس طرح آج

سے پہلے تو کسی نہ ہوا تھا۔ وہ چاہے کھڑے کھڑے اس کے پاس آتا لیکن اس طرح بغیر ملے بھی واپس

نہیں گیا تھا۔

”لگتا ہے، بڑی صاحبہ کے ساتھ کچھ کھٹ پٹ ہو گئی ہے۔ میں تو اس کے لیے مرغ کی کڑا ہی بنا

رہی تھی۔ پلاؤ دم پر تھا۔ وہ بڑی صاحبہ کے کمرے سے نکلا۔۔۔ تن فن کرتا اپنے کمرے میں گھسا اور اپنا

بیگ اٹھا کر چلتا بنا، دو چار کتابیں پڑھنے کو میز پر رکھی تھیں۔ وہ بھی جون کی توں دھری رہ گئیں۔ بات کیا

ہوئی؟ اس کا مجھے علم نہیں۔“ اس نے نگلی بوا کو کہتے سنا تو وہ تھٹک سی گئی۔ دل میں شک سا بھرا۔

”کہیں اس نے ممانی کے سامنے میرا نام تو نہیں لے دیا۔ وہ تو دن رات ڈاکٹر بھانجی، ڈاکٹر

بھانجی کا راگ الاپتی رہتی تھیں۔ محبت کے انکار کا سن کر تو بھڑک اٹھی ہوں گی۔“

دل میں طرح طرح کے خیال آنے لگے تو اس نے رتو کواد پر بھیجا اور خود اس کی جگہ ہنڈیا بھوننے

لگی۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد رتو واپس آئی تھی۔

”صورت حال کافی تھمبیور لگ رہی ہے۔“ رتو نے چچا اس کے ہاتھ سے لے کر اسے ایک طرف

ہٹا دیا۔

”بڑی صاحبہ خاصے خراب موڈ میں ہیں۔ سرتا پاچا درتانا دھوپ میں لیٹی ہیں۔ میری تو کسی بات

اسکول، کالج جانے والا گھر میں کوئی فرد نہیں تھا سونا شتانو، دس بجے سے پہلے نہیں کیا جاتا تھا۔ رتو تو بستر سے اٹھتی ہی نہ تھی۔۔۔ دودھ والا گھنٹیاں بجنا بجا کر تھک جاتا، تب تک بوا کا بیتی، ٹھنڈی، بجتی جھکتی باورچی خانے میں آتیں۔ دودھ لے کر بڑے ماموں کے لیے چائے بناتیں اور انیکٹھی میں کوئلے سلگا کر بڑے ماموں کے پاس اسٹڈی میں لے آتیں۔ انیکٹھی میں دھکتے سرخ سرخ کوئلے دیکھ کر وہاں سے اٹھنے کو جی نہ چاہتا تو یونی ہاتھ سیکتے ہوئے منسلک دانت نکلتائے جاتیں۔ بڑے ماموں کچھ دیر تو برداشت کرتے مگر پھر تنگ آ کر ٹوک دیتے۔

”نکی بوا! جاؤ کہیں اور جا کر یہ طبلہ بجاؤ۔ ہمارے پڑھنے میں خلل آتا ہے۔“

”ارے کہاں جاؤں میاں! وہ کوٹھڑی تو ناؤ برف سے بنی ہوئی ہے، لحاف، بستر سب کے سب برف۔“ ان کے دانت نکلتانے میں مزید تیزی آ جاتی۔ بڑے ماموں کچھ اور چڑ جاتے۔

”نکی بوا! یہ انیکٹھی لے جاؤ کوٹھڑی میں۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ بس ایک کپ چائے کا اور دے جاؤ۔“ نکی بوا ان کے ماتھے پر بڑی تیوریوں کو دیکھتیں اور خالی کپ اٹھا کر بڑ بڑائی ہوئی باہر نکل آتیں۔

اس رات تو ہلکی ہلکی بارش بھی ہوتی رہی۔ رتو نے سونے سے پہلے کوئلے سلگا کر نکی بوا کی جار پائی کے پاس رکھ دیے تھے مگر نکی بوا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ انیکٹھی اٹھا کر لحاف میں رکھ لیں یا لحاف سے نکل کر انیکٹھی پر ہی جا بیٹھیں۔ ادھر ماہین اپنے بستر میں ساری رات بے چین رہی۔ لحاف تو یوں نم تھا گویا کسی نے پانی میں ڈبو رکھا ہو۔ اماں تو جرسی، جرابیں چڑھائے پھر بھی چین سے سو رہی تھیں مگر اسے تو اس وقت تک نیند نہیں آتی تھی جب تک ان تمام لوازمات سے جان نہ چھڑا لے۔

”صبح ہی بڑے ماموں سے کہہ کر بیڑ منگواؤں گی۔“ ہر بار کروٹ بدلتے ہوئے اس نے مصمم ارادہ کیا تھا۔ صبح ہونے پر بڑے ماموں کے بعد ایک وہی تھی جو نماز کے لیے اٹھی تھی۔ نماز پڑھنے کے بعد وہ کچھ دیر بستر میں لیٹی رہی اور پھر جیسے اکتا کر باہر نکل آئی۔ آسمان ابھی بھی بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا لیکن بارش بہر حال رک گئی تھی۔ وہ گیلے ترن میں سے ہوتی ہوئی باورچی خانے تک آگئی اور ابھی چائے کا پانی چولے پر رکھا ہی تھا کہ سیمابھا بھی چلی آئیں۔

”آئی سردی میں باہر نکلنے کی ہمت کیسے کر لی ماہین۔“ انہوں نے آتے ہی اسے دیکھ کر پوچھا۔

”بس چائے کی طلب پہنچ لالی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”ہاں بھئی۔۔۔ جوانی کے چونچلے اور عیاشی یہ ہی تو ہوتی ہے۔ جس چیز کو دل چاہا۔۔۔ کرنے کی ٹھان لی۔“ انہوں نے دوسرا چولہا جلاتے ہوئے کہا۔ ”ہماری عمر تک پہنچتے پہنچتے تو عیاشیاں مجبور یوں میں بدل جاتی ہیں۔ رات بھر صاحبزادے نے ڈھنگ سے سونے نہیں دیا۔ صبح ہونے پر شوہر نامدار نے چین نہیں لینے دیا۔ باپ، بیٹا دونوں بھوک بھوک چلا رہے ہیں۔“ وہ دودھ گرم کر کے فیڈر میں ڈال رہی تھیں۔

”تو یہ فیڈر آپ کس کے لیے لے جا رہی ہیں۔“ اس کے معنی خیز انداز پر وہ بے ساختہ مسکرا دیں۔

”نی الحال تو بیٹے کے لیے لے جا رہی ہوں۔ تم فارغ ہو جاؤ پھر میں اپنے اور عید کے لیے چائے

کا ڈھنگ سے جواب بھی نہیں دیا۔“

”محبت کے بارے میں نہیں پوچھا تم نے؟ اتنی جلدی کیوں چلا گیا؟“ رتو نے آج دھیمی کرتے ہوئے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ سر جھکا کر میز کی سطح کو اپنے ناخن سے کھرچتی گویا خود سے الجھ رہی تھی۔

”تم اس کے اتنے جلدی جانے سے پریشان ہو؟“ وہ دھیمے سے مسکراتے ہوئے اس کے سامنے آ بیٹھی۔

”نہیں۔ میں اس وجہ سے پریشان ہوں جس نے اسے اتنی جلدی جانے پر مجبور کر دیا ہے۔“

”تم جانتی ہو؟“ رتو نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”اندازہ ہے اور سوچتی ہوں اگر اس معاملے میں وہ میرا نام لے بیٹھا تو میرے لیے اس گھر میں رہنا کتنا مشکل ہو جائے گا۔ سب کہیں گے، ماہین کی وجہ سے محبت ماں کے سامنے اٹھ کھڑا ہوا۔“ وہ واقعی پریشان تھی۔

”لیکن اس میں تمہارا تو کوئی قصور نہیں ہے ماہین! پھر کوئی تمہیں کیوں قصور وار ٹھہرائے گا۔“ رتو نے اس کے ہاتھ کو ہچکتے ہوئے تسلی دی تو وہ پھینکی سی ہنسی ہنس کر رہ گئی۔

”ہاں، بظاہر میرا کوئی قصور نہیں نکلتا لیکن کل کو جب ممانی کو احساس ہوا کہ وہ اپنی ڈاکٹر بھانجی کو اپنے ہاں اس لیے بیاہ کر نہیں لاسکتیں کہ ان کا اکلوتا بیٹا میری محبت میں پور پور ڈوب چکا ہے تو یقین مانو، سارے قصور میرے ہی نام نکلیں گے۔ حالانکہ میں نے کتنی کوشش کی ہے محبت کو اپنی طرف بڑھنے سے روکنے کی۔ ہمیشہ ہی اس کے جذبات کے سامنے بند باندھتی آئی ہوں بچپن سے اس گھر میں رہی ہوں، جانتی ہوں کہ ممانی کا جھکاؤ ہمیشہ ہی اپنے میکے والوں کی طرف زیادہ رہا ہے اور پھر محبت ان کا اکلوتا بیٹا سارے ارمان اسی سے تو وابستہ ہیں لیکن محبت۔۔۔ محبت اسرار اپنے ارادوں سے نل جائے ایسا پہلے بھی ہوا ہے۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھی تھی۔

”ماہین۔۔۔ اگر محبت ممانی کی ضد سے مجبور ہو کر ان کی بات مان گیا۔۔۔ تو۔۔۔؟“ رتو جھجکتے ہوئے اس سے پوچھ رہی تھی۔

”تو۔۔۔؟“ ماہین نے رتو کو جواب دیے بغیر ہی یہ سوال اپنے دل سے کیا تھا۔ وہاں مہیب چپ کے سوا اور کوئی جواب اسے نہیں مل سکا تھا۔



دسمبر کا آغاز تھا مگر سردیاں اپنے عروج کو پہنچ گئی تھیں۔ ابر آلود آسمان پر سورج اپنی چھب دکھلاتا نہ چمکیلی دھوپ منڈیروں پر اترتی۔ کھر میں ڈوبے پھول، بوئے، درخت ساکت و صامت کھڑے رہتے۔ بس ایک آگن کی چڑیاں تھیں جنہیں کسی صورت چین نہیں تھا۔ جس وقت سردی کے ستارے ہوئے لوگ نیم تاریک کمروں میں دروازے، کھڑکیاں بند کیے سلکتے کوئلوں پر ہاتھ سینکتے یا لالٹنوں میں دبکے رہتے۔ یہ چڑیاں میری کے درخت سے اتر کر ترن میں آ جاتیں اور اتنا شور مچاتیں کہ ماہین کمرے میں نکل ہی نہ پائی۔ جوتے، موزے ہن کردہ شمال پینٹی ہوئی باہر آئی اور باسی روٹی کے ننھے ننھے ٹکڑے کر کے انہیں ڈالتی رہتی۔ کبھی اماں ڈانٹ ڈپٹ کرتیں تو بھی نکی بوا۔ وہ ان دونوں کے خوف سے جلدی جلدی روٹی ختم کر کے وہاں سے اٹھ جاتی۔

114

”بڑی صاحبہ! آپ کی بات اپنی جگہ سو فیصد درست۔۔۔ مگر یہ بھی تو دیکھیے، بچے کی خوشی کس چیز میں زیادہ ہے۔ آپ کی بھانجی ڈاکٹر ہے۔ ایک چھوڑ دس رشتے مل جائیں گے اس کو۔ آپ کا بیٹا تو اکلوتا ہے، اس کا سن مار کر بھانجی کو بیاہ کر لائیں تو بھی کیا فائدہ۔۔۔؟ اس سے اس کی رائے پوچھیں۔ اگر کوئی اور پسند ہے تو اس کو بھی دیکھیں بھالیں۔ ہو سکتا ہے، وہ اپنے خاندان سے میل کھاتی ہو۔ بیٹے کی آرزو پوری ہوگی تو عمر بھر آپ کا احسان مندر رہے گا۔“ کئی بوائے عمر کا تجربہ گھول کر پی رکھا تھا۔ اب بچی پتے کی بات کی تھی۔

”خدا جانے کیا ہوگا آگے۔۔۔؟ رات بھی اس موضوع پر بات ہوئی۔ تو ایک دم بھڑک اٹھا۔ اس کے ابا تو دم سادھے بیٹھے ہیں۔ میرا خیال تھا۔ تھوڑا غصہ دکھا کر۔۔۔ ضد کر کے اس کو منا ہی لوں گی۔ لیکن وہ تو لانا مجھے چکر دے گیا ہے۔ کہتا ہے، ویزے کے لیے درخواست دے دی ہے۔ ایک بار باہر چلا گیا تو لوٹ کر نہیں آؤں گا۔ اب بتاؤ، میں کیا کروں۔ میرا اکلوتا بیٹا۔۔۔“ وہ دوپٹے کا پلو آنکھوں پر رکھے سسکتے لگیں۔

”سمیعہ کا ٹیلی فون آئے گا تو اس سے کہوں گی۔ سمجھائے اس بے وقوف کو۔۔۔ ہو سکتا ہے، اسی کی کوئی اس کے پلے پڑ جائے۔“

تھوڑی دیر بعد بڑی ممائی اٹھ کر اوپر چلی گئیں۔ باورچی خانے میں بیٹھی ماہین نے ان کی ساری بات سنی اور سن کر سوچا تھا۔

”اب کے محبت آئے گا تو میں خود اس سے بات کروں گی۔“



وہ باورچی خانے میں بیٹھی گاجریں کش کرنے کے ساتھ ساتھ رتو کو ایک ہزار ایک گالیوں سے نواز رہی تھی۔ جو اس ٹھہرتے ہوئے موسم میں اسے اس کے پیڑ لگے کمرے سے نکال کر یہاں باورچی خانے میں لے آئی تھی۔ اس نے لکھا انکار کیا تھا مگر اس کی منٹیں تھیں کہ ختم ہونے میں ہی نہ آ رہی تھیں۔

”آجاؤ ناں۔ اکیلے میں میرا جی گھبرا رہا ہے۔ اتنی تو خاموشی ہے گھر میں۔ بوا اپنے بستر سے نہیں نکل رہیں۔۔۔ تم آجاؤ ناں۔۔۔ کوئی کام مت کرنا۔۔۔ بس میرے پاس بیٹھی رہنا۔۔۔“

اور یوں وہ اس کے اصرار پر کاپٹی لرنزی پکن میں آگئی تھی۔ کچھ دیر تو یونہی وہ کھڑکی میں لگی جالی سے باہر بوندیں گراتے آسمان کو دیکھتی رہی پھر رتو کو پانی میں گاجریں دھوتے اور چھیلنے دیکھا تو چڑ گئی۔

”اتنی سردی میں تمہیں گاجر کا حلوہ بنانے کی کیا سوجھی۔“

”ارے۔۔۔ گاجر کا حلوہ سردی میں ہی تو بنایا جاتا ہے تاکہ وقت بے وقت بھوک لگے تو سردی میں کمرے سے نکل کر باورچی خانے تک نہ آنا پڑے۔ بس بیڈ کے نیچے سے ڈبا گھینٹا اور۔۔۔“ اس کی بات پوری ہونے سے قبل ہی وہ حلوہ کھلا کر ہنس دی تھی۔ جانتی تھی اس کا اشارہ سیما بھابھی کی طرف تھا جنہوں نے منٹیں اور حلوہ بنا کر اپنے بیڈ کے نیچے رکھ چھوڑا تھا اور اس سخت سردی میں جبکہ آسمان بادلوں سے ڈھکا رہتا اور چرند پرند رختوں کی برفاب شاخوں میں دبکے رہتے، وہ اپنے کمرے میں محصور ہو جاتی تھیں۔

”اصل میں چھوٹے صاحب نے منڈی سے بڑی تازہ تازہ گاجریں خرید کر بھجوائی تھیں۔ دودھ

والا دودھ بھی دے گیا تھا۔ اس لیے میں نے سوچا۔ یہ کام منٹا ہی لوں۔“

اور ماہین اسے یوں اکیلے ہلکان ہوتے دیکھ کر رہ نہ سکی تو خود بھی اس کے ساتھ مل گئی اور اب برف ہوتے ہاتھوں کے ساتھ وہ مسلسل رتو کو کوس رہی تھی۔ تب رتو کام چھوڑ کر ابھی اور چولہا جلادیا۔

”بہتر ہوگا۔ تم اس چولہے پہ ہاتھ گرم کر لو۔۔۔ ہمارا کیا ہے، سخت جان ہیں۔ موسم گرمی کا ہوا سردی کا۔۔۔ اس کی تختی ہم پہ اثر انداز نہیں ہوتی۔ لیکن اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو تمہاری اماں مجھے نہیں چھوڑیں گی۔“ رتو ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔ تب ہی بیرونی دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ رتو ایک لمحے کے لیے بری طرح چونک کر ماہین کو دیکھنے لگی تھی۔

”کیا ہوا؟“ ماہین نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”کچھ نہیں۔۔۔ اس نے ہلکا سا مسکرا کر سر جھٹکتے ہوئے گویا اپنے کسی خیال کو جھٹلایا۔

”میں ذرا باہر دیکھ آؤں۔“ وہ ہاتھ دھو کر خشک کرتی ہوئی باہر نکلی۔ اتنی دیر میں دوبارہ دستک ہوئی تھی۔ ماہین نے بڑا سا پتلا اٹھا کر چولہے پہ رکھا اور کش کی ہونی گاجریں اس میں ڈالنے لگی۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ سیدھی ہوئی ہی تھی جب پیروں کی بہت ہلکی سی چاپ سنائی دی۔ اس نے یونہی ایک گاجر کترتے ہوئے سر اٹھا کر دیکھا۔

وہ رتو تھی۔۔۔ دروازے کے عین وسط میں کھڑی۔۔۔ باورچی خانے میں پھیلے اندھیرے میں ہلکا سا اضافہ ہو گیا تھا۔ کہ رتو کا وجود باورچی خانے میں آئی روشنی کے بیچ حائل ہو گیا تھا۔

”کیا ہوا۔؟ یہاں جم کر کیوں کھڑی ہوگئی ہو؟“ اسے ساکت وصامت دیکھ کر اس نے سوال کیا۔

”ماہین! وہ آگیا ہے۔“ اس نے رتو کی سرسراہٹ ہوئی آواز سنی۔

”کون۔۔۔ کون آگیا ہے؟“ اسے رتو کے احساسات غیر معمولی لگے تھے۔

”وہ۔۔۔ وہ آگیا ہے۔ وہ آگیا ہے ماہین۔ جس کے لیے میرے جسم کا رواں رواں دعا کرتا تھا۔“

وہ لڑکھڑا کر دیوار کے ساتھ لگی تو بیٹھتی ہی چلی گئی۔ ماہین کے دل و دماغ میں جھماکا ہوا تھا۔

”چاند بھیا۔۔۔ رتو! چاند بھیا آگئے؟“ وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔

”ہاں۔۔۔ ہاں وہ آگیا۔“ رتو پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ ماہین بے یقینی سے دو قدم اس کی طرف بڑھی۔ مگر پھر اسے وہیں چھوڑ کر تیر کی طرح باورچی خانے سے نکلی تھی۔ لاؤنج پارک کے بے احتیاطی سے برآمدے کے جھکنے فرش پر بھاگتی ہوئی وہ صحن تک آئی تھی۔ قطرہ قطرہ برستی بارش میں بھیکتے۔۔۔ ڈیوڑھی سے نکل کر صحن کے عین وسط میں کھڑے وہ، وہی تو تھے۔ اس کے چاند بھیا۔۔۔ جن کے بالوں پر بارش کے بے حد باریک قطرے چمک رہے تھے اور جو روشن چہرے پر منتظری مسکراہٹ لیے اس پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔

”اوہ میرے خدا۔“ ماہین کو لگا، وہ اپنی ساری توانائیاں کھوپکی ہے۔ اس نے اس ایک منظر کو سینکڑوں بار اپنے تصور میں سجایا تھا۔۔۔ دہرایا تھا مگر اب یہ تصور حقیقت بن گیا تھا تو یقین کا کوئی سرا ہاتھ میں ہی نہ آ رہا تھا۔ دل۔۔۔ دماغ۔۔۔ خوشی۔۔۔ آنسو۔۔۔ جذبے۔۔۔ ہر چیز جیسے برف بن گئی

تھی۔
”ماہین گڑیا۔۔۔ بچانے میں دقت ہو رہی ہے کیا۔۔۔؟“ ان کی آواز۔۔۔ ان کا لہجہ، وہ چھ برس پیچھے لوٹ گئی تھی۔

چاند بھیا۔ اس کے ہونٹ لرزے تھے اور اگلے ہی پل وہ ان سے لپٹی دھواں دھار پروری تھی۔
”مجھے معلوم تھا، آپ آئیں گے۔ ضرور آئیں گے۔ مجھے یقین تھا۔“ وہ بار بار کہہ رہی تھی اور چاند بھیا آنکھوں میں نمی لیے اس کی محبتوں اور آنسوؤں کی برسات میں بھگتے رہے تھے۔



”نہیں معلوم۔۔۔ کس جنون کے تحت گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ بس ایک آگ سی بھڑک اٹھی تھی دل میں۔ ہر الزام برداشت کرتا رہا مگر وہ ایک بہتان میری رگوں میں لہو کی جگہ شرارے بھر گیا تھا۔ نجانے کون سا راستہ تھا۔ کون سا مقام تھا۔ چلتے چلتے یوہی ساری کائنات اندھیرے میں ڈوب گئی۔ ہوش و حواس بحال ہونے میں کچھ وقت لگا۔ لیکن وقت ڈیڑھ مہینے کے عرصے پر محیط ہو گیا تھا۔ بخار بھی بگڑ گیا تھا اور سر کا زخم بھی۔ معلوم ہوا، کسی ہسپتال کے برآمدے میں لاوارث پڑا تھا۔۔۔ کھیاں پورے وجود پر چھٹی ہوئی تھیں۔ ایک ڈاکٹر صاحب وہاں سے گزرے۔ میری تپشی پر ترس آیا شاید میری گھائل ہوئی ہوئی جوانی پر کہ مجھے اٹھا کر اپنے ذاتی کلینک لے آئے۔ ڈاکٹر حیات ایسے جوانوں کو دیکھ کر کڑھتے تھے جو خود اپنے ہاتھوں مختلف ذرائع سے اپنی زندگی برباد کر لیتے ہیں۔ وہ مجھے بھی کوئی ٹی کوئی ہیرو وچی سمجھ بیٹھے تھے لیکن ہوش میں آنے پر جب ان کا اندازہ غلط ثابت ہوا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ گھر میں اپنے مددگار کے طور پر لے گئے۔ غلامی کی مجھے عادت تھی تو یہ عادت اس گھر میں بہت کام آئی۔ ڈاکٹر صاحب تنہا آدمی ہیں۔ وہاں رہنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ ابتدا میں دو تین سال ان کے کلینک میں ملازم رہا۔ اب جو توڑ کر کے اپنا ایک بڑا میڈیکل اسٹور کھول چکا ہوں۔“

یہ چھ سالوں پر مشتمل وہ جدوجہد تھی جس نے چاند بھیا کو اپنی ذات کی پہچان میں مدد دی تھی اور جسے انہوں نے بمشکل چھ منٹ میں سمیٹ کر اس وقت ماہین کے سامنے پیش کیا۔ جب چھوٹے ماموں نماز کے لیے اٹھ کر چلے گئے تھے۔ عبید بھیا کا کوئی دوست آگیا تھا اور اماں بڑی ممانی کو سہارا دے کر اوپر چھوڑنے لگی تھیں اس ساری کہانی میں سے گھر والوں کو صرف رٹے رٹائے چند جملے سنا کر چاند بھیا نے مطمئن کر دیا تھا۔

”زندگی پہلے سے بدل گئی ہے ماہین۔۔۔ وہ سب جو اپنی بائیس سالہ زندگی میں، میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ ان چھ سالوں میں بہت زیادہ سوچ لیا ہے۔ وہ سب جو پہلے بھی دیکھا تھا، نہ دیکھنے کی خواہش کی تھی۔ اب اسے نہ صرف دیکھ رہا ہوں بلکہ پرکھ اور برت بھی رہا ہوں۔ زندگی ایک نئے ڈھب سے گزر رہی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے آنکھوں پر ایک پردہ پڑا ہوا تھا جواب اٹھ گیا ہے۔ ڈاکٹر حیات کمال کے انسان ہیں۔ وہ جس زاویہ سے اس دنیا کو دیکھتے ہیں، وہ غیر معمولی ہے۔ میں نے انہیں کبھی کسی عام انسان کی طرح سوچتے اور بولتے نہیں دیکھا۔ وہ اگرچہ دیکھنے میں بہت عام سے انسان ہیں لیکن ہر فرد سے ان کا خاص رویہ انہیں بہت اونچے مقام پر بٹھا دیتا ہے۔ یوں سمجھو، سوچ کے ایک ایک زاویے کو بدل کے رکھ دیا ہے انہوں نے۔“

وہ بہت متاثر لگ رہے تھے ڈاکٹر حیات سے۔ اسی لیے اتنی عقیدت و احترام سے ان کا ذکر کر رہے تھے۔ ماہین بھی دل ہی دل میں ڈاکٹر حیات کی شکر گزار ہوئی ان کی بات سنتی رہی۔ پھر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئے تو ماہین کو احساس ہوا، رتو ابھی تک چائے لے کر نہیں آئی تھی۔

”میں ابھی اسے دیکھ کر آتی ہوں۔“
وہ کچن میں آئی تو رتو چائے بنانے کے ساتھ رونے کا شغل ابھی بھی جاری رکھے ہوئے تھی۔ ماہین نے بے اختیار ہی ہنستے ہوئے پیچھے سے جا کر اسے ہانپوں میں بھر لیا۔
”اب کس بات کا رونا ہے بھئی۔۔۔ اتنا تو تم ان کے جانے پر بھی نہ روئی تھیں۔“ رتو روتے میں ہنس دی تھی۔

”اور تم چائے بنا رہی ہو یا انہیں ٹالنے کے لیے یونہی خالی دیکھی اوپر رکھ چھوڑی ہے۔“ ماہین نے دیکھی کا ڈھکن اٹھایا۔ پانی کھول کھول کر آدھا رہ گیا تھا۔
”میں ابھی بناتی ہوں۔“ رتو جلدی سے آنکھیں خشک کرتی ہوئی اٹھی۔

”بنالو۔ مگر خیال رہے۔ چائے زیادہ نمکین نہیں ہونی چاہیے۔“ وہ اس کے آنسوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ تب ہی چاند بھیا کچن کے دروازے پر کھٹکھارے تھے۔
”اچھا بھئی۔ ماہین! اب میں چلتا ہوں۔“

”اتنی جلدی۔“ رتو کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا لیکن اگلے ہی لمحے وہ جھینپ کر ماہین کے پیچھے ہو گئی تھی۔
”یہ رتو بی بی کیا کہہ رہی ہیں؟“ چاند بھیا بھی مسکرا رہے تھے۔

”کہہ رہی ہیں، شوق سے چائے بنائیے۔۔۔ بلکہ کہہ رہی ہیں، میں دروازے تک چھوڑ آتی ہوں۔۔۔ ہائے۔“ اس زور سے جنگی کالی تھی رتو نے کہ بات کے خاتمے پر وہ چیخ اٹھی تھی۔
”کتنی بدتمیز ہوتی۔۔۔؟“ ماہین اسے گھورتی ہوئی چاند بھیا کے پاس آکھڑی ہوئی۔

”کہاں جائیں گے آپ۔۔۔؟“
”جہاں پچھلے چھ برس سے رہ رہا ہوں۔“ انہوں نے آرام سے کہا تو وہ ٹی میں سر ہلانے لگی۔
”اب آپ وہاں نہیں جائیں گے۔ آپ کا کمر آپ کا منتظر ہے۔“

”وہ کمر۔۔۔ ہا۔۔۔ اس کمرے کو تالا لگا کر اس کی چابی کہیں گم کر دو۔ وہ تاریک کوٹھڑی اب میرے قابل نہیں رہی۔“ وہ بہت اعتماد سے کہہ رہے تھے۔ ماہین کو اچھی خاصی حیرت ہوئی لیکن اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔

”ہم آپ کا کمر بدل دیں گے۔۔۔ لیکن یہاں سے جانے نہیں دیں گے۔ کیا معلوم اب جائیں تو پھر کتنے عرصے بعد واپس آئیں۔“ ماہین ان کا ہاتھ تھامے ضدی لہجے میں کہہ رہی تھی۔
”ارے۔۔۔“ وہ اسے اپنے ساتھ لیے باہر کی طرف چل دیے۔

”بے وقوف لڑکی! خود کو سنبھالنے میں لگا اتنا عرصہ۔ اپنے قدم جمار ہاتھ باہر کی دنیا میں۔۔۔ اتنی بڑی کائنات میں اپنے حصے کی جگہ ڈھونڈ رہا تھا۔۔۔ اپنا مقام تلاش کرنے میں اتنا وقت تو لگنا ہی تھا تاں۔۔۔ لیکن ہر بار ایسا تھوڑی ہو گا۔“

وہ اب صحن میں پہنچ گئے تھے۔ بارش رک گئی تھی لیکن سرمئی بادل ابھی بھی بڑی تمکنت سے آسمان کو اپنی جا گیر سمجھے ہوئے تھے۔ ہوا ابھی پہلے سے تیز ہو گئی اور اب ہلکا ہلکا اندھیرا زمین پر اترنے لگا تھا۔ وہ اپنے سرد ہاتھوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے جری کی جیبوں میں ڈال کر ڈوڑھی تک آ گئی۔

”لیکن پھر بھی آپ وعدہ کریں۔ آپ بہت جلدی آئیں گے ہم سے ملنے۔“
 ”وعدہ رہا۔۔۔“ انہوں نے اپنی بھاری جیکٹ کی زپ بند کی اور کاکھڑے کرتے ہوئے کہا۔
 ”نہیں نہیں قسم کھاؤں۔۔۔“ ماہین کی بے اعتباری پر وہ ہنس دیے اور دو قدم آگے بڑھ کر اپنے دونوں ہاتھوں اس کے سر پر رکھ دیے۔

”زندگی رہی تو انشاء اللہ کچھ ہی دنوں میں دوبارہ چکر لگاؤں گا۔ اس طرح کیا دیکھ رہی ہو۔۔۔؟“ ہاتھ ہٹاتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ پہلی بار آپ کو یوں ”ڈل“ سے ہنتے ہوئے دیکھا ہے۔۔۔ اور ویسے بھی میں دیکھ رہی ہوں، آپ پہلے سے کافی اسماٹ ہو گئے ہیں۔“ اس نے سر تاپا انہیں دیکھا تو وہ ہلکا سا تہقہ لگا کر ہنس دیے تھے۔

”چلتا ہوں اب۔۔۔“ وہ بیرونی دروازہ کھول رہے تھے پھر اچانک کچھ یاد آنے پر پلٹے۔

”ہاں وہ محبت۔۔۔ محبت کیا کر رہا ہے آج کل۔۔۔؟“

”آپ دوبارہ آئیے گا۔۔۔ میں اس کے بارے میں آپ سے تفصیل سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ اور ہاں اپنے ڈاکٹر حیات کو بھی ساتھ لے کر آئیے گا۔“

”ضرور لاؤں گا۔ ابھی تو مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ یہاں میرے ساتھ کیا ”سلوک“ ہوگا۔“
 ”ویسے سب لوگ بہت اچھے طریقے سے ملے، ہے ناں؟“ ماہین گھر والوں کے اچھے رویے سے خوش تھی۔

”ہاں۔۔۔ لیکن یہ لوگ اگر اچھے طریقے سے نہ ملتے تب بھی مجھے فرق نہیں پڑنا تھا۔ میں جن لوگوں سے ملنے آیا تھا، ان کی خوشی کا مجھے پہلے سے اندازہ تھا۔“
 ”رتو نے آپ کی واپسی کی بہت دعائیں کی تھیں۔“

”جانتا ہوں۔“

”اور پتا ہے ان چھ سال میں۔۔۔“ وہ بے اختیار ہنسی۔

”ان چھ سالوں میں وہ چھ سو میٹر بن چکی ہے آپ کے لیے۔“

چاند بھیا کی آنکھوں میں جگنو سے چمکے نئے لمحے بھر کے لیے۔۔۔ پھر وہ سیدھے ہوئے، اپنے جیکٹ کی زپ کھولتے ہوئے انہوں نے جیکٹ ایک سائیڈ سے ہٹائی۔ سفید وہاریوں والا سویٹر جگمگا رہا تھا۔

”ایک سو میٹر تو اپنی جان سے لگا رکھا ہے۔ اس سے پوچھنا، چھ سو میٹر کہاں رکھوں گا۔“

”اللہ چاند بھیا۔ کتنے کھتے مینے ہیں آپ۔ بالکل رتو کی طرح۔۔۔ میں ابھی جا کر اس کو بتاتی ہوں۔“ وہ جھلاتے ہوئے پلٹی تھی جب چاند بھیا نے اسے بازو سے پکڑ کر واپس کھینچ لیا۔

”بعد میں بتا لیتا۔ ابھی دروازہ بند کرلو۔ میں جا رہا ہوں۔“ انہوں نے دروازہ کھولا۔ چند لمحے

یونہی گزر گئے۔ وہ ایک پاؤں دہلیز پر رکھے تذبذب کے عالم میں کھڑے تھے۔ ماہین کو ان کے انداز پر حیرت ہوئی۔

”ماہین اوہ۔۔۔ تمہاری نجمہ خالہ نظر نہیں آئیں؟“ وہ خاصے ٹھہرے ہوئے انداز میں پوچھ رہے تھے۔ ماہین ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔

”میں تو بہت دیر سے انتظار کر رہی تھی اور آپ نے اب کیا یہ سوال۔۔۔؟ وہ بہت برے حال میں ہیں چاند بھیا! ان کے دل و دماغ نے جس طرح پلٹا کھایا، وہ ناقابل بیان ہے۔ بس چند دن۔۔۔ صرف چند دن تھے جو آپ کے جانے کے بعد انہوں نے نارمل انداز میں گزاریے۔۔۔ اب آپ آگئے ہیں تو ختم کرو دیجئے ان کی یہ سزا۔۔۔ انہیں معاف کر دیجئے۔۔۔ ان کی ہر زیادتی۔۔۔ ان کا ہر ستم۔۔۔ ہو سکتا ہے تب ہی انہیں سکون مل جائے۔“

چاند بھیا ہلکا سے سن رہے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ صورت حال یہ بھی ہو سکتی ہے۔ وہ تو سمجھ رہے تھے انہیں چاند کے آنے کی خبر ہوئی تو وہ ہمیشہ کی طرح تن فن کرنی آئیں گی۔ ان پر طنز کریں گی۔ ان کی تحقیر کریں گی اور مضحکہ اڑا کر چلتی بنیں گی۔

”ایک عرصہ ہوا، لوگوں سے میل ملاقات چھوڑ رکھی ہے۔ اپنے کمرے میں بند ہو کر رہ گئی ہیں۔“ ماہین بتا رہی تھی۔

”اور میں سمجھا، شاید انہیں میری آمد کی خبر ہی نہیں ہوئی۔“ انہوں نے دروازے کا پٹ پوری طرح کھول دیا تھا۔ سرد ہوا کا تیز جھونکا ان کے چہرے سے آ کر ٹکرایا تھا۔

”آپ۔۔۔ چاند بھیا۔۔۔ انہیں دیکھیں گے نہیں۔“ ماہین پوچھ رہی تھی۔ انہوں نے دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں ڈالے اور پاؤں دہلیز سے باہر نکالا۔

”آپ ایک فحش ان سے مل لیں۔ ہو سکتا ہے، آپ کو دیکھ کر۔۔۔“ ماہین کی آواز سرسراتی ہوا میں ضم ہو کر کہیں پیچھے رہ گئی تھی۔

انہوں نے دوسرا قدم اٹھایا تو پھر پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا۔ ان کے دل کی کیفیت اس وقت بہت عجیب تھی۔ شاید وہ نجمہ خالہ کے بارے میں سن کر خوش ہو گئے تھے یا شاید۔۔۔ وہ اداس تھے۔

رتو کو تو جیسے ساری کائنات مل گئی تھی۔ ادھر ماہین چاند بھیا کو رخصت کر کے باورچی خانے میں داخل ہوئی، ادھر رتو نے اسے بازوؤں میں لے کر گھما ڈالا۔

”ایسے۔۔۔ اے۔۔۔ چھوڑو مجھے۔ رتو کی بچی۔۔۔“ وہ بری طرح چیختی تھی مگر رتو تو آج دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔ اسے چکر پہ چکر دے ڈالے اور جب سب دروازے گول دائرے میں گھومنے لگے تب رتو نے ایک دم اسے آزاد کر دیا وہ سیدی میز سے ٹکرائی اور اسٹول پر ڈھکی۔ خود رتو نے گھومتی گھامتی دیوار کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچایا اور وہیں دیوار کا آسرا لے کر بیٹھی تو پھر ہنسی چلی گئی تھی اور اتنا ہنسی تھی۔ اتنا ہنسی تھی کہ اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا اور چہرہ قندھاری انار کی طرح سرخ پڑ گیا تھا۔

ماہین اس کی بے تحاشا ہنسی سے خوف زدہ ہو کر اسے ٹوکنے کی غرض سے بولی تھی۔

”کیسے ہنسی کے فوارے پھوٹ رہے ہیں ابھی چار گھنٹے پہلے اپنی شکل دیکھنی تھی۔ مردے کی طرح پٹلی ہو رہی تھیں اور اب۔۔۔ اب دیکھو کیسے رنگ ہی رنگ ہیں چہرے۔۔۔ یوں پل کے پل کیسے بدل

لیتی ہو خود کو۔“

”ارے تم کیا جانو۔۔۔؟ تو اس پھول کا نام ہے جس پر محبت بارش بن کر برسے تو وہ کھل جاتا ہے۔ نہ برسے تو مرجھا جاتا ہے۔ ارے تو تو ہوا ہے۔ ہوا۔۔۔ اپنے محبوب کے بدن کو چھو لے تو لہرا اٹھتی ہے۔ نہ چھوئے تو ٹھہر جاتی ہے۔۔۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر لہرائے لگی تھی۔“

”اور میں تو آج جی اُسی ہوں۔۔۔ پھر کیوں نہ رنگ برسیں مجھ پر۔“

ڈالی انار کی گوری کا رنگ روپ ہے

رچنا بہار کی ڈالی انار کی

وہ جھوم جھوم کر گا رہی تھی اور خوشی کے اس غیر معمولی اظہار پر مابین مسکرانے کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں حیرت بھرے اسے دیکھ رہی تھی۔

کرنیں ادھر ادھر کریں سولہ سنگھار کی

ڈالی انار کی

گوری کا رنگ روپ ہے۔۔۔

”تمہیں پتا ہے مابین۔“ وہ ایک دم سیدھی ہو کر بھاگتی ہوئی اس تک آئی تھی اور جوش جذبات میں اس کے ہاتھ جکڑتے ہوئے اس کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔

”تمہیں پتا ہے۔۔۔ میرا دل میرے کانوں میں دھڑکنے لگا تھا جب میں نے اس کی دستک کی آواز سنی۔۔۔ اللہ کی قسم۔۔۔ اور پھر میرا دل میری انگلیوں کی پوروں میں دھڑکنے لگا تھا جب میں نے دروازہ کھولا تھا۔“ وہ اپنے ہاتھ اس کے سامنے پھیلائے کہہ رہی تھی۔

”اور پھر۔۔۔ پھر میرا دل میری آنکھوں میں سا گیا تھا جب میں نے اسے اپنے سامنے کھڑے دیکھا۔ اور۔۔۔ اور جب اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی۔۔۔ مجھے دیکھ کر۔۔۔ اور اس نے اپنی انگلی میرے ماتھے پہ مارتے ہوئے کہا تھا ”میں آ گیا ہوں۔۔۔ تجھے لے جانے کے لیے۔“ تو اللہ کی قسم مابین! اس لمحے اس پوری کائنات میں اس کے اور میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔“ تو اپنے تیز ہوتے نفس کے ساتھ آنکھیں بند کیے بتا رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ سب اس کی بساط سے بڑھ کر ہوا ہے۔

”اور مابین! آج اسے اپنے سامنے دیکھ کر مجھے اپنے اللہ پر یقین آ گیا۔ جو اوپر آسمانوں میں موجود ہے۔ یہ سب اسی کی دین ہے۔ سب اسی کی دین ہے۔“

”یہ سب تمہارا کرم ہے آقا۔۔۔“

تو دونوں ہاتھوں کو جوڑتے آسمان کی جانب چہرہ اٹھائے جھوم رہی تھی۔۔۔ اور مابین رشک بھرے انداز میں اسے دیکھے چلی گئی تھی۔

”کتنی صاف اور کھری لڑکی ہے یہ۔۔۔ چاند بھی چلے گئے تھے تو اس نے جی بھر کے سوگ منایا تھا۔ کسی کی باتوں کی پروا نہیں کی۔ اب خوش ہے تو اپنی اس خوشی کا بھرپور اظہار کرے گی۔ میری طرح سات پردوں میں چھپنا نہیں پڑتا اسے، جہاں انسان خود پر بھی اپنا آپ ظاہر کرنے سے ڈرتا ہو۔“ اس کے دل میں کوئی احساس محرومی چٹکیاں بھرنے لگا تھا۔



”تم آگے ہو چاند۔۔۔“ دروازے کے پتوں بچ کھڑی نجمہ خالہ نے بہت نارمل انداز میں کہا تو ڈرائنگ روم میں بیٹھے سب نفوس اپنی اپنی جگہ چونک سے گئے تھے۔ چائے سرد کرتی ہوئی مابین نے خاموش نظروں سے اماں کو دیکھا۔ کتنی بار وہ کہہ چکی تھی کہ نجمہ خالہ کو چاند بھیانکے لوٹ آنے کی خبر سنا دیں مگر اماں ہر بار ہی جھجک جاتیں۔

”اتنی مشکل سے سنبھلی ہے وہ۔ ڈرتی ہوں، اس کا نام سن کر دوبارہ سے دیوانگی کے دورے نہ پڑنے لگ جائیں۔“

”اور اب معلوم نہیں، یہ کس ردِ عمل کا اظہار کریں گی۔“ ڈاکٹر حیات کی موجودگی کی وجہ سے وہ زیادہ اپ سیٹ ہو گئی تھی۔

”اکیلے آئے ہو؟“ انہیں متوازن چال سے چاند بھیانکے طرف آتے دیکھ کر مابین کو حیرت ہوئی۔ وہ سوچ رہی تھی، ان کا ردِ عمل بہت شدید ہو گا مگر حیرت انہیں طور پر وہ بہت نارمل دکھائی دے رہی تھیں۔

”وہ ساتھ نہیں آیا۔۔۔؟“ وہ چاند بھیانکے عین سامنے کھڑی ہوئی تھیں۔ چاند بھیانکے مضطرب سے انداز میں اٹھنا چاہا مگر ڈاکٹر حیات کے مبہم سے اشارے نے انہیں اٹھنے سے باز رکھا تھا۔

”کون۔۔۔؟ کس کی بات کر رہی ہو نجمہ۔۔۔؟“ اماں نے حیرت سے پوچھا تھا۔

”وہی۔۔۔ جو بہت بد دیانت تھا۔۔۔ اپنے وعدوں میں۔۔۔ اپنے رویوں میں۔۔۔ اور اپنی محبتوں میں۔۔۔“

وہ قائلین پر چاند بھیانکے پیروں کے پاس بیٹھ گئی تھیں اور اپنا سر ان کے گھٹنے سے یوں ٹکایا تھا جیسے کوئی چھوٹا بچہ اپنے لاڈ اٹھوانے کو کسی بہت ہی ”اپنے“ کے پاس بیٹھتا ہے اور چاند بھیانکے ہو گئے تھے گویا اپنی جگہ سے ہلنے سے قاصر ہوں۔

”وہی جو کہا کرتا تھا ”میں تمہارے لیے پوری دنیا سے نکرانے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔“ لیکن اپنے جھوٹے رسم و رواج سے لڑنے کی ہمت بھی نہ کر سکا اور وقت آیا تو چپکے سے اپنی بچپن کی منگ کو بیاہ لایا۔۔۔ جولال سوٹ پہنے۔۔۔ سنہری چوڑیاں چھنکاتی سیارے گھر میں ادھر سے ادھر گھوما کرتی تھی۔“

نجمہ خالہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بول رہی تھیں۔ تب ہی اس نے دیکھا، چھوٹے ماموں اسے نجمہ خالہ کو وہاں سے لے جانے کا اشارہ کر رہے تھے۔ وہ اٹھنا چاہ رہی تھی مگر ڈاکٹر حیات نے فوراً اسے ٹوک دیا تھا اور پھر ماموں سے سرگوشی کرنے لگے تھے۔

”ایکسیکوزی۔۔۔ مجھے خلل دینے کا حق تو حاصل نہیں لیکن پھر بھی میرا مشورہ ہے کہ اس وقت انہیں مت چھیڑیں۔ مجھے یہ قطعی نارمل نہیں لگ رہیں۔ انہوں نے غیر معمولی طور پر خود کو کمپوز کر رکھا ہے۔ ارکا زٹوٹ گیا تو ان کا ردِ عمل بہت شدید بھی ہو سکتا ہے۔“

ڈاکٹر حیات کے مشورے پر ماموں نے عمل تو کیا تھا مگر خود وہاں بیٹھے رہنا ان کے لیے ممکن نہ ہو سکا تو بہت آہستگی سے ان سب کے درمیان سے اٹھ گئے تھے۔

”کوئی تصور نہیں کر سکتا۔۔۔ اس دکھ۔۔۔ اور اذیت کا جس سے ان دنوں میں دوچار ہوئی۔ وہ

لحہ کیسا قاتل ہوا کرتا تھا میرے لیے۔۔۔ جب وہ اس کو دیکھ کر مسکراتا تھا۔ اس کا ہاتھ تھام لیتا تھا۔ اس کے لیے گیت گنگنا نے لگتا تھا، وہی گیت جو وہ کبھی میرے لیے گایا کرتا تھا۔ اور جانتے ہو چاند؟“ وہ سر اٹھا کر چاند کی آنکھوں میں جھانکنے لگی تھیں۔

”ایک قیامت اتر آئی تھی میرے وجود میں جب میں کلیوں کے جھنڈ کے پاس اس کی سنہری چوڑیوں کے ٹکڑے بکھرے دیکھا کرتی تھی۔ ان کی سرگوشیاں۔۔۔ ان کی کھلکھلاہٹیں۔۔۔ وہ اپنی دنیا میں پوری طرح گمن ہو گیا تھا اور میں۔۔۔ میں جس لمحہ جیتی تھی، اسی لمحہ مر جاتی تھی۔ میری رات میرے آنسوؤں سے بھیگ جاتی تھی اور میرا دن میری نا تمام خواہشات کی قبر پر پڑا سکھاتا رہتا تھا۔

اور پھر۔۔۔ پھر اس نے تمہیں جنم دیا اور خود مر گئی۔ سن رہے ہو چاند؟“ انہوں نے۔۔۔ بنے چاند کا ہاتھ پکڑ کر بلایا۔

”تمہاری ماں مر گئی اور مجھے پھر سے امید بندھ گئی لیکن وہ پھر بھی لوٹ کر میری طرف نہیں آیا۔ اس کے غم میں دیوانہ ہو کر نکلا تو پھر لوٹ کر نہیں آیا اور تم یہیں پر رہ گئے۔ میرے کرب میں اضافہ کرنے کے لیے۔ جانتے ہو جب تم میرے سامنے آتے تھے تو وہ تم نہیں ہوتے تھے۔ غیث ہوتا تھا۔۔۔ اور جب تم مسکراتے تھے تو تم نہیں۔۔۔ غیث مسکراتا تھا۔۔۔ تمہاری پیشانی۔۔۔ تمہاری آنکھیں۔۔۔ تمہارے ہونٹ۔۔۔ تمہارے نہیں تھے۔۔۔ غیث کے تھے اور جب جب میں تمہیں دیکھتی۔۔۔ مجھے وہ یاد آ جاتا۔ جس نے ہمیشہ ہر مقام پر مجھے دھوکا دیا تھا۔ جو مجھ سے کہتا تھا۔ ”میں تم سے شادی کروں گا۔“ لیکن اس نے مجھ سے نہیں۔۔۔ کسی اور سے شادی کی تھی۔

وہ مجھ سے کہتا تھا۔۔۔ ”میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“ لیکن اس نے محبت بھی مجھ سے نہیں۔۔۔ کسی اور سے کی تھی اور وہ مجھ سے کہتا تھا ”تمہاری جدائی مجھے پاگل کر دے گی۔“ لیکن میری جدائی نے اسے پاگل نہیں کیا، وہ کسی اور کی جدائی میں پاگل ہوا تھا۔ اس نے ہمیشہ مجھے دھوکے دیے اور جب میں تمہیں دیکھتی تھی تو یہ سارے فریب ایک ایک کر کے میرے سامنے آکھڑے ہوتے تھے۔ اس کے سب وعدے یاد آتے تھے جو اس نے میرے ساتھ کیے لیکن وفا نہیں کیے۔ تم مجھے وہ ذلت نہیں بھولنے دیتے تھے جو اس نے میری محبت کا مذاق اڑا کر میری جھولی میں ڈالی تھی۔ میری حسرتیں مجھے ڈسنے لگتیں اور میں اپنے دل کا سارا ہر تمہارے وجود میں انڈیلنے لگتی۔ تمہیں مارتی پہنچتی۔۔۔ سزا میں دیتی۔۔۔ تمہیں بھوکا رکھتی لیکن یہ سب میں تمہارے ساتھ نہیں کرتی تھی چاند۔۔۔ یہ سب تو میں غیث کے ساتھ کرتی تھی لیکن ہر بار ہی غیث کا چہرہ میرے سامنے سے ہٹا تو مجھے تم نظر آنے لگتے۔ تمہارے معصوم چہرے۔۔۔ اے ہاتھ کی انگلیوں کے نشان مجھے میری نظروں سے گرا دیتے۔۔۔ تمہارے گالوں پر بہتے آنسو مجھے گھنٹوں پشیمان رکھتے۔ میں عہد کرتی۔۔۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ لیکن ایسا ہو جاتا۔۔۔ تم غائب ہو جاتے۔۔۔ غیث سامنے آ جاتا۔۔۔ اور میں غیث سے نفرت کرتی تھی چاند۔۔۔ تم سے نہیں۔۔۔ تم سے تو میں نے کبھی نفرت نہیں کی چاند کبھی بھی نہیں۔۔۔ تم سے تو میں محبت کرتی تھی۔ بہت زیادہ محبت۔۔۔ اتنی شدید جتنی ایک ماں اپنے بچے سے کر سکتی ہے۔“

وہ اب سیدھی ہو بیٹھی تھیں اور انہوں نے دونوں بازو اٹھا کر چاند کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ کمرے کی سر دھوا میں ایک وحشت ناک سا ساٹا نادر آیا تھا اور اس تمام عرصے میں شاید پہلی بار

چاند بھیانے نگاہ اٹھا کر نجمہ خالہ کی آنکھوں میں جھانکا تھا جہاں انہیں بے رنگ پانی کی دبیز تہہ کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

”مجھے۔۔۔ مجھے کبھی لگا ہی نہیں تھا کہ تمہیں میں نے جنم نہیں دیا۔۔۔ میں تم سے پیار کرنا چاہتی۔۔۔ تمہیں چھوٹا چاہتی لیکن تم خوفزدہ ہو جاتے۔۔۔ تم ڈر کر مجھ سے دور بھاگنے لگتے اور جب تم مجھ سے دور جانے لگتے۔ تب۔۔۔ تب تمہارا وجود ایک بار پھر غیث کے پیچھے چھپ جاتا اور غیث سے تو مجھے نفرت تھی ناں۔۔۔ لیکن میں تم سے تو نفرت نہیں کرتی۔۔۔ میں نے تم سے کبھی بھی نفرت نہیں کی چاند۔۔۔“

ان کی آواز یک لخت ہی ڈوب گئی تھی۔ چاند بھیانے چونک کر سر اٹھا یا وہ لب بھینچے سا کت بیٹھی انہیں دیکھ رہی تھیں۔ وہ ذرا بھی نہیں روئی تھیں لیکن ان کی آنکھوں میں مچلتا سمندر چاند بھیا کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے۔ نجمہ خالہ نے ایک طویل سانس لی تھی اور پھر ہلکی سی جھرجھری لے کر وہیں قائلین پر ہی ڈھیر ہو گئی تھیں۔ چاند بھیا کا ہاتھ ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ باہن اور اماں ہلکی سی تیزی سے انہیں سنبھالنے کو ایک ساتھ اٹھیں اور چاند بھیا اپنی جگہ ساکت بیٹھے نجمہ خالہ کی بند آنکھوں سے گرتے پانی کے قطرے کو دیکھ رہے تھے۔



بہت دنوں بعد اس نے کسی سے محبت کے آنے کی اطلاع سنی تھی۔ دل کی دھڑکن کا تیز ہونا اسے چیراں کر گیا تھا مگر اس حیرت کو اندر ہی اندر کہیں دفن کرتے ہوئے وہ نجمہ خالہ کے کمرے سے باہر آگئی تھی۔ اماں تو مستقل طور پر ہی نجمہ خالہ کے کمرے میں آگئی تھیں جو ڈاکٹر حیات کی تجویز کردہ ممکن ادویات کے تحت دن کا بیشتر حصہ سوئے میں ہی گزار دیتی تھیں۔

باہر ہلکی ہلکی دھوپ لگی ہوئی تھی اور بہت دنوں بعد اس نے چڑیوں کو پانی میں دوبارہ کھلتے دیکھا تھا۔ سیمابھیا بھی دھوپ میں گرم پانی کی بالٹی رکھے فراز کو نہلا رہی تھیں۔ نئی بوسا رتا پا جا در تانے لپٹی ہوئی تھی۔ رتو کو بھی پائیں باغ کی صفائی ستھرائی میں مصروف دیکھا تو پھر وہ سیدھی اوپر چلی آئی۔ ممانی اپنے بیڈروم میں تھیں۔ وہ آہستہ سے قدم اٹھائی محبت کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹانے لگی۔ پھر اس کی اجازت پر باہن نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ وہ آڑا تر چھابڈ پہ لیٹا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر ایک دم سیدھا ہو بیٹھا۔

”باہر آؤ۔۔۔ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“ وہ اتنا کہہ کر بیٹی اور خود دھوپ میں ادھر سے ادھر ہٹنے لگی۔ ایک دو منٹ بعد وہ باہر نکلا تھا اور بجائے اس کی طرف آنے کے صحن میں پچھی کر سیووں میں سے ایک پر جا بیٹھا تھا۔ گویا ناراضی کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ سر جھٹک کر خود بھی اس کے سامنے جا بیٹھی تھی۔

”یہ کیا کر رہے ہو تم آج کل۔۔۔؟“ اس نے بیٹھے ہی سوال کیا تھا۔

”باہر جانے کی تیاری کر رہا ہوں۔۔۔ بس کچھ دن لگیں گے ویزا ملنے میں۔۔۔“

اس کی طرف سے قطعی بے نیازی کا اظہار کرتے ہوئے اس نے ٹانگیں بد نیزی سے سامنے میز پر رکھیں اور نرم دراز ہو کر اپنی جیب خچہ پھانے لگا۔ پھر مطمئن ہو کر سوئیٹر کے نیچے شرٹ کی جیب سے سگریٹ

”تمہیں شرم آئی چاہیے محبت۔۔۔ تمہیں اپنے والدین کی محبت کا کوئی احساس نہیں اور تم۔۔۔“
 ”میں تم سے صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر تم مجھے روکو گی تو میں رک جاؤں گا۔۔۔“
 وہ اس کی بات کاٹ کر قطعی انداز میں اس سے بھی زیادہ بلند آواز میں بولا تو وہ بری طرح چٹخ گئی تھی۔

”پہلے مجھے وہ حق تو دلو البوجس کے تحت میں تمہیں روک سکوں۔“
 وہ بالکل بے سوچے سمجھے انداز میں بول گئی تھی لیکن اسے اس جملے کے جواب میں اس نے محبت کے تھے ہوئے چہرے پر جو سکون اترتے دیکھا تھا، وہ اسے سر پکڑنے پر مجبور کر گیا تھا۔ ایک طویل سانس لے کر اس نے کن اکھبوں سے دیکھا۔ وہ پہلے کے سے انداز میں سنجیدہ بیٹھا سگریٹ کی راکھ جھاڑ رہا تھا۔ وہ چپکے سے کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ محبت نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ پہلی سیڑھی پر اس نے یونہی غیر ارادی طور پر پلٹ کر دیکھا۔ وہ اپنی جگہ کھڑا سگریٹ کے بچے چھپے ٹکڑے کو جوتے کی نوک سے مسل رہا تھا اور ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ بھی کہ جسے روکنے میں وہ قطعی طور پر ناکام ہو رہا تھا۔
 ”یہ کیا کیا ماہین۔۔۔؟“ یقین کا سرا اس کے ہاتھ میں دے آئیں۔ اب وہ اپنی سی منوانے کے لیے کون سا انتہائی قدم نہ اٹھائے گا۔ وہ مرے مرے قدموں سے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔



”ذاتی و سماجی زندگی میں محرومی ہمیشہ ہی جارحیت کو جنم دیتی ہے یا پھر جب انسان کی اندرونی کشش بڑھ جائے تب وہ جارحیت کا ارتکاب کرتا ہے۔ نجمہ کو ان دونوں صورتوں کو سامنا کرنا پڑا ہے۔ ان کی پوری زندگی میں ایک ایسی کئی محرومیاں ہیں جنہوں نے ان کی شخصیت کو بننے نہیں دیا۔ پھلنے پھونے نہیں دیا۔ اس نے رشتوں سے محرومی کا سامنا کیا۔ والدہ اس وقت فوت ہو گئیں جب اولاد کو، خصوصاً لڑکیوں کو ماؤں کی بے حد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔“

غیاث ان کا دور پرے کا رشتہ دار تھا جس کا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ باپ تو بچپن میں وفات پا گئے تھے۔ ماں نے اسے محنت مزدوری کر کے پالا۔ ماں کے مرنے کے بعد گاؤں میں اس کا کوئی نہ رہا تو بابا جان اسے اپنے ساتھ شہر لے آئے۔ غیاث نے اسی گھر میں رہ کر تعلیم حاصل کی۔ نجمہ نے ہوش سنبھالا تو غیاث کو اسی گھر میں پایا۔ ان کی محرومی نے انہیں غیاث کی طرف مائل کیا۔ غیاث نے انہیں اپنی محبت کا یقین دلایا۔ ساتھ جینے اور مرنے کے وعدے کیے۔

تعلیم مکمل کر کے غیاث نے شہر میں ہی سروس کر لی۔ نجمہ سوچ رہی تھیں۔ اب ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی غیاث بابا جان سے ان کا ہاتھ مائلے گا۔ وہ غیاث کی دلہن بننے کے سنے دیکھ رہی تھیں۔ لیکن غیاث ایک دن گاؤں گیا تو واپسی میں اس کے ساتھ نئی نوٹیلی بنی سنوری دلہن تھی۔ اس نے گاؤں میں اس لڑکی سے شادی کر لی تھی جس سے بچپن میں اس کی ماں نے رشتہ طے کیا تھا۔ نجمہ پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ گھر میں کسی کو ان کے جذبات سے آگاہی نہ تھی۔ نہ وہ کسی سے کچھ کہہ سکتی تھیں۔ غیاث کی بے وفائی اور سنگ دلی نے ان کی شخصیت کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔

یہاں انہیں محبت سے بھی محرومی حاصل ہوئی۔ بچی عمر کی اولین محبت۔۔۔ جو ناکامی سے دوچار ہوئی۔۔۔ یہ ان کی زندگی کا بہت بڑا المیہ تھا۔ وہ کسی سے کچھ کہہ لیتیں، سن لیتیں تو شاید نارمل ہوئی۔۔۔ یہ ان کی زندگی کا بہت بڑا المیہ تھا۔ وہ کسی سے کچھ کہہ لیتیں، سن لیتیں تو شاید نارمل ہوئی۔۔۔

اور ماچس کی ڈبیا نکالی۔ سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبائی اور پھر سگڑا کر بڑے پرسکون انداز میں لمبے لمبے کش لگانے لگا۔ وہ حیرت اور صدمے سے گنگ سی بیٹھی رہ گئی۔ اس کی ایک ایک حرکت دل جلانے اور اسے چڑانے والی تھی۔ جانتا تھا، اسے سگریٹ پیتے ہوئے مرد بالکل اچھے نہیں لگتے۔

”محبت! تم سگریٹ پینے لگے ہو۔۔۔؟“ وہ بہت دکھ سے پوچھ رہی تھی۔
 ”ہاں مجبوری ہے۔۔۔ بپنی پڑتی ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جسے جیونگم کی طرح چھپایا جاسکے اور لااں پاپ کی طرح چوسا جاسکے۔“
 ”ماموں کو علم۔۔۔“

”فارگا ڈسک محترمہ۔۔۔! میں آٹھ دس سال کا بچہ نہیں ہوں جس کی کسی غلطی کو تم بڑوں کے سامنے لے جا کر پیش کرو گی اور وہ مجھے فوراً سزا دینے پر تل جائیں گے۔“ اس کا لہجہ سخت ہی نہیں بے گانہ بھی تھا۔

”یہ۔۔۔ یہ تم کس لمحے میں بات کر رہے ہو مجھ سے۔“ اسے بھی غصہ آنے لگا تھا۔
 ”تم کس لمحے میں سننا چاہتی ہو مجھ سے۔۔۔ بڑا سمجھتا ہوا انداز تھا اس کا۔ ماہین سر تھام کر رہ گئی۔ ہر سوال کا الٹا جواب۔۔۔ ہر بات کا الٹا مطلب۔۔۔ وہ تو بڑے سچا و سچا اس سے بات کرنے آئی تھی مگر محبت بری طرح بگڑا ہوا تھا۔ تب وہ بمشکل خود پر قابو پا کر بڑے نرم لہجے میں بولی تھی۔
 ”محبت! تم ماموں، مہمانی کے اکلوتے بیٹے ہو۔“

”اچھا۔۔۔ خاصی نئی اطلاع ہے یہ۔۔۔“ وہ جیسے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے بولا تھا۔
 (بدبین۔۔۔ گدھا۔۔۔ الو۔۔۔ میری نرمی سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے) وہ دل میں جی بھر کے اسے گالیاں دے کر دوبارہ مسکرائی۔

”اگر تم چلے گئے محبت۔۔۔ تو تم جانتے ہو۔ وہ کس قدر اکیلے ہو جائیں گے۔“
 ”جانتا ہوں۔۔۔“ سگریٹ کی راکھ جھاڑنے کے عمل میں بہت اطمینان ظاہر ہو رہا تھا۔
 ”تو پھر تم کیوں ایک فضول سی ضد کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہو۔۔۔ محبت! بات منوانے کا یہ طریقہ بالکل درست نہیں جو تم نے اختیار کیا ہے۔ مہمانی کتنی پریشان ہیں۔ تمہیں اس بات کا اندازہ تک نہیں۔ ماموں الگ بیندیں گنوائے بیٹھے ہیں۔ تم ان کی آخری اور واحد امید ہو محبت۔۔۔ پلیز ان دونوں کو اس طرح تنگ مت کرو۔“

اس کی بات کے اختتام پر اس نے خاموشی سے اپنی ٹانگیں میز سے ہٹائی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے وہ یہ بھی سمجھی تھی کہ وہ وہاں سے اٹھ کر جا رہا ہے لیکن دوسرے پل وہ کرسی آگے کی طرف گھسیٹ کر دونوں کھدیاں میز پر ٹکائے اس کے چہرے پر نظریں گاڑے بیٹھا تھا۔ وہ چند لمحے یونہی بیٹھی اسے گھورتی رہی لیکن پھر جلد ہی الجھ کر بولی۔

”تم مجھے بڑل کر رہے ہو محبت۔۔۔“
 ”ماہین! اگر تم مجھے روکو گی تو میں رک جاؤں گا۔“ وہ بڑے فیصلہ کن انداز میں کہہ رہا تھا۔ ماہین اپنی جگہ ساکت سی بیٹھی رہ گئی۔
 ”میں تمہارے جواب کا منتظر ہوں۔“ اس کے انداز نشست میں تبدیلی نہیں آئی تھی۔

ہو جاتیں۔۔۔ لیکن وہ اندر ہی اندر ٹوٹی رہیں۔

باب سخت گیر طبیعت کا تھا۔۔۔ بھائیوں کی کاروباری مصروفیات۔۔۔ بھابھیاں بچوں کے مستقبل میں مگن۔۔۔ بہن ازدواجی زندگی میں مگ۔

وہ توجہ سے محروم تھیں۔ محبت و شفقت سے محروم تھیں۔ کسی سنگی ساتھی سے محروم تھیں جس کے کندھے پر سر رکھ کر وہ اپنے اندر کا غبار نکال سکتیں۔ کوئی سہارا نہیں مل سکا کہ وہ مضبوطی سے قدم جماتی ان اوچی پچی راہ گزروں سے گزر جاتیں اور سب سے بڑا ظلم یہ ہوا کہ غیث شادی کے بعد اسی گھر میں رہا۔۔۔ ان کی نگاہوں کے سامنے اپنی خوشیوں میں مگن۔۔۔ بیٹجھاؤ نہ تو اس کی محبت سے پیچھا چھڑا سکیں اور نہ اس کی بے وفائی کے احساس کو بھلا سکیں۔ پھر ہوا یوں کہ وہ اپنی ذات کے گنبد میں قید ہوئی چلی گئیں۔ ان کی تمام خواہشات بند کمرے میں زہریلی تنہائی کا شکار ہوئی گئیں تو پھر ان کے وجود میں کڑواہٹ ہی کڑواہٹ بھر گئی۔ ایک غصہ۔۔۔ احتجاج۔۔۔ احساس محرومی ان سب نے مل کر ان کی شخصیت کو حد درجہ مسخ کر دیا تھا اور پھر ان کے وجود میں پھیلے زہر کو باہر نکلنے کے لیے کوئی راستہ بھی تو درکار تھا ناں۔۔۔ سو یہ راستہ چاند کی صورت ان کے سامنے آ گیا اور چاند کی شخصیت نے انہیں مزید الجھا دیا۔۔۔ ان کی اندرونی کشمکش میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔

چاند کے لیے وہ بیک وقت مثبت اور منفی جذبات رکھنے لگی تھیں۔ وہ عمر کے اس دور میں تھیں جب فطری طور پر ایک عورت میں ممتا کے سوتے پھوٹنے لگتے ہیں۔۔۔ کسی اور وجود کو اپنے وجود میں پرورش دینے اور کسی ننھے منے انسان کو اپنی گود میں کھلانے کی خواہش فطری طور پر دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔ لہذا ایک طرف تو اس خواہش کے تحت اور غیث کی ایک نشانی ہونے کی وجہ سے انہیں چاند سے بے حد محبت محسوس ہونے لگتی تھی اور دوسرے طرف غیث سے نفرت انہیں چاند پر تشدد پر آمادہ کرتی تھی۔۔۔ جب چاند ان کی وجہ سے یہ گھر چھوڑ کر گیا تو ان کے اندر احساس جرم جنم لینے لگا۔ چاند کی غیر موجودگی میں غیث کہیں پس پشت چلا گیا تھا اور چاند کی شخصیت جیسے ابھر کر ان کے سامنے آ گئی تھی۔۔۔ یہ بھی وہ ساری حقیقت جس نے انہیں نارمل سے بنارمل بنا دیا۔ اس نفسیاتی علاج کی ضرورت انہیں آج نہیں بلکہ آج سے کئی برس پہلے تھی۔

ڈرائنگ روم میں سب لوگوں کی موجودگی میں ڈاکٹر حیات نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں نجمہ خالہ کی کیس ہسٹری بیان کی تھی اور ماہین کو احساس ہوا۔ آنسو بہت دیر سے اس کے گالوں پر بہتے چلے آ رہے تھے۔ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے دیکھا۔ ہر فرد سر جھکائے اپنی سوچوں میں غلطان تھا۔

”ماہین! باہر آؤ۔“ چاند بھیا اس کے برابر سے اٹھ کر سرگوشی کرتے ہوئے باہر نکلے تو وہ بھی ان کے پیچھے چلی آئی۔

”کتنی عجیب بات ہے ناں چاند بھیا۔۔۔ ہم لوگوں نے کبھی یہ سوچنے اور سمجھنے کی زحمت ہی نہیں کی تھی کہ نجمہ خالہ ایسی کیوں ہیں۔۔۔ یا وہ ایسا کیوں کرتی ہیں۔۔۔ بس ہر بات پر انہیں الزام دیتے رہتے۔۔۔ حالانکہ انہوں نے کتنی مشکل زندگی گزاری ہے۔۔۔“

”ہوں۔۔۔“ چاند بھیا کی گہری سوچ میں تھے۔

”چاند بھیا۔۔۔ کیا نجمہ خالہ کی ساری زندگی ان ہی محرومیوں کی نذر ہو جائے گی۔“ وہ حقیقتاً ان

کے لیے پریشان تھی۔

”خدا نہ کرے۔۔۔“ چاند بھیا نے فوراً اسے ٹوک دیا۔ ”میں نے تو ان کے لیے بہت کچھ سوچ رکھا ہے۔“

”آپ نے کیا سوچ رکھا ہے۔۔۔؟“ ماہین کو حیرت ہوئی۔

”ڈاکٹر حیات کو دیکھ رہی ہو۔۔۔ وہ نجمہ خالہ کے کیس میں غیر معمولی دلچسپی لے رہے ہیں۔“

”تو۔۔۔؟“ ان کے پراسرار انداز پر وہ کچھ سمجھ نہیں پائی تھی۔

”تو یہ کتنا سمجھ گڑبا۔۔۔ جوانی میں ڈاکٹری کے پیشے سے عشق نے انہیں کسی عورت کی طرف متوجہ ہی نہیں ہونے دیا۔ شادی نہیں کی۔۔۔ لیکن اپنی تنہائی اور گھر کی ویرانی انہیں اکثر پریشان کر دیتی ہے اور میں نے سوچ لیا ہے۔ نجمہ خالہ کو ایک مریضہ کے طور پر تو وہ قبول کر ہی چکے ہیں۔ میں انہیں نجمہ خالہ کو بطور ہم سفر قبول کرنے پر بھی آمادہ کر ہی لوں گا۔“

”لیکن کیسے۔۔۔؟ آپ کیسے آمادہ کر لیں گے انہیں۔“ ماہین الجھ رہی تھی۔

”پہلے انہیں ان کی تنہائی کا خوب احساس دلاؤں گا اور پھر نجمہ خالہ کی تنہائی کا رونا روؤں گا۔ وہ عقل مند انسان ہیں۔ اس عمر میں ایک ایم۔ اے انگلش پاس خوبصورت لڑکی کو چھوڑنے کا ریسک نہیں لے سکیں گے۔“ چاند بھیا بہت پر امید تھے۔ وہ ایک ٹک انہیں دیکھے گئی۔

”چاند بھیا! آپ ان کے لیے اتنا اچھا سوچ رہے ہیں۔۔۔ کیا آپ سب کچھ بھول گئے۔۔۔ جو انہوں نے آپ کے ساتھ کیا؟“

”جب انسان کو اپنا مستقبل بہت خوبصورت نظر آ رہا ہو ناں تو اسے اپنے بد صورت ماضی کو بھول جانا چاہیے اور جو کچھ ابھی ڈاکٹر حیات نے تمہیں بتایا۔ کیا اس کے بعد نجمہ خالہ تمہیں ظالم کے بجائے مظلوم نہیں لگنے لگیں اور پھر ڈاکٹر حیات کہتے ہیں۔۔۔ معاف کرنا خدائی وصف ہے۔۔۔ میں نے اس وصف کو اپنانے کی کوشش کی ہے ماہین۔۔۔“

”اوہ۔۔۔ چاند بھیا۔۔۔ یو آر گریت۔۔۔“ وہ ان سے حد درجہ متاثر ہوئی تھی۔

”اچھا بس بس۔۔۔ آؤ اب ڈرائنگ روم کی خبر لے لیں۔“ وہ اسے ساتھ لیے باغ میں آگئے۔ رتو کی بوا کے سر میں تیل ڈال رہی تھی۔

”کئی بوا! اب تیاری پکڑ لیں آپ بھی۔ رتو جیسی چالاک بہو کے لیے ایک کٹر ساس کا ہونا بہت ضروری ہے۔۔۔“ چاند بھیا، کئی بوا کا ماتھ تھامے کہہ رہے تھے۔

”ارے واہ خونا خواہ تھہانے آگئے۔ میری کئی بوا کو۔۔۔“ رتو بھی کہاں چپ رہنے والی تھی۔ فوراً لڑنے لگ گئی۔ کئی بوا اسے ڈانٹنے لگیں۔

”ہونے والا شو ہر ہے۔۔۔ خبردار جو آئندہ ایسے بات کی۔۔۔“

ماہین کو اس کون میں اپنا آپ غیرا ہم لگا تو وہ فوراً وہاں سے اٹھ آئی۔



”اے نئے سال بتاتھ میں نیا پن کیا ہے۔“

”ماہین۔۔۔ ماہین۔۔۔“ وہ ابھی ڈاکٹری پر چند حروف ہی لکھ پائی تھی جب رتو بھاگتی ہوئی اس

کے سر پہ آہنچی۔

”کیا ہو گیا ہے رتو۔۔۔! کیوں خوا خواہ تنگ کر رہی ہو۔“ وہ چڑ کر بولی تھی۔ سیما بھابی نے نئے سال کے موقع پر گھر میں ہی ملے گئے کارو گرام بنایا تھا۔ عبید بھیا اور اسدان کا بھرپور ساتھ دے رہے تھے۔ وہ ابھی کچھ دیر قبل ہی اپنے کمرے میں آئی تھی اور اس دوران تو کئی مرتبہ اسے ڈسٹرب کر چکی تھی۔ پہلی مرتبہ اسے غبارے نہیں مل رہے تھے۔ دوسری مرتبہ پٹانے کہیں رکھ کر بھول گئی تھی اور اسد سے ڈانٹ کے خیال سے بھابی بھابی اس کے پاس چلی آئی تھی، اس پر رحم کھاتے ہوئے ماہین نے سارا گھر چھان مارا تھا، تب کہیں جا کر واشنگ مشین میں کپڑوں کے ڈھیر سے پٹاخوں کا لگانہ ملا تھا۔

”ہائے رہا۔۔۔ میں نے کہا، کسی بچے کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔“

وہ کھپائی ہنسی ہنس کر اس کے سامنے سے غائب ہو گئی تھی اور اب جبکہ وہ بڑے انہماک سے ڈائری پر ۳۱ دسمبر کی تاریخ لکھ کر حسب حال یہ نظم لکھنے والی تھی تو وہ چیختی ہوئی ایک بار پھر اس کے سامنے تھی۔

”اے ماہین! سنتی ہو کہ نہیں۔۔۔“ وہ اس کے کان کے پاس آ کر چیخی۔

”کیا مصیبت ہے رتو۔۔۔؟“ اس نے جھنجھلا کر ڈائری بند کی۔

”کوئی مصیبت نہیں۔۔۔ لیکن بتاؤں۔۔۔ وہ بڑا صاحبہ آئی ہیں۔۔۔“

”تو۔۔۔؟ کیا پہلی مرتبہ آئی ہیں۔“ وہ چیخی لیکن پھر اس کے راز دارانہ لہجے پر چونک گئی۔

”ہائیں! لیکن اس وقت کیا کرنے آئی ہیں۔۔۔؟“

”ہاں اب پوچھی ہے اصل بات۔۔۔ چلو جا کر سنتے ہیں۔۔۔“ اس نے ماہین کا بازو پکڑ کر کھینچا تو وہ بھی اٹھ کر ساتھ ہوئی۔ بڑی ممانی چھوٹے ماموں کے کمرے میں بیٹھی تھیں کیونکہ زین اور چھوٹی ممانی بھی چھپایاں گزارنے آئے ہوئے تھے اماں بھی کمرے میں موجود تھیں۔ یہ دونوں دروازے سے لگ کر اندر سے آتی آوازوں کو سننے لگی تھیں۔

”ارے کہنا کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔ آج ہی تو منہ سے پھوٹا ہے۔ کہتا ہے۔ مجھے نوکری پیشہ لڑکی سے شادی نہیں کرنی اور اتنی تعلیم کے بعد لڑکی کو نوکری نہ کرنے دینا بھی اس پر ظلم ہوگا۔ بس اتنی سی بات تھی۔۔۔ بانی میرا بچہ آپ کے سامنے ہے۔۔۔ آپ کے ہاتھوں پلا بڑھا ہے۔۔۔ عادات و اطوار سے واقف ہیں۔ ماشاء اللہ بہت سلجھا ہوا ہے۔ آج تک برے دوستوں کی صحبت میں نہیں بیٹھا۔ پانچ سال یونیورسٹی میں پڑھتا رہا۔ اللہ کا شکر ہے، کسی لڑکی کے چکر میں آج تک نہیں پڑا۔“

”لڑکی تو گھر میں موجود تھی۔ یونیورسٹی میں چکر کس سے چلاتے۔“ رتو نے اس کے کان میں سرگوشی کی جبکہ وہ اس کا یا پلٹ بر جیراں تھی۔

”وہ سب ٹھیک ہے آپا! گھر کا بچہ ہے۔۔۔ لیکن میں کیا جواب دے سکتی ہوں؟ آپ ہی اس کی سرپرست ہیں یا پھر بھائی صاحب آپ کے سامنے بیٹھے ہیں ان ہی سے۔۔۔“

اماں آنسو بہانے لگی تھیں۔ انہیں یقیناً ایسا یاد آ رہے تھے۔ کمرے کی فضا بوجھل سی ہو رہی تھی۔ وہ رتو کو وہیں دروازے سے چپکا چھوڑ کر صحن میں آگئی۔ دلفنہ دلفنہ سے چلتی ہوئی ہوا بدن کو کپکپائے دے رہی تھی۔ اس نے لاؤنچ میں جھانکا، وہاں سیما بھابی اور اسد غبارے مچھلانے میں مصروف تھے۔ عبید

بھیا، فراز کو ساتھ لیے لاؤنچ کی مختلف جگہوں میں گفٹ چھپاتے پھر رہے تھے۔ اپنا اپنا گفٹ سب کو خود ہی تلاش کرنا تھا۔ سب کو اپنی اپنی جگہ مصروف دیکھا تو وہ چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد اوپر آگئی۔ باہر صحن میں اندھیرا تھا اور محبت غالباً ابھی اپنے لیے چائے بنا کر کچن سے نکلا تھا۔ اسے دیکھ کر بے اختیار ہی ٹھٹھک گیا۔

”کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔“ اس نے صحن کی لائٹ روشن کی۔

”چائے کا کپ سر پہ انڈیل کر دیکھ لو۔۔۔ خود ہی پتا چل جائے گا۔“ وہ بڑے اطمینان سے کہتی ہوئی کچن میں آگئی۔ چائے کی دیپٹی خالی پڑی تھی۔

”آدھی۔۔۔ آدھی کر لیں۔۔۔“ اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے فوراً تجویز پیش کی۔ تو اس نے نفی میں سر ہلادیا۔

”پوری لے لو۔“ اس نے فوراً اپنا کپ اس کی طرف بڑھایا۔ ماہین نے دیکھا، وہ غیر معمولی طور پر خوش تھا اور اس خوشی کو چھپانے کے لیے اسے خوا خواہ الجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ماہین نے خاموشی سے کپ اس کے ہاتھ سے لے کر سائیڈ پر رکھ دیا۔

”یہ سب کیسے ممکن ہوا۔۔۔ اور وہ بھی اتنی جلدی۔“ اس نے دونوں ہاتھ سینے پہ باندھتے ہوئے براہ راست سوال کیا تو لمحہ بھر کے لیے وہ گڑبڑا سا گیا۔

”کیسے ممکن ہونا تھا۔۔۔؟ میں نے کہہ دیا، میں ایسی لڑکی سے شادی نہیں کرنا چاہتا جو گھر گرہستی کو بھول کر اپنے کینک اور مریضوں کی ہو کر رہ جائے۔ پھر ابانے تمہارا نام تجویز کر دیا اور امی رشتہ لے کر پہنچ گئیں۔“

”بس اتنی سی بات۔۔۔؟“ خاصا گھڑا گھڑایا جواب ملا تھا۔ اسے مطمئن نہیں کر سکا۔

”ہاں تو اور کیا۔۔۔؟ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا۔ تم آج اشارہ کرو۔۔۔ امی آج تمہارے ہاں پہنچ جائیں گی۔“

”مجھے لگتا ہے۔۔۔ تم مجھے بنا رہے ہو۔۔۔؟“ وہ اس کے مشکوک انداز پر اسے گھورنے لگا تھا۔

”ممانی عفت کے لیے اس قدر جذباتی ہو۔۔۔“

”محترمہ! ممانی کا بیٹا آپ کے لیے ممانی سے زیادہ جذباتی ہو رہا تھا۔ لہذا اس معاملے کو جلد از جلد ختم کرنے کے لیے اس نے ایک ہاتھ میں پسل پکڑا، دوسرے ہاتھ میں سلیپنگ پلز اور ایک تھڑی قسم کی دھمکی دے دی کہ جس سے چاہیں شادی کر دیں۔ بس ایک عفت سے نہیں کروں گا۔ اماں کے تو ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تھے۔۔۔ ابامیرے ہم نوا تھے۔ لو ہا گرم دیکھا تو فوراً جوت لگا دی۔“ ماہین کے بارے میں کیا خیال ہے۔۔۔؟“ میں نے کہا۔ آپ کا فریاد دار ہوں۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔۔۔ بس ظاہر ہے، امی کو بھانجی سے زیادہ بیٹا عزیز تھا۔ اس لیے پہنچ گئیں نچلے پورشن میں۔“ اس نے چنگیوں میں بات ختم کی۔

”اوہ میرے خدا۔۔۔ تم نے اس طرح بلیک میل کیا انہیں۔۔۔؟“ وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔

”بالکل۔۔۔ وہ کسی اور طرح بلیک میل ہونے کو تیار ہی نہیں تھیں۔ لیکن اب تم کیا اس بات پر

اظہارِ افسوس کرتی رہو گی۔“
”نہیں۔ میں کیوں اظہارِ افسوس کروں گی۔ میں تو جا رہی ہوں نیچے۔۔۔“ وہ ہاتھ جھاڑتی ہوئی
پکڑ سے باہر آئی۔

”کیوں۔۔۔؟“ وہ اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔
”اپنا انکار بھی تو پہنچانا ہے ناں بڑوں کو۔۔۔“ وہ بڑی سنجیدگی سے آگے بڑھی تھی۔ محبت نے لپک
کر اسے بازو سے پکڑ کر رکھا اور حد درجہ حیرت سے اسے دیکھا۔
”تم کیا کہہ رہی ہو ماہین۔۔۔؟“
”ٹھیک کہہ رہی ہوں۔۔۔ مجھے ایسے شخص کا ہاتھ ہرگز نہیں قبول جوتا بڑا جیڑ ہو۔ جو سگریٹ پیتا
ہو۔۔۔ میز پر ناگنیں رکھ کر بیٹھتا ہو۔۔۔ اور لڑکیوں سے خراب لہجے میں بات کرتا ہو۔۔۔ بلکہ بچپن میں
مجھے تنگ بھی کیا ہو۔“

وہ جان بوجھ کر اسے ستار ہی تھی لیکن محبت ایک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔
”تم ایسے شخص کا ساتھ تو قبول کر سکتی ہوناں جو تمہارے دل کی آواز پر تمہارے پاس پہنچ جاتا ہو۔
مشکل میں تمہاری مدد کر سکتا ہو اور تمہاری محبت میں ساری دنیا سے لڑنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔“
”مجھے آج پتا چلا ہے کہ تمہاری آواز اتنی خوبصورت ہے۔“ ماہین اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکی۔
”آئندہ بھی مزید انکشافات ہوں گے۔۔۔“
”اب چلتی ہوں۔۔۔“ اسے رومانگ ہوتے دیکھ کر وہ تیزی سے آگے بڑھی مگر وہ راستے میں
حائل تھا۔

”اپنی محبت کی طویل عمر میں، میں نے بھی تم سے کچھ نہیں مانگا۔ آج صرف یہ آدھا گھنٹہ مانگ رہا
ہوں۔“
وہ گھڑی کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے بڑی امید سے کہہ رہا تھا۔ ساڑھے گیارہ ہو چکے تھے۔
ماہین چلتی ہوئی دیوار کے پاس آرکی اور نیچے جھانکنے لگی۔
”انسان کی زندگی میں بعض گھڑیاں ایسی بھی آتی ہیں جب اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کی زندگی
کے خوبصورت ترین ماہ و سال کا آغاز ہونے والا ہے۔ یہ گھڑیاں مجھے کوئی ایسا ہی سند یہ دیتی ہوئی
محسوس ہو رہی ہیں۔۔۔“

محبت اس کے برابر میں کھڑا تھا۔ ماہین نے ٹھنڈی بخ دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے اس کا چہرہ
دیکھا۔ خوشی کا بھرپور عکس اس کے چہرے پر جھلکارا ہوا تھا۔ ماہین کو اس لمحہ وہ بہت خوبصورت لگا تھا۔
”یا شاید یہ ہے ہی خوبصورت۔۔۔ میں نے ابھی غور سے دیکھا بھی کہاں ہے؟“ وہ سوچنے لگی۔
محبت اسے ایک منٹ رکنے کا کہہ کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ واپس آتے ہوئے اس نے پھن کی
لائٹ بجھا دی تھی۔

”ارے۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔؟“ وہ چونکی۔
”کچھ نہیں۔۔۔ میں تمہیں یہ گفٹ دینا چاہتا ہوں۔۔۔“ وہ بہت پُر جوش ہو رہا تھا۔
”کھول کر دیکھو۔۔۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں، اس کی روشنیوں میں تمہارا خوشی سے دھمکتا چہرہ کیسا

لگتا ہے۔“ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ چڑ جاتی۔۔۔ گراب غالباً ماحول کا اثر تھا کہ وہ خاموشی سے گفٹ
کھولنے لگی تھی۔ گفٹ کھولنے پر محبت نے ہاتھ بڑھا کر کوئی چھوٹا سا بٹن پش کیا تھا اور اگلے ہی پل وہ
مہبوت ہو کر رہ گئی تھی۔

”اوہ میرے خدا۔ یہ۔۔۔ یہ بہت خوبصورت ہے۔۔۔ بہت خوبصورت۔۔۔“
وہ کرٹل کا بنا ہوا ایک ڈیکوریشن پس تھا۔ چھوٹے سے گلدان میں دو ادھ کھلے گلاب جو بٹن
دبانے سے سرخ روشنی منعکس کرنے لگے تھے اور کرٹل کی ہی نہایت مہارت سے تراشی گئی پتیوں میں سبز
روشنی سی بھرتی تھی۔ رات کے اس پہر جب آسمان پر چاند ستارے روشن تھے اور سرد موسم میں دل جذبات
کی گرمی سے معمور تھے، یہ تجھ سے زندگی کی طرح خوبصورت لگا تھا۔
”سنو۔۔۔ کوئی نظم تو سناؤ۔۔۔ بہت اچھی اور خوبصورت۔۔۔“ محبت نے اس سے پہلی بار
فرمائش کی تھی۔

وہ صرف چند لمحے سوچنے کے بعد اسے نظم سنانے لگی تھی۔
آنکھوں کو چھوڑ ہے ہیں ستاروں کے نرم ہاتھ
پلکوں پر آرکی ہے ٹنٹائے کھکشاں
زلفوں کے تار تار سے پھولی ہیں مستیاں
ہونٹوں کو چومتی ہے شرارت سے چاندنی
پیروں کی لغزش ہیں صراحی کی ہچکیاں
رستوں میں ہر طرف ہیں گل یاسین کھلے
خوشبو میں کیوں نہ گوندھ لیں کرنوں کے ہار ہم
سننے ہیں چاندنی یونہی بر سے گی رات بھر
مجھ کو پکاریے تو ذرا احتیاط سے
ایسا نہ ہو کہ کالج کی دیوار گر پڑے
میں خواب کے سفر میں ہوں
آہستہ بولیے

وہ بند آنکھوں سمیت خوبصورت لہجے کے ساتھ نظم سناتی چلی گئی۔ اس کی بند آنکھوں کے پیچھے بچے
خوابوں کی لماعت محبت نے اپنی پلکوں پر بھی محسوس کی تھی۔ وہ اسے یونہی اپنے آپ میں کم گھڑے
دیکھتے رہنا چاہتا تھا لیکن عین اسی وقت اطراف سے زور زار دھماکوں کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ وہ
دونوں اپنی اپنی جگہ چونک گئے۔
”نیا سال مبارک۔“ ماہین نے ابتدا کی تھی۔
”تمہیں بھی۔۔۔“

”ماہین۔۔۔ ماہین۔۔۔“ نیچے تو چیخ رہی تھی۔
”توبہ ہے، یہ تو سارے جہان کو خبر کر دے گی۔“ وہ فوراً نیچے کی طرف پلکی۔ وہ بھی اتنی ہی تیزی

سے اس کے پیچھے بھاگا تھا۔

”ارے۔۔۔“ وہ ٹھنکی۔

”میرا داخلہ ابھی تک نچلے پورشن میں ممنوع نہیں ہوا۔۔۔“ اس نے فوراً وضاحت کی۔

ماہین کچھ لمحے دیکھتی رہی اور پھر کندھے اچکا کر ہنستے ہوئے نیچے اترنے لگی۔ جہاں ایک ہنگامہ گرم تھا۔ خوشیاں اور رونقیں اپنے عروج پر تھیں۔ آسمان پر دمکتا چودھویں کا چاند اور درخشاں ستارے نئے سال کی ان اولین ساعتوں میں ان کی دائمی خوشیوں کی دعا کرتے ہوئے کائنات پر جھک آئے۔ چاندنی میں نہایا ہوا ہر منظر بہت واضح اور روشن تھا۔

چاندنی میں نہا رہی تھی رات

اور جگنو دعائیں کرتا تھا

آج آنکھوں سے نینداڑ جائے



دادی اماں کہتی تھیں ان کی اس گھر میں بڑی عزت کی جاتی ہے۔ سو اس نے زمانے بھر کی جھوٹی نمبر ایک دادی پر یقین کر لیا۔ بالکل دل سے۔۔۔ اور یہیں اس سے غلطی ہوئی تھی۔ خیر یقین کر لیا، آنکھ بند کر کے ان کے پیچھے چل دی۔ یہاں اس سے دوسری غلطی ہوئی تھی، آنکھیں کھلی رکھتی تو معلوم ہو جاتا کہ دادی کہاں جا رہی ہیں بلکہ اسے بھی لیے جا رہی ہیں۔

اور اب۔۔۔۔۔

جب کہ وہ اسے یہاں لے کر آچکی تھیں ایک دھوئی گھاٹ میں تو وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھولے بشتر بشتر اپنے سامنے کے منظر کو دیکھ رہی تھی۔ کھلا سا صحن تھا۔ جس میں تین ہونی تاروں پر دھلے کپڑے یہاں سے وہاں تک پھیلے ہوئے تھے اور سب کے سب مردانہ۔

مردانہ جرابیں، مردانہ قمیصیں، مردانہ شلواریں، مردانہ بنیائیں۔۔۔۔۔

نہ کوئی فراک۔ نہ چوڑی دار پانچاھے، نہ کرتے، نہ دھنک رنگ دوپٹے، لال، ہنر سبز، پیلا سب رنگ غائب، عجیب بلیک اینڈ وائٹ سا منظر تھا۔

وہ تو سہم کر دادی کے پیچھے چھپنے لگی۔

ان کی ٹانگیں کی قمیص میں دیوچی۔ چٹکیاں کاٹیں، کانوں میں گھسی۔

مگر دادی تو کس سے مس نہ ہوئی تھیں۔

وہ تو ہمیشہ ہی چڑتی تھی دادی کی ڈھٹائی سے مگر آج تو حد ہو گئی تھی۔

خالی مکان۔۔۔ بالکل ویران۔۔۔ بیابان۔۔۔ نہ آدم بونہ آدم ذات۔

”اگر“ یہاں کوئی رہتا تھا، تو اس وقت ہرگز گھر میں موجود نہ تھا۔ اور دادی۔۔۔ کس قدر رازداری

سے دبے پاؤں چلتی ہوئی پورے گھر کا جائزہ لے رہی تھیں۔

عجیب چیز وہ کب تھا جو اس کی پشت پر بہت نمایاں تھا۔ اتنا نمایاں کہ جیسے ایک چھوٹے سا زکافٹ بال اس نے اپنی قمیص کے نیچے پشت کے عین درمیان میں باندھا رکھا ہو۔ صرف بچوں کو ڈرانے کے لیے اور اب اسے بھی ڈرا رہا تھا۔ اپنی میلی گدلی آنکھوں میں قہر بھرے۔ خونخواریت سے گھورتے ہوئے وہ مزید دادی کے بازوؤں میں سمیٹنے لگی۔

تب ہی ایک پاٹ دار آواز گھر کے لمحاتی ستارے میں گونجی تھی۔
”کبڑے میاں! ارے کون چیخا تھا یہاں، بلکہ چیخی تھی۔ پڑوس میں آواز سن کر میں تو بھاگی چلی آئی۔“

اور بھاگنے والی اپنے جس بھاری بھر کم وجود کے ساتھ بھاگی چلی آ رہی تھیں تو وہ بھی اک معجزہ تھا اور ان کے بھاگنے کے باوجود اگر ان سب کے سروں پر چھت اور پیروں تلے زمین قائم تھی تو وہ ایک اور معجزہ تھا۔

”حسنہ! پاپا! گھر کھلا چھوڑ کر کہاں چل دی تھیں آپ۔۔۔ اب خدا جانے کب سے یہ دونوں۔۔۔“ اس مرد کی آواز اس کی صورت سے زیادہ بھڑکی تھی۔

”اوئی اللہ۔۔۔ چوریاں۔۔۔“ حسنہ! پاپا کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑنے لگے۔ ابھی حال ہی میں محلے میں ایسی واردات ہوئی تھی، دو نہایت شریف نظر آنے والی خواتین ہاتھ روم میں جانے کے بہانے کسی گھر میں گھس آئیں۔ چند لمحوں بعد گھر والے سب ہاتھ روم میں۔۔۔ اور خواتین قیمتی ساز و سامان کے ساتھ چھپت۔۔۔

”شاباش ہے حسنہ! شاباش۔۔۔ یعنی کہ اب ہم چور ہیں۔ ڈاکو ہیں، ارے دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے کیا۔۔۔؟ ہمیں پہچان ہی نہ سکیں۔“

”لا حول ولا۔۔۔“ وہ شپٹا کر دادی سے علیحدہ ہوئی۔ انہیں شوق تھا، ہر محاورے کو اپنی مرضی کے معنی پہنانے کا۔ وہ تو شکر ہوا کہ خاتون محاورے پر غور کرنے کے بجائے دادی پر غصہ فرما رہی تھیں۔

”اے بڑی بی! میں نے واقعی آپ کو نہیں پہچانا۔۔۔“

”لیجئے بات ختم۔۔۔ قصہ پاک۔۔۔“ اس نے ہاتھ جھاڑے اور قریبی کرسی پر ڈھکے گئی۔۔۔

”اور دادی کہتی تھیں۔ ان کی اس گھر میں بڑی عزت ہے۔ لیکن یہ لوگ لگتا ہے ”عزت“ کے بجائے ”عزت افزائی“ کرنے والے ہیں۔“

وہ دادی کو دیکھ رہی تھی جو بڑی چالوسی سے حسنہ! پاپا کو لیے کمرے میں چل دی تھیں اپنا تعارف کروانے کے لیے۔ حسنہ! پاپا شیش و شیش میں مبتلا ان کے ساتھ ساتھ تھیں اور اسے خوب معلوم تھا دادی کا تعارف کیا ہے؟

”میں فلاں ابن فلاں ابن فلاں کی فلاں فلاں ہوں۔۔۔ کچھ یاد آیا۔۔۔ کوئی بھولا بسرا چہرہ؟ کوئی گمشدہ تعارف؟ کوئی کھویا ہوا رشتہ دار؟

”ہاں بس میں وہی ہوں جس سے پہلی مرتبہ تم ملی تھیں تو چہرے کا رنگ یوں چھلسا ہوا نہیں تھا۔ اس وقت قدرت مجھے بنا کر اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں رکھے۔ بڑے پیار سے دیکھ رہی تھی اور آج۔۔۔“

”اگر کوئی آجائے تو کیسی سبکی ہوگی۔۔۔“ اس کے ماتھے پہ پسینہ نمودار ہونے لگا۔
”چوروں کی طرح گھر میں گھس گئے۔ نہ گھنٹی بجائی، نہ دستک دی۔ آواز بھی نہیں لگائی اور۔۔۔“ وہ بے چینی سے دو قدم آگے بڑھی۔ دادی نے کون سے کمرے میں گھس گئی تھیں بلا اجازت، اسے وہیں صحن میں تنہا چھوڑ کر۔

”اللہ کہیں یہ گھر آسب زدہ نہ ہو۔ اتنی خاموشی ہنستے ہنستے گھر میں تو نہیں ہوتی۔“ وہ ہاتھ مسلنے لگی۔ صحن میں اترتی ملکی ملکی شام میں جب وحشت بھری تھی۔ اسے چار اطراف پھیلی تنہائی سے خوف آنے لگا۔ تار پہ سوکھے کپڑے ہوئے ہوئے لرز رہے تھے۔

”ہو تو نہیں چل رہی۔۔۔“ اس نے پسینہ خشک کیا، تھوک نکلنے کی کوشش کی۔۔۔ خود کو بہادر بنانا چاہا لیکن خوف کے پاؤں نہیں ہوتے، وہ سامنے سے نہیں آتا، عقب سے حملہ آور ہوتا ہے۔ چھلانگ لگا کر آتا ہے محلوں میں۔۔۔ اور حاوی ہو جاتا ہے۔

اور اسے اس آسب زدہ شام میں، صحن کی تنہائی میں لگ رہا تھا کہ کپڑے بل رہے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ بل رہے ہیں بلکہ تاروں سے نیچے اتر رہے ہیں۔

سب سے پہلے جراثیم دھم دھم، اچھلتی کودتی اس کے آس پاس رقص کرنے لگی ہیں اور وہ قمیص۔۔۔ جس کے بازو سب سے لمبے ہیں وہ آئے گی اور اس پر تار توڑ حلقے کر دے گی۔ دھن دھنا دھن۔

اور وہ سفید ازار بند، جو دھیرے دھیرے ریگتے ہوئے اس کی طرف آرہا ہے۔ وہ آئے گا اور پھندے کی صورت اس کے گلے کے گرد لپٹ جائے گا اور اسے کسی پھاسی دیے ہوئے مجرم کی طرح صحن کے عین وسط میں لٹکا دے گا، کسی ان دیکھے درخت کے ساتھ۔

آنے والے آئیں گے اور دیکھیں گے، اس کا نیلا پڑتا چہرہ گز بھر لمبی زبان منہ سے باہر۔
”اے لڑکی!“ نہ جانے کس نے پکارا، کس نے چھو۔۔۔ اس کے حلق سے نکلنے والی چیخ بے ساختہ تھی۔

”کون ہو تم۔۔۔؟“

آواز عقب سے آ رہی ہے۔ اس نے ذرا کی ذرا مڑ کر آنے والے کی طرف دیکھا اور اس عجیب و غریب وضع قطع رکھنے والے مرد کو دیکھ کر جہاں اس کے چہرے کا رنگ اڑا وہیں وہ گھٹ ویاں سے بھاگی لگی تھی۔ سیدی اس طرف جہاں سے اسے دادی ایک کمرے سے نکلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔
”کون ہو تم دونوں۔۔۔؟ یہاں کیا کر رہی ہو؟“ آنے والا مرد لمبے لمبے ڈگ بھرتا ان کی طرف لپکا تھا۔

”اے خدا کی مارتھ پر کلمو ہے۔۔۔ کیا قہر بن کر ٹوٹے پڑے ہو۔ دھیرج سے بات نہیں کر سکتے کیا۔ بچی کو ڈرا کر رکھ دیا خوا خواہ۔“

دادی نے لرزنی کا پتی بچی کو بانہوں میں سمیٹنا جو خوف کھائی آنکھوں کے ساتھ اس مرد کو دیکھ رہی تھی جس کے پھپھڑی بالوں میں برابر کی سیاہی اور سفیدی آپس میں گھل مل گئی تھی۔ وہ اپنے پورے قد سے کھڑا ہونے کے بجائے جھکا کھڑا تھا۔ اتنا کہ وہ پانچ فٹی دادی کے بالکل برابر ہو گیا تھا اور سب سے

حسہ آپا اس کا سر تبا جائزہ لیتے ہوئے برابر بیٹھی تھیں۔
 ”اے حسہ! تم نے بتایا نہیں، تمہارے کتنے بچے ہیں۔۔۔؟“ دادی نے فطری تجسس کے تحت

پوچھا۔

”چار بیٹے ہیں ماشاء اللہ۔“
 وہ دادی پوتی اس کے آگے کی تفصیل جاننے کی منتظر تھیں مگر حسہ خاموش ہو چکی تھیں۔
 ”اور بیٹیاں؟“

”کوئی نہیں اماں۔۔۔ بس بیٹوں سے گھر بھرا ہے۔“
 ”ہائیں۔۔۔!“ دادی نے کڑبڑا کر بخت آور کو دیکھا جس کی آنکھیں شرتا غر با حرکت کرنے کے
 ساتھ ساتھ دادی کو بھاگ چلنے پر اکسارہی تھیں۔

”اے حسہ! پانی تو پلاؤ ذرا۔۔۔“ دادی نے خشک گلے پر ہاتھ پھیرا۔ حسہ کے چار جوان جہان
 بیٹے ان کی نگاہوں کے سامنے آکر اوہم مچانے لگے تھے۔

”کبڑے میاں! ذرا پانی تولانا۔ اور چائے کا پانی چولہے پر رکھ دو۔“ حسہ نے آواز لگائی۔
 ”چائے کا تکلف نہ ہی کیجئے۔“ اس نے مروتا کہنا چاہا مگر دادی کی کہنی اس کی پسلی میں کسی میزائل
 کی طرح لگی تھی۔

”نہیں بھئی، اگر وہ چائے پلانا چاہ رہے ہیں تو تمہیں کیا اعتراض ہے؟“
 دادی کا ندیدہ پن اسے ہمیشہ ہی چلو بھریانی میں ڈوبنے پر مجبور کرتا تھا مگر اب وہ صرف اپنی پسلی
 سہلا رہی تھی کہ اس کی تو مروت بھی باعث افزائش ”درد“ ہی ثابت ہوئی تھی۔
 ”ویسے اماں بی! ایک بات کہوں۔۔۔؟ برا مت ماننا۔۔۔ جوان لڑکی کو اب تک گھر میں بٹھائے
 رکھا۔ اچھا ہوتا کہیں دو بول بڑھو ادیتیں، تمہاری ذمہ داری تو ختم ہوئی۔“ وہ بغور اس کا جائزہ لے رہی
 تھیں، بخت آور پہلو بد لئے لگی۔

”ہاں بھئی! دادی کی عزت سے گھر میں۔۔۔ پوتی جائے بھاڑ میں۔۔۔“
 شربت سے بھرا گلاس اس کی نظروں کے عین سامنے آ گیا تھا۔ اس نے چپ چاپ گلاس تھام لیا
 اور اس کی ٹھنڈک کو اپنی ہتھیلیوں میں جذب کرتے ہوئے کن اکھیوں سے دادی کو دیکھنے لگی۔

لی جس قدر طے، شب ماہتاب میں شراب
 کے مصداق غنا غٹ گلاس پہ گلاس چڑھائے جا رہی تھیں۔ معلوم نہیں انہوں نے حسہ کی بات سنی
 بھی تھی یا پھر سن کر نظر انداز کر دی تھی۔ اس نے لمبی سی سانس کھینچتے ہوئے گلاس لبوں سے لگا لیا۔

☆☆☆

صبح کی دائیں دیوار کے ساتھ چھوٹے سے کمرے کا دروازہ ہنر رنگ کا تھا۔ جسے غلت میں کھول
 کر اس نے قدم اندر رکھا تو غراب سے گھٹنوں کے بل کمرے کے فرش پر جاگری بغیر کوئی آواز نکالے۔
 کیا ہوا تھا؟ یہ سوچنے کا اس کے پاس وقت ہی نہ تھا کیونکہ اس کے پیچھے دادی بھی اس کمرے میں
 داخل ہونے والی تھیں۔ وہ تو گرنے کے بعد خود ہی اٹھ جاتی لیکن اگر دادی گرجا میں تو انہیں بس اللہ ہی
 اٹھاتا۔ سواس نے فوراً ہی چیخ کر دادی کو خبردار کیا۔

مجھے مٹانے کے درپے ہے۔

ان دنوں آنکھ کا نور اپنے جوبن پر تھا اور آج۔۔۔

وہی نور میری پلکوں تلے دم توڑنے کو ہے۔۔۔

وہ وقت اور تھا جب زندگی میرا رنگ دیکھا کرتی تھی۔

یہ وقت اور ہے جب میں زندگی کے رنگ دیکھ رہی ہوں۔

ہاں میں وہی ہوں۔ جو ایک بوڑھے، خراث مالک مکان کے دوسرے کے گھر میں گزارہ کرتی
 تھی۔ جس کے ایک کمرے میں، میں نے اپنی دکان کھول رکھی تھی اور اس دکان میں رکھے گئے، آئے،
 والوں اور بچوں کی ٹافوں کی فروخت سے میں اپنا اور اپنی پوتی کا پیٹ پالتی تھی۔

وہ پوتی جو باہر برآمدے کی کرسی پر سر بیہوڑائے بیٹھی ہے اور جو بہت ہی سیاہ بخت ہے۔

وہ جب پیدا ہوئی تھی تو اپنی ماں کو گھائی تھی لیکن اس کے باوجود اس کا باپ اسے بخت آور کہتا تھا۔
 حالانکہ اس نے اپنے باپ کو بھی کھالیا تھا۔ اس وقت جب وہ اسے اسکول میں داخل کروانے کے لیے
 جا رہا تھا اور ایک تیز رفتار گاڑی اسے چل کر چلی گئی تھی وہ پھر بھی زندہ رہی تھی۔

اور پھر بھی۔۔۔ بخت آور کہلاتی تھی۔

اور اب میں اسے کچھ اور سیاہ بختیوں سے بچانے کے لیے اپنے بوڑھے پروں میں چھپائے
 بھاگ نکلی ہوں کہ وہ بوڑھا، خراث مالک مکان کسی کالے نخوس بلے کی طرح ہمارے گھر کی دیواروں پر
 منڈلانے لگا تھا۔

یہ ہے ہمارا تعارف۔ ہم دونوں کی پہچان۔ ہاں ٹھیک ہے دد کی رشتہ داری ہے۔ لیکن ہے تو سہی
 نا۔۔۔ اور اب تو تم یہ نہیں کہہ سکتیں نا کہ تم نے ہمیں پہچانا نہیں۔
 ”ارے سو گئی ہو کیا“ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔

دادی اس پر جھکی ہوئی تھیں، اس نے اپنی بو جھل پلکیں اٹھائیں اور بھاری ہوتا سر جھٹک کر سیدھی
 ہو بیٹھی تھی۔

نیند کہاں آ رہی تھی؟ سوئی بھی نہ تھی۔ بس ایک غبار سا چھا گیا تھا گویا

جب آنکھ کھلی تو نذریاں تھا، نہ سود تھا۔

وہی آسیب زدہ گھر، وہی کبڑے میاں، جواب سارے دھلے دھلائے، خشک کپڑے تاروں سے
 اتار کر انہیں تہہ کر چکے تھے اور اب چیزوں کو اٹھانے، رکھنے کے بہانے پورے گھر میں چکراتے پھر رہے
 تھے۔ ان کے بھاری جوتوں کی دھمک گھر میں پھیلی خاموشی پر خراشیں ڈال رہی تھی۔ اور پچھلے آدھے گھنٹے
 سے مسلسل انہیں جلتے پھرتے دیکھ کر اسے یقین ہو چکا تھا کہ ان کے کاندھوں کے درمیان بچوں کو ڈرانے
 کے لیے فٹ بال نہیں تھا بلکہ جیج کا کلب تھا۔ اونٹ کے کوہان کی مانند۔۔۔

اسے مسلسل اپنی طرف دیکھتے پا کر کبڑے میاں باورچی خانے کے دروازے پر رک کر بیک لخت
 اس کی طرف پلٹے تو وہ فوراً ہی گھبرا کر دادی کی طرف متوجہ ہو گئی جواب حسہ آپا سے اس کا تعارف کروا رہی
 تھیں۔

”یہ ہے بخت آور۔۔۔“

دادی جو اس سے محض ایک قدم پیچھے کھڑی تھیں۔ ہکا بکا سی کمرے کی نیم تاریکی میں اپنی پوتی کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ جواب سے صرف ایک لمحہ قبل ان سے آگے کھڑی تھی اور دوسرے لمبے غائب ہو چکی تھی۔ آواز البتہ بدستور آ رہی تھی۔

”دادی! آگے مت آنا۔“

”کیوں۔۔۔ آگے شیر کھڑا ہے؟“

”نہیں دادی! آگے کنواں ہے۔“ اس نے اپنے زخم گزیدہ گھٹنے سہلاتے ہوئے کمرے کے فرش کو دیکھا جو صحن کے فرش سے کم از کم ایک ڈیڑھ فٹ نیچا تھا اور سیڑھی نام کی کوئی چیز بھی نہ تھی۔ وہ ہائے وائے کرتی بمشکل اٹھی اور اٹھتے ہی دادی کی کمرے لپٹ گئی۔

دادی کسی نوعمر دوشیزہ کی طرح ”ہائیں ہائیں۔۔۔ ارے۔۔۔ ارے“ کرتی ہوئی بری طرح مچلیں مگر اس دوران وہ انہیں صحیح کھانچ کر کمرے کے فرش پر اتارنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

”بیچے سنبھالے اپنا مال۔۔۔“ اس نے اپنے مال و اسباب کی دونوں گھڑیاں دادی کی طرف اچھالیں اور خود چار پانی پر ڈھیر ہو گئی۔

ایک ہی شہتیر پر ڈالا گیا یہ کمرہ اتنا چھوٹا تھا کہ دو چار پائیاں اور ایک چھوٹی سی میز رکھنے کے بعد اس میں کسی اور چیز کے رکھنے کی گنجائش ہی نہ بچی تھی۔

ان کی آمد سے قبل یہ کمرہ ایک اسٹور تھا اور اب جو قدرے معقول حالت میں نظر آ رہا تھا تو وہ سارا کا سارا تانی حسہ کے بیٹوں اور کپڑے میاں کی کارکردگی کی بدولت تھا۔

”دادی! میں تو اب سونے لگی ہوں، اس لیے مجھے تنگ مت کرنا۔“ دادی گھڑیاں کھول کر سامان ٹھکانے لگانے کی فکر میں تھیں سو اس نے پہلی ہی خبردار کیا اور خود دوسرا پاؤ پیٹہ تان کر لیٹ گئی۔ کمرے کے دروازے پر سب دھلے ہوئے تھے لہذا ہلکی سی حنفی جسم کو بہت بھلی لگ رہی تھی۔ اس گھر میں آنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب وہ پرسکون حالت میں تھی ورنہ کل سے تو بہت بے زاری و بے آرامی سہ رہی تھی۔ کل شام جوں ہی تانی حسہ کے چاروں بیٹوں کی گھر میں آمد شروع ہوئی، دادی نے اسے ایک کمرے میں محصور کر دیا۔ وہ تو بعد میں خبر ہوئی کہ کمرہ بھی تانی حسہ کے سپوتوں کا ہی تھا۔ دیواروں پر لگے بڑے بڑے پوسٹرز بھی اسی چیز کی نشاندہی کر رہے تھے۔ کوئی بیٹ پکڑے کھڑا ہے تو کوئی مکا تانے۔ ایک بہت بڑے بن مانس کی تصویر بھی۔

وہ سوچتی رہی۔۔۔ ”یہ جانے کون سے نمبر کا بیٹا ہے؟“

اسی دوران ان کے دو عدد بیٹے بھی اپنا جہیز گرا گئے تھے۔ اپنی دانست میں بہت معصوم بن کر دروازے سے ٹھوکر کھا کر اندر آئے تھے۔ بول نہیں آئے نہیں، بھیجے گئے ہوں اور کمرے میں آکر اس کی موجودگی پر پھر پورا ظہار حیرت۔۔۔ کچھ اس طرح کہ ان کی لاعلمی پر قربان جانے کو دل چاہے۔

”ارے آپ کون؟ اور یہاں۔۔۔؟“

دوسرے والے نے تو حد ہی کر دی تھی۔

”اف! یہ میری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں؟ لڑکی؟

یعنی کہ ایک لڑکی۔۔۔ ہمارے گھر میں۔۔۔ لڑکی۔۔۔؟“

اور اظہار حیرت کے بعد یوں بغیر اجازت اندر آ جانے پر معذرت۔۔۔

صاف صاف بہانہ تھا اس سے بات کرنے کا مگر اس قدر بھونڈی اداکاری کہ اس کا دل کھری کھری سنا دینے کو چاہا۔ پہلا پہلا دن تھا سو خاموش رہی ورنہ منہ کے اندر زبان تو مسلسل بل کھا رہی تھی۔ دادی اسے یوں خاموش بیٹھا دیکھ لیتیں تو مارے حیرت کے بے ہوش ہو جاتیں۔ شکل و صورت کے دونوں معقول تھے، دونوں باری باری اندر آئے تھے۔

”آپ کون۔۔۔؟“ ایک کی آنکھیں ذرا بڑی تھیں اور وہ کجخت آدھی گفتگو آنکھوں کے ذریعے ہی کر رہا تھا۔

وہ چپ چاپ اسے گھورتی رہی۔ جواب دینے کی زحمت نہ کی تو وہ خود ہی اپنا تعارف کروانے لگا تھا۔

”میرا نام شعیب ہے۔۔۔ پیارے پیارے کہتے ہیں۔“ پیار، پرزور دیا گیا تھا۔

”یہ تصویر آپ کی ہے یا آپ کے بھائی کی۔“ اس نے خاصی سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

پیلا صاحب نے پوری توجہ سے پی کیپ لیے ہوئے، کون کھاتے بن مانس کو دیکھا اور پھر ناک کی سیدھ میں جو منہ اٹھا کر بھاگے تو جاتے ہوئے دروازے کے پٹ سے یوں نکلے جیسے اسے ساتھ لے جانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔

دوسرا بڑی بہادری سے آیا تھا۔ بات بات پر مسکراتا شاید اس کی عادت تھی۔ چنانچہ اس بتیسی کی نمائش کرتے ہوئے بخت آور نے اس سے بھی اپنا سابقہ سوال پوچھا تو مسکراہٹ جیسے اس کے چہرے سے چپک سی گئی ہو، اسی مسکراہٹ کے ساتھ وہ دروازے کی طرف لپکا اور جاتے ہوئے اپنی ایک چپل بھی وہیں بھول گیا۔ ذرا سی دیر بعد ایک چھڑی دروازے سے اندر آئی تھی اور چپل گھسیٹ کر لے گئی تھی۔ اسے تو بھگانے کا ٹوکا مل گیا تھا۔ تیسرا آتا تو وہ اس سے بھی یہی سوال کرتی مگر تیسرے کی آمد سے قبل ہی دادی بھاگی چلی آئی تھیں، افتاب و خیزاں۔۔۔

”کم بخت مارے، ایک کے بعد دوسرا۔۔۔ اندر ہی گھسے جارہے تھے۔ کیا کرنے آئے تھے، کچھ کہا تو نہیں تم کو۔۔۔؟“

اف دادی کے سوال و جواب۔۔۔ وہ چڑ گئی۔

”اگر کچھ کہتے، تو کیا اپنے پیروں پر چل کے جاتے وہ۔۔۔ کمال کرتی ہیں دادی آپ بھی۔“

”یہ درمیان والے دونوں مجھے پورے شیطان لگتے ہیں۔ چھوٹا پھر بھی معصوم لگ رہا ہے۔ بڑے کو ابھی دیکھا نہیں۔“ دادی اسے رپورٹ دے رہی تھیں جسے اس نے بڑی غیر دلچسپی سے سنا تھا۔

رات کا کھانا اسی کمرے میں تانی حسہ کے ساتھ کھایا تھا۔ مٹر گوشت اور پھولی پھولی کشمش والی فرنی، دادی کی تو پانچوں گھی میں تھیں اور فرنی سے رغبت دیکھنے کے لائق۔ وہ کھاتے ہوئے دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ دادی کی اس گھر میں واقعی بڑی عزت ہے لیکن یہ خیال بھی چند لمحوں کا تھا۔ ذرا دیر میں ہی معلوم ہو گیا کہ یہ سارا اہتمام ان کے لیے نہ تھا بلکہ تانی حسہ کے بڑے بیٹے کے لیے تھا جو اسلام آباد سے آج رات ہی میں واپس پہنچنے والے تھے۔

”لڑکوں سے کہا ہے کمرہ خالی کرنے کے لیے۔“ تانی حسہ نے اکتائے ہوئے انداز میں بتایا

کہ دوپہر تک وہ تھکن سے بے حال اپنی نیند پوری کرتی رہی۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تو اجنبی ماحول اسے چونکا گیا تھا۔ تب اسے یاد آیا، وہ اپنی تھکاوٹ ختم کرنے کے لیے یہاں لیٹی تھی اور دوپہر کو دادی کے جگانے کے باوجود نہیں جاگی تھی۔ اب جب وہ خود سے جاگی تھی تو دادی اور تھکن دونوں غائب تھیں۔ اس نے چار پانی سے نیچے اتر کر اپنا جوتا تلاش کر کے پہنا اور دوپہر درست کرتی دروازے تک آگئی۔

سہ پہر ڈھل گئی تھی، صحن میں بچھی چار پانیوں پر دادی اور تائی حنہ بیٹھی تھیں۔ دادی سوال کرنے پر آمادہ، تائی حنہ جواب دینے میں متردد۔۔۔

کسی اور کو وہاں نہ پا کر وہ باہر نکل آئی، قدموں کی چاپ پر تائی حنہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، بڑی جانچتی، پرکھتی، ٹولتی ہوئی نگاہ تھی۔ وہ دادی کے پہلو میں سمٹ گئی۔ تب ہی صحن کے آخری کونے میں بنے غسل خانے سے کوئی برآمد ہوا۔ کاندھوں پر پھیلا تولیہ، گھٹنوں تک آبی نیکر۔۔۔ یہ غالباً نہانے کے بعد کا حلیہ تھا۔ وہ بڑی موج میں گنگناتے ہوئے نکلتا تھا لیکن صحن تک آتے آتے ٹھٹھک کر رہ گیا تھا۔

”یہ میرا سب سے چھوٹا بیٹا۔۔۔ احمد۔۔۔“ تائی حنہ نے تعارف کروایا۔

اور وہ چھوٹا بیٹا اتنا چھوٹا بھی نہیں تھا کہ دو اجنبی خواتین کے سامنے نیکر پہن کر آنے پر شرمندگی محسوس نہ کرتا۔ سو وہ پلٹ کر بھاگا اور غراب سے دوبارہ غسل خانے میں گھس گیا پھر گلا پھاڑ پھاڑ کر کبڑے میاں کو لیکارنے لگا، ذرا دیر بعد وہ تھوڑی دیر پہلے کی شرمندگی کے آثار لیے باہر نکلا تو خاصے معقول حلیے میں تھا۔ انہیں ہلکی آواز میں سلام کہہ کر کمرے میں گھسا اور پھر گیلے گیلے بال جما کر کتابیں ہاتھ میں لیے باہر نکل آیا۔

”نیوش پڑھنے جا رہا ہوں۔“ وہ ان کے قریب سے گزرتا باہر کوچیل دیا تھا۔ تائی حنہ کسی کام سے اٹھ کر باورچی خانے کی طرف گئیں تو وہ بھی منہ ہاتھ دھونے غسل خانے کی طرف آگئی۔ باہرنگی تو ایک اور شخصیت دادی کے پاس براجمان تھی۔

سرخی ملایسی شلوار میس، ہلکی سی سرخی لیے ہوئے خمار آلود آنکھیں، کھلتی ہوئی گندمی رنگت، نقوش میں جاذبیت، تائی حنہ کے سب سے بڑے بیٹے تینور حسن۔۔۔

متعارف ہونے پر گرتی پڑتی نظر اس پر ڈالی، بہت بے ضرر سا انداز تھا دیکھنے کا۔ وہ کوئی بزنس شروع کر رہے تھے، اسی بھاگ دوڑ میں نیندیں اڑی ہوئی تھیں۔ آج تڑکے اسلام آباد سے واپسی کے بعد اب تک نیند ہی پوری ہو رہی تھی اور اب جاگے تھے تو دادی کے ہاتھ لگ گئے۔

”کتنا بڑھا ہے؟“

”بزنس کون سا کر رہے ہو؟“

”پیسہ کہاں سے آئے گا؟“

”بخت آور ہر سوال پر پہلو بدلتی رہی۔“

”کیا سوچ رہے ہوں گے وہ بھی۔۔۔؟ بڑھیا جان ہی نہیں چھوڑ رہی ہے۔“

وہ کن اکھنڈوں سے تینور حسن کا جائزہ لیتی رہی۔ اب منہ بگڑا، اب تیوری چڑھی۔ اب جھنجھلائے مگر

تھا۔
”آئے ہائے ان بیچاروں کو کیوں لگا دیا کام سے۔ خواہ مخواہ ہم بن بلائے مہمانوں کو کوستے ہوں گے۔ صبح ہوتی تو ہم دونوں مل کر خود ہی۔۔۔“

دادی نے اس پوری ملاقات کے دوران پہلی عقل مندی کی بات کہنا چاہی تھی مگر انہوں نے ٹوک دیا۔

”سارے گھر کا کٹھ کباڑ کچھ چھوڑا ہے وہاں، آپ کے بس کی بات کہیں تھی اور پھر میرے بچے ایسے نہیں۔ بہت ہاتھ بٹاتے ہیں میرا اور پھر کبڑے میاں ہیں نا، وہ کروالیں گے۔“

ان کا جواب سن کر دادی خاموش ہو رہیں۔ صاف ستھرا کمرہ مل جاتا تو بھلا وہ کاہے کو ناخوش ہوتیں، باہر خوب غل غپاڑا مچا ہوا تھا۔

شور ہنگامہ۔۔۔ بے چنگم قہقہے، چیخ دھاڑ، معلوم نہیں صفائی ہو رہی تھی یا دنگل۔۔۔

بعد میں کبڑے میاں نے آ کر خبر دی تھی۔

”اسٹور روم میں اتنا کچھ بڑا ہے کہ صفائی کرنے کے بجائے خود کشی کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔ تاہم اسے ایک صاف ستھرے کمرے کی شکل دیتے دیتے صبح تو ہو ہی جائے گی۔ لہذا مہمانوں سے درخواست کر دیں کہ وہ آج رات اسی کمرے میں قیام فرمائیں۔“

خبر نامہ ختم ہو گیا۔۔۔ کبڑے میاں اپنی چپل سے فرش کو گھستے واپس لوٹ گئے۔ دادی نے جھٹ سے ایک چار پانی سنھال لی۔ وہ ٹکڑ ٹکڑ کمرے کی ایک ایک چیز اور اومتی ہوئی تائی حنہ کا جائزہ لیتی رہی۔ بیٹھے بیٹھے ٹھٹھک گئی تو بتی بجھا کر دادی کے برابر جا بیٹی۔

”اے لڑکی! دوسری چار پانی خالی ہی تو پڑی ہے۔۔۔“ دادی نے گھر کا۔

وہ مسمانے لگی۔

”پراپا گھر۔۔۔ اجنبی جگہ۔۔۔ پہلی رات۔۔۔ ڈر لگا تو۔۔۔؟“

دادی لکٹی ہی دیر بڑبڑاتی رہیں۔ وہ ہمیشہ اس کے ساتھ سونے سے گھبراتی تھیں کہ وہ ان سے لپٹ کر سونے کی عادی تھی۔ اور دادی کے بھی گد گدی ہونے لگتی اور بھی دم گھٹنے لگتا۔

دادی کو شانت رکھنے کے لیے وہ لکٹی ہی دیر تک چار پانی کے کنارے پردہ کی رہی۔ نیند کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ دادی کے خراٹے چند لمحوں میں ہی گونجنے لگے تھے۔ وہ کچھ دیر چپکی رہی پھر کروٹ پے کروٹ بدلنے لگی حتیٰ کہ دادی نے کسماتے ہوئے اسے ڈانٹ دیا تھا۔

”ڈھنگ سے لیٹ جا۔ کیا کھٹل کاٹ رہے ہیں تجھے؟“

وہ رونہا سی ہو کر چھت کی کڑیاں گننے لگی تھیں۔ باہر سے آوازیں بہت دیر تک آتی رہیں رات میں اگر کبھی اس کی آنکھ لگی بھی تو عجیب و غریب خواب تنگ کرتے رہے۔ کبھی ایک ہی میدان میں کبڑے ہی کبڑے جمع ہو کر قہقہے لگاتے رہے اور کبھی چار مختلف شکلوں کے جن بھوت آکر اسے ڈراتے رہے، اسی عالم میں صبح ہوئی۔ وہ منہ ہاتھ دھونے کے بعد دوبارہ اسی کمرے میں جا کھسی تھی۔ ناشتے کے بعد لوگ اپنے اپنے کاموں پر روانہ ہوئے تو تائی حنہ نے انہیں ان کے کمرے کی راہ دکھائی جو اگرچہ بہت چھوٹا تھا مگر اس کی نیم تاریکی میں پھیلی ٹھنڈک اور صاف ستھرے بے شکن بستر نے ایسا سکون پہنچایا تھا

وہاں کمال کا صبر تھا۔ ہر سوال کا تفصیلی جواب، کوئی پریشانی، کوئی جلدی نہیں، بکھرے لہجے بالوں میں انگلیاں چلاتے، ہونٹوں پر مسہم مسکراہٹ سجائے۔

”اب تک یوں ہی پھر رہے ہو یا۔۔۔؟“ دادی کا لہجہ معنی خیز تھا وہ تلبس سر پہیٹ کر رہ گئی۔ سخت بری لگتی تھی دادی کی ٹوہ لینے کی عادت مگر دادی نے باقی عادتوں سے کہاں جان چھڑائی تھی جو اس کے برا لگنے پر اس عادت کا پیچھا چھوڑ تیں۔

تینور حسن ذرا چونکے، پھر مطلب سمجھے۔
”جی۔۔۔ منگنی ہو چکی ہے۔“

”چلو۔۔۔ قصہ ختم۔۔۔“ بخت آور نے سکون کا سانس لیا۔ دادی کی بولتی بند ہو گئی۔ بھلا اب پوچھنے کو باقی کیا رہ گیا تھا۔ اسے دادی کا منہ دیکھ کر ترس آنے لگا۔

جھریوں زدہ چہرہ، لٹکا ہوا، مایوس، آنکھیں فضا میں لکھی کسی نادیدہ تحریر کو پڑھنے لگی تھیں، اس نے بے اختیار ہی اٹھ کر ان کا منہ چوم لیا۔ ساری فکر مندی اسی کی ذات کے لیے تھی۔ اسے اپنا آپ ایک بوجھ سا محسوس ہونے لگا تو اٹھ کر کمرے میں چلی آئی۔

”کھانا لے آؤں یا چائے؟“

وہ اپنا بستر درست کر رہی تھی جب کبڑے میاں بوتل کے جن کی طرح کھلے دروازے میں نمودار ہوئے۔ پوچھنے کا انداز ایسا تجلّت بھرا تھا گویا جان چھڑانے آئے ہوں۔

وہ ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گئی۔ ٹھنڈا کھانا کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ گرم کرنے کی زحمت نہ دینا چاہتی تھی سو چائے کا کپڑا ڈالا۔ پھر یاد آیا، سفر کے دوران بسکٹ خریدے تھے جو کھائے بغیر یونہی گھڑی میں رکھ چھوڑے تھے۔

”چلو، کچھ تو بھوک مٹے گی۔۔۔“ وہ اٹھ کر الماری میں رکھی چیزوں کا جائزہ لینے لگی تھی۔

☆☆☆

مہینہ بھر ہو چلا تھا یہاں رہتے ہوئے مگر معمولات تھے کہ جوں کے توں۔۔۔ ایک کمرے میں پڑے پڑے جی ادب گیا۔ ماشاء اللہ لڑکوں سے گھر بھرا ہوا تھا۔ ایک آتا تو دوسرا جاتا۔ کبھی ان کی موجودگی میں کمرے سے باہر نکلتی تو تائی حنہ کے تیور بدل جاتے۔ دادی الگ گھیرائیں۔ وہ جھل ہو کر دوبارہ کمرے میں گھس جاتی۔ مگر کب تک؟ جی چاہتا سب چھوڑ چھاڑ یہاں سے بھاگ نکلے۔ ایک روز زیادہ ہی اکتاہٹ محسوس ہوئی تو تنگ آ کر۔۔۔ سب بھول بھال کر کمرہ چھوڑ کر باہر نکل آئی۔ ناشتے کے بعد سب لوگ اسکول، کالج کے لیے نکل چکے تھے۔ کبڑے میاں جھاڑو لے کر کمرے میں گئے تو وہ بھی ان کے پیچھے ہی گھس گئی۔

اتنے دن ہو گئے تھے یہاں رہتے ہوئے، سب دیکھ رہی تھی۔ تائی حنہ بہت کام کرتی تھیں مگر اس کے باوجود سب کام نہیں کر سکتی تھیں۔ خصوصاً صفائی ستھرائی کے معاملات تو سب کبڑے میاں کے ہاتھ میں تھے۔ ہفتے بھر بعد جی چاہتا تو جھاڑو اٹھا کر کمروں میں گھس جاتے، ہر طرف گرداڑاتے۔ چینیلیں مارتے اور باہر آ جاتے۔ چار پائیوں، پلنگوں کے نیچے دھول مٹی سب جوں کا توں، ان کے نیچے گھسنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ان کا کوبان تھا اور چار پائیاں اٹھانے کی زحمت وہ خود سے نہیں کرتے تھے۔

کبھی زیادہ ہی صفائی کا شوق ہوتا تو شعیب اور منیب اٹھ کھڑے ہوتے خوب ہا ہا کار بچتی۔ ایک ایک چیز کی صفائی دھلائی اور پھر دونوں میں سب برابر۔ ایک دم ویسے کا ویسا۔ سو اس روز وہ آنکھیں اور کان دونوں بند کر کے میدان عمل میں کود گئی تھی۔

کبڑے میاں نے اسے دیکھ کر برا سا منہ بنایا مگر اس کا منہ ان سے زیادہ بگڑا ہوا تھا۔ موٹے موٹے ہونٹوں اور پیلی پیلی گدلی آنکھوں والا یہ شخص اسے قدرت کی کوئی بھیا تک سی غلطی لگنے لگا تھا۔

”اگر آپ کو گھرائی کرنی ہو تو پھلے سے کھڑے رہیے ورنہ آپ کی ضرورت ہر گز نہیں ہے۔“

اس نے جھاڑو ان کے ہاتھ سے چھین لی۔ سر منہ دوپٹے سے لپیٹ کر جھاڑن ہاتھ میں لے کر وہ تن وہی سے مصروف ہو گئی تھی۔ ہاتھ پیر توڑ کر مرفت کی کھاتے رہنا اسے منظور نہ تھا۔

جو لوگ ہمارے قیام و طعام کا ذمہ اٹھائے ہوئے ہیں انہیں بھی تو ہماری ذات سے کچھ فائدہ ہو۔“ اس نے سوچ لیا تھا۔ سو دیواروں، چھتوں سے جالے صاف کیے۔ بستر جھاڑے، چادریں، غلاف دھوئے۔ پلنگوں کو دھوپ لگوائی۔ بند الماریوں کو ہاتھ بھی نہ لگایا۔ کھلی الماریوں کی ایک ایک چیز جھاڑ پونچھ کر ترتیب سے رکھی۔ فرش پہ جھاڑو کے بعد دو، دو تین بار پوچا لگایا۔ فرنیچر جھاڑا۔ دروازے کھڑکیوں کو رگڑ ڈالا۔ شام تک دونوں کمرے صاف ستھرے، چمک دار اور دیکھنے والوں کو حیرت زدہ کر رہے تھے۔ خود وہ دھول مٹی سے اٹ کر بھوت لگ رہی تھی۔ سونہا دھو کر خود کو ما بھار گڑا۔۔۔ اور برآمدے سے الم غلم سمیٹ کر دوبارہ اپنے کمرے میں جا گھسی۔

تائی حنہ سب دیکھ رہی تھیں۔ منہ سے اچھا، برا کچھ نہ پھوٹیں۔ دادی خوش تھیں بلکہ بہت خوش تھیں پونی کی کارکردگی پر۔۔۔ وہ چاہتی تھیں اسی گھر میں بخت آور کا ٹھکانہ بن جائے مگر بخت آور تائی حنہ کے لیے دیے انداز دیکھ رہی تھی۔ وہ خوش فہم نہ تھی، اپنی حیثیت جانتی تھی۔ یہ سب اگر کیا تھا تو کوئی مقصد، کوئی پلاننگ نہ تھی اس کی۔

شام کو لڑکے واپس آئے تو حیران پریشان۔

”جادو کی چھڑی گھمائی ہے کیا؟“

”کسی پری کا کارنامہ ہے۔“ قیاس آرائیاں، جگت بازی، شعیب اور منیب دونوں مزہ لے رہے تھے۔

”اماں نے ڈپٹی نذیر احمد کا کوئی ناول پڑھ لیا ہوگا۔“

”کبڑے میاں کو سلیقہ مند بننے کا شوق چرایا ہوگا۔“

یہ سب تائی حنہ کے سامنے کی باتیں تھیں۔ ادھر وہ منظر سے نہیں، ادھر انہیں یاد آنے لگا۔
”ارے لڑکی!“

”ہاں۔۔۔ ہاں، یقیناً لڑکی۔“

”اب پتا چلا ہمارے گھر میں ہے آئی اک لڑکی۔“

”اسی کا کارنامہ ہے۔“

”واہ، واہ شکر یہ، نوازش، کرم، مہربانی۔“ بلند آواز میں راگ الاپا جا رہا تھا۔

وہ سب سنتے ہوئے بھی انجان تھی۔

”کیا ہوتا جو ہماری بھی کوئی بہن ہوتی۔ یوں چھپ چھپ کر کمروں میں نہ بیٹھتی۔“ احمد کی حسرت بھری آواز سن کر اس کا دل بھر آیا۔

”آہ! کیا ہوتا۔۔۔ جو میرا بھی کوئی بھائی ہوتا۔ اس کے لاڈ اٹھاتے، ناز و خیرے برداشت کرتے، دھڑلے سے اس کی چیزوں کو چھیڑتے۔ کمرے کو سنوارتے۔ وقت گزرتا وہ ہوتا تو یوں کسی کے گھر میں کچا ہے کو پڑی رہتی۔ کیوں میں اور دادی چوروں کی طرح چھپتے پھرتے۔“ وہ نیکے میں منہ چھپا کر رو دی تھی۔

☆☆☆

باورچی خانے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چولہے ٹھنڈے پڑے تھے۔ تائی حسنہ کی ”ہائے“ البتہ کبھی گھبراہٹ دے جاتی تھی۔ رات انہیں ہلکا ہلکا بخار تھا، اب ناشتا بنانے کی ہمت ان میں نہ تھی۔ سو بازار سے ناشتا منگوانے کا پروگرام بن رہا تھا۔ کمرے میں بیٹھی ساری صورتحال سے باخبر بخت آور کو غصہ آ گیا۔

”دیکھ رہی ہیں آپ؟ یہ عزت ہے ہماری، آپ کے یا میرے ہاتھ کا پکا کھانا نہیں کھا سکتے یہ لوگ۔“

”ارے واہ۔۔۔ مہمانوں کو کون زحمت دیتا ہے؟“

دادی جیسی خوش فہم وہ کہاں؟ فوراً تنک کر بولی۔

”مہمان نہیں بلائے جان سمجھتی ہیں وہ ہمیں۔ ڈر ہے انہیں کہ اس گھر کے لوگوں میں گھل مل کر اس گھر کے معاملات میں دیخل ہو کر ہم ہمیشہ کے لیے یہاں نہ رہ جائیں اور میں آپ سے کہہ رہی ہوں دادی! آپ ان لوگوں سے کہہ کر جلد از جلد کسی چھوٹے موٹے کرائے کے مکان کا بندوبست کروالیں۔ میں ایسی ذلت زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتی۔“ وہ دوپٹے کی بکلی مار کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

”ہونہ چھوٹا مونا کرائے کا مکان، دماغ خراب ہے اس لڑکی کا۔ بھول گئی ہے کہ مکان ہمارے پاس پہلے بھی تھا اور اسے کیوں چھوڑنا پڑا۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں، مجھ بڑھیا کا کیا ہے۔ خود اس کی ذات کا دھڑکا لگا رہتا ہے مجھے۔۔۔“ دادی گروٹ کے بل لیٹی خود کلامی کے سے انداز میں بول رہی تھیں۔

بخت آور جلتی جھنکی سیدھی باورچی خانے میں لگی تھی، جہاں تائی حسنہ کبڑے میاں کو ناشتے کی تفصیل سمجھا رہی تھیں۔ اس نے جاتے ہی پرات میں آٹا نکالنا شروع کیا تو تائی حسنہ کے ماتھے پر کئی بل ایک ساتھ بڑ گئے۔

”کیا کر رہی ہو؟“

”آٹا گوندھ رہی ہوں۔“

تائی حسنہ اس دیدہ دلیری پر اس کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔ تب وہ ان کی طرف پلٹی۔

”گھبرا کیوں رہی ہیں؟ چرانے چھپانے کی عادت نہیں ہے مجھ میں۔“ قبضہ کرنے“ یا کچھ ”چھین“ لینے کی حسرت بھی نہیں ہے۔ معدے کے ذریعے دل میں اترنے کا راستہ بھی نہیں آتا۔ اس لیے ایسا کوئی خیال آپ کے دل میں ہے تو بھی تو اسے نکال دیجئے۔ آپ کے رحم و کرم پر پڑے ہیں، مانگے مانگے کا کھاتے ہیں۔ اس میں ہماری خوشی نہیں تقدیر کا چکر ہے۔ جن لوگوں کی انا، عزت نفس،

وقار سب زمانے کے ہاتھوں مجروح ہو چکا ہو ان سے خوف نہیں، ان پر ترس کھایا جاتا ہے۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ آپ مجھ سے ناشتا بنانے کا کہہ سکتی تھیں مگر آپ نے نہیں کہا۔ میں اچھوت نہیں۔ احمد اللہ مسلمان ہوں۔ صبح و شام اللہ کا نام لیتی ہوں۔ کبھی ہاتھ دھوئے بغیر لقمہ نہیں توڑا۔ ناخن بڑھانے کے شوق میں میل پکیل جمع رکھنے کی عادت بھی نہیں کہ آپ کو الم غلام کھلا دوں۔ آج در بدر سہی لیکن گھر میں رہنے بسنے کا سلسلہ ہے مجھ میں، آپ اعتبار تو کیجئے۔“ اس کی آواز بھر گئی۔

”تو یہ کتنا بولتی ہے یہ لڑکی۔۔۔“ کبڑے میاں بڑ بڑا کر باہر نکلے مگر ٹھٹھک گئے۔ خبر ہی نہ ہوئی تھی کہ تیور حسن دروازے پر آکھڑے ہوئے تھے۔ ساری بات سن چکے تھے اسے رنجیدہ ہوتے دیکھ کر آگے بڑھ آئے تھے۔

”بس باتیں ہی بناتی آتی ہیں یا ناشتا بھی بنا سکتی ہو؟“ ان کا لہجہ ہلکا ہلکا سا تھا۔

”اور ایسی بے وقوفی کی باتیں آئندہ مت کرنا۔ تمہاری طرح پٹر پٹر بولنا مجھے نہیں آتا لیکن اتنا سن لو کہ تم اس گھر کے فرد کی طرح ہو، باعزت، باوقار۔۔۔ ترس کھائے جانے والے لوگ کم از کم تم جیسے نہیں ہوتے۔ بے نا امان!“

”وہ تصدق چاہ رہے تھے۔ تائی حسنہ کم صم بیٹھی تھیں۔ بخت آور جھوٹ نہیں کہہ رہی تھی۔

انہیں شروع سے ڈر تھا، لڑکی معصوم بھی ہے، پرکشش بھی۔ کسی بیٹے پر قابو نہ پالے۔ ایک پر بھی قبضہ جہاں تو ان کی راجدھانی خطرے میں پڑ جائے گی۔ مملکت تقسیم ہو جائے گی نہ بھی ہوئی تو بڑھیا کے مر مر اجانے پر لڑکی مستقل ان کی ذمہ داری بن جاتی۔ سوچ رکھا تھا جلد ہی انہیں کوئی اور بندوبست کرنے کو کہہ دیں گی۔ اتنی دور کی رشتہ داری تھی۔ انہیں کیا پڑی تھی در دوسر مول لینے کی مگر آج تو بخت آور نے انہیں اپنی ہی نظروں میں شرمندہ کر دیا تھا۔ وہ وہ بیٹی خاموشی سے اسے دیکھتی رہیں۔

بڑی نفاست سے آٹا گوندھ رہی تھی۔ ذرا سا آٹا ادھر ادھر نہ گرایا۔ تو اچو لہے پر چڑھایا اور جھٹ پٹ پٹ پٹ بنانے لگی۔ پتلے پتلے گول پراٹھے بے حد نرم۔

احمد ہمیشہ ان سے ایسے پراٹھوں کی فرمائش کرتا تھا مگر انہیں پراٹھے کی عادت تھی۔ بمشکل آدھا کھایا جاسکتا تھا۔ بخت آور آلیٹ بنا رہی تھی۔ ہلکا ہلکا براؤن، پھولا پھولا سا۔

کبڑے میاں بار بار مداخلت کر رہے تھے۔ بخت آور چڑ گئی۔

”یہ کام آپ کے کرنے کا نہیں، مجھے سب بنانا آتا ہے۔ آپ جائیے یہاں سے۔“

کبڑے میاں نے پہلے ناگواری سے اسے دیکھا اور پھر سر جھٹک کر باہر نکل گئے۔

وہ اپنی دھن میں لگی رہی، تائی حسنہ کن اکھیوں سے تاڑتی رہیں۔ غصہ کی پھر تیلی تھی وہ، اور پھر عمر کے اس حصے میں تھی جہاں اٹھنا بیٹھنا، ہلنا جلنا کار دشوار نہیں ہوتا۔ سب کام منوں میں ہو جاتا ہے اور باہمی نہیں چلتا۔

ذرا دیر بعد کبڑے میاں پھر بھاگے چلے آئے۔

فلاں کے لئے ناشتا، ڈھمکاں کے لیے چائے۔

بخت آور نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ انہیں ہر کام میں دخل دینے کی عادت تھی، اب کون بار بار ان کے منہ لگے۔ اس نے اپنا کام مکمل کیا۔ برآمدے میں چھوٹی سی گول میز پڑی تھی اس کی کرسیاں

سارا دن یہاں سے وہاں بکھری رہتیں۔ رات کوئی وی کے سامنے، صبح استری اسٹینڈ کے پاس، دوپہر کو کمرے میں، شام کو کچن میں۔
بخت آور کے کہنے پر کبڑے میاں نے کرسیاں میز کے گرد لگائیں۔ اور خود فرش کو گھستے ڈیوڑھی میں جا بیٹھے۔

بڑی بس اپنی ہی مرضی کیے جا رہی تھی۔ پہلے ہر طرف سے آوازیں گونجتیں۔
”کبڑے میاں! بھاگ کے گرم گرم پراٹھا لائیے گا، آج بس چھوٹی کھجور تھی۔“
کوئی پکارتا۔ ”کبڑے میاں! چائے ٹھنڈی تھار، مانو برف جیسی۔۔۔ گرم کر لائیے۔“
”کبڑے میاں! آج بھی چلیں، ایک چکنی نمک کی ضرورت تھی۔ آپ کان کھودنے لگے کیا؟“
ہر طرف ایک ہی نام کی گونج، ایک ہی پکار۔ رات کا کھانا ہو، صبح کا ناشتایا شام کی چائے، وہ اپنے نام کی تکرار سنتے، خوش رہتے۔ اپنی اہمیت کا خوش کن احساس جو ملتا تھا۔

”چلو بھی! کسی کے کام تو آرہے ہیں نا“ انہیں اس بھاگ دوڑ میں تسکین محسوس ہوتی اور آج یہ لڑکی میز سجانے پہ لگی تھی۔ سب کچھ سامنے پڑا ہوگا۔ کبڑے میاں کے یاد رہیں گے۔ انہیں بالکل بھی اچھا نہ لگ رہا تھا۔ منہ پھلایے روشندان میں شور مچانی پڑیوں کو کوسے رہے۔
باورچی خانے میں بیٹھی بخت آور نے چند لمحے ان کا انتظار کیا پھر خود ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہاٹ پاٹ، دہی کا پیالہ، اجارہ، آلیٹ میز پر سجانے لگی۔

شعب آئینے کے سامنے کھڑا بال بنانے کے ساتھ ساتھ منہ کے مختلف زاویے بھی بنا رہا تھا۔ تیور حسن کمرے میں اپنی فائل میں کچھ پیرز رکھ رہے تھے۔ احمد اور منیب جرابوں کے جوڑے پہ جھگڑ رہے تھے۔ اسے دھڑلے سے میز پر ناشتا سجاتے دیکھ کر تمام صاحبان ساکت رہ گئے۔ بخت آور نے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ چائے کا تھرماس اور کپ لا کر رکھے۔ پھر چنگیز میں سے دو روٹی روٹیاں کھینچیں۔ ان پر اچار کی پھانٹ رکھی اور دو کپ چائے لے کر اپنے کمرے میں گھس گئی۔
دادی ناشتا دیکھ کر منہ بسور نے لگیں۔ انہیں اچھے دنوں کی یاد آرہی تھی جب ناشتے میں حلوے مانڈے کھانے کو ملتے تھے۔ جب ان کے سر ہانے پڑی میز کو پھلوں اور میوؤں سے خالی نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔

”اور اب کوئی دیکھے۔۔۔ ہا۔۔۔ ہا۔۔۔“
ان کی ٹھنڈی آپس سننے کی عادت تھی بخت آور کو، سونوالے ننگے کے ساتھ ساتھ ان کی ٹھنڈی آپس بھی اپنے اندر اتار رہی کہ اس نے تو ان دنوں کی بس داستان ہی سنی تھی۔ دیکھنا نصیب نہ ہوئے تھے اور اگر ہوئے بھی تھے تو کم از کم اب یادداشت میں محفوظ نہ تھے۔
☆☆☆

”دیدے پھوٹیں کم بختوں کے۔ گھر آئی مہمان ہوں ان ہی کے خاندان سے وابستہ، اتنا بھی لحاظ خیال نہیں۔“
کپڑے نچوڑتے ہوئے وہ خیالوں ہی خیالوں میں شیب اور منیب کی گرونیں بھی مروڑ رہی تھی۔ گالیوں، کوسنوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

کسی یتیم، بے آسرا لڑکی کو اتنا معتبر کرتا ہے۔ یہاں تو اندر باہر سب ایک سے ہیں، چہروں پر معصومیت مگر گھنے، میسنے۔ اس کی نظریں اپنے چہروں پہ محسوس کر کے وہ دونوں گڑبڑا گئے۔

”ہاں بھئی۔۔۔ بازار میں بڑی چیز ہو گئے ہم تو، جس کا دل چاہے نظروں کی مار مارے۔ جس کے جی میں آئے لفظوں کے تیرا چھالے، دل میں درد سا اٹھ رہا تھا، خوب روئے چلی گئی۔ یوں جیسے کسی اپنے کے سامنے دل کے پچھوے پھوڑ رہی ہو۔

”ارے۔۔۔ آپ تو بہت جذباتی ہو رہی ہیں۔ ایسی ویسی کوئی بات نہیں۔ کہ ہم لفظوں کی مار اور نظروں کے تیر۔۔۔ حد ہو گئی یعنی کہ۔۔۔“

شعیب کی تو غیرت پہ تازیانہ بن کر لگی تھی یہ بات۔ شوخی، شرارت سب اڑن چھو۔۔۔ اب تو عزت پہ بن آئی تھی۔ چھوٹی موٹی سی لگتی تھی یہ لڑکی۔۔۔ ایسی منہ پھٹ ہوگی اندازہ کہاں تھا انہیں۔

”آپ کو غلط نہیں ہوئی ہے“ منیب کی پیشانی عرقِ ندامت سے تر تھی۔

”وہ تو بس آپ اتنے دنوں سے ہم سے لالعلق رہیں تو ہمیں اچھا نہیں لگا تھا۔ ورنہ آپ تو ہماری بہن جیسی ہیں۔“ منیب کے برادرانہ جذبات اندے چلے آ رہے تھے۔

”بالکل سچی بہن جیسی ہے ناں، بیسے۔۔۔“

”ارے واہ، جب ہماری کوئی بہن نہیں۔۔۔ تو بہن جیسی کیوں؟“ اس کی کوئی کل سیدھی نہیں تھی۔

بخت آور آنسو بہانا بھول کر پٹر پٹر اسے دیکھے گئی۔ کیسا بے مروت انسان تھا، منیب اپنی جگہ شرمندہ ہو گیا۔ میز کے نیچے سے اس کا پاؤں دبایا۔ چٹکیاں کاٹیں۔

”یا گل ہے کیا؟ پہلے نہیں تھی بہن۔۔۔ اب تو اللہ نے دی نا؟“ منیب اسے قائل کر رہا تھا۔

”مجھے دی ہوگی۔“ وہ کندھے اچکاتے ہوئے بڑبڑایا پھر کرسی کھسکا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیا کہہ گیا ہے یہ۔۔۔“ بخت آور کا ماتھا ٹھکنا۔ ٹھیک سے سن نہ پائی تھی مگر منیب نے بھی ٹال دیا۔

”بس ایسے ہی بول رہا ہے۔ آپ جانے دیں اس کو، بس آج سے میں ہوں نا آپ کا بھائی۔

بالکل سگے والا۔۔۔“ منیب دل سے کہہ رہا تھا۔

”ہائے بچی۔۔۔“ بخت آور کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

کیسا مان دیا تھا منیب نے اس کو، وہ تو ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔

شعیب نے ایک نظر ان دونوں کو دیکھا اور پھر سر جھٹک کر دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈالے، گنگنا تا ہوا باہر کی طرف چل دیا تھا۔

☆☆☆

بس آنکھ جھپکنے کی دیر تھی اور کڑا ہی میں سے بھنی ہوئی کبھی غائب۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ سکتے میں رہ گئی۔ کڑا ہی میں چچہ گھمایا۔ خوب الٹ پلٹ کر دیکھا مگر کبھی نہ نادر۔

”یا اللہ۔۔۔ وہ روہا سکی ہو گئی۔

یونہی بے اختیاری نظرِ دادی پر ڈالی۔

”اف۔۔۔ دادی۔۔۔!“ وہ اتنے زور سے چیختی تھی کہ منہ سے گرم گرم بھاپ نکالتی دادی پٹپٹا سی

گئی تھیں۔

”کیا ہو گیا لڑکی؟“

ادور لڑکی بے چاری کیا بتاتی بس سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ وہ پچھلے آدھ گھنٹے سے دادی کے منہ سے پن کو تاڑ رہی تھی۔ جب تائی حسنہ یہاں بیٹھی گوشت کے لیے مسالہ تیار کر رہی تھیں اور دادی جو کپ شپ لگانے کے لیے ان کے پاس بیٹھی تھیں۔ گوشت کو دیکھ کر بات بھول گئی تھیں اور آنکھیں تھیں کہ حلقوں سے اہل اہل کر گوشت کی ٹھیلی کو چھو رہی تھیں۔ کچے گوشت پر ان کے منہ سے پن کا یہ حال تھا تو کینے پر شاید آنکھیں ہنڈیا سے چپک ہی جاتیں۔ وہ کتنی ہی دیر تک اس پاس گھومتی رہی، دادی دیکھیں تو انہیں وہاں سے اٹھنے کا اشارہ کر دے مگر دادی کو گوشت کے سوا کچھ اور دکھائی کہاں دے رہا تھا؟ وہ تو تائی حسنہ کو کسی ہمسائی نے اپنی طرف بلوایا اور تائی حسنہ جاتے جاتے کھانا پکانے کی ذمہ داری اسے سونپ گئیں۔

دادی اس موقع سے فائدہ نہ اٹھاتیں تو ”دادی“ کیونکر کہلاتیں۔

اور بخت آور اگر صدمے کے عالم میں منہ پھلائے بیٹھی تھی تو صرف احمد کے واسطے۔۔۔ نویں کلاس میں پڑھنے والا دھان پان سا احمد کس قدر عزیز ہو گیا تھا اسے، خود احمد بھی دیوانہ تھا اس کا۔ بانی تینوں اس سے بڑے تھے، ایک فاصلہ ان کے درمیان برقرار رہتا۔ یہ تو بخت آور ہی تھی۔ جو اس سے کھل مل گئی تھی۔ دوستوں کی باتیں، پڑھائی پر گفتگو، کرکٹ پر تبصرہ۔۔۔

وہ کام میں مصروف ہوئی اور احمد بولتا رہتا۔ وہ بھی بغور سنتی۔ کبھی خیالوں میں کھو جاتی۔ واپس لوٹی تو احمد کا بیان شد و مد سے جاری ہوتا۔ پھر وہ بخت آور کا خیال بھی بہت رکھتا تھا۔ بھی اسکول کے پیسے بچا کر سوسے لا دیتا، کبھی کبھی بیٹھی املی۔

جواباً بخت آور سے بھی جو بن پاتا کرتی تھی۔ آج اس نے سوچ رکھا تھا پکاتے ہوئے کبھی احمد کے لیے الگ سے نکال لے گی۔ اسے بہت پسند تھی مگر دادی۔۔۔ اس نے دانت کچکچاتے ہوئے دادی کو گھورا۔۔۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اب اپنا بلکہ دادی کا ہی کلیجہ نکال کر بھون ڈالے، احمد کو کتنی مایوسی اٹھانا پڑے گی لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ دادی تو مزے سے اٹھ کر باہر کو چل دیں۔ وہ گوشت پر ہر ادھنیا اور کٹے ہوئے ٹماٹر چھڑکے گئی۔

تب ہی کبڑے میاں چلے آئے۔ سلاڈ کے لیے سبزی لے کر آئے تھے۔ آتے ہی چھری اور پلیٹ اٹھانے لگے۔ اسے معلوم تھا وہ ابھی سلاڈ بنانے لگیں گے سو فوراً ہی ٹوک دیا۔

”سلاڈ میں بنالوں کی کبڑے میاں! آپ چائے پی لیں۔“

اسے معلوم تھا کبڑے میاں ایسے ہزار کام کرنے کے عادی ہیں۔ کبھی سبزی بنادی، کبھی تائی کو مصروف دیکھا تو لڑکوں کے لیے چائے بنادی۔ اوپر تلے کے سب کام تو تھے ہی ان کے ذمے مگر باورچی خانے کے کام کرتے دیکھ کر بخت آور کو ان سے عجیب سی الجھن ہونے لگتی تھی۔ پہلے دن سے وہ اس انسان کو دل سے قبول نہ کر پائی تھی مگر پھر بھی کوشش کرتی تھی کہ اپنے انداز سے اس گریز کو ظاہر نہ ہونے دے۔

اب بھی اس نے عام سے انداز میں کہتے ہوئے سبزیاں اپنی طرف کھسکالی تھیں۔ تھوڑی دیر پہلے تائی حسنہ نے اپنے لیے چائے بنائی تھی۔ ایک کپ بچا تھا۔ بخت آور نے فوراً گرم کرنے کے لیے دیگنی

چولہے پر چڑھادی اور خود سبزیاں کاٹنے لگی۔

کبڑے میاں خاموش اپنی جگہ کھڑے تھے اور اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھ رہے تھے۔ بہت ہلکی سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر آئی تھی اور غائب ہو گئی تھی۔ وہ حیران تھے تھوڑے پریشان بھی۔
”اسے کیسے خیال آ گیا کہ مجھے چائے پی لینی چاہیے۔“

وہ پر خیال نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”یہ لڑکی سب کا بہت خیال رکھتی ہے۔ اللہ نے بڑے اچھے دل سے نوازا ہے اس کو۔“
”آپ برآمدے میں بیٹھیں۔ میں چائے دیں لے آتی ہوں۔“ انہیں سر پہ سوار دیکھ کر وہ جھنجھلا سی گئی تھی۔

کبڑے میاں بغیر کچھ محسوس کیے اپنے ہی خیالوں میں گم باہر چل دیے۔ محسوس بھی کیا کر سکتے تھے ان سے تو وہ اسی لہجے میں کلام کرتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہی سوچ سکتے تھے کہ۔۔۔
”زبان سے ذرا سنگ دل اور کڑوی لگتی ہے لیکن دل۔۔۔“

ذرا دیر بعد وہ چائے کا کپ ان کے سامنے میز پر رکھ گئی تھی۔ کبڑے میاں کی مسکراہٹ رکنے میں نہ آ رہی تھی۔ ایسی عزت سے تو آج تک کسی نے نہیں نوازا تھا انہیں۔ خدمت کرنے کی عادت تھی، کروانے کی نہیں۔ وہ چالیس برس سے اس گھر میں تھے۔ مالک، نوکر کا حساب کتاب نہ تھا۔ کھانا، پینا، اوڑھنا سب ہی گھر کے دیگر افراد جیسا تھا۔ عید شب برأت پر سب کے ساتھ نئے کپڑے بنتے۔ تنگی بڑی تھی میں بھی برابر کے حصہ دار، خواہ کے نام پر کبھی بھی ایک پیسہ اپنی بیٹی کے لیے نہ رکھا تھا۔ خاص خاص موقع پر حسد آواز بردستی کچھ نہ کچھ ختمادیتیں۔ حالانکہ جتنا کام وہ کرتے تھے، چاہتے تو سینکڑوں تنخواہ کے نام پر بٹور سکتے تھے مگر وہ تو الناس گھرانے کے احسان مند تھے۔

رہنے کو گھر، کھانے کو روٹی، سب سے بڑھ کر پیار، محبت کرنے والے لوگ اور کیا چاہیے تھا انہیں۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے۔

”حسنہ آ پاپا جو کولہو کے بیل کی طرح دن سے رات کرتا ہوں تو بس آپ کے احسان کا بدلہ چکانے کی ایک کوشش ہے۔ مگر کیا کروں، آپ کے احسانات بہت زیادہ ہیں اور میری استطاعت بہت کم۔“
یہ ان کی عاجزی تھی۔ گھر کے سیاہ و سفید کے مالک تھے مگر بھی جو خود سے اپنے لیے کھانا نکالا ہو یا چائے، دودھ کی فرمائش کی ہو۔ ہمیشہ حسنہ آ پاپا نکال کر دیتی تھیں۔ بھی ان سے بھول چوک ہو جاتی تو پھر دل بھوکے رہتے۔

حسنہ آ پاپا کو یاد آتا تو انہیں پر چڑھائی کرتیں۔

”اے کبڑے میاں۔۔۔ اوندھانے پھرتے ہو یہاں سے وہاں، ذرا روٹی، سالن اپنے لیے بھی نکال لو تو کیا قیامت ہے۔“

مگر وہ بھی اپنے نام کے بس ایک ہی تھے۔

”یہی بات تو ہے جو مجھے میری اوقات میں رکھتی ہے۔ اوقات بھول گیا تو ہر ایک دل میں کانٹے کی طرح چھپنے لگوں گا۔“ وہ دل میں سوچتے، زبان پر نہ لاتے۔ بس مسکراتے رہتے۔۔۔ اور خدمت میں لگے رہتے۔۔۔ آج یوں میز کرسی پہ بیٹھ کر چائے پی رہے تھے تو عجیب شان اور تفاخر میں گھرے بیٹھے

تھے۔ ہمیشہ دوسروں کا خیال رکھتے تھے۔ آج ان کا خیال رکھا گیا تھا۔

”تیور! ناشتا کر کے جانا۔“

”احمد! دودھ ختم کرو۔“

”شبیب! چائے تیار رہے۔“

”منیب! تمہارے کپڑے نکال دیے ہیں۔“

”یہ کر دیا ہے، وہ کر دیا ہے۔“ عجیب غلامانہ سا انداز تھا ان کا ہمیشہ سے۔۔۔ یوں جیسے وہ بنے ہی اس کام کے لیے ہوں۔

اور۔۔۔ آج ان سے کہا گیا تھا۔

”کبڑے میاں! چائے پی لیجئے۔“

وہ سکون سے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔ دھیمادھیماس عزت و وقار کا احساس۔ یہ ان کی زندگی کی سب سے مزید ارجائے تھی۔

☆☆☆

وہ نہا کر باہر نکلی تو کبڑے میاں سامنے آ کھڑے ہوئے۔

”استری کر دیتے۔۔۔“ وہ شرٹ اس کی طرف بڑھا رہے تھے۔

”کل تک سب کبڑے میاں کی منت سماجت کرتے تھے۔ آج کہتے ہیں، ہمیں استری کرنا نہیں آتا۔“

وہ بھدی سی ہنسی ہنس کر چل دیے۔

بجنت آدور برآمدے میں رکھے استری اسٹینڈ پہ شرٹ استری کرنے لگی۔

”کنکنی دیر لگی کی بجنت آدور۔۔۔؟“

”ہائیں۔۔۔“ وہ ایک بل کے لیے چونکی ایسی بے تکلفی۔۔۔ پلٹ کر دیکھا۔

شبیب گھڑی باندھتے ہوئے کمرے سے نکل رہا تھا۔

”کیسے منہ بھاڑ کر کہہ دیا بجنت آدور۔۔۔ باجی۔۔۔ آ پاپا کہتے زبان دکھتی ہے کیا۔۔۔؟“

آس پاس کوئی نہ تھا، اس نے فائدہ اٹھا کر جھاڑ دیا تھا۔ ایک آنکھ نہیں بھائی تھی اس کی یہ دیدہ دلیری، ابھی تائی حسد یہاں ہوتیں تو آنکھوں ہی آنکھوں میں چھید ڈالتیں اسے۔

”ارے واہ۔۔۔ میرا دماغ خراب ہے کیا؟ اتنی اچھی لڑکی اور۔۔۔“ وہ شرارتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”دماغ نہیں، نیت خراب ہے۔۔۔؟“ اس نے جل کر کہا۔

وہ تہقیر لگا کر ہنس دیا۔ عجیب جاتی قسم کا تہقیر۔

اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ پھر اسے گھورنے لگی۔

وہ بمشکل سنجیدہ ہوا۔

”مجبور مت کرو۔۔۔ جب لگتی ہی نہیں ہو تو کیوں کہوں آ پاپا، باجی۔۔۔“

”احمد اور منیب کیوں کہتے ہیں؟“ اس نے تنک کر پوچھا۔

”مجھے کیا خبر۔۔۔“ اس نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے پھر استری کا سوچ نکالا اور شرٹ اس کے ہاتھ سے بچتی۔

”سچا اور کھرا بندہ ہوں۔۔۔ جودل میں ہے وہی زبان پر۔۔۔ دھوکے فریب کی زبان نہیں آتی مجھے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

”تمہارا مطلب ہے احمد اور منیب دونوں دھوکے باز اور فریبی ہیں؟“ اسے پتے لگ گئے تھے، شمیم نے ٹوک دیا۔

”تو بے کیجئے جو ان کے خلوص پر شبہ کروں۔۔۔ دیوار سے سرنگرا کر مر جائیں گے، میں تو صرف اپنی بات کر رہا ہوں۔“ وہ ہنستا ہوا کمرے میں چلا گیا۔

بخت آدرا ایک ٹک کمرے کے بند دروازے کو دیکھتی رہی پھر ڈھیلے ڈھیلے قدموں سے چلتی اپنے کمرے کی طرف آگئی۔

”عجب بے ہودہ انسان ہے یہ۔۔۔ پتا نہیں کس پر گیا ہے“ اسے غصہ آ رہا تھا شمیم پر۔

”بانی سب تو اتنے اچھے ہیں تیور بھائی سے لے کر احمد تک۔ ایک یہ ہی عجوبہ ہے اس گھر میں، نہ زبان پر کنٹرول، نہ آنکھ پر۔۔۔“ وہ کیلے بال سلکھانے لگی۔

”تیور حسن آتے جاتے اکثر اسے پوچھا کرتے۔

”کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔۔۔“

”کچھ چاہیے تو بتاؤ۔۔۔ واپسی پر لیتا آؤں گا۔“

وہ بتاتی تو کیا، بس اس توجہ پر ممنون سی ہو جاتی۔ ہلکی سی آواز میں، مختصر سا جواب دے کر سامنے سے ہٹ جاتی۔

احمد سے دوستی تو تھی ہی۔۔۔ منیب بھی سادہ سا انسان تھا۔ خیال رکھنے والا، ایک شمیم ہی مسئلہ بننا دکھائی دے رہا تھا اسے۔۔۔ حالانکہ بہت کم مخاطب کرتا تھا اسے، براہ راست بات چیت بھی دانستہ کوشش نہ کرتا تھا مگر جتنی بار بھی سامنے آتا۔۔۔ انداز و اطوار یہی ہوتے۔ سرسری نگاہ ڈالتا تھا اس پر مگر نہایت بھرپور۔۔۔ اس ایک لمحے میں آنکھوں میں جو چمک ابھر آتی تھی وہ اگلے کئی لمحوں تک بخت آدرا کو پریشان رکھتی تھی اور اب تو وہ اپنے اکثر ہی کام کبڑے میاں کے ذریعے اس سے کرداتا تھا۔ وہ بھی مروتا گردیتی۔۔۔ کبھی کسی کام کا بہانا کر کے ٹال دیتی۔ گھر کے باقی افراد البتہ اسے اپنے ذاتی کاموں کے لیے زحمت نہیں دیتے تھے۔

☆☆☆

دادی اپنی بوٹی کھولے تائی حسہ کو ان تبرکات کا دیدار کروا رہی تھیں جو ایک عرصے سے اس بوٹی میں مقید تھے۔ یہ بوٹی سال میں دو چار بار ہی نکلتی تھی اس لیے وہ بھی مارے اشتیاق کے بھاگ کر ان کے پاس آ بیٹھی۔ دادی کے بھاری بھاری زبورات تھے، جن کی چمک دمک آج بھی جوں کی توں تھی۔ سونے کا بھاری گلوبند، پازیب، بالوں میں لگانے کے لیے کلپ، وہ جتنے شوق سے ایک ایک چیز اٹھا کر دیکھتی۔ دادی اتنی ہی بے رحمی سے وہ چیز اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیتی۔

”بڑی قیمتی چیزیں ہیں، تمہیں کیا خبر؟“

”ہاں دودھ پیتی پچی ہوں نا۔“ وہ زبورات چھوڑ کر باقی چیزیں دیکھنے لگی۔

عطر کی خالی شیشیاں تھیں۔ جس زمانے میں دادا نے لا کر دی تھیں، اس وقت یقیناً بھری ہوئی ہوں گی مگر اب تو عرصہ دراز سے ان شیشیوں کو خالی ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کے علاوہ خوب لمبے لمبے پراندے تھے، ہلکے انکوری رنگ کا وہ سوٹ تھا جو بخت آدرا کے ابا نے آخری بار دادی کو لا کر دیا تھا اور دادی نے ان کے مرنے کے بعد یونہی اپنے پاس رکھ چھوڑا تھا سلوانے کی زحمت بھی نہ کی تھی۔ سہرے گوٹے والا سرخ رنگ کا غرارہ جسے دیکھ کر وہ ہر باری طرح چل گئی تھی۔

”دادی! ایک بار پہن لینے دیں۔ صرف ایک بار۔۔۔ دیکھوں تو سہی، کیسا لگتا ہے؟“

اسے گہرے رنگ پسند تھے مگر دادی نے آج تک پہننے ہی نہ دیے تھے۔ اب بھی تختی سے ٹوک دیا وہ منت سماجت میں لگ گئی۔ تائی حسہ اس بچکانہ ضد پر ہنسی رہیں پھر غرارہ اٹھا کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

”کیا ہے اماں!“ بچی کا شوق ہے، پورا کرنے دیں۔“

”یہ ہوئی نابات۔۔۔“ وہ کمرے میں بھاگ گئی۔ غرارہ پہنا، سلیقے سے دوپٹہ اوڑھا۔ الماری سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر لپ اسٹک نکالی۔ گہرے سرخ رنگ کی۔۔۔ تائی حسہ کے کمرے کی صفائی کرتے ہوئے اسے ملی تو تائی حسہ نے اسے ہی دے دی تھی۔

”جب سے تیور کے ابا چل بے، کبھی نگہا نہیں کیا، تم ہی رکھ لو۔۔۔“ اس کے بھی کس کام کی تھی، لے کر یونہی الماری میں رکھ دی۔ آج نکال کر خوب رگڑی ہوئی ہوں پر اور پھر باہر نکل آئی۔ جانے کس رنگ میں تھی۔ گھنٹی، لہرائی، دادی کے سامنے آئی تو انہوں نے انگلی رکھ لی ناک پر۔

”اوئی ماں! یہ ہونٹ کس چیز سے رنگے ہیں؟“

وہ ہٹ گئی، کچھ بات نہ بن پائی تو کھسیانی سی ہو کر یونہی ہنس دی۔ دادی اپنی جگہ مبہوت سی رہ گئیں۔

سرخ دوپٹے کے ہالے میں رنگ تو جیسے کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ شہد رنگ چمکتی آنکھوں سے جھلکتا شرمیلا پن اور بے ساختہ مسکراہٹ۔

دادی ایک لمحے کے لیے تھرا سی گئی تھی۔

انہیں تو خبر ہی نہ تھی وہ کیسا خزانہ ہاتھ میں لیے پھرتی ہیں۔ مٹے مٹے پھولوں والے بے رنگ لباس پہنے، اس سے پہلے وہ کبھی انہیں نظر ہی نہ آئی تھی۔ اور آج۔۔۔ انہوں نے سینے پہ ہاتھ رکھ لیا تھا۔

”کہاں چھپائے پھرتی تھی یہ اتنا حسن، اس سے پہلے کبھی نظر نہ آیا۔؟ ارے یہ سرخ رنگ میں کیا جادو بھرا ہے جو۔۔۔“ وہ حیران تھیں اور کچھ پریشان بھی۔ تائی حسہ کی نظروں میں ستائش تھی اور وہ لاپرواہ، بے نیاز۔۔۔ دادی کے غرارے پر تبصرے کر رہی تھی۔ تب ہی دروازہ پر کھٹکا ہوا۔

دادی برج طرح چوگی۔۔۔ مزانہ آوازیں ڈبوڑھی میں گونج رہی تھیں۔

”اچھا بس اب۔۔۔ بدل کر آ پڑے۔۔۔ جلدی کر۔۔۔ ایک منٹ کی بھی دیر نہ ہو۔۔۔“ وہ غیر متوقع طور پر دھاڑی تھیں۔

”ایک منٹ دادی! ابھی تو۔۔۔“ وہ منمنائی۔ جو ابا دادی نے جو تے کی طرف ہاتھ بڑھا لیا تھا۔

دوسرے ڈاکٹر کے پیچھے بھاگتا رہا۔ منیب ماں کو سنبھال رہا تھا۔ احمد دیوار کے ساتھ شاک کی حالت میں کھڑا کھڑا سب کا منہ دیکھ رہا تھا۔ بڑے بھیا گھر میں اسے سب سے زیادہ پیارے تھے۔
”اگر انہیں کچھ ہو گیا تو۔۔۔؟“ وہ ڈر کے مارے رونا بھی بھول گیا تھا۔

دادی نرموں سے جھٹھڑ رہی تھیں۔

”ہمیں دیکھنے تو دو۔۔۔ ہمارا بچہ ہے کس حال میں؟“

پریشان، بھاگ دوڑ میں مصروف نہیں ان کی بات سننے کی بھی روادار نہ تھیں۔ بخت آور کپڑے میاں کے ساتھ گھر میں رہ گئی تھی۔ جب تک ہاسپٹل سے کوئی اطلاع نہیں آئی وہ مصلے سے نہ اٹھ سکی تھی۔ کپڑے میاں سارے گھر میں بے قرار پھرتے رہے، ان کے ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے۔ کون کون سی دعائیں نہ مانگ ڈالی تھیں انہوں نے۔ شام گئے شیبب آیا تو ان کے استفسار پر بازوؤں میں منہ چمپا کر رو دیا تھا۔ نجانے صبح سے کیونکر ضبط کیے پھر رہا تھا۔

”ارے بتاتے کیوں نہیں کیا ہوا ہے؟“ اسے جھنجھوڑتے ہوئے کپڑے میاں کی آواز پھٹ گئی تھی۔

بخت آور دروازے کا پٹ تھا لے لرزتی رہی۔

”ہمارے تیمور بھیا عمر بھر کے لیے معذور ہو گئے کپڑے میاں وہ کبھی چل پھر نہیں سکیں گے۔“
”آہ۔۔۔!“ دکھ کی لہر، دل کا ٹوٹی چلی گئی تھی۔ وہ مرے مرے قدموں سے چلتی اپنے کمرے میں آگئی۔ کپڑے میاں، شیبب کو لٹاڑ رہے تھے۔

”بے وقوف لڑکے یہ خوشخبری کیوں نہیں سناتے کہ میرے بچے کی جان بچ گئی۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہ زندہ ہے، ہم سب کے درمیان موجود ہے۔ بند کرو رونا دھونا۔ مقام شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی جان بخش دی۔۔۔“ کپڑے میاں کی آواز میں لرزش بڑھتی چلی گئی تھی۔

بخت آور اپنی بے ترتیب سانسوں پر قابو پانی خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی۔ تیمور حسن کے چہرے کی نرم سی مسکراہٹ نگاہوں کے سامنے سے ہٹنے میں نہ آ رہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے بیٹھی رہی۔

☆☆☆

گھر کی دیواروں پر اندھیرا چپکے سے اتر اٹھا اور اپنی اداس نگاہوں سے ایک ایک چہرے کو ٹکٹا رہا تھا۔ رات گئے دادی اور تانی حسنہ کی آمد ہوئی۔ منیب اور شیبب ہاسپٹل میں رہ گئے تھے۔ احمد گھر آتے ہی اپنے کمرے میں گھس گیا۔

تانی حسنہ کی حالت خستہ تھی، آنکھیں رو رو کر سو جھمی ہوئی تھیں۔ دادی بھی مغموم، رہ رہ کر ٹھنڈی آہیں بھرتی رہیں۔ تانی حسنہ کو دلاسا، تسلیاں دیتے تھے کھیں تو اٹھ کر باہر آئیں۔ باورچی خانہ سونا پڑا تھا۔ چولہا ٹھنڈا اٹھا۔

”ارے کھانا دانا کچھ نہیں پکا کیا؟“ انہوں نے قریب گزرتے کپڑے میاں کو مخاطب کیا تو وہ جیسے پھٹ پڑے۔

”ہاں پکا یا ہے۔ حلوہ پوری پکی ہے۔ پلاؤ، زردہ دم پر ہے۔ اے کچھ خدا کا خوف کرو بوڑھی اماں!

”جاری ہوں، جاری ہوں“ وہ تیزی سے پلٹی۔

منیب اور شیبب ایک دم اس کے سامنے آ کر کھڑے تھے۔ احمد کھلکھلا رہا تھا۔

وہ گڑ بڑا سی گئی۔ دادی کی شعلہ انگشتی آنکھوں کے سوا کچھ نظر ہی نہ آیا۔ اپنے ارد گرد گھومتے احمد کو دھکا دے کر پیچھے ہٹایا۔ کمرے کی طرف بھاگی مگر غرارہ پہن کر بھاگنے کی عادت کہاں تھی، پیر کا انگوٹھا پانچ پانچوں میں پھنسا۔۔۔ اور وہ دھڑام سے منہ کے بل زمین پر۔۔۔ ہفت آسمان نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ انواع و اقسام کی آوازیں ہر طرف سے بلند ہوئیں مگر شرمندگی کے مارے بصارت، سماعت سب ختم۔

”ارے پکڑو۔۔۔ اٹھاؤ۔۔۔“ دادی، تانی حسنہ اس کی طرف لپکیں۔ لڑکے اپنی جگہ ساکت مگر کسی کے بھی حرکت میں آنے سے قبل وہ اٹھی اور ایک ہی جست میں کمرے کے اندر، دادی پیچھے بھاگیں۔ اندر داخل ہونے کو تھیں جب دھاڑ سے دروازہ بند ہو گیا۔ ایک بازو کمرے میں اور دادی پوری کی پوری باہر۔۔۔ شور غوغا مچا، دادی کی آہ و بکا سب سے بلند، منیب نے پوری کوشش کی دادی کو کھینٹنے کی مگر دوسری طرف بخت آور انہیں پہنچ کر دروازہ بند کر چکی تھی۔

”یہ کیا ہوا؟“ ماں بیٹے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہے۔

”زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔ خیریت تو ہے نا؟“ وہ باہر کھڑے پوچھتے رہے۔ کتنی ہی دیر بعد دروازہ کھلا۔ دادی برآمد ہوئیں۔

”ہونٹ پھٹ گیا ہے۔ ہاتھ پہ گوڑا اور ناک سو جھمی ہوئی۔“ دادی از حد پریشان۔۔۔ رپورٹ

ان تک پہنچائی اور سر تھام کر بیٹھ گئیں۔

”میری ہی نظر لگ گئی کم بخت کو۔۔۔“ انہیں یقین تھا۔

بخت آور رات تک کمرے سے باہر نہ آئی۔ تیمور حسن اس کی غیر موجودگی کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے۔ تانی حسنہ سے استفسار کیا۔ انہوں نے وجہ بتائی تو فوراً اس کے پاس چلے۔

”ڈاکٹر کے پاس چلو۔۔۔ کہیں گہرا زخم نہ ہو۔“

وہ گڑ بڑا کھٹکھٹ نکالنے لگی میں سر ہلائی رہی۔

”چلو مجھے ہی دکھا دو۔۔۔ کوئی دوائی وغیرہ لگا دوں۔“ وہ بالکل سنجیدہ تھے مگر بخت آور راضی ہی نہ

ہوئی۔

”میں خود ہی لگا لوں گی۔“ تیمور حسن طویل سانس لے کر رہ گئے۔ اس بچکانے پن پر ہنسی بھی آ رہی تھی مگر زیادہ اصرار نہ کر سکے۔۔۔ زخم پر لگانے کے لیے ٹیوب دی اور احتیاط کی تلقین کرتے ہوئے باہر چل دیے۔

☆☆☆

تیمور حسن کا ایک سیڈنٹ ہو گیا تھا۔ یہ اطلاع کسی دوست نے پہنچائی تھی جسے سن کر گھر کا ہر فرد اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا تھا۔ کئی برس قبل ایسے ہی ایک حادثے میں ان کے باپ چل بے تھے، وہی خوف ایک بار پھر سرسوں میں منڈلانے لگا تھا۔ تانی حسنہ نے روز کو اپنا آب بھلا ڈالا۔ جس وقت وہ لوگ ہاسپٹل پہنچے تیمور حسن امیر تنہی وارڈ میں تھے، ملنے کی اجازت تھی نہ دیکھنے کی۔ شیبب زرد چہرہ لیے ایک سے

وجود کا احساس ہوا۔ بے ساختہ ہی گردن موڑ کر انہوں نے ساکت کھڑے سائے کو پہچاننے کی کوشش کی۔ تب وہ سایہ حرکت کرتا ہوا ان کے نزدیک آ رہا تھا۔

”تیور بھائی!“ آواز پہچاننے ہی وہ بے اختیار نظریں چراگئے تھے۔

”ارے بخت آور۔۔۔ تم۔۔۔؟ کمال ہے میں تو بھول ہی گیا تھا کہ۔۔۔“ وہ بات ادھوری چھوڑ کر پھسکی سی ہنسی دیے تھے۔

”تیور بھائی!۔۔۔ آپ ٹھیک تو ہیں نا۔۔۔؟“

بخت آور ان کے قریب آ کر کھڑا ہوا۔ وہ جواب دیے بغیر پردے سے چھن چھن کر آتی روشنی کو دیکھ گئے۔

”آپ فکر مت کیجئے۔ آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے، ہے نا، آج کل تو بہت ترقی کر لی ہے ڈاکٹروں نے۔۔۔“ وہ انہیں تسلی دینے کی ناکام سی کوشش کر رہی تھی۔

”تم مجھے دیکھنے ہاسپٹل نہیں آئیں۔“ انہوں نے دانستہ موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

”آئی تھی ایک روز۔۔۔ آپ سو رہے تھے۔ پورے جسم پر پٹیاں بندھی تھیں۔ بس اس کے بعد دوبارہ جانے کی ہمت ہی نہ ہو سکی۔ لیکن یہاں گھر میں، میں آپ کو بہت یاد کرتی تھی تیور بھیا! گھر بالکل خالی خالی لگتا تھا آپ کے بغیر۔۔۔“

وہ پلٹیں جھپک جھپک کر آنسو روک رہی تھی۔ تیور حسن چپ چاپ کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے لیٹے تھے۔ ان کے پاس کہنے کے لیے گویا کچھ بھی نہیں تھا۔

”میں آپ کے لیے کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔“ وہ ان کی بے توجہی کو نوٹ کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”بیلا بھی نہیں آئی نا؟“ وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولے تو بخت آور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے ٹھٹھکی سی گئی تھی۔

”اتنے بہت سے دنوں میں اس نے ایک بار بھی محسوس نہیں کیا کہ مجھے اس کی کتنی ضرورت ہے۔“ وہ بہت دل گرفتہ نظر آ رہے تھے۔

بخت آور کیا کہتی، بس نظر جھکا کر باہر آ گئی تھی۔

”بیلا کو آنا چاہیے تھا سب سے پہلے، وہ آ کر دیکھتی تو سہی کہ۔۔۔“ تیور حسن کی آنسوؤں سے بوجھل آواز نے بخت آور کو بہت دیر تک اداس کیے رکھا تھا۔

☆☆☆

”وہ بہت ہی بے حس لڑکی ہے یا پھر حد سے زیادہ درد مند۔۔۔ میں جتنی بار بھی ان کے ہاں گیا ہوں۔ اس سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ اس کی امی کہتی ہیں کہ وہ بہت حساس ہے، تیور کو اس حالت میں نہیں دیکھ سکتی۔ اسے ذرا سنبھلنے دو۔ وہ اس حادثے سے بہت زیادہ متاثر ہوئی ہے۔ لیکن بخت آور! اس حادثے نے ہم سے زیادہ تو کسی کو متاثر نہیں کیا ہوگا۔ کیا ہم سب اس لیے کو دیکھنے اور سنبھلنے کے باوجود زندہ نہیں ہیں؟ کیا ہمدردی یہی ہے کہ اس شخص کو تنہا چھوڑ دیا جائے جو اس حادثے میں سب سے زیادہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا ہے۔ تیور بھائی ہر آہٹ پر چونک چونک جاتے ہیں۔ خالہ، خالو کی آمد پر ان

ہمارا کلیجہ منہ کو آ رہا ہے اور تمہیں کھانے پینے کی سوجھ رہی ہے۔“

”آئے ہائے۔ کیا کانوں میں گھسے آ رہے ہو کبڑے میاں۔۔۔ دھیرے نہیں بول سکتے تم۔۔۔ اور حلوے، زردے کیوں پکپکے لگے بھلا۔ ایسی کون سی خوشی دیکھ لی ہم نے۔ میں تو یہ پوچھ رہی ہوں کہ جو بھڑ بھڑ آگ جل رہی ہے خالی پیٹ میں، یہ کیونکر بجھ جائے گی۔ لاکھ صدے جھیلے، صعو بیس سبیں، خوب جانتی ہوں کہ اس دوزخ کو گھرے بغیر چارہ نہیں۔ بھٹلے سے کلیجہ منہ کو آئے، دل دکھ سے بھٹ جائے مگر ٹٹنے بہر، دو، تین چار۔۔۔ آخر کو تو پیٹ روئی مانگے گا نا، پھر اس بے چاری کی بھی فکر کرو جو جھ سے پانی کا گھونٹ نہیں نگل سکی۔“

انہوں نے تائی حسن کی طرف اشارہ کیا۔ کبڑے میاں لا جواب ہو کر بڑبڑاتے ہوئے تیز قدم اٹھاتے وہاں سے چل دیے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد واپسی ہوئی بن کباب کا شاہ پران کے ہاتھ میں تھا۔ دادی تکیے سے ٹیک لگائے اونگھ رہی تھیں، کہا بول کی خوشبو سونگھتے ہی فوراً اٹھ بیٹھیں۔ کبڑے میاں نے کھانا نکال کر سب کے سامنے رکھا اور خود یوڑھی میں چلے گئے۔ رات کے سرد تر سناٹے میں ان کی دکھ بھری آہیں وقفے وقفے سے سب ہی کو سنائی دیتی رہی تھیں۔

☆☆☆

بہت دنوں بعد اس نے تیور حسن کو دیکھا تھا۔ چہرے پر کھنڈی زردی، ماند پڑتی ہوئی رنگت، آنکھوں میں دکھ کا ایک سمندر تیر رہا تھا۔ شیبب اور کبڑے میاں انہیں سہارا دے کر کمرے تک لائے تو تائی حسن انہیں بازوؤں میں سمیٹ کر رو دی تھیں۔

بخت آور آنکھوں میں آنسو بھرے سب کے پیچھے کھڑی تیور حسن کے چہرے پر اتنی اذیت اور تکلیف کو دیکھ کر ہونٹ کاٹتی رہی۔ دادی، تائی حسن کو ڈانٹ ڈپٹ کر باہر لے گئیں، مٹکے کی کتنی عورتیں تیور حسن کو دیکھنے آئی تھیں۔ اظہار دکھ کے مختلف انداز، ایک سے بڑھ کر ایک ہمدرد، تیور حسن آنکھوں پر بازو رکھے چادر اوڑھے لیٹے تھے۔ بے رنگ پانی کی ایک لکیر مسلسل بہتی ہوئی کپٹی کے بالوں میں جذب ہو رہی تھی۔

بخت آور سے برداشت نہ ہو سکا تو قریب سے گزرتے ہوئے شیبب کو بے اختیار ہی پکار بیٹھی۔

”ان سب عورتوں سے کہو، یہاں سے اٹھ جائیں۔ ان کے ہمدردی جتانے سے، ترس کھانے سے تیور بھیا کو دکھ ہو رہا ہوگا۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز کے ساتھ بمشکل کہہ پائی تھی۔

شیبب نے اس کی بات سنتے ہوئے ایک نظر تیور پر ڈالی اور پھر چپ چاپ باہر نکل گیا۔ ذرا دیر میں دادی کتنی جھپکتی آئی تھیں۔

”اے باہر آ کر بیٹھو۔ کیا بچے کے سر پہ سوار ہو گئی ہو۔ ڈاکٹر نے آرام کرنے کو بولا ہے اور تم لوگ ہو کہ بچوں سمیت یہاں کھسی بیٹھی ہو۔ آؤ صغریٰ باہر بیٹھتے ہیں۔ ارے جلیلہ اٹھا لاؤ اپنے بچے کو۔۔۔ خواہ نواہ شور کیے جا رہا ہے۔“

دادی آن واحد میں سب کو لے کر باہر نکل گئی تھیں۔ کمرے میں خاموشی کا احساس ہوتے ہی تیور حسن نے بازو ہٹا کر آنکھیں کھول دی تھیں۔ طویل سانس لے کر دونوں ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں خشک کرنے کے بعد وہ نجانے کیا سوچے جا رہے تھے، جب اچانک ہی کمرے کی نیم تاریکی میں کسی دوسرے

کے چہرے پہ جو امید ابھرتی ہے آن واحد میں بکھر جاتی ہے، میں اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ دل کٹ کے رہ جاتا ہے، ان کی لا چاری اور بے بسی پر۔۔۔ اتنے اچھے تھے ہمارے تیور بھائی، خدا جانے یہ کیسی آزمائش ہے۔

یہ شبیب تھا، بے حد الجھا ہوا پریشان حال، ذرا تنہائی میسر آئی تو اپنی ساری ہمتی بخت اور کے ساتھ بانٹنے لگا تھا۔ نہ جانے کیسا رشتہ بندھ گیا تھا اس لڑکی کے ساتھ، کہیں کوئی بیت تھی نہ پردہ داری۔ بس ایک وہی گریزاں تھی مگر کب تک۔۔۔؟ یوں لگتا تھا ایک ایک کر کے سارے ہتھیار پھینک ڈالے تھے اس نے۔ خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا قسمت کے آسیرے پر۔۔۔

تیور حسن کے ساتھ ہونے والے حادثے کے بعد وہ یوں بھی بہت چپ چاپ اور متعطل سی رہنے لگی تھی۔ پہروں خاموش بیٹھی رہتی۔ شبیب آتا تو دونوں ایک دوسرے سے اپنی اپنی کہہ سن لیتے۔

تائی حسن تو بالکل ہی ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی تھیں۔ گھر میں کیا ہو رہا ہے کیا نہیں، وہ جیسے سب بھلائے بیٹھی تھیں۔ ایک دادی اور کبڑے میاں تھے جن کے جھگڑنے کی آوازیں سے سارا دن گھر گونجتا رہتا۔ دادی، کبڑے میاں سے خار کھاتی تھیں۔ کبڑے میاں دادی سے برگشتہ۔۔۔ دن گزرتے جا رہے تھے۔

☆☆☆

بیلا آئی تھی مگر اتنی خاموشی سے کہ گھر میں کسی کو خبر بھی نہ ہوئی تھی۔ موسم اس روز ابر آلود تھا۔ بخت اور اور دادی نیم تاریک کوٹھڑی میں دبی بیٹھی تھیں۔ کبڑے میاں ڈیوڑھی میں جھلنگا سی چارپائی پر لیٹے، ٹھنڈے ٹھارے لٹاف میں مسلسل کیکپار رہے تھے۔ جب کینوس شوڑ میں مقید پاؤں بغیر کوئی آواز پیدا کیے ان کے قریب سے گزر گئے۔ نم آلود رخ کو پار کرتے ہوئے اس کا رخ تیور کے کمرے کی طرف ہی تھا۔ نیم غنودگی میں لیے حسن نے دروازہ کھلنے کی آواز پر آنکھ کھولی تھی۔

”کون۔۔۔؟ کون ہے؟“ دروازے کے پتھوں بچ کھڑے سائے کو وہ پہچان نہ سکے تھے۔

”میں ہوں۔“

”بیلا!“ بے ساختگی سے اس نام کو وہ ہر آنے میں تیور حسن کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔

”کیسے ہو تیور؟“ وہ ست روی سے چلتی ہوئی ان کے نزدیک آرکی تھی۔

”اب آئی ہو پوچھنے۔ جب سارے زخم بھر چکے ہیں۔ اس وقت کیوں نہیں آئیں جب زخم ابھی کچے تھے اور بے پناہ اذیت میں تڑپتا یہ دل تم سے میحانی کے چاہ بہت شدت سے کر رہا تھا۔“ بہت سے شکوے زبان تک آئے تھے مگر ہونٹ ساتھ نہ دے سکے۔

”میں۔۔۔ میں بہت دنوں سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔“ سرد اور جامد چپ کے بعد وہ بس اتنا ہی کہہ پائے۔

”کیوں میرا انتظار کیوں کر رہے تھے تیور حسن؟“

بہت ہی سادہ سے لہجے میں پوچھا گیا سوال، تیور حسن کی آنکھوں میں ڈھیروں ڈھیروں جھیر جھیر گھبراہٹ تھا۔

”کوئی کسی کا انتظار کیوں کرتا ہے؟“ تیور کی خاموشی ایک ہی سوال کی بازگشت بن کر رہ گئی تو وہ

جیسے جھنجھلا کر بولی تھی۔

”بھی تو بتانے آئی ہوں تم کو۔۔۔ کہ اب میرا انتظار مت کرو۔ میں اس راستے سے قدم موڑ چکی ہوں، جس کے دوسرے سرے پر بھی تم کھڑے تھے۔“

باہر بادل کی آنکھ سے پہلا قطر گر اٹھا اور ڈری سہمی ہوا کا جھونکا کمرے میں آکر کونے کھدرے میں منہ چھپانے لگا تھا۔

مجھے معلوم ہے۔۔۔ میں تمہارے دکھ میں اضافہ کر رہی ہوں۔ جانتی ہوں کہ سب لوگ میرے اس فعلیے پر ناخوش ہوں گے حتیٰ کہ میں بھی۔۔۔ لیکن تیور! تم خود سوچو۔ زندگی ایک اپناج شخص کے ساتھ کیسے گزاری جاسکتی ہے۔“

ٹھنڈ پہلے سے بہت بڑھ گئی تھی۔ تیور کو اپنا جسم کپکپاتا ہوا محسوس ہوا تو وہ کبل میں کچھ اور سمٹ گئے۔

”آج زخم نیا ہے۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے بڑھ کر تمہارا ہمدرد۔۔۔ غمگسار، ہتھیلی کا چھالہ بنا کر رکھا ہوگا تمہیں، لیکن رفتہ رفتہ سب اکتانے لگیں گے تب۔۔۔ تب تم صرف میری ہی ذمہ داری بن جاؤ گے اور میں اتنی بڑی ذمہ داری نہیں اٹھا سکتی۔ میں نے تمہارے ساتھ ایک مکمل، بھرپور زندگی کے خواب دیکھے تھے۔ محبت کی تھی تم سے۔۔۔ اور اس محبت کا دعوا میں آج بھی کرتی ہوں کہ اس محبت سے دستبردار ہونا میرے لیے ممکن نہیں لیکن تمہارے ساتھ زندگی گزارنا بھی تو ممکن نہیں رہے گا تیور! تمہیں آسرا دیتے ہوئے میں خود تھک گئی تو کیا ہوگا؟ مجھے کون سنبھالا دے گا؟ اماں، اماں مجھ پر زور ڈال رہے ہیں تم سے شادی کرنے کے لیے۔ کہتے ہیں ”خدا سے ڈرو، یہ حادثہ تمہارے ساتھ بھی ہو سکتا تھا۔“ لیکن تیور! یہ حادثہ میرے ساتھ ہوتا تو تم اتنے متاثر نہ ہوتے جتنا آج میں ہوئی ہوں۔ تم تو اپنی ضروریات کے لیے محتاج ہو کر رہ گئے۔ میں تم سے شادی کر بھی لوں تو بتاؤ کہاں سے کماؤ گے۔۔۔؟ کیسے کھلاؤ گے؟ زندگی پہلے ہی بہت ٹکھن ہے۔ میں اسے مزید دشوار نہیں بنا سکتی۔“

”بیلا! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ کوئی بہت اچانک کمرے میں داخل ہوا تھا۔ بچ کی آواز کے ساتھ ہی لمحہ بھر میں کمرہ روشنی سے بھر گیا تھا۔

بیلا نے بہت تیزی سے آنکھیں میچ کر آنے والے کی طرف سے رخ موڑا تھا۔ شبیب نے ایک جھٹکے سے اسے موڑتے ہوئے اپنے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔

”کیا کہہ رہی تھیں آپ؟“ وہ متوحش سے انداز میں پوچھ رہا تھا۔ سستے ہوئے چہرے اور سرخ ہونے بھاری پپوٹوں کے ساتھ بیلا ان میں سے کسی کا بھی روشنی میں سامنا کرنے کی ہمت نہ کر پارہی تھی۔

”کون کون سے تیر چلا چکی ہیں آپ اس شخص پر، جسے زندگی کی طرف کھینچ لانے کی جدوجہد ہم دن رات کر رہے ہیں۔“ وہ اسے دونوں بازوؤں سے پکڑے جھوڑ رہا تھا۔

”کوئی تیر نہیں چلایا میں نے۔ حقیقت بتائی ہے، وہ سچ بتایا ہے جو کبھی نہ کبھی اس کے سامنے آنا ہی تھا۔“ تھکے تھکے سے انداز میں اس نے شبیب کے ہاتھ جھٹک ڈالے تھے۔

”کیسا سچ۔۔۔؟“ شبیب خوفزدہ ہو گیا تھا۔ تیور حسن کی آنکھوں میں جلتے آس، امید کے دیے

بجھ گئے تو کیا ہوگا۔ زندگی کیونکر گزر پائے گی۔
بیلا لب بھیجے کھڑی تھی۔ اسے جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکی تھی۔
شعیب تیمور کی طرف لپکا۔

زرد چہرہ، کپکپاتے ہونٹ۔۔۔ ساکت پلکیں۔۔۔ کہیں بہت گہری چوٹ لگی تھی۔
”تیمور بھائی! کیا کہا ہے اس نے آپ سے۔۔۔ تیمور بھائی بولیں۔ مجھے بتائیں اس نے کیا کہا ہے؟“

تیمور کی خاموشی نے اسے دہلا دیا تو وہ چیخ پڑا تھا۔ تب تیمور حسن کی پلکوں نے بس کی، برسوں پرانی نیند سے جاگے ہوئے شخص کی طرح انہوں نے خالی خالی نگاہوں سے پہلے لب پکتی بیلا کو دیکھا اور پھر پریشان حال شعیب کو۔

”یہ کبھی ہے۔۔۔ میں اناج ہو گیا ہوں۔ اپنی ضروریات کے لیے دوسروں کا محتاج اور یہ کہ کسی اناج شخص کے ساتھ زندگی نہیں گزارا جاسکتی۔ کیونکہ زندگی بہت کھن ہے اور۔۔۔“ ان کی سانسیں ایک دوسرے میں الجھ رہی تھیں۔

”بیلا رکیں۔۔۔ میری بات سنیں۔“ شعیب بے اختیار دروازے سے باہر نکلتی بیلا کو پکارنے لگا مگر بیلا رکی نہیں بلکہ قدموں کی رفتار پہلے سے بڑھ گئی تھی۔

”بیلا! آپ اچھا نہیں کر رہیں۔ بیلا پلیز! اس طرح مت کریں۔“
شعیب اس کے پیچھے لپکا تھا مگر تیمور حسن کی خراب ہوتی طبیعت نے اس کو بیلا کا بہت دور تک پیچھا نہیں کرنے دیا تھا۔

تاہم اس کی بلند ہوتی آوازوں نے گھر کے کونے کھدردوں میں دیکے افراد کو ضرور جھنجھوڑا لیا تھا۔ جس وقت سب لوگ وہاں پہنچے، تیمور حسن ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے اور شعیب ان کے ادھ بونے وجود کو بازوؤں میں بھیچے سسک رہا تھا۔

”بہت برا کیا ہے بیلا نے۔۔۔ بہت برا کیا ہے؟“
”یا اللہ! کون کون سے صدمے جھیلے گا میرا بچہ۔۔۔“ تائی حسہ وہیں کمرے کی چوکت پر ڈھکی گئی تھیں۔ دادی اور بخت آور ہکا بکا کھڑی تھیں۔

کبڑے میاں ڈیوڑھی میں ماتم کرتے رہ گئے۔
”ارے کٹے پھٹے جسموں کو کیوں دیکھتے ہیں لوگ، دلوں میں کیوں نہیں جھانکتے۔ محبت میں مصلحت کیسی؟ سودو زیاں کا حساب کیونکر۔“

☆☆☆

”اس نے بہت جلد بازی سے کام لیا۔ وہ تھوڑا انتظار تو کرتی۔ میں خود اسے اپنی زندگی سے بے دخل کر دیتا۔ اس دم توڑتے رشتے پر آخری وار اسے نہیں، مجھے کرنا تھا۔“ بہت دنوں بعد تیمور حسن کی چپ ٹوٹی تھی۔

دور بیٹھے کبڑے میاں نے زخمی چڑیا کو پانی پلاتے ہوئے سراٹھا کر انہیں دیکھا۔ کس منت سماجت سے انہوں نے تیمور کو کمرے سے باہر آنے پر آمادہ کیا تھا اور نہ وہ تو جیسے روشنی، اجالے اور کھلے آسمان سے

ہی خوف کھانے لگے تھے۔
”بھول جائے تیمور بھیا! اب اس ذکر سے کیا حاصل۔۔۔“ شعیب ہر قسم کی پریشانی ان کے ذہن سے کھرچ دینا چاہتا تھا۔

”کس قدر کٹھنور لگ رہی تھی وہ اس وقت۔۔۔ ایسا کڑا لہجہ، ایسے بے رحم الفاظ، وہ تو راہ چلتے معذور لوگوں پر ترس کھایا کرتی تھی۔ ان سے ہمدردی کے مواقع تلاش کرتی تھی۔ کیا میرے لیے اس کے پاس ترس کھانے کی بھی گنجائش نہ تھی۔“

تیمور حسن کو اب تک وہ سب ایک خواب لگ رہا تھا۔ شعیب نے کرسی کی پشت سے ٹپک لگائے ہوئے ان کے چہرے پر پھیلی حیرت اور بے یقینی کو دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس بات کے جواب میں اسے کیا کہنا چاہیے۔

”وہ آخری وقت تک مجھ سے محبت کا دغا کر رہی تھی۔ کہتی تھی۔“ تمہاری محبت سے دستبردار ہونا میرے لیے ممکن نہیں۔ شعیب! جن سے محبت کی جاتی ہے ان کے لیرولیر جسم کیوں کانٹوں پر گھسیٹا جاتا ہے؟“

شعیب بے چارگی سے انہیں دیکھتا رہ گیا۔ اس کے پاس ان کے کسی سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔
”بیلا نے اچھا نہیں کیا تیمور بھائی! اس نے ہم سب کو بہت دکھ دیا ہے۔“

”مجھے اس کے فیصلے نے نہیں، اس کے رویے نے دکھ دیا ہے۔ اس نے اپنے جائز حق کا استعمال بہت سفاکی اور بے رحمی سے کیا ہے۔ حالانکہ اپنی رائے مجھ تک پہنچانے کے لیے اس کا میرے سامنے نہ آنا ہی کافی تھا۔ کاش وہ تھوڑا انتظار کرتی اور دیکھتی کہ محبت کرنے والے تعلق توڑنے کا ہنر کس خوبی سے نبھاتے ہیں کبھی کبھی ادھوری کہانیوں کا انجام بھی بہت خوبصورت ہوا کرتا ہے۔“ ان کی گفتگو خود کلامی میں ڈھل گئی۔

شعیب متصل سے انداز میں آسمان پر اڑتے پرندوں کو دیکھتا رہا۔ کبڑے میاں زخمی چڑیا کے حلق میں پانی کا آخری قطرہ ٹپکا رہے تھے۔

☆☆☆

”سمجھ میں نہیں آتا اس گھر کا سنے گا کیا؟ آوے کا آواہی بگڑا ہوا ہے۔“
تیمور نے گردن موڑ کر دیکھا۔ کمرے کی جھاڑ پونچھ کرنی بخت آور سخت جھنجھلائی ہوئی تھی۔ ایک دوپٹے میں بال لپیٹ کر سر پر پگڑی باندھ رکھی تھی۔ دوسرا گلے میں۔ گردوغبار سے الٹی ہوئی اچھی خاصی جھمڈا رہی تھی۔

تیمور حسن نے توجہ ہٹا کر دوبارہ آنکھیں بند کر لیں مگر بڑا ہٹ جاری تھی۔

”کیا ہوا ہے؟“ تنگ آ کر انہوں نے پوچھا۔

”یہی تو میں پوچھ رہی ہوں کہ آخر ہوا کیا ہے، جو سارا گھر اجاڑ، دیران، جنگل بیابان لگ رہا ہے۔ جسے دیکھو منہ پھلائے اور سجائے بیٹھا ہے۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے بڑھ کے دکھی نظر آنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کبڑے میاں ہیں تو انہیں دال سبزی لانے کی فکر نہیں۔ منیب ہے تو وہ سارا دن گھر میں نہیں کھتا۔۔۔ احمد کو تو جیسے چپ ہی لگ گئی ہے اور تائی حسہ ہر بندے سے یوں خفا ہیں جیسے ہر معاملے میں

بس دوسرے ہی خطاوار، قصور وار ہیں۔“ وہ کرسی کھینچ کر دھب سے ان کے سامنے آ بیٹھی تھی۔

”جانتی ہوں میں۔ اس دقت مجھے دیکھ کر آپ کی نفیس طبیعت پر جو جو کچھ گزر رہا ہوگا لیکن کیا کروں؟ دادی کی کھوپڑی ہوئی عینک کل واشنگ مشین میں بڑے میلے کپڑوں کے ڈھیر میں سے برآمد ہوئی ہے۔ میں تو کہہ رہی تھی کہ غلطی سے کپڑوں میں چلی گئی ہوگی مگر انہیں یقین ہے کہ ساری کارستانی کپڑے میاں کی ہے۔ خیر جانے دیجئے اس قصے کو۔ معاملہ تو یہ ہے کہ اب عینک ملنے کے بعد جو انہوں نے گھر کا جائزہ لیا تو شامت کس کی آئی، مجھ مسکین کی۔ آج کے آج گھر شیشے کی طرح نہ چمکایا تو ہو سکتا ہے کل علی الاعلان کسی بچکے کے ساتھ لگی ہوئی پانی جاؤں۔“

”توبہ ہے بخت آور! کتنا بولتی ہو تم؟“ عجیب اکٹایا سا انداز تھا ان کا۔ بخیر۔ جھٹک کر رہ گئی۔

”شکر نہیں کرتے کہ میری سریلی آواز صبح و شام گھر میں سننے کو ملتی ہے۔ اگر میں بھی چپ کا روزہ رکھ لوں، جیسا کہ سب نے رکھا ہوا ہے تو صرف کوؤں کی آوازیں سننے کو ملیں یا پھر کپڑے میاں کے جوتے کی دھمک۔۔۔“ اپنی بات ختم کر کے وہ خود ہی زور سے ہنس دی تھی، بالکل بے مہذب، بے وجہ۔

تیور حسن نے بغور اسے دیکھا۔ اس کی ہنسی میں وہ بے ساختگی مفقود تھی جسے اس سے پہلے وہ ہمیشہ محسوس کرتے تھے۔ صاف ظاہر تھا وہ محض انہیں بہلانا چاہ رہی تھی یا پھر گھر میں بہت دنوں سے پھیلی سوگوار سی فضا کو خوشگوار بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ لمحہ بھر کے لیے مسکرا دیے تھے۔ محض اس کا دل رکھنے کے لیے۔

”ہاں، محسوس تو میں بھی کر رہا ہوں۔۔۔ گھر میں سب لوگ میری وجہ سے پریشان ہیں لیکن میں چاہنے کے باوجود خود کو ابھی اس قابل نہیں کر پایا کہ ہنستے مسکراتے دوسروں کو تسلی دوں۔ انہیں اطمینان دلاؤں کہ میں اس حادثے کے اثرات دل سے قبول کر چکا ہوں اور یہ کہ کسی قسم کا احساس محرومی میرے قریب بھی نہیں پھٹکا۔ ابھی یہ ممکن ہی نہیں میرے لیے۔ میں لاکھ خود کو حوصلہ مند بناؤں لیکن جب جب اماں میرے سامنے آتی ہیں، میری آنکھ اپنے ہی دکھ سے بھر آتی ہے۔ شیب اور کپڑے میاں کو اپنے لیے تکلیف اٹھاتے دیکھتا ہوں تو احساس جرم سادل میں بھرنے لگتا ہے۔ ایک عرصہ لگا تھا مجھے اس قابل ہونے میں کہ اس پورے گھر کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا سکوں لیکن یہ کیا کہ آج میں خود ایک بوجھ بن کر رہ گیا ہوں۔“

تیور حسن کی آواز بھڑا گئی تو وہ لب بھینچ کر خود پر قابو پانے لگے تھے۔

بخت آور اپنی آنکھوں میں آئی نمی کو دھکیل کر بولی تو اس کا لہجہ بہت شگفتہ تھا۔

”اچھا لگا تیور بھائی کہ آپ نے خود کو کوئی غیر معمولی انسان ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ حادثہ اتنا معمولی نہیں کہ اسے چٹکیوں میں اڑایا جاسکے۔ یقیناً بہت ہمت اور حوصلے کی ضرورت ہے آپ کو۔ لیکن ایک بات بتاؤں تیور بھائی! انسان بوجھ اس وقت بنتا ہے جب وہ کسی ذہنی معذوری کا شکار ہو جائے۔ جسمانی معذوری کے لیے ایک چھوڑ گئی سہارا مل سکتے ہیں لیکن اگر آپ ذہنی طور پر منتشر پریشان اور لاچار ہو جائیں گے تب آپ اپنے لیے ہی نہیں دوسروں کے لیے بھی مشکلات پیدا کر دیں

گئے۔ جسمانی سہارا دینا آسان ہے جذباتی سہارا دینا مشکل، اللہ نے آپ کے لیے صرف ایک نعمت جینی ہے۔ دل، دماغ، نظر سب موجود ہے۔ عقل اور شعور ہے جو ہر محرومی کا نعم البدل ہو سکتے ہیں۔ آپ ذہنی طور پر خود کو مضبوط بنائیں تو ابھی بھی آپ اس قابل ہیں کہ اس گھر کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا سکیں۔

کندھے تو ماشاء اللہ سلامت ہیں نا آپ کے؟“

وہ آخر میں شرارت سے ہنسی تو تیور حسن بھی پھٹکی سی ہنسی ہنس دیے تھے۔

”یہ سب باتیں تم کہہ رہی ہو۔ جب کہ میں کسی اور سے سننے کا آرزو مند تھا۔“

”ارے جانے دیجئے۔ بے لحاظ و بے مروت لوگوں کو یاد کرنے میں کون وقت برباد کرے۔“

”ایسا مت کہو بخت آور۔۔۔! اسے حق حاصل تھا کہ وہ اپنے لیے کوئی بہتر فیصلہ کرتی۔“ وہ فوراً اسے نوک بیٹھے تھے۔

”کاش۔۔۔ وہ واقعی اپنے لیے کوئی بہتر فیصلہ کرتی۔“ بخت آور نے پوری سنجیدگی سے کہا تو تیور

سر جھٹک کر مسکرا دیے۔

”ہاں اس گھر کے ہر فرد کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ جانب داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے فیصلے کو غلط قرار دے دے۔ تاہم مجھے اس سے کوئی گلہ نہیں۔“

”اب اگر آپ خود کو اعلیٰ ظرف بنانے پر تلے ہوئے ہیں تو میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“

وہ کندھے اچکانی دوبارہ جھاز بونچھ میں مصروف ہو گئی تو تیور حسن نے مسکراتے ہوئے سائیڈ ٹیبل

سے کتاب اٹھالی تھی۔ بخت آور نے کچھ دقت کے لیے ہی سہی، ان کو مایوس سوچوں سے نجات ضرور

دلا دی تھی۔

☆☆☆

تائی حسہ، منیب اور احمد سمیت تیور حسن کے کمرے میں محفل سجائے بیٹھی تھیں۔ وہ صحن میں بیٹھی پوری توجہ سے تائی حسہ کے دوپٹے پر کروشیے کا کام کر رہی تھی، جب کسی کی نظروں کی تپش نے اسے بے اختیار ہی سر اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ یونہی بے ارادہ وہ بے اندازہ اس نے کپڑے میاں کی طرف دیکھا جو اس سے کچھ فاصلے پر پائش، برش اور جوتے کے کئی جوڑے آس پاس پھیلے بیٹھے تھے لیکن جانے کب سے اپنا کام بھولے بیٹھے تھے۔ اب نگاہیں اس پر جمی تھیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ بخت آور کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔

”یہ کیا ہو گیا کپڑے میاں کو؟“ اس کے ماتھے پر ایک ساتھ کئی تیوریاں ابھریں۔ تب کپڑے

میاں چو سکتے ہوئے بھر پور انداز میں مسکرا دیے تھے۔

”میں سوچ رہا تھا کہ۔۔۔“ وہ کچھ نکلتے کہتے رکے اور پھر سر جھٹک کر رہ گئے۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے ان کا“ وہ جھنجھلا کر رخ موڑ گئی۔

”بخت آور! تم ہم سب لوگوں کا کتنا خیال رکھتی ہو۔“

بخت آور کے تیزی سے چلتے ہاتھ ایک لمحے کے لیے رکے۔

”ہم سب لوگوں کا۔۔۔؟ ہونہر، اچھی خوش فہمی پالی ہے۔“ وہ بولے بغیر اپنا کام کرتی رہی۔

”تمہارے آنے سے گھر میں رونق ہی ہو گئی ہے۔ نجانے کیوں دل چاہتا ہے کہ ہم ہمیشہ۔۔۔ لیکن

خیر جانے دو۔۔۔ تمہاری دادی کہاں ہیں؟“
 ”خبر نہیں۔۔۔“ اس نے بے دلی سے جواب دیا۔ وہ چاہتی تھی کبڑے میاں یہاں سے اٹھ جائیں لیکن ان کے انداز بھی نجانے کیوں بدلے ہوئے تھے۔ خواہنا وہ بات سے بات نکالتے جا رہے تھے۔
 ”بخت آؤ تم ہی کبھی کبھار تیمور کے پاس چلی جایا کرو۔ یونہی کبھی کوئی بات سنادی، کبھی ادھر ادھر کی باتیں۔ میرا مطلب ہے بڑا چپ چپ رہنے لگا ہے۔ شعیب، اپنی نوکری کی بھاگ دوڑ میں لگا رہتا ہے۔ باقی پڑھائی میں مصروف۔۔۔ تو۔۔۔“
 ”کبڑے میاں! میلے کپڑے سرف میں بھگو دیں اور دیکھیں سبزی والا آیا ہے تو ٹماٹر اور دھنیا لے لیجئے۔“ اس نے واضح طور پر کتابت بھرے انداز میں انہیں ٹوکا اور خود اٹھ کر کمرے میں آ گئی۔
 ”انہیں زیادہ خبر ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔۔۔“ اس نے دوپٹے کے الماری میں رکھا۔ دھماکہ لپیٹ کر سنبالا۔ پھر بستر کی چادریں بدل کر میلی چادریں بٹ میں بھگو کر باورچی خانے کی طرف آئی تو ہٹھک سی گئی۔
 کبڑے میں اور دادی سرگوشیاں کرتے ہوئے ایک دم جس طرح خاموش ہوئے تھے اس کا حیران ہونا بجا تھا۔

”کبڑے میاں! میں نے آپ سے کہا تھا کہ۔۔۔“
 ”ہاں، ہاں بس جا رہا ہوں۔“ کبڑے میاں کھسیانی ہنسی ہنستے وہاں سے چل دیے۔
 ”یہ کبڑے میاں کیا کہہ رہے تھے۔“
 ”ہوں، کچھ نہیں۔۔۔“ دادی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔
 ”ارے وا! کانوں میں گھسے بیٹھے تھے آپ کے اور ابھی کچھ کہا ہی نہیں۔“ وہ مشکوک سی پوچھ رہی تھی۔
 ”جان مت کھا میری، تیرے کام کی بات نہیں۔“
 ”آپ کے کام کی تو ہے نا وہی بنا دیں۔“
 ”جان مت کھا میری، سوچنے دے مجھے۔ ایک نئی پریشانی میں ڈال گیا یہ کبڑا۔“
 ”کون سی پریشانی۔۔۔ دادی کون سی پریشانی؟“ اس نے جھٹ ان کا کھٹنا تھا مایا۔
 ”آئے۔۔۔“ ہائے اب تو آ جا میری جان کو۔ دفع ہو، مجھے حواسوں میں واپس تو آنے دے جونک بن کر چٹ گئی مجھے، چل ہٹ کچھ کام وام کرنے دے۔“ دادی اسے بری طرح جھڑک کر چوہلا جلائے لگیں۔ وہ منہ بنائی وہاں سے اٹھ گئی۔
 ”امی پوچھ رہی ہیں آج کیا کچے گا۔۔۔؟“ احمد نے غلطی کی جواسے پکار بیٹھا۔
 ”بندر کی ٹھو پڑی اور پچھتر کے سری پائے۔ ویسے ابھی گلے نہیں۔“ وہ اسے ایک طرف دھکیلتی کپڑے دھونے چل دی تھی۔

☆☆☆

”وہ ہوتے کون ہیں ہمارے معاملات میں بولنے والے۔۔۔ انہیں کس نے حق دیا ہے کہ وہ

”صبح کے گئے اب لوٹے ہو، کیا وقت ہو چکا ہے۔ اب اگر لڑکے بالے آکر کھانا مانگیں گے تو کیا دوں گی انہیں۔۔۔ تمہارا سر۔۔۔“

”ارے واہ! میرا سر کیا فالتو ہے؟“ کبڑے میاں پہلے ہی منڈی کے بھاؤ تاؤ سے چڑے ہوئے تھے۔ پھاڑ کھانے کو دوڑے پھر جوتا کھینچنے باورچی خانے میں گھس گئے۔

”آئے۔۔۔ ہائے پاؤں اٹھا کر نہیں چل سکتے کیا؟“ دادی کو سخت وحشت ہوتی تھی اس آواز سے۔۔۔

”اٹھا کر سر پہ رکھ لوں کیا؟“

”نہیں توڑ کر جیب میں رکھ لو۔ بھلا ہوگا تمہارا۔“ وہ جلی بھنی باورچی خانے میں داخل ہوئیں۔

”جانے کس گناہ کی سزا پار ہے ہیں آپ کی صورت، اب تو کچھ یاد بھی نہیں۔ بوڑھے لوگوں کی سماعت کمزور ہو رہی ہے سنا تھا، اللہ جانے کن خوش نصیب گھروں میں بستے ہوں گے وہ بوڑھے۔ ہماری قسمت میں تو یہ رکھی تھی۔ خراٹ بڑھیا! دیوار پار کی باتیں سن لیتی ہیں۔ جھوٹ فر فر بولتی ہیں۔ ان جیسا چالوس زمانے بھر میں کوئی دوسرا نہ ہوگا۔ چالاکی میں کوؤں کو مات دیتی ہیں اور کن سونیاں لینے کی عادت تو عذاب بن گئی ہمارے لیے۔“

انہوں نے چھری بچ کر دادی کو گھورا جو انہیں بڑبڑاتے دیکھ کر سماعتوں پہ زور دے رہی تھیں۔

”اب کھڑی کیا ہیں۔۔۔ پیاز کاٹ رہا ہوں۔ سبزی پنا لیجئے۔“

دادی گڑبڑا کر سیدھی ہوئیں۔ ٹوکری سے سبزی نکالنے لگیں۔

”بخت آدرو کو بلا لیجئے۔ اگر یہی رفتار رہی تو رات تک ہی کھانا ملے گا سب کو۔“

کبڑے میاں بڑی تیزی سے پیاز چھیل رہے تھے۔ دادی ڈھیٹ بنی رہیں۔ جانتی تھیں اب وہ اتنی جلدی باہر آنے والی نہیں۔

کبڑے میاں نے پیاز کاٹ کر دادی کے حوالے کی اور خود باہر آ کر اسے پکارنے لگے۔

”بخت آدرو! ارے بھئی کہاں ہو؟“ انہوں نے کچھ بھری ہوئی چیزیں سمیٹیں۔۔۔

”سبزی بالو، تمہاری دادی کے ہاتھ کا بنا کون کھا سکے گا بھلا۔“ وہ بلند آواز سے کہتے تینور کے کمرے میں چلے آئے تھے۔ وہ کتاب سینے پہ دھرے سو رہے تھے۔ کبڑے میاں کی دل میں متاسی جاگ اٹھی تھی ان کے لیے۔ بڑی آہستگی سے کتاب اٹھا کر سائیڈ ٹیبل پہ رکھی، تینور کے جگری یا علی رضا نے بہت امید دلائی تھی۔

”آپ فکر مند مت ہوں کبڑے میاں! تینور کو ان شاء اللہ پہلے کی طرح چلتا پھرتا دیکھیں گے آپ۔“

اس نے دعا کیا تھا۔ علی رضا کے ماموں بڑے ہسپتال کے بڑے ڈاکٹر۔۔۔ کبڑے میاں نے تو آنکھ بند کر کے یقین کر لیا تھا۔ دن رات دعائیں کرتے۔ علی رضا کے لیے بھی اور تینور کے لیے۔

”کیا گوشت پوست کی ٹانگیں لگیں گی دوبارہ۔۔۔ درد، تکلیف تو نہیں ہوگی۔“ ان کی پریشانی اپنی جگہ، علی رضا بہت دیر تک ہنستا رہا تھا۔

”اصلی نہیں، مصنوعی ٹانگیں، کبڑے میاں!“

ہیں۔ جو دوسروں کی خیرات سے ہی بھر سکتا ہے۔ ہر کسی کو اپنا مفاد عزیز ہوتا ہے دادی! وہ سب تینور بھی کے لیے سوچتے ہیں۔ لیکن آپ کو صرف میرے لیے سوچنا ہے۔ صرف میرے لیے۔“

”تیرا دماغ خراب ہے اور کچھ سمجھ بھی نہیں۔ رونی، رزق، غم، خوشی سب انسان کی قسمت میں لکھا جا چکا ہے۔ اس سے زیادہ کہاں سے حاصل کرے گی تو۔۔۔ آج اس بے بس کو ٹھکرا رہی ہے۔ کل کلاں کوئی عقل کا اندھا مل گیا تو۔۔۔ کسی کی سوچ لولی، لنگڑی ہوئی تو۔۔۔؟ کس کس کو کہاں کہاں دھنکارے گی۔ اللہ سے خوف کھا۔ آج اس بے چارے پر رحم کھائے گی تو کیا خرابو پر والا تجھ پر رحم کھالے۔ تجھے تیری اوقات سے بڑھ کر دے دے۔“

دادی اپنی چارپائی سے اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھی تھیں، لیکن اس نے کمال بدتمیزی سے انہیں پرے دھکیل دیا تھا۔

”اٹھیں یہاں سے پتا نہیں کیسی سوچ ہے۔ آپ کی جہاں اور کچھ سمجھ میں نہیں آئے۔ لند کو بیچ میں لے آئیں۔ نہیں کرنا میں نے کسی پر بھی رحم، آجائے جو قیامت مجھ پر ٹوٹی ہے۔“

وہ گستاخی پر اتر آئی تو دادی منہ ہی منہ میں بکتی جھکتی اٹھ کر اپنی چارپائی پہ آ گئیں۔ وقفے وقفے سے جاری بخت آدرو کی بڑبڑاہٹوں نے انہیں بہت دیر تک جگائے رکھا تھا۔

☆☆☆

نجانے کن خیالوں میں گم تھی، وہ سوٹ دھو کر رازور سے نچوڑ دیا تو ”جیس“ کی آواز سے دامن قیص سے الگ ہو گیا۔

”ہائیں۔۔۔“ وہ آنکھیں پھاڑے اس اندھ ہٹاک منظر کو دیکھتی رہی۔ وہ ہی تو جوڑے تھے اس کے پاس۔۔۔ ایک تن پر اور دوسرا ہاتھ میں دھبیوں کی صورت۔

”ساری مصیبت ہمارے لیے۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رودی۔ قیص گول مول کر کے ایک طرف اچھالی، دامن آنسوؤں سے خوب ہی تر کیا اور نچوڑ ڈالا۔

”کرتے رہیں وضو۔۔۔ جنہیں کرنا ہے۔ ہمارے لیے تو سب بے کار، پوری دنیا جی کا جنجال، خواہ مخواہ کا وبال، اور آپ بھی سمیٹ رکھیں سارا خزانہ، مر جاؤں تو نذر، نیاز دیتی رہے گا۔ جیتے جی تو کوئی خوشی دیکھنا نصیب نہیں ہوگی۔ جس کی آپ جیسی دادی۔۔۔“ گلے میں پھندا سا پڑ گیا تھا۔ کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

دادی منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی، کوئی اٹھیں اور قیص اٹھا کر جائزہ لینے لگیں۔ مرمت کے قابل ہے یا نہیں۔

بخت آدرو نے بہتے آنسوؤں کے درمیان ساری کارروائی دیکھی اور پھر چیل کی طرح ان پر جھپٹ پڑی۔

”خبردار! جواب آپ نے اسے جوڑنے سینے کا سوچا بھی۔ چولہے میں جھونک دوں گی۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے قیص کو نوچ کھسٹ کر رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ دادی نے ہر تھام لیا۔

وہ رونی دھوتی کمرے میں بند ہو گئی۔ دادی ایک بار پھر آنکھیں سکیڑ سکیڑ کر قیص کا جائزہ لینے لگیں پھر کوئی چارہ نہ پا کر کبڑے میاں پر ٹوٹ پڑیں جو سبزی لے کر ابھی گھر میں داخل ہوئے تھے۔

”ہا۔۔۔ ہا۔۔۔ مصنوعی ناٹکیں۔“ کبڑے میاں افسوس سے سر جھٹک کر تینوں حسن کے اوپر چادر برابر کرتے باہر نکل آئے۔ ڈیوڑھی میں چار پائی بچھا کر لیٹے ہی تھے کہ شیب اندر داخل ہوا اور زوردار سلام بھڑا۔

”کبڑے میاں! جلدی سے کھانا دیں۔ میں بھوک سے مر رہا ہوں۔“ موٹر سائیکل کھڑی کر کے وہ واش بیسن پہ ہاتھ دھونے لگا۔

”تینوں بھیا!“

”سور ہے ہیں۔“ کبڑے میاں کہتے ہوئے باورچی خانے میں چلے آئے۔

”بخت آور کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ دروازے بند کیے کیوں بیٹھی ہے؟“ شیب کے لیے کھانا نکالتے ہوئے انہوں نے سوچ میں گم دادی کو چونکا دیا۔

”ٹھیک ہے طبیعت، تنگ کرنے پہ آئے تو یہی کیا کرتی ہے۔ نہ کسی کی مجبوریوں کا لحاظ نہ پریشانی کا خیال۔“ ٹھنوں پر زور دیتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

کبڑے میاں نے بغور انہیں دیکھا۔

چہرہ تھکا تھکا سا۔۔۔ پریشان، بیزار۔

”کیا بات ہوئی ہے؟“

دادی کو جواب دینے پر آمادہ نہ دیکھ کر کبڑے میاں ٹرے اٹھائے کمرے میں چلے آئے۔

”کبڑے میاں! گھر میں بہت سناٹا ہے۔“ شیب کبڑے بدل کر پلنگ پہ دراز ہو چکا تھا۔

”ہاں بھئی! سناٹا تو ہو گا ہی۔ احمد ابھی تک اسکول سے نہیں لوٹا۔۔۔ منیب اور آبا جان صبح سے گئے ہوئے ہیں ماموں کی طرف۔۔۔ پھر سناٹا تو محسوس ہو گا نا۔“

کبڑے میاں نے پانی کا گلاس بھر کر سامنے رکھا۔ شیب بس انہیں گھور کر رہ گیا تھا۔

”جی ہاں! مجھے تو نہیں معلوم کہ احمد اس وقت اسکول میں ہوتا ہے اور منیب نے آج اماں کے ساتھ ماموں کی طرف جانا تھا۔“ اس کے جھنجھلا کر کہنے پر کبڑے میاں نا بھجی کے عالم میں اسے دیکھتے دانت نکوستے باہر چل دیے۔

”ہاں میاں! سناٹا تو ہے۔ خالی، ویران، بھائیں بھائیں کرتا آنگن۔“ انہیں شدت سے گھر میں پھیلی غیر معمولی خاموشی کا احساس ہوا۔

سونے پن میں پلچل بچانے والی کمرے میں بندھی۔ ان کا دل ہولنے لگا۔ عادت ہو گئی تھی، بخت آور کو ادھر سے ادھر چلتے پھرتے دیکھنے کی۔ اس کی اوٹ پٹانگ باتیں سننے کی۔ حالانکہ وہ ان سے کم ہی براہ راست مخاطب ہوتی تھی لیکن پھر بھی بظاہر وہ اپنے کام میں مصروف مگر پردہ اسی کی باتوں پر دھیان رکھے رہتے تھے۔

”بخت آور۔۔۔ بخت آور۔۔۔ کھانے کا وقت ہے۔ دروازہ کھولو۔۔۔“ وہ اس کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے تھے۔

”کس بات پر ناراض ہو۔۔۔ دادی نے کچھ کہا ہے کیا؟“

”کبڑے میاں! مجھے تنگ مت کریں، میں بہت بد لحاظ ہوں اور بد تمیز بھی۔ ایسا نہ ہو کہ کچھ الٹا

سیدھا کہہ بیٹھوں۔“ دروازہ کھول کر ایک لمحے کے لیے وہ سرخ چہرے کے ساتھ سامنے آئی اور پھر کھٹاک سے دروازہ بند ہو گیا۔

کبڑے میاں چند لمحے دروازے کو گھورتے رہ گئے تھے۔

”ارے میاں! ایسے نہیں باہر آنے کی وہ۔ سال میں ایک مرتبہ ایسا دورہ بڑ جاتا ہے۔ اسے چھوڑ دو اس کے حال پر جب اپنا دل مان گیا تب سب بھول بھال سامنے آ جائے گی۔۔۔ بستی کھلتی پہلے جیسی۔“

دادی اپنی پریشانی کو بے فکری کے لبادے میں چھپا کر ڈیوڑھی میں آ بیٹھیں۔ جانتی تھیں سارا غصہ رات کی بات کا ہے۔ ٹھیں کا تو بس بہانا ڈھونڈا۔

”آپ سا پتھر دل بھی ہو گا کوئی۔“ کبڑے میاں دادی کی بے حسی پر کڑھ کر رہ گئے۔

”بچی تنگ سے بھوک پیاسی کمرے میں بند ہے۔ پوچھا تک نہیں۔ ایک دہی ہے جو سارا سارا دن ایک ایک کے آگے پیچھے پھرا کرتی ہے۔“

دادی سے بڑھ کر ظالم اور جابر کون ہو سکتا تھا کبڑے میاں کی نظر میں، باورچی خانے میں جا کر کھانے کی ٹرے تیار کی اور پھر دروازہ بجائے لگے۔

”بخت آور۔۔۔ بخت آور کھانا کھا لو۔ دادی نے بہت مزے کی بھجیا بنائی ہے۔“

”بھئی! کھانے سے کیا ناراضی۔۔۔ اور ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم۔۔۔ ہم سے کیوں خفا ہو۔۔۔؟“

کبڑے میاں کی بھدی، سپاٹ آواز، بے ڈھنگی دستک صحن کی خاموشی میں وقفے وقفے سے ابھرتی رہی۔ بے چارے کبڑے میاں منانے کے ڈھنگ سے ناواقف بس اپنی سی کوشش کر رہے تھے۔ دروازہ کھلنے پر لمحے کے لیے جو بخت آور کا چہرہ نظر آیا تھا وہ آنکھوں میں گھب کر رہ گیا تھا متورم آنکھیں خوب روئی ہوئی بیگانہ چہرہ بیٹھی بیٹھی آواز۔۔۔ دل کٹا جا رہا تھا۔۔۔ پھر کیسے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتے، ٹرے میں رکھ کر سنان ٹھنڈا ہو چلا تھا، مگر ان کی انگلیاں بند دروازے پر دستک دیتے نہ نکلی تھیں۔

پھر بالآخر دروازہ کھل گیا تھا۔ ایک جھٹکے سے وہ باہر نکل کر ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

”کیا تکلیف ہے آپ کو۔۔۔؟“ لہجہ حد درجہ گستاخانہ۔۔۔ چہرہ متمایا ہوا، شعلہ انگلی آنکھوں میں نفرت کی انتہا۔

”میں۔۔۔ میں یہ کھانا۔“ کبڑے میاں بوکھلا سے گئے تھے۔

”کیوں لائے ہیں کھانا۔ میں نے مانگا تھا آپ سے۔ کہا تھا کہ مجھے بھوک لگی ہے؟“

”نن۔۔۔ نہیں مگر کھانے کا وقت۔۔۔“

”ہزار پادہ یہ جتانے کی کوشش کی ہے میں نے کہ مجھے بلائے۔۔۔ مجھ سے بات چیت کرنے کی کوشش مت کیا کریں۔۔۔ سنا آپ نے، مجھے آپ سے نفرت ہے۔۔۔ بہت برے لگتے ہیں آپ۔۔۔ میں اس جگہ سے اٹھ جاتی ہوں جہاں آپ موجود ہوں۔۔۔ لیکن آپ پھر بھی سمجھ نہیں پاتے۔۔۔ کس ڈھیٹ مٹی سے بنے ہیں آپ کہ پھر بھاگے چلے آتے ہیں۔ نہیں ضرورت مجھے آپ کے

جلائیں۔ کتنی ہی چکی اتار لیں۔ مارے بندھے کام ختم کیا باہر نکلی ہی تھی جب صحن میں بندھے تار سے کپڑے اتارنی تائی حسنہ نے پکار لیا۔
 ”یہ کبڑے میاں ڈیوڑھی سے چار پائی نکال کر کہاں لے گئے۔ ابھی سردیاں ختم کہاں ہوئی ہیں اچھی خاصی ٹھنڈ ہوئی ہے باہر۔“

بخت آور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تائی حسنہ خود ہی جھانک کر آئیں۔
 ”لو بھلا یہ کیا بات ہوئی باہر چبوترے پہ چار پائی ڈالے بیٹھے ہیں۔۔۔ کہتے ہیں یہیں ٹھیک ہوں۔۔۔ کیا بچوں والی ضد لگائی ہے ٹھنڈ وڈ لگ گئی تو یہاں ہزاروں کام رکے رہیں گے۔ پریشانی الگ۔“ بڑبڑاتے ہوئے انہوں نے کمر نکال کر بخت آور کے ہاتھ میں تھما دیا۔
 ”کبڑے میاں کو دے آؤ۔۔۔ خود سے تو ابھی کسی چیز کی مانگ نہیں کریں گے۔“ وہ تیسور بھیا کے کمرے میں چلی گئیں۔ بخت آور کو بادل خواستہ کمر نکال اٹھانا پڑا۔
 دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔

پندرہویں کا چاند تھا۔ نم آلود چاندنی میں ہر چیز بہت صاف صاف دکھائی دے رہی تھی۔ کمر میں لپٹے لپٹائے کبڑے میاں دروازے کی طرف پشت کیے چار پائی پہ سکرے سٹے بیٹھے تھے۔ پراسرار خنک چاندنی میں دائیں، بائیں جھلکتی ایک عجیب الخلقت چیز۔
 بخت آور کو خوف سا محسوس نہ لگا۔

اٹنے پاؤں بھاگے ہی والی تھی۔ جب شیبب آتا دکھائی دیا۔ حسب توقع وہ سیدھا کبڑے میاں کے پاس جا رہا تھا۔
 کبڑے میاں! یہاں کیوں چار پائی۔۔۔ وہ فکر مندی سے پوچھ رہا تھا۔

”ہونہر، ہمدردیاں سینے کا کتنا شوق ہے انہیں۔ بے وجہ کے کھرے۔“ اس نے دروازے کی اوٹ سے جھانکا۔

شیبب کبڑے میاں کے برابر بیٹھا انہیں بازوؤں میں لیے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ تاہم کبڑے میاں کی آواز بلند تھی۔

”نہیں شیبب میاں! مجھے یہیں رہنے دو۔ ڈیوڑھی میں دم گھٹنے لگتا ہے میں یہیں ٹھیک ہوں۔۔۔ ٹھیک ہوں۔ میں۔“

ان کی آواز کپکپا گئی تھی۔ لہجہ ڈوب گیا۔ فضا میں نمی سے گھلنے لگی تھی۔ بخت آور نے کمر گول مول کر کے وہیں سے چار پائی پھاڑا اور خود واپس لوٹ آئی۔

☆☆☆

”کیاں مصروف رہتے ہو آج کل؟“ شیبب عجلت میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ بس اچانک ہی سامنے آگئی تھی۔

”اسلام آباد سے کال آئی ہے۔ وہاں جانے کی تیاری کر رہا ہوں تیور بھائی کو بھی لے کر جانا ہے، علی رضا۔“ وہ بتا رہا تھا بخت آور یک ٹک اسے دیکھ گئی۔

”شیبب! پریشان ہو؟“ وہ پوچھنے بغیر نہ رہ سکی۔

کھانے کی۔۔۔ لے جائیے اسے۔۔۔“
 اس نے ایک جھٹکے سے ان کے ہاتھوں میں پکڑی ٹرے ہوا میں اچھالتے ہوئے گویا سارے غم و غصے کو نکال دینے کی کوشش کی تھی۔

”اور کان کھول کر سن لیں کبڑے میاں! آئندہ آپ نے مجھ سے یا میرے کسی بھی معاملے سے کوئی تعلق رکھا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ ان ہی لوگوں پر لٹا ہے اپنی محبت اور ہمدردی جو اس کے مستحق ہیں اور عادی بھی۔ میری جھولی میں تو آپ اپنے جیسی چھوٹی موٹی بد نما اور کبڑی خواہشات ڈالیں گے۔ جائیے کبڑے میاں جائیے اور بخشے مجھے۔“ انتہائی تنفر سے دونوں ہاتھ جوڑی وہ پلٹ گئی تھی۔

کبڑے میاں کی ساکت آنکھوں کے سامنے ایک بار پھر کمرے کا سپاٹ دروازہ تھا۔ اور ان کا دل جو چند لمحے قبل بند ہو چکا تھا ایک بجلی لے کر دوبارہ زندہ ہو گیا تھا۔

”یہ کیا کہا ہے بخت آور نے ابھی ابھی۔“ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے دیوار کو تھاما۔

”اسے مجھ سے بھگن آتی ہے۔ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے۔۔۔؟“

”کیوں۔۔۔؟ کس لیے۔۔۔؟“

”اریے کبڑے میاں میں نے کہا تھا نا!۔۔۔ چھوڑ اسے اس کے حال پر۔“ دادی ڈیوڑھی میں

سے چلا رہی تھیں۔

کبڑے میاں کپکپاتے ہاتھوں سے بکھرے برتن سمیٹ رہے تھے۔ دھندلی آنکھوں اور سائیں سائیں کرتے کانوں سمیت۔۔۔ نہ کچھ دکھائی دے رہا تھا نہ سنائی۔۔۔ وہ بمشکل خود کو گھسیٹتے باورچی خانے تک لے گئے۔

نجانے کیوں دل بگھلا جا رہا تھا وہ وہیں فرش پر دونوں بازوؤں میں منہ چھپا کر بیٹھ گئے۔ ان کا بد وضع وجود بہت دیر تک ان کے بچتے آنسوؤں کے درمیان ہچکولے کھاتا رہا تھا جبکہ اندر کمرے میں بیٹھا شیبب اپنی جگہ ساکت و صامت تھا۔

☆☆☆

شام ڈھلے اس کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ تائی حسنہ ابھی ابھی واپس آئی تھیں۔ سخت فکر و مندو پریشان۔

”فلاس نے کھانا کھایا یا نہیں۔۔۔ تیور کو کسی نے پوچھا یا یونہی پڑا رہا۔۔۔ احمد کا چہرہ کیوں اتر اٹھا لوگ رہا ہے۔۔۔؟“

”ارے حسنہ۔۔۔ ایک دن کے اندر اندر کیا دنیا بدل گئی۔ تمہارے بعد سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا تم چھوڑ گئی تھیں۔ کھانا ہر روز کی طرح دونوں وقت پکا کھایا تیسرے وقت تم خود آمو جوہر میں اور احمد بھلا ایک دن میں کہاں کا پہلوان بن جاتا، حد ہو گئی بھئی۔۔۔“ اندرونی خلفشار میں مبتلا دادی چڑ گئیں اس بے وجہ کی پریشانی سے۔

”خفا کیوں ہو گئیں بی اماں۔۔۔ بس یونہی پوچھ لیا۔۔۔ شیبب بھی تو نظر نہیں آ رہا اور کبڑے میاں کی تو میں جب سے آئی ہوں آواز ہی نہیں سنی۔“ تائی حسنہ بولتی رہیں۔ دادی اپنی سوچ میں غرق، باورچی خانے میں بخت آور برتن اٹھا اٹھا کر پختی رہی۔ نجانے کس پر غصہ آ رہا تھا۔۔۔ کتنی روٹیاں

الماری کا پٹ کھولتے ہوئے شیب نے پلٹ کر ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر کچھ کاغذات نکالنے لگا۔

”میں کبڑے میاں کی وجہ سے پریشان ہوں۔“
”کیوں انہیں کیا ہوا ہے؟“ کبڑے میاں کا نام سنتے ہی جس طرح اس کا لہجہ و انداز بدلتا تھا وہ شیب سے چھپانہ رہ سکا۔

”تم نے اس دن بہت بدتمیزی کی تھی ان کے ساتھ۔“ شیب کا انداز جتانے والا تھا۔
”وہ شخص تمہیں مجھ سے چھیننے کے پروگرام بنا رہا تھا۔“ اس نے کہنا چاہا لیکن لب بھینچ کر رہ گئی۔
”تمہیں شاید اندازہ نہیں وہ کتنے محبت کرنے والے انسان ہیں۔ بچپن سے لے کر آج تک انہوں نے اس طرح ہمارا خیال رکھا ہے کہ۔۔۔“

”تم لوگوں کا خیال رکھنا تھا شیب! احسان کے یہ نوکرے انہوں نے میرے سر پر نہیں رکھے جو ان کی ہر اچھی پری بات کو برداشت کروں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی شیب کے سامنے اپنے ناگوار جذبات کا اظہار کر بیٹھی تھی۔

”میں سمجھ نہیں پا رہا۔ کیسی لڑکی ہو تم؟“ شیب الجھ کر اسے دیکھنے لگا۔
”میرا نہیں خیال ان جیسے معصوم اور بے ضرر انسان کی کوئی بات ناقابل برداشت بھی ہو سکتی ہے۔“

”تمہارے لیے ایسا ہی ہوگا۔ لیکن میرا معاملہ الگ ہے۔ کبڑے میاں نہ پہلے کبھی مجھے بھائے ہیں اور نہ اب انہیں اچھا سمجھنے کے لیے تم مجھے مجبور کر سکتے ہو۔“ وہ پاؤں پچھتی باہر نکل گئی۔ شیب سر ہٹا کر وہیں بیٹھ گیا تھا۔

”یہ کون سا روپ ہے اس لڑکی کا۔“ اسے لگ رہا تھا بیلا دوسری مرتبہ اس گھر میں گھس آئی ہے۔ اپنی تمام تر بے رحمی۔۔۔ اور سفاکی سمیت۔

☆☆☆

”کسی بھی انسان کی معذوری اس کی اپنی پیدا کردہ نہیں ہوتی۔ کوئی بھی انسان خود کو بد صورت بنانا پسند نہ کرتا اگر خود کو بنانا اس کے اپنے اختیار میں ہوتا ہم بد صورت لوگوں سے نفرت کرتے ہیں۔ ہمیں معذور لوگوں پر ہنسی آتی ہے، ہم ان پر رحم کھاتے ہیں ہمیں ان پر ترس آتا ہے۔ بس ان سے محبت نہیں ہوتی۔ شاید اس لیے کہ ہم انہیں تخلیق کرنے والے کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔“

بخت آورا! میں بہت خوفزدہ ہو گیا ہوں۔ مجھے ڈر لگنے لگا ہے تم سے، بیلا سے اور تم جیسے دوسرے بہت سے لوگوں سے۔ معذوری بد صورتی کو ختم دیتی ہے اور بد صورتی نفرت کو۔ میں سوچتا ہوں اگر میں تیور بھائی کی جگہ ہوتا یا پھر کبڑے میاں کی جگہ تب۔۔۔؟ تب اسی سفاکی سے بیلا مجھے چھوڑ جاتی، اور اسی بے رحمی سے تم اعلان کر رہی کہ تمہیں مجھ سے بھگنا ہے۔

مجھے معاف کر دینا بخت آورا! لیکن میں ایسے نافرمان بنی محبت کے قابل نہیں سمجھتا جو کسی انسان کو محض اس کے ظاہری خود خال کی بنا پر کمتر یا حقیر سمجھتا ہو، محبت کے آداب و شرائط سے میں واقف نہیں مگر اتنا جانتا ہوں انسان ادھورا ہو یا بد صورت بد وضع ہو یا بد ہیئت اس سے محبت ہو یا نہ ہو، اس کا خیال رکھنا

پڑتا ہے خاص طور پر اس وقت جب ہم اس کی محبتوں کے عادی بھی ہوں اور مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا بخت آورا کہ تم نے ایک بہت ہی معصوم شخص کا دل دکھایا ہے۔“

کاغذ اس کے ہاتھ سے پھسلا اور لہراتا ہوا صحن کے پکے فرش پہ جا گرا تھا۔ قریب سے گزرتے کبڑے میاں ٹھٹھک کر رکے۔ جھکے اور کاغذ اٹھا کر بڑی احتیاط سے اس کے پاس رکھ گئے تھے۔ بخت آورا نے طویل سانس لیتے ہوئے سر اٹھایا۔

”اور شیب میری محبت سے دستبردار ہو گیا۔ صرف اس لیے کہ میں نے اس شخص کا دل دکھایا۔“

اسے حیرت ہو رہی تھی بے حد حیرت۔۔۔
”یہ ٹھنکا سا شخص، کچھ بڑی بالوں والا کبڑا میلی گدلی آنکھیں۔ موٹے سے ہونٹ اور بھدی ناک۔ جس کو دیکھ کر اس نے ہمیشہ سے بے دلی سے منہ پھیر لیا۔ جسے آج تک اس نے قدرت کی ایک بھی ناک غلطی سمجھا۔“

اور شیب مجھے چھوڑ گیا۔ محض اس لیے کہ۔۔۔؟“
اس کی بے یقینی نگاہیں دنوں کبڑے میاں کا طواف کرتی رہیں۔

☆☆☆

”اے بخت آورا! تو بولتی کیوں نہیں، کیا ہو گیا ہے تجھے۔ دیکھ تو گھر کیسا بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔“

دادی کو جانے کیا ہوا تھا جو ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی تھیں۔ ہلکی ہلکی دھوپ میں بیٹھی اپنی سوچوں میں گم بخت آورا نے مندی مندی آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا۔
”کیا بولوں دادی! کچھ نہیں ہے میرے پاس بولنے کے لیے۔“

”اور یہ خط کس کا ہے۔ کئی دنوں سے مٹی میں دبائے پھر رہی ہو۔“ دادی نے اس کی گود سے جھانکتا نیلے رنگ کا لفافہ دیکھ لیا تھا۔

”شیب نے اسلام آباد سے بھجوایا تھا میرے نام۔ پہلا اور آخری خط۔“ وہ پھکی سی بے رنگ مسکراہٹ چہرے پہ سجائے انہیں بتا رہی تھی۔

”آئے۔۔۔ ہائے تمہارے نام کیوں؟ اپنی اماں اور بھائیوں کو لکھتا تمہارے سے بھلا کیا تعلق اس کا۔“

”ہاں! مجھ سے بھلا کیا تعلق اس کا اگر کوئی تھا بھی تو اب کہاں رہا، سب کچھ ختم۔ آنکھوں سے خواب ختم اور دل سے خواہشات۔ اندر جیسے ہر طرف ریت اڑ رہی ہے۔ دادی! خالی ڈھنڈا قبرستان نہ بین کی آواز آتی ہے نہ سکسکایا خاموشی کا گلا گھونٹتی ہیں۔ ایسی جامد چپ ہے دادی جو ٹوٹنے میں ہی نہیں آ رہی۔ بس خوف سا محسوس ہوتا ہے۔ ایک پھندا سا پڑا ہے گلے میں سانس لینا بھی مشکل۔۔۔“

وہ جسے بڑی اذیت میں اپنا گلا مسل رہی تھی۔
دادی نے اسے ہنسی سے دیکھا کہ اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔

”کیا بول رہی تھی بخت۔۔۔!“
”کچھ نہیں دادی کچھ بھی نہیں۔“ اس نے مردہ سے لہجے میں انہیں دلاسا دینا چاہا۔

”نہ ڈرا مجھے۔ تیرے سوا ہے ہی کون؟ بہتی کھلتی رہا کر، میرے دل کو تسلی ہوتی ہے کوئی پریشانی ہے تو مجھ سے کہہ، مجھے بتا۔“

وہ دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھامے کہہ رہی تھیں۔ چہرے پر ہزار پریشانیاں، آنکھوں میں ہزار وسوسے۔ بخت اور کوان پر ترس آنے لگا۔

”بس اتنا سادل ہے دادی۔۔۔ میں تو بس آپ کا امتحان لے رہی تھی۔ کوئی پریشانی کوئی تکلیف نہیں بے فکر رہیں۔۔۔“ نرئی سے ان کا ہاتھ پھینکتے ہوئے اس نے اپنا سر دادی کے سینے پہ رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

”چلنے میں دقت تو ہوتی ہوگی تیمور بھائی،“ شیب اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر پوچھ رہا تھا۔

”ہاں شروع شروع میں مشکل تو ہوگی۔۔۔ میں خود بھی ابھی تک۔۔۔“

بخت آور نے سر اٹھا کر دیکھا، وہ پوری توجہ سے تیمور بھائی کی بات سن رہا تھا۔

”نظر ملانے کی ہمت نہیں یا اس قابل ہی نہیں سمجھتے کہ۔۔۔“

چائے میز پر رکھتے ہوئے ذرا سی چھلک گئی تھی۔۔۔ تیمور حسن نے بات ادھوری چھوڑ کر تعجب سے اسے دیکھا۔ اپنے ہی خیالوں میں گم وہ چائے رکھ کر واپس پلٹ گئی تھی۔

شیب کرسی کے ہتھ پر نجانے کیا گھرچ رہا تھا۔

”معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے اس لڑکی کو۔۔۔ ہر وقت یونہی کھوٹی کھوٹی سی رہتی ہے۔۔۔ نہ پہلے کی طرح بولتی ہے نہ بہتی ہے۔۔۔ حالانکہ اب تو عادت سی ہو گئی تھی بستر پہ پڑا اس کی اوٹ پٹانگ باتیں سنتا رہتا تھا۔ رونق سی لگی رہتی تھی اس کی بدولت۔۔۔ لیکن اب کچھ۔۔۔“

”ای بتا رہی تھیں آپ اور علی رضا دوبارہ سے اپنے بڑے کام شروع کر رہے ہیں۔“ شیب نے گویا کسی بہت ہی غیر اہم بات کو کاٹ کر کہا تو تیمور ایک لمحے کے لیے خاموش سے رہ گئے۔

”ہاں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے اب۔“ وہ اسے تفصیلات بتانے لگے جسے سنتے ہوئے شیب ذہنی طور پر غیر حاضر رہ رہا تھا۔ ایک عجیب وحشت سی اس کا گھیراؤ کرنے لگی تھی۔

”شاید ابھی کچھ عرصے تک مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔“ اسے خدشہ سے احساس ہوا۔ میں اس لڑکی سے نفرت نہیں کرتا لیکن اس سے محبت کرنا بھی اب میرے بس میں نہیں رہا۔“

بخت آور کی کام سے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ شیب تیمور حسن سے معذرت کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”تو اب یوں بھاگنے لگے ہو مجھے سے شیب حسن!“ استری شدہ کپڑے الماری میں رکھ کر اس کھلے پٹ کی اوٹ میں اس نے خوب اچھی طرح اپنی آنکھیں میلیں۔

”بخت آور!“ تیمور بھائی کے پکارنے پر وہ پٹی۔

”روزہ کب افطار کر رہی ہو۔۔۔؟“ وہ بہت سنجیدگی سے پوچھ رہے تھے۔

”روزہ۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔ چپ کا روزہ۔۔۔ بہت دنوں سے رکھا ہوا ہے نا۔۔۔؟“ وہ نرم مسکراہٹ چہرے پہ سجائے پوچھ رہے تھے۔

بخت آور انہیں کوئی جواب نہ دے پائی تھی۔ یونہی افسردگی سے سر جھٹک کر باہر آ گئی تھی۔ دادی باورچی خانے میں تائی حسنہ کے ساتھ کھانا بنوا رہی تھیں وہ سست روی سے چلتی و پھرتی آ گئی۔

”دادی! آپ سے کچھ بات کہنی ہے۔۔۔“ وہ دروازے کی چوٹ تھامے کھڑی تھی۔

”ہاں بول۔۔۔“ لہسن پیاز میں ابھی دادی اس کے مدہم لہجے کی طرف متوجہ ہی نہ ہوئی تھیں۔

”دادی! مجھے آپ کی۔۔۔ آپ کی ہر بات قبول ہے۔“

”ہائیں۔۔۔ کس بات کا کہہ رہی ہے۔۔۔ کون سی بات؟“

دادی نے جلتی ہانڈی پر پانی کا چھینٹا دیا۔۔۔ تائی حسنہ البتہ چونک گئی تھیں۔ وہ بغیر کوئی جواب دیے ہونٹ کاٹتی رہی۔ آنکھیں آنسوؤں سے لالباں بھرا آئیں۔ تائی حسنہ بے اختیار اٹھ کر اس کے پاس چلی آئیں۔

”بخت آور! تیمور۔۔۔ تیمور کے لیے کہہ رہی ہوتا۔۔۔؟“ تائی حسنہ نجانے کیسے اتنی جلدی بات کی تہہ تک پہنچ گئی تھیں۔

بخت آور نے بمشکل اثبات میں سر ہلا دیا۔

دادی ہنڈیا بھول کر ٹکڑا اس کا منہ دیکھنے لگیں۔

”دیکھ بخت آور۔۔۔ کوئی زور زبردستی نہیں۔۔۔ تیری اپنی مرضی ہے۔۔۔ کل کلاں جو مجھے طعنہ دیتی رہی کہ۔۔۔“ دادی ہکلا سی گئیں۔

”نہیں دوں گی کوئی الزام، کوئی طعنہ نہیں دوں گی۔۔۔ سب میری مرضی ہے۔۔۔ ہر فیصلہ میرا اپنا ہے۔۔۔ صرف میرا اپنا۔۔۔“ آنسو ایک تو اتر سے بہہ نکلے تو لب چھتی، سسکیاں روکتی وہاں سے بھاگ گئی تھی۔

☆☆☆

رات کافی سے زیادہ بیت گئی تھی جب دروازے پر دستک ہوئی۔ مہندی اور ابلن کی خوشبو میں بسی بخت آور چونک کر اٹھ بیٹھی تھی۔

دادی نے کروٹ بدلی کھٹکھار کر آواز لگائی۔ ”کون ہے اس وقت۔“

”میں ہوں بی اماں! ایک بات کہنی تھی۔۔۔“ کبڑے میاں کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔

کبڑے میاں دیوار کے ساتھ لگے بیٹھے تھے، دروازہ کھلنے کی آواز پر ذرا سا چونکے، گردن موڑ کر دیکھا کمرے میں پھیلے گھپ اندھیرے میں بیولا سا دکھائی دے رہا تھا۔

”مبارک ہوئی اماں! اللہ نے بنیا کا گھر بسایا ہے۔“

وہ بہت مسرور لگ رہے تھے۔ بخت آور دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

”بخت آور سو گئی ہے کیا۔۔۔؟ اصل میں بی اماں۔۔۔ میں اس کے لیے کچھ چیزیں لایا تھا۔“

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بہت بے صبری سے بولے تھے۔

”خبر نہیں اسے پسند آئیں یا نہ آئیں۔۔۔ وہ تو مجھے بھی پسند نہیں کرتی۔۔۔ کچھ بعید نہیں یہ سب زیور گہنے اٹھا کر میرے منہ پہ دے مارے۔۔۔“ وہ بے ہنگم طریقے سے ہنستے۔

”پر ہم بھی کیا کریں بی اماں! بڑے بدنصیب لوگ ہیں۔۔۔ دل میں قبرستان بنائے بیٹھے ہیں۔ ہر روز کیا کیا دن نہیں کرتے، شکوہ نہیں۔۔۔ بس دل میں حسرت سی اٹھتی ہے۔۔۔ کاش ہماری بھی کوئی بیٹی

ہوتی۔۔۔ ایسے ہی نازخروں والی، ہم سے محبت کرتی۔۔۔ دیکھتی کہ یہ بوجھ جو ہم اپنی کمر پہ لادے پھرتے ہیں، اس کے نیچے ایک دھڑکتا ہوا دل بھی ہے۔ وہ دیکھتی کہ اس دل میں کتنا پیار ہے، محبت ہے، چاہ ہے، کوئی کھوٹ، کوئی غصہ، کوئی نفرت نہیں۔۔۔ لیکن۔۔۔“

ان کی بھدی سی ہنسی رات کی شفاف چادر پر کئی شکلیں سی ڈال گئی تھی۔ بخت آور نے بے دردی سے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا۔

”لیکن ہمیں بخت آور بیٹا سے بھی کوئی شکایت نہیں، بھلے وہ مجھ سے نفرت کرے بھلے میرے وجود سے گھن کھائے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ بس مجھ سے محبت کرنے کا حق نہ چھینے۔ یہ دیکھیے ذرا۔ بڑے چاؤ سے لایا ہوں۔ ساری عمر کا جمع جھٹکا لگایا ہے مگر پھر بھی کچھ بن نہیں پایا۔“ وہ گود میں رکھی پولی کھول رہے تھے۔

”معافی تلافی کے لفظ۔۔۔ پچھتاوے کے آنسو۔۔۔ کیا نچھاور کروں آپ پر کبڑے میاں۔۔۔!“

وہ تھک کر وہیں دہلے پہ بیٹھ گئی۔

”اتنے بد صورت وجود میں ایسا خوب صورت دل کس نے رکھ دیا، شمیٹ نے تو کہا تھا۔۔۔“

”بد صورتی گناہ نہیں لیکن بد صورت رویہ بدترین گناہ ہے“ پھر آپ نے یہ گناہ کس طرح معاف کر دیا۔“

ملکائی سی چاندنی میں اس کی نظر ریشمی کپڑوں پر پڑے چاندی کے دستے زیورات سے ابھرنے لگی۔

بیلا نے تیمور حسن کو ٹھکرایا کیونکہ وہ معذور تھا تیمور حسن نے اسے معاف کر دیا ہم سب نے نہیں کیا۔ میں نے کبڑے میاں سے نفرت کی مگر وہ سب کچھ بھول گئے وہ سب جو میں نے ان سے کہا اور جو ان کے ساتھ کیا۔ لیکن شمیم نہیں بھولا۔

تو پھر بد صورت کون ہوا؟

”شمیم حسن! اگر تمہاری طرح میں بھی حساب کتاب کرنے بیٹھوں تو پوچھوں کہ دوسروں کے جسے کی سزا دینے والے تم کون ہوتے ہو۔ میں نے ایک معصوم انسان کا دل دکھایا تو کیا تم نے کسی کا دل نہیں توڑا؟ اس طرح تو میرا اور تمہارا گناہ ایک جیسا ہونا، تم نے خود کو برتر سمجھا اور مجھے ٹھکرا دیا۔۔۔“

دوسروں کا خیال کس طرح رکھا جاتا ہے، درحقیقت یہ نہیں بھی نہیں معلوم، محبت سکھانے کے لیے محبت سے ہاتھ کھینچ لینا اس سے دستبردار ہو جانا مناسب نہیں ہوتا۔ محبت سکھانے کے لیے محبت کو فروغ دیا جاتا ہے معاف کیا جاتا ہے۔ بھول جانا بڑتا ہے، دوسروں کی غلطیوں کو، کوتاہیوں کو۔۔۔ اور یہ میں نے کبڑے میاں سے سیکھا ہے یا پھر تیمور حسن سے جسے میں نے اپنی خواہش پر نہیں پڑا۔ لیکن جو میری تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے، لظاہر ادا ہوگا۔۔۔ لیکن مکمل انسان اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے دم سے چراغ روشن ہیں، آنکھوں میں، دلوں میں اور اس پوری کائنات میں۔“

اس نے ننگن کلائیوں میں ڈال کر پازیب اور کپڑے اٹھالے تھے۔۔۔ اسے یقین تھا اگلی صبح اس کی کلائیوں میں سب ننگن اور پیروں میں پڑی پازیب دیکھ کر کبڑے میاں سے بڑھ کر اور کوئی خوش نہیں ہوگا۔ چاندنی کی پازیب کو بہت احتیاط سے پاؤں میں ڈالتے ہوئے وہ خود کو میلے میں آئی ایک ایسی بچی تصور کر رہی تھی۔۔۔ جس نے پہلی دفعہ لوگوں کو کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا اور ابھی ابھی زندگی کو جاننے کا آغاز کیا تھا۔

میرے گمشدہ

اور چڑیا کا تیسرا بچہ بھی مر گیا۔

دھب کی موہوم سی آواز کے ساتھ چڑیا کا بے بال و پر بچہ آنگن کی جلتی بلی زمین پر گر اور ایک دو جھنکوں میں ہی اس کا بونی سا وجود ساکت ہو گیا۔ ماورچی خانے سے باہر نکلتے کا کا جان کی نگاہ اس پر پڑی تو چائے سے بھری پیالی ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ وہ اندھا دھند اس طرف کو بھاگے۔

چڑیا کے بچے کی چونچ ہو لے سے تھر تھرائی تھی۔ کا کا جان نے اپنے ہاتھ کی سخت پوروں میں اس دم توڑتے وجود کو زخمی سے تھاما اور حوض کی طرف لپکے، مگر چڑیا کا وہ گلابی سا بچہ پانی کی ایک بوند حلق سے نیچے اتارے بغیر ہی مر گیا۔ کا کا جان کی ٹھیلی پر پڑے اس مردہ بچے نے ان کے جسم کی ساری توانائیاں نچوڑ لی تھیں۔ اس کی بند آنکھوں میں اترتی سیاہی مائل نیلا ہٹ اور تھی چونچ سے جھانکتی سرخی کا کا جان کا دل نوچ کر لے گئی تھی۔ ان کا ہاتھ ایک دم مفلوج ہو کر ان کے پہلو میں گر گیا تھا۔ چڑیا کا بچہ حوض کے کنارے گر اور کا کا جان چھوٹ چھوٹ کر کسی ننھے بچے کی طرح رو دیے تھے۔

”چڑیا کا تیسرا بچہ بھی۔۔۔“ کیا رویوں سے خشک پتے نکالتی ماور اپنی جگہ پاکت ہو گئی تھی۔

روٹی کر لائی چڑیا بے قراری سے کا کا جان کے سر کے آس پاس منڈلا رہی تھی۔

اس کی معصوم چو۔۔۔ چو سے چھلکتا درد، بے بسی۔ ماور کا دل بے پناہ اداسی میں گھر گیا۔

”بے چاری چڑیا۔۔۔!“ وہ تاسف سے کا کا جان اور چڑیا کو دیکھتی رہی۔

دونوں کا دکھ ایک ہی تھا۔

کا کا جان کی سسکیاں اور چڑیا کی کرلاہٹیں۔

ماور اوہیں گھٹنوں کے بل بیٹھ کر گھاس نوچنے لگی۔ اسے کا کا جان کی طرح رونا نہیں آتا تھا، مگر اس کا دل کسی بھاری ریل کے نیچے دبائے رہا تھا۔

گزشتہ کئی روز سے کا کا جان کی ہر سرگرمی کا مرکز ایک یہ گھونسلہ ہی تو تھا۔ جس روز چڑیا اپنی چونچ

میں پہلانا لے کر اُڑی کا کاجان کے چہرے پہ چھائی مسرت قابل دید تھی۔

”گھونسلہ بنے جا رہا ہے بڑا! آؤ دعا کریں۔ اللہ اس ننھی چڑیا کی محنت ٹھکانے لگا دے۔ اس ننھے آشیانے کو آندھی و بارش سے بچائے۔“

اور اس نے بھی مسکراتے ہوئے ان کے ساتھ دیا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے تھے اور پھر کچھ روز بعد جب درختوں کی برہنہ شاخوں پر سبز کوئلیں پھوٹ رہی تھیں اور فضا میں سبز گھاس کی تازہ خوشبو ہلکورے لے رہی تھی۔ ”چوں چوں“ کی دلفریب آوازوں سے سارا گھر بھر گیا تھا۔ گھونسلے سے اٹھتی معصوم اور نوزیر آوازوں کو سن کر کاجان کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔

”کئی دنوں کی تپسیارنگ لے ہی آئی۔“

”بند پرنا لے کا سارا رخ زمین کی طرف ہے۔ اگر نیچے گر گئے تو۔۔۔“ وہ اپنا خدشہ زبان پر نہ لائی تھی، مگر وہی ہوا تھا۔ پہلے دو بچوں کے بعد آج تیسرا بچہ بھی پتی زین پہ گر کر مر گیا تھا۔

مادرانے ایک طویل سانس لے کر سر اٹھایا۔ کاجان اپنے کمرے میں جا چکے تھے اور درو کی ماری چڑیا بائیتی کا پتی کسی شاخ تلے جا چھپی تھی۔

”اتنا چھوٹا سا وجود اور اتنا ڈھیر سا درد۔۔۔ کیسے سہہ پائے گی ننھی چڑیا۔“ درخت کی شاخوں سے سرخی مائل زرد دھوپ براہ راست اس کے وجود پر پڑنے لگی تو وہ بجھے دل کے ساتھ اٹھ کر خود کا کاجان کے بند کمرے کے دروازے کو کتتی برآمدے کی سیڑھیوں پہ آ بیٹھی۔

دھوپ ڈھل رہی تھی۔

”آج کی یہ شام ننھی اداس ہو گئی۔“ ہوا میں ہلکی سی پیش کو محسوس کرتے ہوئے اس نے ستون سے سر ٹکا دیا۔

درختوں کے لمبے ہوتے سائے اس کے دل میں وحشت جگا گئے۔

ہر طرف چپ اور ویرانی۔

”کاجا جان بھی کیسی کیسی باتوں کو دل پہ لے لیتے ہیں، اب اگر یہ چڑیا کے بچے کا معاملہ نہ ہوتا تو چائے کی ایک پیالی کے ساتھ ان کا لکھا ہوا کوئی کالم ہی سن رہی ہوتی۔ اچھا یا برا۔ کوئی آواز تو کانوں میں پڑتی۔“

وہ بیزار سی ہو کر ابا کے کمرے میں آئی۔ وہ ابھی تک دوا کے زیر اثر سو رہے تھے۔ تب ہی کسی نے لکڑی کا دروازہ زور سے بجایا۔ وہ اٹنے قدموں واپس آ گئی۔ دروازے کے باہر سلیم کے سائیکل کی گھنٹی بار بار جیتی سنائی دی تو اس نے بے دھڑک دروازے کی کنڈی گرا دی۔ پچھلے ایک ہفتے کے اخباروں کا بنڈل نعل میں دبائے دھوپ کی شدت سے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ سلیم نے ایک مختصر سی نگاہ اس پر ڈالی اور سلام کرتے ہوئے سیدھا کاجا جان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ باورچی خانے میں آ کر چائے کا پانی رکھنے لگی۔ سلیم کو دیکھ کر ہی پتہ چلتا تھا کہ آج ہفتے کا دن ہے ورنہ دنوں، مہینوں اور تارینوں کا حساب کتاب رکھنا، اس گھر کے مکین عرصہ ہوا بھول چکے تھے۔

سلیم ہفتے بھر کے اخبار نہ جانے کہاں کہاں سے ڈھونڈ کر لاتا تھا۔ صرف کاجا جان کے لیے اور اب اسے رات گئے تک ان کے پاس بیٹھنا تھا۔ دنیا بھر کی خبروں پر تبصرہ سننے کے لیے، کاجا جان کے خیالات

اور آراء سے مستفید ہونے کے لیے۔

”پتا نہیں سلیم کوجا کاجان سے اتنا عشق کیوں ہے؟“

کمرے کے دروازے پہ ہوتی دستک کو سنتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔ ذرا دیر بعد سلیم کی سنجیدہ سی شکل باورچی خانے کے دروازے پر نمودار ہوئی۔

”کاجا کا دروازہ نہیں کھول رہے۔۔۔“ وہ الجھا ہوا تھا۔ مادرانے لمحہ بھر کے لیے اس کی بات سنی۔

”اگر سلیم کے آنے پر بھی دروازہ نہیں کھلا تو گویا اب صبح تک کوئی امید نہیں رکھی جاسکتی۔ پھر یہ چائے کا تکلف۔۔۔؟“ اس نے ہاتھ بڑھا کر چولہا بند کر دیا۔

”جب کبھی دل کو نہیں لگتی ہے۔ یہ دروازہ پہروں بند رہتا ہے۔ اب خدا جانے کمرے میں بیٹھے کب تک اپنے غموں کو روتے رہیں گے۔ سنا تھا وقت بہت سے زخموں کو بھر دیتا ہے۔ مگر یہاں تو خزاں بھی رلائی ہے اور بہار بھی، کوئی گھونسلہ بکھر جائے تو اداسی جو بن پر۔“

پھول مرجھائیں تو غم کا انت۔۔۔ چڑیا کا بچہ مر جائے تو ماتم شروع۔ ڈار سے کوئچھڑے تو واویلا، کوئی کہاں تک بہلائے ان کو۔ دیکھتے بھالتے بھی کچھ نہ کچھ ایسا ہو ہی جاتا ہے کہ۔۔۔“ اپنے خیالات میں الجھتے اس نے سر اٹھایا۔

سلیم اس کی خاموشی سے تنگ آ کر جانے کب کا چاکا تھا۔

☆☆☆

خشک دودھ کا ڈبا خالی تھا۔ اس نے مایوس ہو کر ڈبا واپس رکھا اور باورچی خانے سے باہر نکل آئی۔ ڈھلتی شام میں چائے پینے کو کتنا دل چاہا تھا۔۔۔ مگر۔۔۔

”آہ یہ مفتی۔۔۔ دال روٹی ہی چلتی رہے تو بڑی بات۔ وقت بے وقت ایسی عیاشی ہم لوگوں کو نصیب کہاں؟“

وہ چپ چاپ ابا کے کمرے میں آئی۔۔۔ اور بیٹھ کر کرسی جھلانے لگی۔

کاجا جان نے ابا کو کوئی کتاب پڑھ کر سناتے سناتے ہوئے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ کھڑکی سے باہر کسی بے رنگ منظر پہ نگاہ جمائے وہ بہت بے زاری لگی تھی انہیں۔

”کیوں بھی۔۔۔ وہ چائے پلانے کا ارادہ کیا ہوا ہٹو۔۔۔؟“ کتاب کے درمیان میں انگلی رکھے اسے عارضی طور پر بند کرتے ہوئے وہ اس کی طرف پلٹے۔

”دودھ ختم ہو چکا کا۔۔۔“

”وہ تو کئی روز پہلے کی بات ہے نادان۔۔۔ میں اتنے روز سے قبوے پر ہی توجی رہا ہوں“ انہوں نے ہنسی میں بات اڑائی چاہی مگر وہ مروٹا بھی ان کا ساتھ نہیں دے سکی۔

”لیکن مجھے قبوہ اچھا نہیں لگتا۔“

اس کی بات پر کاجا جان لمحہ بھر کے لیے چپ سے ہو گئے۔

”کوئی شربت ہی بنا لو۔۔۔“ گھڑی بھر بعد انہوں نے متبادل پیش کیا۔

”کون سا بناؤں؟ بادام کا۔۔۔؟ انار کا۔۔۔؟ یا مالٹوں کا۔۔۔؟“ معلوم نہیں اس نے شرارت کی تھی یا طنز۔۔۔ کاجا جان پھسکی سی ہنسی ہنس دیے تھے۔

اگلے روز جب وہ جھاڑ پونچھ کر ان کے سب اخباروں کو ترتیب سے رکھ رہی تھی انہوں نے آواز دے کر بلا لیا۔ اپنے آس پاس بے شمار صفحات پھیلانے، اپنے ضروری اور غیر ضروری کا غذات الگ کرتے ہوئے انہوں نے عینک کے موٹے عدسوں کے پیچھے سے گھورا۔

”یہ سارا دن کن کاموں میں الجھی رہتی ہو تم جب کہ کرنے کے سب کام جوں کے توں پڑے ہیں۔“ انہوں نے کاغذوں کا ایک پلندا نکال کر اس کے سامنے میز پر بچھا۔

”کئی روز قبل تم سے یہ کالم عبداللہ ظفر کی میز تک پہنچانے کے لیے کہا تھا۔ اب یہ اتفاقاً میرے سامنے نہ آ جاتا تو یو بی کاغذوں کے ڈھیر میں خدا جانے کب تک دفن رہتا۔“

”وقت کیا ہوا ہے؟“ انہوں نے اپنی کلائی پہ بندھی گھڑی پہ نگاہ ڈالی اور پھر دیوار پر لگے کلاک کو دیکھا۔ دونوں کی سوئیاں رکی ہوئی تھیں۔ انہوں نے کلائی سے گھڑی اتار کر میز پہ دھیرے سے ٹھوکی اور پھر اس کی سوئیاں گھمانے لگے۔

”بہر حال۔۔۔ ابھی بیٹھا ہو گا وہ دفتر میں۔ تم یہ کالم لے جاؤ۔“ ان کی پوری توجہ اپنی گھڑی کی جانب تھی۔ وہ چند لمحے گھڑی انگلیاں جٹھائی رہی۔ تب انہوں نے نگاہ اٹھا کر اس کی ہچکچاہٹ کو جانچا۔

”بھی بکھار باہر کی فضا میں بھی سانس لے لینا چاہیے۔ کوئی حرج نہیں ہوتا۔“

”آپ خود چلے جاتے۔“ اس نے ایک بار پھر جان بچانا چاہی۔

”بھائی جان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ میرا گھر پہ بکھڑا ہی مناسب ہے اور یوں بھی مجھے ڈر لگتا ہے بڑا! کہیں تم اس گھر کی تنہائی کا نوالہ ہی نہ بن جاؤ۔ صبح وشام ان درختوں میں گھومتے پھرتے کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری جڑیں زمین کے اندر تک اتر جائیں اور پندے تمہاری شاخوں پر گھونسلہ بنانے لگیں۔“

ان کا لہجہ ڈرا ہوا تھا اور آنکھیں پر غم۔۔۔ وہ اپنے ناخن سے میز کی سطح کھرپٹنے لگی۔

”بھئی تمہیں اداس اور خاموش دیکھوں تو۔۔۔“

”آپ میری بہت فکر کرتے ہیں کا کا۔۔۔“ انہیں جذباتی ہوئے دیکھ کر اس نے بات کاٹ دی۔

”بھائی جان کے بعد میرے لیے صرف تم ہی تو ہو۔۔۔ تمہیں دیکھ کر اپنے سو غم بھولتا ہوں بڑا! تم کیا جاناؤ تم میرے لیے کیا ہو؟“ ان کی آواز مدھم بڑھ گئی۔ وہ کاغذوں کا پلندا اٹھا کر باہر نکل آئی۔

آسمان گدلا سا ہوا تھا اور فضا میں ہر طرف گرداڑ رہی تھی۔

”گھر سے نکلتے ہی آندھی آگئی تو۔۔۔؟“ تیز ہوا سے درختوں کے پتوں کو شور کرتے دیکھ کر اس نے سوچا۔ مگر ہوا کی خوشگواریت گھر سے نکلنے پر مجبور کر رہی تھی۔ سو وہ بڑے اطمینان سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

”بس کے تکلیف دہ سفر اور پھر بے شمار سیڑھیاں چڑھنے کے بعد وہ اخبار کے دفتر میں پہنچی تو یہاں کے کھٹن زدہ ماحول نے اسے مزید کوفت میں مبتلا کر دیا تھا۔ ہر میز پہ دو چار لوگ سر جوڑے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ چند ایک چلا چلا کر دفتر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک اپنی آواز پہنچا رہے تھے۔ ایک نو عمر لڑکا میز کے نیچے گھس گھس کر چائے کے خالی کپ نکال رہا تھا۔ سگریٹ کا دھواں اور کاغذات کے انبار کی ناگوار سی مہک۔

کا کا جان کہا کرتے تھے۔۔۔ کسی زمانے میں یہ اخبار ملک کے نمبر ایک اخباروں میں شامل ہوتا تھا۔ ہاں ہوتا ہو گا۔۔۔ مگر وہ تو جب سے دیکھ رہی تھی تب سے ایسا ہی تھا۔ معلوم نہیں اس ادارے کے

لوگوں کے علاوہ بھی کوئی اسے پڑھتا تھا کہ نہیں۔ اس کی آمد کا جائزہ خاصے ناقدانہ انداز میں لیا گیا تھا۔ وہ سیدھی عبداللہ ظفر کے سببن میں گھس گئی۔ اپنے کسی ملازم پر خوب ہی برس کرہا پڑتے ہوئے انہوں نے یہاں وہاں میز پہ ہاتھ مارتے ہوئے اپنی عینک ڈھونڈ کر ناک پہ لٹکانی اور اس کا بغور جائزہ لینے لگے۔ اس نے اپنا تعارف کرائے بغیر کالم ان کے سامنے رکھ دیا۔ ایک سرسری نگاہ ڈال کر انہوں نے بس کالم نگار کا نام پڑھا اور پھر ان کا غذات کو میز کی سب سے چمکی دراز میں ڈال دیا۔

”نو شیرواں ہم سے پردہ کرنے لگا ہے کیا؟“ وہ اب پُرسکون تھے۔ مادر اکو اس بات کا کوئی جواب سمجھ میں نہیں آیا تو چپ بیٹھی رہی۔

”اس سے کہنا، اب بات بہت پرانی ہو چکی ہے۔ لوگوں کو سقوطِ ڈھاکہ میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ لکھنا ہے تو سقوطِ بغداد پہ لکھے، فلسطین کے، کشمیر کے مسائل پہ لکھے۔ جو بیت گیا سو بیت گیا۔ لوگ اسے پڑھنا چاہتے ہیں جو ہو رہا ہے۔ آج کے دکھوں پر ماتم کرے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے نونے میں اب کوئی دم غم نہیں رہا۔ عرصہ ہوا یہ آگ سرد ہو چکی۔ اب تو نئے آتش فشاں نگاہوں کے سامنے ہیں۔“

وہ اپنے بے لگ انداز میں بول رہے تھے۔ مادر انہیں شک بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی۔

”کیا واقعی ایسا ہی ہے۔ جیسا یہ کہہ رہے ہیں؟“

”نو شیرواں صاحب کو ہمارا بہت سلام کہنا اور ہماری طرف سے یہ انہیں دے دینا۔“

عبداللہ ظفر نے قدرے ترچھا ہو کر غالباً اس سے چھپاتے ہوئے اپنے بڑے میں سے کچھ رقم نکالی۔ میز کی دو چار درازیں کھنگالنے کے بعد انہیں مطلوبہ چیز نہ ملی تو میز کی بالائی سطح پر ہٹا بول دیا۔ کچھ کاغذات ادھر ادھر گرے۔ پانی کا گلاس چھلکا۔۔۔ پیپر ویٹ لڑھک کر میز کے نیچے جا چھپا تب انہیں ایک لفافہ ملا جس میں وہ رقم ڈال کر انہوں نے مادر کے سپرد کی تو اس کے چہرے پہ ہلکی سی سرخی چھا گئی۔

”کالم لگ جاتا تو پھر۔۔۔“

”سنو لڑکی! نو شیرواں نے تمہیں کالم دیا، تم نے مجھ تک پہنچا دیا۔ میں تمہیں یہ رقم دے رہا ہوں۔ تم اسے نو شیرواں تک پہنچا دینا اب بتاؤ۔ اس معاملے میں اس سے زیادہ کوئی تعلق ہے تمہارا؟“

وہ براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے۔

ان کی بات درست تھی۔ لیکن انداز۔۔۔ وہ بری طرح شرمندہ ہو گئی۔

عبداللہ ظفر قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔ پھر اٹھ کر اس کے قریب چلے آئے۔

”اس دفتر کا ماحول اتنا شائستہ اور مہذب بھی نہیں کہ میں اپنی بیٹی کو چائے پلاؤں اور اس کی ناراضی دور کرنے کی کوشش کروں۔ اس کام کے لیے میں کسی روز تمہارے گھر آؤں گا۔ تاہم اتنا بتا دوں کہ یہ واقعی میرا اور تمہارے چچا کا معاملہ ہے۔ تم خواہو اس کے بیچ ناگ مت اڑاؤ۔ سمجھیں؟“ انہوں نے شفقت سے اس کا سر ہلایا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر انہیں سلام کرنی باہر آ گئی۔

”نو شیرواں سے کہہ دینا، باری آنے پر کالم لگ جائے گا۔“ انہوں نے پیچھے سے آواز لگائی۔

وہ میز ہیال اترتے ہوئے سر جھٹک کر مسکرا دی۔ جانتی تھی اور بہت سے کالموں کی طرح اس کالم کی باری بھی شاید کبھی نہیں آئے گی۔ اس کے ہاتھ میں روپے تھے۔ اور وہ مزید کچھ سوچ کر بدل نہیں ہونا چاہتی تھی اس لیے سیدھی بازار چلی آئی۔

موسم کے تیور بدلے بدلے سے تھے، لیکن پھر بھی وہ ان لمحات سے بہت لطف اندوز ہوئی۔ دکانوں کے شوکیس میں نئی چیزوں کو دیکھتے ہوئے بہت سا وقت بیت گیا۔ تب اس نے ٹھکن محسوس کرتے ہوئے واپسی کی ٹھانی۔ گھر آئی تو خشک دودھ کے بڑے پیکٹ کے ساتھ دال، چاول اور سلاد کے لیے کچھ بنریاں لائی تھیں۔ بقیہ پیسے کا کاجان کی دراز میں ڈال کر وہ چکن میں چلی آئی۔ رات کو اچار اور سلاد کے ساتھ دال چاول کھاتے ہوئے وہ خوشگوار موڈ میں چپک رہی تھی۔ کاجان اور اباس کی باتیں سن کر مسکراتے رہے۔

☆☆☆

”بھئی سلیم! تم جو ہر وقت اپنی یونیورسٹی میں دندناتے پھرتے ہو تو کیا ہماری ماورا کا داخلہ نہیں کروا سکتے وہاں؟“ کاجان کی بات سن کر حوض کے کائی زدہ پانی سے نگاہ ہٹاتے ہوئے اس نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا۔

وہ دونوں لکڑی کی بوسیدہ کرسیاں گھاس پہ ڈالے بیٹھے تھے اور بے رنگ میز کا کاجان کے ادھورے مسوے دوں اور ردی سے لائے گئے اخباروں سے بھرا ہوا تھا۔ صبح کا وقت تھا اور آم کے کچے پور سے مہکتی فضا پیری کے انتہائی گھنے اور طویل قامت درخت سے سرخ کچے ہوئے بیر پٹاپ زمین پہ گر رہے تھے۔ جنہیں چن کر وہ دھونے کے لیے ذرا دیر کو یہاں رکی تھی کہ کاجان کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

سلیم ان کی بات سن کر ذرا سا چونکا۔ ایک نظر انہیں اور حیران ہوتی ماورا کو دیکھنے کے بعد وہ ان کے کالم کھول کر بغور جائزہ لینے لگا۔

”داخلہ تو ہو سکتا ہے کا! اگر آپ چاہیں۔“ وہ سنجیدگی سے کہتے ہوئے اٹھا اور ان کا قلم دھونے چل دیا۔

ماورا، کاجان کی دماغی حالت پہ شبہ کرتی ان کے قریب چلی آئی۔

”ابھی کیا کہہ رہے تھے آپ؟“

کاجان بغیر جواب دیے اخبار کھگانے لگے تھے۔

”گھر کیسے چلے گا۔۔۔؟ اباجان۔۔۔ ان کی دیکھ بھال، کھانا پکانا۔۔۔؟“

”پہلے سارا کچھ تم ہی کرتی ہو؟“ انہوں نے اخبار تہہ کر کے رکھا اور بیروں کی ٹوکری اپنی طرف کھسکا لی۔

”ٹھیک ہے۔ آپ بھی بہت مددکرواتے ہیں لیکن۔۔۔“

”گوئی بوا سے کہہ دوں گا آجیا کرے گی۔“ ان کا اطمینان ماورا کو کسی طور ہضم نہ ہو رہا تھا۔

(تو کیا یہ سوچ سمجھ کر طے کیے بیٹھے ہیں کہ) وہ کچھ لمحوں کے لیے خود سے ابھی، اس کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے کاجان ذرا سا مسکرائے۔

”گھر کی فکر کیوں کرتی ہو؟ میں یہی تو ہوتا ہوں سارا دن۔ تمہیں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا کچھ اور پریشانی ہو تو کہو؟“

سلیم قلم دھو کر نیا کور کر لانے کے بعد اب اس میں روشنائی بھر رہا تھا۔

”سکتائیں، فیسیں، کپڑے، روز آنے جانے کا کرایہ۔۔۔“ اس نے بہت سوچ سمجھ کر مسئلہ اٹھایا۔

”سکتائیں خریدنے کی ضرورت ہی کیا ہے، لائبریریاں بھری ہوئی ہیں کتابوں سے۔ کپڑوں کے ایک دو جوڑے بھی بہت، کوئی فیشن شو میں تھوڑی جانا ہے۔ آجانا لاکھ بس یہ۔۔۔ باقی رہ گئی فیس، تو دو سال کے لیے کہیں نوکر دو کر دیا جاتا ہے۔ کر لیں گے کچھ روز محنت، مزدوری۔“ وہ مزے سے ہیر کھا کر گٹھلیاں پھینک رہے تھے۔

”اب یہ کام کریں گے آپ۔“ اس نے ناراضی سے انہیں دیکھا تو وہ جانداری ہنسی ہنس دیے۔

”ارے بھئی میں کون سا سچ مچ کرنے جا رہا ہوں۔ اب اتنا دم خم کہاں۔ ہاں وہ کرامت علی ایک عرصے سے پیچھے پڑا ہے۔ ایک، دو ناول لکھ دیتا ہوں اس کو۔۔۔ نام اس کا، دام ہمارے۔“

وہ جل بھن گئی تھی ان کے ارادوں پر۔

”وہی ناول جو اپنی پونجی سے شائع کرانے کی حسرت ایک عرصے سے دل میں لیے بیٹھے ہیں آپ، آخر ایسی کون سی آفت، قیامت آگئی ہے جو مجھے یونیورسٹی بھجوانے پر تلے ہیں آپ۔۔۔ اور اب جان بھی کبھی راضی نہیں ہوں گے۔ خود میرا دل نہیں چاہتا پڑھنے کو۔ بس بی۔ اے بہت ہے۔“ اس نے ختمی فیصلہ سنایا۔

”تمہارے لیے بہت ہو گا بی۔ اے، ہمارے لیے نہیں ہے۔“ ان کا اطمینان برقرار تھا۔

”تو پھر آپ ہی جایئے یونیورسٹی۔ میرا کوئی ارادہ ہے نہ شوق۔“ وہ بدتمیزی سے کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”جائیں گی تو بٹو آپ ہی۔“ وہ اس کے پیچھے چالاک سی ہنسی منے تھے۔ اپنے کمرے کی طرف جاتی ماورا کو غصہ آیا تو دل میں ان کی بات نہ ماننے کا پکا فیصلہ کر لیا۔ مگر وہ کاجان ہی کیا جو دوسرے کو اس کے ارادوں پر کاربند رہنے دیں۔

دو تین روز تک قلم ہاتھ میں لیے وہ سفید کاغذوں کو سیاہ کرتے رہے۔ کھانے پینے کا ہوش نہ تھا۔

بہت ہوتا تو اٹھ کر اپنے لیے کالی بھجنک چائے بنائی یا غائب دماغی سے دو چار قہقہے لے کر برتن کھسکا دیے۔ ماورا سے کبھی سیدھے منہ بات نہ کی، سلیم آیا تو اسے ڈانٹ کر بھگا دیا۔۔۔ وہ مکمل یکسوئی چاہتے تھے۔

ماورا نے تنگ آ کر اباس سے شکایت کی۔

وہ فاج کے مریض۔۔۔ بولنے سے قاصر۔

اس کے شکوے سن کر دھیرے دھیرے مسکراتے رہے۔ کاجان کی جاں نثاری پر ان کی آنکھیں

بھرا آئیں۔

”وہ جو کر رہا ہے، اسے کرنے دو۔ ورنہ مان ٹوٹ جائے گا۔“ انہوں نے اشاروں سے سمجھایا تو اس نے بھی چپ سا دھلی۔

چوتھے روز اس نے سلیم کو کاغذات کا پلندا لے جاتے دیکھا تو وہ نہ سکی۔ یونہی رنجیدہ ہی ہو کر کاجان کے پاس چلی آئی۔

”آپ اچھا نہیں کر رہے کا!“

”ہوا کیا تھا کا کا؟“ وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔
 ”ہوں۔“ کا کا جان نے چونک کر پرسوج نظروں سے اسے دیکھا اور پھر ٹالنے کے لیے بات ہی

بل گئے۔
 ”اب مجھے ہی دیکھ لو، پانچ جماعتیں پڑھا ہوں لیکن کوئی ڈگری نہیں۔ ناؤز، کالم، سوچ، سمجھ، دانائی
 سب ایک طرف۔ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا ہوں۔ ہوتی کوئی ڈگری ہاتھ میں تو کسی بڑے انگریزی اخبار
 میں آج بھی نوکری کر رہا ہوتا۔ آن بان سے زندگی گزارتے، یوں مرمر کر نہ جی رہے ہوتے۔“ ان کا لہجہ
 ہاروا تھا۔

”بہت سوں سے اچھے ہیں کا کا۔“
 ”کیا خاک اچھے ہیں بڑا! کیا دل نہیں چاہتا کہ بھائی جان کا علاج کسی اچھے بڑے اسپتال میں
 ہوتا، اب تک بھلے چنگے ہو چکے ہوتے۔ تمہیں دیکھتا ہوں تو عجیب بے بسی کا احساس ہوتا ہے۔ سوچتا
 ہوں، بھائی جان ٹھیک ہوتے تو کیا عیش و آرام کی زندگی ہوتی تمہاری۔“ انہیں اپنی ذمہ داریوں سے
 بڑھ کر اپنی بے بسی کا خیال رلاتا تھا۔

”اب مجھی کوئی کمی تو نہیں ہے کا کا! ابا ٹھیک ہوتے، تب بھی میں اتنی ہی مطمئن، پرسکون اور
 خوشحال ہوتی، جتنی اب ہوں۔ آپ مجھی تو میرا اتنا خیال رکھتے ہیں۔ مجھی کسی چیز کے لیے ترسے نہیں
 دیا۔“ وہ ان کا ہاتھ تھامے سچے دل سے کہہ رہی تھی۔

”تو پھر تم میری بات مان کیوں نہیں لیتیں۔ میں واقعی تمہارے لیے کوئی کمی نہیں چاہتا۔“ وہ پھر
 سے اپنی بات پر آ کر کہے تھے۔ اس نے گہری سانس لی۔
 ”مان تو رہی ہوں کا کا! حالانکہ میرا پڑھنے کو دل نہیں چاہتا۔“

”سلیم تمہارے کاغذات جمع کرادے تو پھر تم اس کے ساتھ جا کر یونیورسٹی دیکھ آنا۔ بہت اچھا اور
 زمدار لڑکا ہے وہ۔ تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہونے دے گا۔“

☆☆☆

بہت عرصہ پہلے کی بات نہ تھی۔ کا کا جان ”کتاب گھر“ کے بیچے بیٹھے بازار کی رونق دیکھ رہے
 تھے۔ سلونی شام تھی، غروب ہوتے سورج کی سرخی سامنے مسجد کے میناروں کو دکھا رہی تھی۔ فضا میں
 اترتی ٹھنڈک کلیوں اور گلابوں کی خوشبو سے لبریز۔ وہ کسی سوچ میں محو تھے اور پھولوں کے ہار، گجرے
 بیچنے والے کے بعد دیگرے ان کی نگاہوں کے سامنے سے گزرتے چلے گئے تھے۔

تب ہی ایک نوجوان لڑکا دکان میں داخل ہوا۔ بھٹی صاحب رومی کی کتابوں کے ڈھیر میں گم کا کا
 جان کی مطلوبہ کتابیں تلاش کر رہے تھے، جب اس لڑکے نے کاؤنٹر بجا کر انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ
 اپنی کتاب کے بارے میں پوچھ رہا تھا جس کے لیے اس نے کافی عرصے سے جتنی صاحب کو کہہ رکھا
 تھا۔

”وہ کتاب نہیں مل رہی بچے!“ بھٹی صاحب کے لاپرواہی سے دیے گئے جواب سے لڑکے کے
 چہرے پہ مایوسی پھیل گئی تھی۔

کا کا جان دو تین روز سے اس لڑکے کو باقاعدہ چکر لگاتے دیکھ رہے تھے۔ اس کی اداسی کو شام کے

وہ تھکن زدہ سے پاؤں پیارے لیٹے تھے۔ وسط اپریل کی دوپہر میں خاموشی رچی تھی اور کھلی کھڑکی
 سے گندم کے پکے ہوئے خوشنویں کی سنہری مہک گرم ہوا کے ساتھ کمرے میں آرہی تھی۔
 انہوں نے کچھ دیر بڑی سپاس کی نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر اس کی اداسی کو محسوس کرتے
 ہوئے فوراً ہی نرم پڑ گئے۔

”کیا تمہیں لگتا ہے کہ میں تمہارے لیے برا کروں گا؟“ اسے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے انہوں
 نے گنجھیر۔ سی سنجیدگی کے ساتھ یہ سوال کیا تھا۔

”میرے لیے نہیں مگر اپنے لیے۔“
 ”شش۔۔۔“ انہوں نے فوراً ہی اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ”تمہیں کیا معلوم میرے لیے

کیا اچھا ہے، کیا برا۔ نادان ہو بالکل۔“ انہوں نے ہلکی سی ڈانٹ پلائی۔
 ”نادان ہوں، بے حس نہیں۔ آپ نے اپنے خواب بیچ دیے اونے پونے داموں، صرف میرے
 لیے کا کا جان! میرا دل کتنے لگتا ہے جب میں سوچتی ہوں کہ آپ کے خیالوں پر، آپ کے لفظوں پر کسی
 اور نام۔۔۔“ روکتے روکتے بھی آٹسو بہہ نکلے تھے۔

کا کا جان اس کے ہاتھوں پہ گرتے شفاف آنسوؤں پہ نگاہ جمائے بیٹھے رہ گئے تھے۔
 کتنا اطمینان حاصل ہوتا ہے، جب کوئی آپ کے لیے روئے، تڑپے آپ کے لیے آنسو بہائے۔
 یہ بات کتنی تسکین بخش ہے کہ دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو آپ کا دکھ جانتے ہیں، سمجھتے ہیں اور پھر رو
 دیتے ہیں۔

کا کا جان نے ایک طویل سانس لی، ان کے چہرے پہ پھیلی آسودگی دیکھنے کے لائق تھی۔
 ”نگلی! میری ساری پوٹی تو تم ہو۔ میرے سارے خواب، سارے خیال تم ہی سے وابستہ ہیں۔
 پڑھ لکھ کر کچھ بن جاؤ تو پھر دیکھنا میرے ہر شاہکار پر میرا ہی نام ہوگا اور یہ لفظ ختم تھوڑی ہوتے ہیں۔ تب
 تک کچھ اور لکھا، کچھ اور عمر رسیدہ ہو جائیں گے۔ کہانی کو جھڑنا آجائے گا انہیں۔ دو سال کی ہی بات
 ہے پھر میں تخلیق کروں گا، تم تشہیر۔“

”ایک ڈگری لے کر کون سی دنیا فتح کروں گی میں۔ آپ بھی پتا نہیں کیا کیا سوچ لیتے ہیں۔“ اس
 نے بے دردی سے آنسو گڑے۔

”ڈگری بڑے کام کی چیز ہوتی ہے بڑا! علم ہونہ ہو ڈگری ضرور ہونی چاہیے۔ اسی کے بل پہ عہدہ ملتا
 ہے، اس سے وزارتیں ملتی ہیں۔ اس ایک دستاویز کے زور پہ میں نے لوگوں کو راتوں رات محل کھڑے
 کرتے دیکھا ہے۔“

”ابا بھی تو بہت پڑھے لکھے تھے کا کا!“ اس نے انہیں خوش فہمیوں کے جال سے نکالنا چاہا۔

”ہاں۔ پر ان کا سارا علم، ساری قابلیت، ساری ڈگریاں ایک من چاہی غلطی کی نذر ہو گئیں۔ دوش
 ان کا نہیں، قصور ان کی قسمت کا تھا یا پھر اس سماج کا۔ جو ان کی غلطی معاف کر دینے کا ظرف نہیں
 رکھتا تھا۔ کسی زہر آلود عضو کی طرح انہیں اپنے جسم سے کاٹ کر پھینک دیا۔ تا عمر پچھتاوے میں جنے
 ہیں۔ رہی سہی کسر پیدا کرنے والے نے پوری کردی۔ انسان تقدیر کے چکر میں آجائے تو اس کا اپنا بس
 نہیں چلتا۔“ وہ بات کرتے ہوئے کہیں کھو سے گئے تھے۔

رنگوں میں گھٹتے دیکھا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”کتا میں نکال کر الگ سے رکھ لینا بھئی! میں چند روز میں دوبارہ چکر لگاؤں گا۔ آؤ میرے ساتھ۔“ وہ بھئی صاحب کے بعد اس نوجوان سے مخاطب ہوئے وہ قدرے حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگا۔
”چلے جاؤ! فائدے میں رہو گے۔“ بھئی صاحب نے ٹھوکا دیا تو وہ کچھ نہ سمجھنے کے باوجود ان کے پیچھے چل دیا تھا۔

ایک طویل راستہ پیدل چلنے کے بعد وہ جس گھر تک آئے اس کا بڑا سا دروازہ لکڑی سے بنا ہوا تھا۔ دروازہ کھلتے پر ایک مختصر سی روش سامنے آئی جس کے دونوں اطراف کی پچی زمین گھاس سے اُلی ہوئی تھی۔ سبز قلعے میں آم، آڑو اور انار کے درختوں کی بہتات تھی۔ آڑو اور انار کے درمیانے قد کے درختوں کی شاخیں باہم یوں پیوست تھیں کہ کچے سبز آڑو کے ساتھ ہی انار کے سرخ شگوفے کھلے ہوئے تھے۔ اس سبز قلعے کا آدھا حصہ اس طویل قامت پیری کے درخت نے گھیر رکھا تھا جس کی شاخیں جھک کر ایک جھاڑ کی صورت میں زمین پر آ رہی تھیں۔ گھنی پیری کے نیچے کا حصہ دن کی روشنی میں بھی تاریک تھا۔ آم کے درخت کے نیچے چھوٹا سا حوض جس پر جا بجا خشک پتے تیر رہے تھے۔ سامنے برآمدے کے خرابی دروازوں پر سینٹ کی جالیاں لگی تھیں اور ان سے پرے کمروں کی قطار، بے رنگ و روغن، بوسیدہ دروازے، بے ترتیب کیاریاں، قدیم درختوں کی شاخوں سے لپٹی ہیبت ناک سی خاموشی جو کی زہریلے ناگ کی طرح پھنک رہی تھی۔

سلیم کو خود سے دو قدم آگے چلتا ہوا شخص کوئی بدروح معلوم ہوا تھا اور یہ سارا گھر کی آسب کا مسکن۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل چاہا تھا کہ وہ پلٹ کر بھاگے اور اس گھر سے بہت دور جا کر نئی دم لے مگر اس دوران وہ شخص اسے ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آنے کی دعوت دے چکا تھا۔

اس نے جھنجکتے ہوئے دروازے سے اندر قدم رکھا۔ کمرے کے اندر بھی سانے کا وہی عالم تھا۔ وہ چپ چاپ کونے کی دیوار سے جا لگا۔

اس شخص نے جیب سے چابی نکالی اور کمرے میں موجود لکڑی کی واحد الماری کھولنے لگا جس کے شیشے بے حد دھندلے تھے۔

چند لمحے بعد اس کی مطلوبہ کتاب اس کے سامنے تھی۔ وہ حد درجہ حیرت سے اس شخص کو دیکھ گیا۔
”تم پر اعتبار کر کے تمہیں یہ کتاب دے رہا ہوں امید ہے تمہیں نہیں پہنچاؤ گے۔ فی زمانہ کتاب سے زیادہ انسان کا انسان پر اعتبار زیادہ قیمتی ہے۔ بیٹھ جاؤ، چائے بنا کر لاتا ہوں۔“

عجیب بے نیازی تھی، انداز و اطوار میں، بات چیت میں۔

وہ ان کے جانے کے بعد کمرے کی خالی دیواروں، الماری میں بھری کتابوں، میز پر رکھے بہت سے مکمل، نامکمل مسودوں اور ان کے کھلے قلم کا جائزہ لیتا رہا جس کی نوک پر روشنی جم چکی تھی۔ وہ چائے لے کر آئے جو بیک وقت بہت کڑوی اور بہت میٹھی تھی۔ زیادہ پتی، زیادہ چینی۔ وہ پہلا گھونٹ لیتے ہی مسکرا دیا تھا۔

”میرا نام سلیم ہے۔“ اس نے بہاں مرتبہ خوف اور ہچکچاہٹ کے بغیر انہیں دیکھا تھا۔
”مجھے سب کا کا جان کہتے ہیں۔“

”کیا میں اکثر آپ سے ملنے کے لیے آ سکتا ہوں؟“
”تمہارا دل چاہے تو ضرور۔“

☆☆☆

یونیورسٹی میں پہلا دن اور سلیم اسے لان میں بٹھا کر غائب۔ ہوا بالکل بند تھی۔ ماحول میں جس اور قدرے پیش نے اسے حد درجہ پر زار کر دیا تھا۔ فائل میں سے چند پیپرز نکال کر جھلتے ہوئے وہ اپنے سامنے آتے جاتے اسٹوڈنٹس کو دیکھتی رہی۔

”ابھی نکلے یہاں سے اور بھاگتے ہوئے گھر پہنچ جاؤں۔ بھاڑ میں چائے یونیورسٹی، ڈگری اور بڑھائی۔ ارے اس وقت آم کی چھاؤں تلے کیا مزے سے سستایا کرتی تھی۔ کا کا جان کو بھی عجب میٹھی۔ کیسی مشقت میں الجھا دیا۔ اب یہاں کتابوں سے مغز ماری کیا کروں گی۔“ اس نے دوپٹے کے بلے ماتھے پر آیا پسینہ پونچھا۔

”اور یہ سلیم کو دیکھو، کا کا نے کہا تھا تمہارا خیال رکھے گا، کوئی پریشانی نہ ہوگی اور حضرت دو گھنٹے سے غائب۔“ اس نے اٹھ کر ایک چھوٹا سا چکر لگا کر یہاں وہاں سلیم کو ڈھونڈا۔ کسی منچلے اسٹوڈنٹ نے اپنے ہاتھ رکھ کر قدرے جھکتے ہوئے ”مے آئی، ہیلپ یوسیم“ کا نعرہ لگایا تو وہ چڑ کر دوبارہ اسی منچ پر آگئی۔ تب ہی اسے احساس ہوا کہ اسے سخت جھوک لگ رہی ہے۔

صبح کا کا جان نے بھی کیسی غفلت میں اسے گھر سے نکالا تھا۔ سلیم کو دیر ہو رہی تھی۔ وہ خود تو منہ سے کچھ نہ بولا۔ کا کا جان نے ادھم مچا دیا تھا۔ ماور کو اگر پہلے سے خبر ہوتی کہ آج یونیورسٹی جانے کا پروگرام ہے تو نماز کے بعد ہی سے تیاری شروع کر دیتی۔ مگر قصور تو سارا کا کا جان کا تھا جو سلیم کے ساتھ پروگرام بنا کر اسے بتانا بھول گئے تھے اور اب سب سے زیادہ آفت بھی انہوں نے ہی مچائی ہوئی تھی۔ جب تک بارا پکڑے بدل کر آئی، وہ اس کے تمام ضروری کاغذات فائل میں لگا چکے تھے۔ بقیہ چیزیں سلیم کو تمامیں اور وہ دونوں گھر سے باہر۔ ناشتا بھی نہ کرنے دیا۔

”اور یہ سلیم۔۔۔ یہ بھی تو کا کا جان کا ہی چیلہ ہے۔ اب ہے کوئی احساس۔ ایک لڑکی ذات کو تنہا یہاں بٹھا کر خود بخود نے کہاں کہاں آوارہ گردی کر رہا ہوگا۔“

اس نے تھک کر پہلو بدلا۔ اکتاہٹ اور بے زاری کے بعد ذہن پہ چھائی غنودگی نے اس کی آنکھوں میں سرخی بھردی۔

تب ہی دور سے سلیم آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ کوفت بھرے انداز میں اسے قریب آتا دیکھتی رہی۔
”میں جمع ہوگئی، یہ رہی رسید، یہ رول نمبر سلپ، یہ کلاسز کا شیڈول۔“ اس نے سارے کاغذات ایک ایک کر کے اسے تھمائے۔

”یہ کچھ نوٹس ہیں اور یہ چند کتابیں۔ ابتدائی طور پر ان ہی سے مدد ملے گی۔ بعد میں ڈھونڈنے سے بھی نیٹس ملا کر تیں۔ انہیں اسٹڈی کر کے جائیں گی کلاس میں تو بہت مدد ملے گی۔“

مادرانے بے دلی سے ساری چیزیں تھام کر گود میں رکھ لیں۔ سلیم نے ایک نظر اس کے اکتائے نوٹس پر ڈالی اور پھر بیچ کے دوسرے سرے پر جا بیٹھا۔ مادرانے گردن گھما کر اسے دیکھا۔

”آپ مجھے یہاں بٹھا کر بھول گئے تھے یا آپ کے پانچ منٹ سے مراد پانچ گھنٹے ہوتے ہیں۔“

ہاتھیں کر کے وہ اٹھی تو کا کا کمرے میں موجود نہ تھے۔ وہ کوئی خاص توجہ دیے بغیر باورچی خانے میں آگئی۔ صبح کی ٹھنڈی روٹی پر آم کی چٹنی رکھی۔ ساتھ میں گرم چائے کا کپ بنایا اور مزے سے کھا کر باہر آگئی۔

فضا میں جس جوں کا توں موجود تھا۔ درختوں کے پتے ساکت اور ان کی شاخوں میں دکی چڑیاں بے زار لگ رہی تھیں۔ اس نے شہوت کے درخت کی شاخوں میں پھنسا کٹورا نکال کر دیکھا۔ بالکل خشک، گرد آلود، وہ حوض کی طرف آگئی۔ کٹورا دھو کر اس میں صاف پانی بھرتے ہوئے اسے ایک درخت کی اوٹ میں کا کا کی جھلک دکھائی دی۔ اس نے قدرے حیران ہو کر دیکھا اور کٹورا شاخوں میں دوبارہ پھنسا کر پیچھے سے گھوم کر کا کا جان کے سامنے آگئی۔

”ارے۔“ اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔
وہ درخت سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ سر جھکا ہوا اور یہ مولے مولے آنسو ہاتھ کی پشت پر پٹاپٹ برس رہے تھے۔

”کا کا جان!“ اس نے ایک دم ان کے قریب اٹھ کر ان کا چہرہ اوپر کیا۔ آنکھیں سرخ اور سو جی ہوئی۔ آنسو ان کے پورے چہرے پر پھیلے ہوئے تھے۔ کسی حساس بچے کی طرح چھپ چھپا کر، بغیر کوئی آواز نکالے وہ بہت زیادہ رو جکے تھے۔

”کیا ہوا ہے کا کا جان!“ انہیں اس حالت میں دیکھ کر ماورا کو لگا، وہ خود بھی ایک دم رو دے گی بغیر کوئی وجہ جانے۔

”بول کیوں نہیں رہے کا کا جان! کیوں رو رہے ہیں؟“ اس نے زور سے ان کا بازو جھنجھوڑا۔
”کچھ نہیں ہوا، یونی اپنی کوتاہی پر رونا آگیا۔“
”کیسی کوتاہی؟“

کا کا جان بغیر کوئی جواب دیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ بازو موڑ کر آستین سے آنسو پونچھے اور حوض پہ آکر منہ پر پانی کے چھپکے مارنے لگے۔

وہ چند لمحے منتظر رہی پھر اٹھ کر ان کے سر پہ جا پہنچی۔

”آپ بتا کیوں نہیں رہے کا کا! میں کچھ پوچھ رہی ہوں آپ سے؟“

”ارے کچھ نہیں بولا تم تو خواہو۔“ انہوں نے کترا کر نگل جانا چاہا مگر اس نے زبردستی روک لیا۔

”یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ یوں چھپ چھپا کر روتے رہیں اور کوئی آپ سے پوچھے بھی نا۔ یوں غیریت برتیں گے تو عمر بھر بات نہیں کروں گی آپ سے۔“ اسے سچ بچ غصہ آگیا تھا۔

کا کا جان چند لمحے ہونٹ کاٹتے رہے پھر بمشکل بولے۔

”سارا قصور میرا ہے۔ جوں جوں عمر بڑھتی جا رہی ہے، میں بھی سٹھپاتا جا رہا ہوں۔ پہلے سلیم کے ساتھ پروگرام بنایا تو تمہیں یونیورسٹی جانے کی اطلاع نہ کی۔ صبح پکڑ دھکڑ کر یونیورسٹی بھیجا تو ناشتے کا خیال نہ کیا، یعنی غلطی پہ غلطی۔ حالانکہ جانتا تھا، تمہارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ سلیم کو بھی صرف فیس کے پیسے دیے تھے، ورنہ وہیں سے کچھ دلادیتا۔ پتا نہیں کیوں مجھ سے ایسا ہو جاتا ہے، حالانکہ میں کرنا تو نہیں

”پانچ گھنٹے۔۔۔؟“ سلیم کی نگاہ کلائی پہ بندھی گھڑی پر پھسلی۔ اسے یاد تھا، وہ اسے پانچ منٹ میں واپس آنے کا کہہ کر گیا تھا۔

”بمشکل ایک گھنٹہ ہوا ہے۔ آفس میں رش بہت تھا۔ فیس جمع کرانے میں زیادہ وقت لگا پھر لائبریری سے بھاگ بھاگ کتابیں نکلاؤں۔ ایک دوست سے نوٹس لانے کا کہہ رکھا تھا۔ نعلیت ہی سب کام نمٹا کر آیا ہوں۔“ سلیم نے وضاحت دی تھی۔

ماورا کی کلائی پر گھڑی موجود تھی، مگر نہ وہ بھی اس کی بات کا یقین نہ کرتی۔

”اب ڈیپارٹمنٹ دیکھنے چلیں یا لائبریری؟“ سلیم پوچھ رہا تھا۔

”میرا خیال ہے، گھر چلتے ہیں۔“

”گھر۔۔۔؟“ سلیم نے تعجب سے اسے دیکھا۔

”اصل میں، میں نے ناشتا نہیں کیا تھا۔ بھوک، پیاس اور گرمی نے میرا برا حال کر دیا ہے۔“ اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ سلیم بری طرح شرمندہ ہو گیا۔

”مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ یہاں کینٹین ہے، میں آپ کو وہاں سے۔۔۔“

”نہیں، گھر ہی چلتے ہیں۔ فی الحال تو مجھے یہاں کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا۔ پتا نہیں ہر روز کیسے آیا کروں گی۔“ وہ بہت بد دل لگ رہی تھی۔

سلیم نے اصرار کرنا چاہا تھا مگر کچھ سوچ کر چپ ہو رہا۔ موڈ نہ ہو تو کسی بات پر وہ کا کا جان سے بھی ٹکرا کر لیا کرتی تھی۔ اس کا تو بالکل بھی لحاظ نہ کرتی۔ وہ چپ چاپ شرافت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مارے مردت کے یہ بھی نہ کہا کہ ابھی مجھے ایک بہت ضروری اسائنمنٹ جمع کرانی ہے۔ اس کے موڈ کا بھی کیا بھروسہ، بچے تھوڑا کر اس کے پیچھے پڑ جاتی۔

☆☆☆

گھر پہنچی تو ہر سو خاموشی تھی۔ سلیم اسے چھوڑ کر باہر سے ہی واپس چلا گیا تھا۔ وہ دے پاؤں چلتا ہوئی اما کے کمرے کی طرف آئی۔ وہ انہیں ڈرانے کا ارادہ رکھتی تھی مگر کا کا نجانے کہاں سے نکل آئے، اسے دیکھتے ہی غرہ بلند کیا۔

”آہا۔۔۔ آگئی ہماری بوا!“

وہ پہلے بری طرح ڈر کر اچھلی اور پھر ہنستی ہوئی کمرے میں بھاگ آئی۔
”ابا! میں آگئی۔“ وہ جاتے ہی ان سے لپٹ گئی۔ ابا کا کپکپاتا ہاتھ بمشکل اس کے سر پہ آکے ٹھہرا۔
”تمہارے بغیر دل بہت اداس ہو گیا تھا۔“ ابا نے آدھی بات زبان سے، آدھی اشاروں سے

سمجھائی۔

”اٹھیے بھائی جان! گیلے سے لگایے بیٹا کو۔ یوں منہ بسورتے ہوئے تو اسکول میں بھی پہلے دن نہ گئی تھی، جیسے آج یونیورسٹی گئی تھی۔“ کا کا جان نے آکر اسے چھیڑا۔

”جی اسکول کے پہلے دن مجھے ابا نے تیار کر کے بھیجا تھا۔ ناشتا بنا کر اپنے ہاتھوں سے کھلایا اور کھانا بنا کر ساتھ روانہ کیا تھا۔ آج تو ہمیں کا کا جان نے بھگتا یا تھا۔ بغیر ناشتے، بغیر چائے پانی کے۔“

اس نے شرافت سے کہتے ہوئے ان کے چہرے کی بدلتی رنگت کو نہ دیکھا تھا۔ ذرا دیر تک ابا

چاہتا مگر غلطی بس ہو ہی جاتی ہے۔“ ان کی آواز دوبارہ بھڑا گئی۔

ماورائے سر تھا مایا۔

”کیوں ایسی بات منہ سے نکالی۔ بے چارے کا کا جان کا دل توڑ دیا۔“ وہ جی بھر کر پچھتائی۔

”تم نے سارا دن بھوک میں گزارا ہوگا۔“ وہ دل کی باتیں زبان پہ لا رہے تھے۔

”پلیز کا کا۔“ ماورائے چیخ کر انہیں چپ کرادیا۔

”کیوں اتنے حساس ہو جاتے ہیں آپ! اتنی سنجیدگی سے لیتے ہیں آپ ایسی باتوں کو۔ مجھے جانتے نہیں ہیں کیا۔ کتنا فضول بولتی ہوں میں۔ کبھی تول کر نہیں بولی بلکہ بول کر بھی نہیں تولتی۔ جو منہ میں آتا ہے، کہہ دیتی ہوں۔ معنی و مطلب کی پروا کیے بغیر۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا آپ یوں سوچیں گے۔ قسم لے لیجیے جو دل میں ذرا سا بھی شکوہ ہو۔ بس یوہی زبان پھسل گئی اس پل اور پھر میں کوئی دودھ پیتی پچی تو نہیں جو اتنی سی بھوک بھی برداشت نہ کر سکوں گی۔ کا کا جان بہت برے ہیں آپ! آج تو حد کر دی ہے۔ کتنی شرمندگی ہو رہی ہے مجھے، آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔“ وہ چیخ پانی پانی ہو رہی تھی۔

کا کا جان اس سے بڑھ کر شرمندہ کہ بے چاری پچی پریشان ہو گئی۔

فورا ہی موڈ درست کر لیا۔ ہونٹ مسکرانے سے انداز میں پھیلا لیے۔ بات بدل ڈالی، یونہی یونیورسٹی کے متعلق پوچھنے لگے۔

ماورا ابھی تڑپتی رہی پھر کا کا جان، ابا کے پاس چلے گئے۔ وہ ابا کے لیے دلیہ پکانے کو اٹھ گئی۔ کام سے فارغ ہو کر کچن سے باہر نکلی تو موسم اپنا رنگ بدل رہا تھا۔ آسمان کا رنگ زردی مائل سرخ ہو رہا تھا۔ ہوا میں تیزی اور ٹھنڈک۔ گرد اڑا کر برآمدوں تک آ رہی تھی۔ اس نے بالٹی اٹھائی اور پانی بھر بھر کر برآمدے سے آگے کی پچی زمین پر چھڑکنے لگی۔

شاہِ مدینہ، شاہِ مدینہ

عطروں سے بڑھ کر تیرا پسینہ

شاہِ مدینہ، شاہِ مدینہ

بیری کی شاخوں میں چھپے طوطوں نے شور مچا رکھا تھا۔ وہ برآمدے کی سیڑھیوں پہ بیٹھ کر زور زور سے نعت پڑھنے لگی۔

ہوا میں مزید تیزی آ گئی تھی۔ درختوں کی شاخیں زور زور سے ہلکورے لینے لگیں۔ ماحول میں مٹی کی خوشبو رچ بس گئی تھی۔ اڑتی ہوئی گرد آنکھوں میں گھسنے لگی تو دوپٹہ کھینچ کر گھٹنوں تک تان لیا۔ یہ بچپن کی عادت تھی۔ نعت پڑھ کر بہت سرد ملتا تھا۔ ایک نعت ختم ہوئی، دوسری شروع۔

کوئی لفظوں میں کیسے بتائے

ان کے رتبے کی حد ہے تو کیا ہے

ہم نے اپنے بڑوں سے سنا ہے

صرف اللہ ان سے بڑا ہے

کسی نے سر پہ زور کی دھپ لگائی۔ اس نے ہڑبڑا کر گھونگٹ الٹا۔ شوں کی آواز کے ساتھ آندھی آئی اور دوپٹہ دور تک اڑا لے گئی۔ اس نے بمشکل ایک کونے سے تھام کر دوپٹہ سنبھالا۔

”بھاگ جاؤ کمرے میں پھر چیخ چیخ کر روؤ گی۔“ کا کا جان کمرے کے دروازے بند کر رہے

تھے۔

تیز آندھی نے دل دھڑکا دیا۔ ایسا موسم اسے بہت خوفزدہ کرتا تھا۔ ڈر کر بھاگی سیدھی ابا کے کمرے میں۔ وہ تنکے سے ٹیک لگائے بیٹھ کر رہے تھے۔ یہ فوراً ان کے کاندھے سے لگ کر بیٹھ گئی۔

کا کا جان دروازے کھڑکیاں بند کر کے اُٹے اور آتے ہی اس کا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔

”یونیورسٹی میں پڑھتی ہے اور آندھی سے ڈرتی ہے۔ واہ واہ۔۔۔ کیسی دلیر ہے ہماری بیٹی۔“

”بہت دلیر ہوں، درختوں کے پیچھے چھپ چھپ کر نہیں روتی، ہاں۔“ اس نے بھی ان کی کمزوری پکڑ لی تھی۔

”زیادہ باتیں مت بناؤ، ابھی ٹھوکریں مارتی ہوا آئے گی۔ سب دلیری دھری کی دھری رہ جائے گی۔ بہت خوفناک طوفان ہے۔ بارش بھی ہوگی، بادل بھی گرھیں گے۔“

شام کے چار بجے تھے اور باہر آدھی رات کا منظر۔ گردے اُٹے بادلوں نے قیامت کا شور مچا رکھا تھا۔ دن کی روشنی غائب تھی۔ ہر چیز پر سیاہی غالب۔ وہ سہم کر چپ ہو گئی۔ اباسلی آمیز انداز میں اسے تھکیاں دینے لگے۔

کا کا جان نے بھی بات بدل دی اور پوچھنے لگے۔

”یونیورسٹی میں کس کس سے ملیں، کسے دوست بنایا، کیا کیا دیکھا؟“

”لو، پہلے دن ہی دوستیاں گانٹنے بیٹھ جاتی۔ ابھی تو بس دو دروڑے ہی سب دیکھا اور دہاں کی لڑکیاں۔۔۔ کا کا کچھ مت پوچھیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک لباس۔ آپ تو کہتے تھے دو جوڑوں میں گزارہ ہو جائے گا لیکن وہاں تو واقعی فیشن شو لگتا ہے۔ اتنے اچھے اچھے کپڑے۔ لیجیے اب اور کیا کہوں۔ یہ سب بتاؤں گی تو آپ پھر حساس ہونے لگیں گے کہ بٹو کے پاس زیادہ کپڑے کیوں نہیں۔ سمجھیں گے کہ ماورا شکوہ کر رہی ہے۔ لو بھئی، ہم تو اُلٹی سیدھی کہنے سے بھی گئے۔ زبان پہ تالا لگانا پڑے گا اگر یہ یہی صورت رہی تو۔“

وہ بولتی رہی۔ کا کا دل پہ پتھر رکھ کر مسکراتے رہے۔

مفلوج ابا نے آنکھوں میں آبی نمی کو گرد کے بہانے پونچھا۔ تسبیح کے دانے بے ترتیب ہو کر ان کی کپکپاتی انگلیوں سے نکلتے گئے۔ اپنی بہت ہی بیماری بیٹی کے معصوم چہرے سے نگاہ ہٹا کر آنکھیں بند کرتے ہوئے انہوں نے دھکی دل کے ساتھ سوچا۔

”کاش میں کسی قابل ہوتا۔“

☆☆☆

تازہ کلیوں کی مہک ایکدم اس کی سانسوں میں شامل ہو گئی تھی۔ ہارون اسرار نے قطعی غیر ارادی طور پر اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے عین سامنے وہ لڑکی بیٹھی تھی اور یہ تیسری مرتبہ ہوا تھا کہ وہ اس لڑکی کو دیکھ کر ہٹک سا گیا تھا۔

”کیوں؟“ وہ سوچ میں ڈوب گیا۔

”اس لڑکی کے قطعی اجنبی خدوخال میں اتنی اپنائیت کیوں؟“

”ہر بار یہ چہرہ مجھے چونکا دیتا ہے۔ اپنی جانب کھینچتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ کہیں کوئی پرانی جان پہچان؟“ اس نے ہلکی کتاب پر سے نظریں ہٹا کر اس لڑکی کو دیکھا اور پھر اپنی یادداشت کو کھنگال کر کہیں کچھ بھی نہ تھا۔ بس وہی دو واقعات تھے جو ننھے جگنوؤں کی طرح ذرا ذرا سی دیر بعد دل و دماغ میں جل بھر رہے تھے۔

اسے یاد تھا، اس روز وہ پروفیسر افضال ناصر کے پاس کسی کام سے گیا تھا۔ کلاس روم میں داخل ہونے پر اسے پہلا چہرہ یہی نظر آیا تھا۔ پروفیسر افضال اپنی نئی کلاس سے تعارف حاصل کر رہے تھے اور یہ لڑکی کہہ رہی تھی۔

”مجھے نہیں معلوم مستقبل میں، میں اس ڈگری کو کس طرح استعمال کروں گی۔ میرے یہاں آنے کا خواب کسی اور آنکھوں نے دیکھا تھا۔ میں تو بس اس خواب میں رنگ بھرنے کو یہاں آ گئی ہوں۔“

”گویا تمہاری زندگی کے اہم فیصلے دوسرے لوگ با آسانی کر سکتے ہیں۔“ پروفیسر صاحب کا اندازہ یقیناً درست تھا مگر اس لڑکی نے بڑی سہولت سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے انہیں رد کر دیا تھا۔

”سب لوگ نہیں سر! لیکن جو شخص میرے حوالے سے دیکھے گئے ایک خواب کے لیے اپنے سب خواب بیچ ڈالے، اس کا ہر حرف میرے لیے حرف آخر ثابت ہوگا۔“

ہو سکتا ہے اس کے اور پروفیسر صاحب کے درمیان مکالمہ کچھ دیر اور جاری رہتا مگر پروفیسر صاحب اس کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ لڑکی سر جھکا کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔

اور ہارون اسرار کو یہ بھی یاد تھا کہ اس دن ایک چہرہ پل بھر کے لیے دن کے نجانے کس حصے میں اس کی نگاہوں کے سامنے گھوما بھی تو اسے یاد نہ آ سکا تھا۔ اس نے یہ چہرہ کب اور کہاں دیکھا تھا۔

”اے ہارون! کیا خیال ہے۔ یہ انیب جو ہداری اس باریوین کا ایکٹس۔۔۔“ احمد کیانی اس سے کچھ پوچھ رہا تھا۔

ہارون اسرار نے اپنے شعور میں ڈوبتی ابھرتی سوچ کا کونہ پکڑتے ہوئے احمد کیانی کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تھا۔

اور شخص دو دن قبل اس نے اس لڑکی کو کوریڈور میں ایک لڑکے سے ٹکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ لڑکا بہت عجلت میں تھا اور اس انداز سے اس سے ٹکرایا تھا کہ اس کی ہاتھ میں پکڑی فائل اور فائل میں رکھے بہت سے کاغذات کوریڈور میں بکھر گئے تھے۔ وہ اسی تیزی میں معذرت کے دو بول کہتا آگے بڑھ گیا تھا اور اس لڑکی کو سخت بے زاری کے عالم میں اپنے تمام کاغذات اٹھاتے دیکھ کر ہارون کو اس بدتہذیب لڑکے پر بلا کا غصہ آیا تھا۔ اس وقت یہ لڑکی اپنے تمام کاغذات اٹھا کر فائل میں لگانے کے بعد کلاس روم میں جانے کے بجائے وہیں کوریڈور کی سیڑھیوں پر آ بیٹھی تھی۔ فائل اس کی گود میں تھی اور بند مٹھی پہ چہرہ جمائے وہ گویا خود سے باتوں میں جو ہو گئی تھی۔

اور ہارون کو یہ بھی یاد تھا کہ اس روز، اس پل، اس نے یونہی بے وجہ ہی کوریڈور میں کئی چکر لگائے تھے۔

اس روز موسم بہت خوبصورت تھا اور بارش کی نمی سے لبریز ہوا اس روز بھی کلیوں کی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ وہ دھیرے سے مسکرا کر سیدھا ہو بیٹھا پشت کرسی سے ٹکا کر نگاہیں اس کے چہرے پہ جمادیں۔

اور آج تیسری بار وہ لڑکی اس کے سامنے تھی۔ لائبریری کے روشن اور پرسکون ماحول میں اپنے سامنے ایک کتاب کھولے وہ خود ایک بند کتاب کی مانند اسے متاثر کر رہی تھی۔ کلیوں کی بہت مدھم سی خوشبو آس پاس سرسرا رہی تھیں۔

”اس لڑکی کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ ان شاہزادیوں کا خیال آ جاتا ہے جو اپنے محل کے چہرو کے میں بیٹی، دریا پہ ڈولتی کشتیوں کے عقب میں ڈوبتے سورج کو دیکھا کرتی تھیں اور آداس رہتی تھیں۔“ احمد نے کتاب بند کر کے سامنے میز پر کھسکا ئی اور دونوں بازو سینے پر باندھ لیے۔

ہارون نے نگاہوں کا زاویہ بدل کر ایک نظر احمد کو دیکھا اور پھر کھلی کتاب کے کئی صفحات ایک ساتھ پلٹتے ہوئے پوچھا۔

”جانتے ہو اسے؟“

”کچھ خاص نہیں، بس اتنا ہی کہ اس کی آواز بہت اچھی ہے اور بولنے میں ایک خاص ردھم۔ میں نے ابھی تک اسے دوسرے اسٹوڈنٹس کے ساتھ کھلتے ملتے نہیں دیکھا۔“

احمد کیانی کھڑا ہو کر اپنی کتابیں سمیٹ رہا تھا۔

جبکہ ہارون اسرار کے اٹھنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

☆☆☆

سہ پہر کا وقت تھا۔ سلیم، کا کا جان کے ساتھ کھانا کھا کر ابھی ابھی گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تو جھوٹے برتن یونہی پڑے تھے۔ لمبی دم والی گلہری روٹی کا ننھا سا ٹکڑا اپنے ہاتھوں میں تھامے بڑی نزاکت سے کھا رہی تھی۔ ذرا سی آہٹ پر اس کا تیزی سے چلتا ہوا منہ ساکت ہوا اور اگلے ہی پل وہ باہر نکل گئی۔ ماورائے جھوٹے برتن اٹھائے، کمرے کو ذرا سا سیٹ کیا اور باہر نکل گئی۔ آج موسم اچھا خاصا گرم تھا۔ گرم ہوا بدن کو جھلسائے دے رہی تھی۔ اس نے ابا کے کمرے میں جھانکا تو انہیں قدرے بے چین دیکھ کر وہ تولیہ بھگولائی۔ چہرے، گردن، بازوؤں پہ گیلا تولیہ پھیر کر اس نے پگھلا تیز کرنے کی ناکام کوشش کی۔ ہزار بار مٹن گھمانے کے بعد بھی وہی رفتار رہی تو ابا بے اختیار مسکرا دیے۔ وہ بھی کھسیا کر پیچھے ہٹ گئی۔

”کن چونپلوں میں پڑی ہو، یہ دیکھو۔“ کا کا جان نے اندر آ کر بھگو کر پنجوڑی ہوئی چادر ابا کے اوپر ڈال دی۔ ہوائی آلودہ ٹھنڈک کے ساتھ ان کے بدن تک پہنچی تو ان کے چہرے پہ خود بخود آسودگی پھیل گئی۔ کا کا نے آگے بڑھ کر کھلی، کھڑکی بند کی۔ دروازے کے سامنے پردہ گرایا اور خود باہر نکل گئے۔ وہ وہیں بیٹھ کر کتابیں کھگانے لگی۔ نیم تاریک کمرے میں اسے کتاب پر جھکے دیکھا تو ابا باہر جا کر پڑھنے پر اصرار کرنے لگے۔ اس نے ساری کتابیں اٹھائیں اور کا کا کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ ان سے ایک اسائنمنٹ لکھوانا چاہ رہی تھی۔

”آخر ہمیں بھی تو کچھ فائدہ ہو۔“

مگر کا کا نے صاف انکار کر دیا۔

”پکا پکا حلوہ کھانے کا شوق ہے تو ابھی بنائے دیتا ہوں مگر یہ کام نہیں کرنے کا۔ استاد سے بے ایمانی۔“ تو بہ۔۔۔ سارا علم دھول مٹی، لیکچر دینے میں ان کا کوئی ٹائی نہ تھا۔

اس نے کتابیں کھینچ کر اپنے سامنے رکھ لیں۔

”کچھ مدد تو کروا سکتے ہیں کہ نہیں۔“ اس نے آخری حربے کے طور پر امید سے انہیں دیکھا۔ انہوں نے بڑے چست انداز میں اپنی الماری کھولی اور دو چار کتابیں اس کے سامنے رکھ کر خود باہر چلے گئے۔

”اوہ خدایا۔“ یہ موٹی موٹی کتابیں دیکھ کر اس کا دل ادب گیا۔ جمائی پہ جمائی آنے لگی۔ آنکھیں نیند سے بھر گئیں۔ اس سے پہلے کہ ان ہی کتابوں کو اوڑھ بچھا کر سوجائی کا کاجان پرچ میں چائے کا کپ کھڑکھڑاتے سر پہ آن پہنچے۔

”کڑک جائے۔“

”کا کا! اتنی گرمی میں؟“

”تو جاؤ، پہلے نہادھو کر تازہ دم ہو آؤ۔ یوں سست ہو کر پڑھنے لگیں تو ہو چکا کام۔ اٹھ جاؤ، ورنہ درجہ بھاپڑ لگا کر ساری نیند رخصت کر دوں گا۔“ ان کی آنکھوں سے سچ سچ کا غصہ چھلک رہا تھا۔

”تب تک تو چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔“ اس نے کپ تھاما اور چسکیاں لینے لگی۔ ساتھ ساتھ اسائنمنٹ کی آؤٹ لائن بھی تیار کر لی۔

”ایک کالم لکھ رکھا ہے۔ صبح لیتی جانا۔ واپسی پر عبداللہ ظفر کو دے آنا۔ صبح کے وقت تو وہ دفتر میں نہیں ہوتا۔“

کا کا جان کی بات سن کر اس کا چلتا ہوا قلم یکجہت تھم گیا تھا۔ کئی باتیں ایک ساتھ یاد آ گئیں تو اس نے خالی کپ آہستگی سے چٹائی پر رکھ دیا۔ کا کا جان کرسی پر اس کی طرف پشت کیے بیٹھے تھے۔ وہ کئی لمحے نہیں دیکھتی رہی پھر کتاب کی بے جان سطروں پر نگاہ جمادی۔

وہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ پچھلا کالم شائع ہو گیا؟ اگر نہیں تو ایک بار پھر کیوں؟ مگر پوچھنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ کتنے پل بیت گئے، تب جانے کیسے زبان پھسل گئی۔

”کا کا، کہتے ہیں سقوط ڈھاکہ کے نوے میں اب کوئی دم خم نہیں رہا، بات پرانی ہو گئی ہے اور یہ کہ اب اس آگ میں کوئی چنگاری باقی نہیں رہی۔“

کا کا جان اس کی بات سن کر چپ ہو رہے تھے۔ اتنی طویل چپ کہ اسے ان کی طرف سے کسی جواب کی امید نہ رہی۔ تب وہ بولے ابھی تو یوں گویا ہر سانس بچکی لے رہی ہو۔

”جسم کا کوئی حصہ کٹ جائے تو وقت صرف زخم بھرتا ہے، بخرومی کا کر بناک احساس کبھی دم نہیں توڑتا، خواہ دن گزریں یا ماہ و سال۔ جس نے جھپٹا ہوا، وہی جانتا ہے۔ ہنستے بستے گھروں میں ویرانی یوں اتری تھی کہ دل آج بھی کھنڈر ہیں۔ پر کیا کریں کہ جو دکھ میرا ہے، وہ میرا ہی ہے۔ اسے تم جان سکتی ہو، نہ کوئی اور۔“

ماورائے طویل سانس لے کر سر جھکا دیا۔ بے اختیار ہی ابا کی ڈائری کا لکھا ہوا ایک صفحہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا تھا۔

”دو ہفتے ہو گئے ہیں اور یہ نوجوان یہیں رہتا ہے۔ نیم دیوانہ، نیم پاگل سا، زیادہ تر غشی طاری رہتی ہے۔ ہوش میں آئے تو اس کا رونا دیکھا نہیں جاتا۔ رانیہ جی جان سے اس کی خدمت کرتی ہے۔ با

اوقات اس کے رونے کر لانے پر خود بھی رونے لگتی ہے۔ اسی کی منت سماجت پر گلی گلی اس کی شناخت کے لیے گھوما ہوں۔ تب جا کر معلوم ہوا کہ وہ تو اپنے تنکا تنکا بھرے آشیانے کا چلتا پھرتا نوحہ ہے۔ گھر بل چکا تھا اور ہر طرف اڑتی ہوئی راگھ نے آسان بھی دھندلا دیا تھا۔ آس پاس کے لوگوں نے بتایا کہ اسی راگھ میں نوشیرواں کی بیوی کی لاش بھی دبی تھی۔ اس بیوی کی لاش جس کی کوٹھ میں نوشیرواں کا سات ماہ کا بچہ بل رہا تھا۔ میں اس اجڑے بیباں سے نکل بھاگا۔ میرا بھی ایک گھر تھا جس میں میری بیوی میری منتظر تھی۔ یہ وحشت ناک سیاہ دھواں مجھے اپنے گھر کی طرف بڑھتا دکھائی دے رہا تھا۔ ایسا نہ ہو کہ میں دیر کر بیٹھوں۔ گھر پہنچا اور پھر رانیہ اور نوشیرواں کو لے کر سیدھا پاکستان آ گیا ہوں۔ جس دیوانے کو گھراٹھا لانے میں رانیہ سے خفا تھا، وہی شخص اب دل سے قریب محسوس ہونے لگا ہے۔ خوابوں، امیدوں اور تمنائوں کو کھود دینے والا انیس سالہ شخص۔ مظلوم و مقہور۔ کاش میرے پاس کوئی ایسی طاقت ہوتی کہ اس کی سیاہ آنکھوں میں بھرے آنسوؤں کی جگہ مسکراہٹ کی روشنی بھر سکوں۔ یہ شخص اتنا پیارا ہے کہ اب تو لگتا ہے عمر بھر اس کی جدائی بھی برداشت نہیں ہوگی۔“

کا کا جان نے اس کی طرف رخ موڑ لیا تھا۔ وہ جو بہت دیر سے ان کے سرمئی بالوں پہ غالب آتی سفیدی پر نگاہ جمائے بیٹھی تھی۔ سر جھکا کر آنکھوں میں آئی می کو پیچھے دھکیلنے لگی۔

”کہنے والوں کو بتا دیا کرو! دکھ کبھی ماند نہیں پڑتا۔ تقسیم کا واقعہ تو سقوط ڈھاکہ سے بھی بہت پہلے کا ہے ناں۔ پر لوگ آج بھی اپنے پیاروں کو روتے ہیں جن کی بے گور و کفن لاشیں راہ کی دھول مٹی میں پڑ رہی گئیں۔ اب اور کیا کہیں جو پچھڑ گئے ان کی یاد رہ کر آتی ہے اور جو کبھی نہ مل سکے ان کے ملنے کی امید نہیں جانی۔ ہاں بات پرانی ہو گئی ہے مگر دکھ پرانا نہیں ہوا۔ اس خطے کے ایک کونے میں ہم اپنا دل بھول آئے ہو! وہ پکارتا ہے ہمیں تو اندر ایک نہیں، ہزار چنگاریاں پھوٹی ہیں۔ من مہشم ہو جاتا ہے اور لوگ کہتے ہیں، اس آگ میں چنگاری باقی نہیں رہی۔“

☆☆☆

سینما روم خالی ہو چکا تھا۔ آخری اسٹوڈنٹ کو بھی اپنے سامنے سے گزرتے دیکھ کر احمد کیانی نے اتنا کر دو بارہ اندر جھانکا۔ بہت سی خالی کرسیوں کے درمیان بیٹھے ہارون اسرار کے اٹھنے کا کوئی ارادہ نہ دیکھ کر وہ بری طرح جھنجھلا یا۔

”ایلیکسیو زی۔“ وہ اسے پکارنے کو تھا، جب وہ لڑکی ایکدم اس کے سامنے آ گئی۔ ہلکی سی گھبراہٹ، اور بے چینی اس کے ہر انداز سے نمایاں تھی۔

احمد کیانی نے ہٹ کر اسے راستہ دیا اور پھر خود بھی اس کے پیچھے چل دیا۔ وہ لڑکی اب کرسیوں کے آس پاس کوئی چیز ڈھونڈ رہی تھی۔

”کس گمان دھیان میں مصروف ہو۔ چلنے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟“ وہ ہارون سے مخاطب تھا۔

”تم چلو، میں آ رہا ہوں۔“ وہ بڑے اطمینان سے اپنی فائل کھولنے لگا تھا۔

”اوکے لیکن اگر تم نے پانچ منٹ سے زیادہ دیر لگائی تو ہو سکتا ہے میں تمہیں پارکنگ میں نہ ملوں۔“ وہ اسے گویا تنبیہ کر رہا تھا۔

”ایلیکسیو زی۔“ میرا پٹن کہیں کھو گیا ہے۔ کیا آپ میں سے کسی نے دیکھا یا کسی اور کو اٹھاتے

ہوئے دیکھا ہوتا۔“ وہ لڑکی دور کھڑی پوچھ رہی تھی۔
 ”وہ پین گولڈ کا تھا؟“ احمد نے اس کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے سوال کیا۔
 ”گولڈ کا؟“ وہ لڑکی حیران ہوئی اور پھر غشی میں سر ہلا دیا۔

”آپ شاید میرا مذاق اڑانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ پین میرے لیے گولڈ سے بھی زیادہ قیمتی تھا۔“
 ”میں نے کسی کا مذاق نہیں اڑایا اور نہ ہی میں نے کوئی پین دیکھا ہے۔“ احمد نے کندھے اچکائے اور باہر کی جانب چل دیا۔

وہ چند لمحے کھڑی آس پاس دیکھتی رہی اور پھر ہاتھ مسلطی باہر کی جانب چل دی۔
 سینینا روم کے ٹھنڈے ٹھارے ماحول میں تنہا بیٹھے ہارون اسرار نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر اس لڑکی کو بہت دور تک جاتے دیکھا اور پھر اپنی فائل میں سے ایک پین نکال کر اسے بغور دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر اس وقت ایسی مسکراہٹ تھی کہ کوئی بھی دیکھتا تو جان لیتا کہ چور کون ہے۔
 کا کا جان اس پر اتنا بر سے تھے کہ حد نہیں۔ وہ دونوں کانوں پہ ہاتھ رکھے، آنکھیں میچے سر جھکائے بیٹھی رہی۔

”حد ہوگئی، ایک قلم تک تم سے سنبھال نہیں گیا اور کیا کرو گی تم زندگی میں۔ جانتی ہو، ایک قلم کار کے لیے اس کا قلم کیا حیثیت رکھتا ہے۔ میں اپنی اولاد کی طرح سنبھال کر رکھتا تھا اسے۔ اتنے سالوں میں وہ ایک بار بھی میری نظروں سے اوجھل نہیں ہوا اور تم ہو کہ ایک روز میں اس سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ اگر بتا ہوتا کہ ادھر ادھر چھینک آؤ گی تو کبھی نہ دیتا اور تم نے مانگا کیوں تھا مجھ سے، ہیں۔“ اس کے سر پہ ہاتھ گاڑ کر اس کا رخ اپنی جانب کیا۔

”جانتی ہونا، انکار نہیں کر سکتا تمہیں، اس لیے مانگ کر لے گئیں۔ اچھا آئندہ کے لیے تمہیں کوئی چیز دوں تو پھر کہنا۔“ اس کے سر پہ اچھی خاصی چپت لگا کر وہ کمرے سے باہر چلے گئے تھے۔
 اس نے سارا غبار ابا کے پاس آکر نکالا۔

”سمجھا لیں اپنے بھائی صاحب کو۔ ایک ناکارہ پین کے بدلے اتنی باتیں سنائی ہیں مجھے۔ کھونے والی چیز تھی، کھو گئی۔ اب کہاں سے ڈھونڈ کر لائی میں۔ پاگلوں کی طرح ایک ایک سے تو پوچھتی پھری میں مگر نہیں ملا۔ لوگ پوچھ رہے تھے۔ کیا گولڈ کا پین تھا؟“

”اب شکایتیں لگا رہی ہو چغل خور۔“ کا کا جان نجانے کہاں سے گھوم پھر کر واپس آ گئے تھے۔
 ”میں نہیں لگاتی، آپ لگائیں۔“ انہیں ابا کے پاس بیٹھے دیکھ کر وہ چڑا کھڑ گئی۔

”بھائی جان! میرا اگلم گم کر آئی ہے یہ لڑکی۔“ وہ ابا کا ہاتھ تھامے دیکھ رہے تھے کہ وہ ہے تھے۔ ”ہونہہ! ایک بار پھر میری تکرار۔“ وہ آنکھوں میں آنسو بھرے باہر آ گئی۔ شام ہو رہی تھی۔ درختوں پہ واپس آتی چڑیوں نے شور مچا رکھا تھا۔ فضا میں ہلکی سی گرد تھی اور سورج کی لالی درختوں کے آخری سروں پہ ٹھہری ہوئی تھی۔

اس کا دل اچاٹ سا ہو گیا۔ بے زاری حد سے سوار ہوئی تو لیے بانس کا ڈنڈا لے کر اس نے سارا غصہ آم کے درخت پر نکالا۔ پٹا پٹ، بے شمار کیریاں یہاں وہاں گرتی رہیں۔

کا کا جان کمرے سے چیخنے لگے۔
 ”کیوں رزق کی بے حرمتی پہنچی ہو۔ سارا پھل پیروں تلے آئے گا۔ ارے کچا پھل کس کام کا، ایسی بر باد۔“

اس کے کان پر جوں تک نہ رہتی۔ بہت سی کیریاں گرا چکی تو چڑیوں کی دشمن ہوگئی۔ چھٹاک، چھٹاک۔۔۔ درخوں کی شاخوں پہ ڈنڈا مار کر سب چڑیوں کو اڑا ڈالا۔ بہت سے پتے ڈالیوں سے ٹوٹ کر زمین پہ آ رہے۔ اس درجہ بدتمیزی پر کا کا جان اور کتنا خاموش رہ سکتے تھے۔ زور سے دھاڑتے ہوئے کمرے سے باہر نکلے تو وہ ڈر کے مارے سب چھوڑ چھاڑ بھاگ کر کمرے میں جا چھپی۔ چار پائی پہ گر کر نیچے میں منہ جھالیا۔ بہت دیر تک بے آواز آنسو بہاتی رہی پھر ہلکی سی جھپکی آ گئی۔

آنکھ کھلی تو کمرہ تاریک تھا۔ کچھ دیر کسلندی سے پڑی رہی پھر مجبوراً اٹھ کر باہر آ گئی۔ برآمدے میں زیر و پا در بلب روشن تھا اور اس سے پرے آنگن کی ہر چیز اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

کا کا جان دوسرے کمرے میں ابا کو کچھڑی کھلا رہے تھے۔ وہ دانستہ چپل تھپتھپتے ہوئے کمرے کے سامنے سے گزری تاکہ ان کے موڈ کا اندازہ ہو سکے مگر وہ دروازے کی طرف پشت کیے بدستور اپنے کام میں مصروف رہے تھے۔

وہ بددل ہو کر باورچی خانے میں آ گئی۔ کیر یوں سے بھری ٹوکری سامنے دھری تھی۔ اس نے چند کیریاں چھیل کر چٹنی بنائی۔ آٹا گوندھ کر روٹی بنانے تک وہ ساری ناراضی بھول کر شرمندہ ہوئی رہی۔

”انہ۔۔۔ کیا جن بھوتوں کی طرح آفت مچائی تھی میں نے۔ حد ہوگئی بھئی۔“ اسے خود پہ کا کا جان والا غصہ آیا تھا۔ اسی کشمکش میں آخری روٹی جل گئی تھی۔ اسے اپنے لیے رکھ کر باہر جھانکا۔ کا کا جان چار پائیاں آنگن میں بچھا رہے تھے۔ وہ باورچی خانے میں بیٹھی ان کا انتظار کرتی رہی پھر خود ہی کھانا تیار کر کے باہر آئی تو وہ چار پائی پہ چپت لیٹے تھے۔ ابا ساتھ والی چار پائی پہ لیٹے خراٹے لے رہے تھے۔

چاند غائب تھا، چاروں اور مکمل تاریکی، ہلکی ہلکی ہوا کلیوں کی خیز جھبک سے بوجھل ہو رہی تھی۔
 ”کا کا! کھانا۔“ وہ پانتی پر بیٹھ گئی۔

وہ چند لمحے اندھیرے میں اسے دیکھتے رہے پھر چنگیر اس کے ہاتھوں سے لے لی۔
 ”تم بہت بدتمیز ہو گئی ہو بڑا!“ ان کے لہجے میں شکایت تھی۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ کچھ وقت یونہی گزرا پھر یکدم ہاتھ بڑھا کر قریب سے گزرتے جگنو کوٹھی میں لے لیا۔

”کا کا معاف کر دیں۔“ اس نے جگنو ان کے بالوں میں چھوڑ کر دونوں ہاتھ ان کے سامنے جوڑ دیے۔

”بگلی۔“ کا کا جان خوش دلی سے ہنس دیے۔
 ماور او لگا وہ ایک جگنو ہزار جگنوؤں میں بدل کر اس کے آس پاس منڈلانے لگے ہیں۔

☆☆☆

زمین سے آسمان تک پھیلے خلا میں وہ تنہا بیٹھی تھی۔ اتنی تنہا کہ آس پاس بکھرے لوگوں کا وجود اس کے لیے کہیں بھی نہیں تھا۔ ان لوگوں کی بہت سی باتیں، بہت سی آوازیں ان کے گھر بھی تھیں تو اسے سنائی نہ دے رہی تھیں۔ ایک مہیب خاموشی تھی جس میں اس کا وجود بہت ہو لے ہو لے تیر رہا تھا۔ ہاں، واحد احساس

جو اس کی رگوں میں ایک خوشبوس دوڑا کر اسے تازہ دم کر رہا تھا، ننگے پیروں تلے شبنم میں بیگی گھاس کی ٹھنڈک کا احساس تھا۔ یونیورسٹی کے سبزہ زار میں، بیچ سے ٹیک لگائے، آنکھیں موندے وہ بڑی فراغت سے بیٹھی تھی۔ تبھی ہولے سے کوئی سرسراہٹ اس کے بہت ہی قریب اُبھری۔ کوئی انجانی سی ہلک، نامعلوم سا احساس۔ اس کی پلکیں لرز کر ایک دوسرے سے ذرا سی جدا ہوئیں تو سب سے پہلی نگاہ گودی میں پڑے گلاب کے پھول پر جا کے رکھی تھی۔ کھلا ہوا بے حد سرخ پھول۔ اس کی آنکھیں ایک جھٹکے سے کل گئیں۔

بائیں طرف کسی کے وجود کا احساس ہوا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، بہت اطمینان سے اس کے برابر بیٹھا تھا۔ اس سے نگاہ ملنے ہی وہ ایک خوبصورت اندرونی حصار جو بہت دیر سے اسے اپنے گھیرے میں لیے بیٹھا تھا، یکنخت ہی ایک چھناکے سے ٹوٹ سا گیا تھا۔ اپنے حواسوں میں واپس آنے میں اسے بس چند لمحے لگے تھے۔ ایک بار پھر گلاب کے پھول کو اپنی نگاہوں کی گرفت میں لے کر وہ کچھ حیران اور کچھ پریشان ہوئی تھی۔

”یہ۔۔۔؟“ پھول اٹھا کر اس نے سوالیہ نظروں سے ایسے دیکھا جس کے لبوں پہ ٹھہری بہم مسکراہٹ گویا اس کی رنگ بدلتی کیفیات سے محفوظ ہونے کی دلیل تھی۔
”یہ آپ کے لیے ہے۔“ بڑا ہی پرسکون انداز تھا۔ ماورا نے کتے ہی پل اسے دیکھنے اور سمجھنے میں لگا دے تھے۔ بہترین لباس، چمکدار چہرہ اور آنکھوں سے چمکتی بشارت۔ وہ یقیناً کسی امیر کبیر خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔

”میرا نام ہارون اسرار ہے۔“ اسے پوری طرح اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے تعارف کرایا۔ ماورا نے ایک طویل سانس لے کر نگاہوں کا زاویہ بدلا۔

”تمہارے تعارف کے لیے بس اتنا ہی کافی ہوتا کہ تم ایک مرد ہو، خوشحال مرد۔ نام کوئی بھی ہو سکتا ہے مگر کام۔۔۔؟“ استہزاء سے مسکراہٹ کے ساتھ اس نے سوچا اور پھول کی پتیوں کو اپنی پوروں سے چھو کر اس کی نرمی محسوس کرنے لگی۔

”میں فائل ایئر کا اسٹوڈنٹ ہوں اور۔۔۔“ اس نے اپنی بات جاری رکھی تھی۔

”اپنی دولت اور حسن کا خرچ وصول کرنے کے لیے مجھے تھیں لڑکیوں کو چارہ ڈالنا۔۔۔“ اس نے ذرا سا جھٹکتے ہوئے پیروں میں جوتا پھنسا یا۔

”میں آپ کا نام جانتا جا رہا ہوں۔“ وہ اپنے اصل مقصد کی طرف آیا۔

”انداز ماہرانہ، طریقہ بوس۔۔۔ وہی روایتی جملے بازی جن کے بارے میں کبھی صرف افسانوں میں پڑھا کرتے تھے۔ درس گاہ کو بھی اپنی تفریح کی جگہ سمجھ لیا ہے انہوں نے۔“ وہ عجب اکتاہٹ سی محسوس کرتے ہوئے اپنا بیک اور فائل اٹھانے لگی تھی۔

”میں نے آپ کا نام۔۔۔“ اس کے دوبارہ بولنے پر وہ کچھ دیر کو ٹھہری۔

”نام کے بعد چائے یا کوئڈنگ کی آفر، پھر دوستی کی پیشکش، پھر تحفے تحائف کا تبادلہ، چند روز عیاشی اور پھر تو کون، میں کون؟“ طنزیہ انداز میں اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”تم مجھے فلرٹ سمجھ رہی ہو؟“ اس کی روشن آنکھوں میں حیرت اور غصہ ایک ساتھ چھلکا ہوا تھا۔
”اس کے بعد میں تمہیں اور کیا سمجھ سکتی ہوں۔“
گلاب کا پھول اس کی نگاہوں کے سامنے لہرا کر بیچ پر پھینکتے ہوئے وہ ہلکی تو اکیلدم ہی اس کا ہاتھ تھام کر روکتے ہوئے وہ اس کے مقابل آ گیا تھا۔
”دیکھو، تم اس طرح۔۔۔“

ایک لمحے کے لیے ماورا کا سارا جسم سُن ہو گیا تھا۔
اگلے ہی پل کسی غیر مرئی طاقت کے زیر اثر اس نے بجلی کی سی تڑپ سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔
”اپنی حد میں رہو، ورنہ میں تمہارا سر پھاڑ دوں گی۔“ کپکپاتی آواز میں اس نے بمشکل کہا اور پھر بھاگتے ہوئے لمحہ بہ لمحہ وہ اس سے دور ہوئی تھی۔
ہارون اسرار حیرت کی انتہا پہ کھڑا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا واقعہ تھا کہ اس نے کسی لڑکی کا ہاتھ پکڑا ہوا اور وہ لڑکی اس سے یوں ناراض ہو گئی ہو۔

☆☆☆

وہ وقت سے پہلے گھر آ گئی تھی۔ لکڑی کا دروازہ بجاتے بجاتے اس کے ہاتھ سرخ ہو کر دُکھنے لگے تھے۔ دھوپ کی شدت اور انتظار کا یہ عالم کہ بند دروازے سے سر پھوڑنے کو دل چاہ رہا تھا۔ بہت دیر بعد دروازے کے دوسری طرف قدموں کی آہٹ اُبھری۔ دروازہ کھلا تو کا کا اجڑے بالوں، سرخ آنکھوں سمیت حواس باختہ سے سامنے کھڑے تھے۔

”تم اس وقت۔۔۔“ یونیورسٹی کے بعد لائبریری میں اچھا خاصا وقت لگا کر آیا کرتی تھی، سوان کی حیرت جانڑ تھی۔

وہ بغیر کچھ کہے اندر آ گئی۔

کا کا جان نے ایک بار پھر کریدا۔

”خیریت تو ہے نا، یوں بے وقت کیسے آ گئیں؟“

”بس یونہی۔ ذرا گرمی سی محسوس ہو رہی تھی اور سر میں درد بھی ہونے لگا، اس لیے جلدی واپس آ گئی۔“ اس نے سوچ سمجھ کر کہا نا بنایا۔ وہ بھی شاید بچی نیند سے اٹھ کر آئے تھے، فوراً ہی مل گئے۔

”کہا تو تھا، ٹھنڈی چیزیں کھایا کرو۔ وہ شہوت کا سارا پھل یونہی مٹی میں رُل جاتا ہے۔ آج ہی پنہ بچھا دیتا ہوں۔ کل تک شہوت اکتھے کر کے شربت بنادوں گا۔ گرمی کو پاس پھینکے نہیں دے گا۔“ وہ جواب میں کچھ نہ بولی تھی۔

کا کا باہر نکل گئے، تب ایک لمبا سا سانس کھینچ کر وہ چارپائی پر گر گئی۔

کچھ دیر یونہی جھٹ پتے نگاہ ٹھہری رہی پھر اچانک وہ اپنا باباں ہاتھ اٹھا کر بغور اسے دیکھنے لگی۔

کچھ بھی نہیں تھا مگر نجانے کیوں پانچ دہائی ہوئی انگلیوں کا لمس جیسے اس کے ہاتھ پر ثبت ہو کر رہ گیا تھا۔

بمشکل دو کا سز لے پائی تھی وہ اور اس سارے وقت میں اس کی نگاہ بار بار پھسل کر اپنے ہاتھ کی پشت پر جا رہی تھی۔ پچھر کا ایک لفظ بھی سماعتوں میں نہ پڑا تو وہ بے زار ہو کر گھر چلی آئی۔

”یہ عجیب مصیبت ہے۔“ وہ آنکھوں میں نمی لیے اٹھ بیٹھی۔

”اپنی وقت گزاری کے لیے دوسروں کی جان عذاب میں ڈال دو۔ کسی کی پل بھر کی تفریح، لمبے بھر کی عیاشی اور کسی کی جان کا روگ۔“ وہ دونوں بازوؤں میں منہ چھپا کر لیٹ گئی۔

”اللہ کرے آج کے بعد کبھی اس کی شکل دکھائی نہ دے۔“ اس نے دل سے دعا کی تھی۔

☆☆☆

وہ یونیورسٹی جانے کو تیار تھی، پر نجانے کیوں سستی دکھا رہی تھی۔ ناشتا کرنے کے بعد یونہی کتنی دیر تک وہ ٹپکتی رہی۔ درختوں کی شاخوں پہ ادھر سے ادھر اڑتے ہوئے پرندے اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ وہ پھرتی پھرتی کلیوں کے جھنڈ کے پاس آگئی۔ خوب کھلی کھلی سی کلیاں توڑ کر آچل بھرا اور حوض کے کنارے آ بیٹھی۔ ایک ایک کر کے بہت ساری کلیاں حوض کے پانی پہ تیرنے لگی تھیں۔ اس بے معنی سے کھیل میں نجانے کیوں اتنا مزہ آ رہا تھا۔ گول گول گھومتی ہوئی کلیاں۔ بھی دائرہ بنتا، بھی ٹوٹ جاتا۔ اس کھیل سے ان کی تو باتیں کلیاں لے کر باکے پاس چلی آئی۔ کا کا کی مدد سے نہانے دھونے کے بعد خوب تازہ دم ہو کر وہ تسبیح کر رہے تھے۔ مادرانے آچل ان کے سامنے پھیلا یا تو انہوں نے کبھی بھر کلیاں اٹھا کر سینے پہ پھیلا لیں۔ کا کا جان کیاریاں درست کرتے ہوئے بڑی دیر سے اس کی حرکات و سکنات دیکھ رہے تھے۔ معمول سے زیادہ وقت ہوا تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

مادر اور اش پہ چلتے چلتے ایک دم پٹی تو کا کا بیک لیے اس کے سامنے کھڑے تھے۔

”آؤ ہمیں اسٹاپ تک چھوڑ آؤں۔“ وہ اس کے گریز کی وجہ نجانے کیا سمجھ رہے تھے۔ مادر اذرا سا

ہنس دی۔

”میں چلی جاتی ہوں کا کا!“ اس نے بیک ان سے لیا اور دروازے سے باہر آگئی۔ کا کا جان دروازے میں کھڑے بہت دیر تک اسے ست قدم اٹھاتے دیکھتے رہے اور تب ہی پلٹے، جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

یونیورسٹی تک کا سارا سفر اس نے بہت بے دلی سے طے کیا تھا۔

”مجھے آج آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔“ وہ ایک طویل سانس کھینچتی پوائنٹ سے اتری تو حسب معمول کوئی قدم سے قدم ملا کر اس کے ساتھ چلنے لگا تھا۔ وہ ایک پل کے لیے حیران تو ہوئی مگر سر جھکاتے چلتی رہی۔

”اسے دیر ہو گئی تھی یا اتنا وقت انتظار میں برباد کیا؟“ یہ سوال بڑے شریر سے انداز میں نگاہوں کے سامنے ناچا۔ ہونٹوں پہ میہمی مسکراہٹ خود بخود آرکی تھی، دل میں گہرا اطمینان۔ ذرا سا رخ موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

سیاہ بینٹ، اخروٹی رنگ کی شرٹ، سلیٹے سے بنے ہوئے بال۔

کا کا کے پاس ہمیشہ ملگجے سے شلوار میس میں آیا کرتا تھا۔ بے ترتیب بال سنگھی سے بے نیاز، بس بات کرتے کرتے انگلیوں سے بال سنوار لیا کرتا تھا۔ پیروں میں ایک بدرنگ سی چپل ہوتی اور بس۔ یونیورسٹی میں ہمیشہ بک سک سے درست ہو کر آتا تھا۔ مادر اہر بار ہی دیکھ کر چونک جایا کرتی۔ جب سے

وہ یونیورسٹی آنے لگی تھی، دیر سویر بھی ہو جاتی تو پوائنٹ سے ہمیشہ اس کے ساتھ ہی اترتا کرتا تھا۔ خدا جانے کب اور کس وقت سوار ہوتا تھا۔ مادر کو کبھی خبر نہ ہو سکی تھی۔ بغیر کچھ کہے، بولے وہ چپ چاپ برابر برابر چلتے رہتے۔ ڈپارٹمنٹ میں پہنچ کر وہ اپنی کلاس میں داخل ہو جاتی، تب وہ راستہ بدل لیتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں بھی چڑتی، کبھی کلاس فیلوز کی معنی خیز نظروں سے خائف ہوئی مگر آج اس کے ساتھ چلنا برا نہیں لگتا تھا۔

”چلو گھر سے باہر بھی نکلوں تو کوئی تو ہوتا ہے نا آس پاس۔“ دل میں دوسرا ہٹ کا احساس جاگزین ہوا تو موڈ خود بخود درست ہو گیا تھا۔

”سلیم! آج مجھے سینٹرل لائبریری جانا ہے۔“

ڈپارٹمنٹ پہنچ کر اس نے گھڑی بھر کے لیے رکستے ہوئے کہا تھا۔

”میں تھرڈ پیریڈ میں آ جاؤں گا۔“ سلیم نے بخجیدگی سے جواب دیا تھا۔

☆☆☆

پروفیسر احمد ضیاء کا لیکچر حرف بہ حرف نوٹ کرتے ہوئے اسے اپنے اطراف میں بڑھتی ہوئی تاریکی کا قطعاً احساس نہ ہوا تھا۔ آس پاس کی دبی دبی سرگوشیوں پر توجہ اس نے نہ پہلے کبھی دی تھی، نہ اس وقت دی۔ غیر معمولی صورت حال کا ادراک اسے اس وقت ہوا تھا جب بند دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور لڑکیوں کے منہ سے چیخوں کی دبی دبی آواز نکلی۔ گرد آلود ہوا کا تیز جھونکا پل بھر میں کمرے کے کونے کھدروں تک جا پہنچا تھا۔ اس نے ذرا سا سر اٹھایا اور پھر دم بخود رہ گئی۔ موسم کا اعتبار بھی کبھی نہیں کیا جاسکتا لیکن ایسا موسم۔ اس کا دل سکو سوٹ کر سینے کے نجانے کس گوشے میں جا چھپا۔

پروفیسر صاحب نے موسم کے تیور دیکھ کر ”انجوائے یور سیلف“ کا نعرہ لگایا اور کلاس سے باہر لڑکے ہو کر اترے ان سے بھی آگے نکل گئے تھے۔ وہ فائل سینے سے لگائے لڑکیوں کے جھگڑے میں باہر نکلی مگر کورڈیور سے باہر آتے ہی اس کے سارے حوصلے جواب دے گئے۔ اس کی اولین خواہش اس لمحے گھر پہنچنے کی تھی۔ دم بہ دم بڑھتی ہوئی ہولناک تاریکی میں بادلوں کی ہیبت ناک گرج چمک۔ آندھی کے زور سے ل کر چنگھاڑتے ہوئے طویل قامت درخت۔ لڑکیوں کے چہرے پہ پھیلتا خوف و ہراس، کورڈیور کے ستون سے لگی وہ زرد چہرے کے ساتھ ہولے ہولے کانپتی رہی۔ سینے پہ بندھے بازوؤں میں فائل پوں جکڑ رکھی تھی کہ انگلیوں کی پوریں سفید ہو رہی تھیں۔ آسمان سے پانی کی تیز بو چھاڑ زمین پہ اتر آئی تھی۔ ہوا کے زور سے سفیدے کے درخت کا کوئی ٹہنا جھج کر زمین پہ آ رہا تو بیسیوں منجلیوں کی زوردار مصنوعی چیخوں نے ماحول کو لرز کر رکھ دیا تھا۔ بارش سے بچنے کے لیے وہ دو قدم پیچھے ہٹی تھی مگر اسی پل نجانے کس طرف سے لڑکے لڑکیوں کا ایک بڑا سا گروپ بارش سے بچتا بچتا کورڈیور میں آ گیا۔ ان کی دھم بھم سے وہ لڑکھائی تو پیچھے ہٹتے ہٹتے کلاس روم کے دروازے تک آ گئی۔

”یا اللہ!“ بجلی کی کرنی تو اس کا رہا سہا دم بھی نکل گیا۔ بمشکل لڑکھرائی ہوئی وہ کلاس روم میں داخل ہوئی اور پہلی کرسی پر گر گئی۔

”ابا۔۔۔ کا کا جان۔۔۔“ اس کی سرگوشی سسکی بن کر لیوں سے خارج ہوئی تھی۔ بچپن سے یہ موسم اسے خوف کی انتہائی بلندیوں پر لے جا کھڑا کرتا تھا۔ ذرا بڑی ہوئی تو لرزتے کانپتے دل کے ساتھ گھٹنوں

میں سر دیے روتی رہتی۔ اب بھی آنسو ایک قطار میں آنکھوں سے بہہ نکلتے۔
 ”یا اللہ! آئندہ رک جائے، بارش ختم ہو جائے، میں گھر پہنچ جاؤں۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے گڑگڑا رہی تھی۔ یہ طوفان ایک آدم خور اژدھا تھا جو اس کے آس پاس پھنکار رہا تھا۔
 ”خوف زدہ ہو؟“ مردانہ آواز اتنے قریب سے ابھری تھی کہ ایک پل کے لیے اس کے دل کی دھڑکن بھی ساکت ہو گئی تھی۔ نگاہ اٹھا کر دیکھے بغیر ایک چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا تھا۔
 ”تم تنہا تو نہیں ہو، نہ ہی کھلے آسمان تلے کھڑی ہو پھر اتنی خوفزدہ۔“ اس نے تمام قوتیں مجتمع کرتے ہوئے بمشکل سر اٹھا کر دیکھا۔

وہ طویل قامت عین اس کے سامنے سینے پہ بازو باندھے کھڑا تھا۔ انداز بہت دوستانہ، لہجہ اپنائیت بھرا۔ یوں جیسے برسوں کا شناسائی ہو۔
 سختی سے دانت بچھتے ہوئے، سر جھکا کر اس نے دل سے سلیم کی آجانبہ کی دعا کی تھی۔
 ”میں سمجھتا تھا تم بہت بہادر ہو مگر۔۔۔“
 ”ہٹ جاؤ میرے سامنے سے۔“ اس کے آنسوؤں میں مزید روانی آ گئی۔
 وہ ایک پل کے لیے خاموش ہو گیا۔
 ”تم نے اس روز بھی میری پوری بات نہیں سنی تھی۔“
 ”میں نہیں سننا چاہتی۔“
 ”کیوں؟“

”تم جانتی ہو، میں کتنے دنوں سے۔۔۔“ وہ بچوں کے بل اس کے عین سامنے بیٹھا تھا۔ کوئی کھلی کھڑکی ایک دھماکے سے بند ہوئی تو وہ ہلکی سی چیخ کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ہارون اسرار سر جھٹک کر دروازے میں جا کھڑا ہوا۔
 ”انسانوں سے بھی ڈرتی ہو اور موسموں سے بھی۔ کوئی دوست نہیں تمہارا۔ کسی سے بات کرنا تمہیں پسند نہیں۔ ماورا! کس ہستی سے آئی ہو تم۔“ وہ پلٹ کر اس سے پوچھنے لگا۔
 ”یہ میرے نام سے واقف ہے۔“ اسے اپنا ساکت وجود بے حد گزور محسوس ہوا۔
 ”اور وہ احمد کیانی! اسے تم کسی ٹک کی۔۔۔“ وہ نجانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔

دھواں دھار بارش کا شور، کورس میں گانے کی آوازیں۔
 وہ بہت کچھ کہہ رہا تھا اور ماورا کو کچھ سنائی نہ دے رہا تھا۔ پلکیں جھپکے بغیر وہ اسے دیکھتی رہی۔
 ”فلٹرٹ کرنے کے لیے میرے سر کل میں ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی موجود ہے۔ مجھے محض وقت گزاری کے لیے، عیاشی کے لیے تمہاری کوئی ضرورت نہیں تھی۔ سب کچھ اور ہے ماورا! جو مجھے تمہاری جانب کھینچتا ہے۔“ وہ دروازے کے کھلے پٹ سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔
 ”فارگاڈ سیک۔ چپ کر جاؤ، یہ سب جھوٹی باتیں۔ اوہ خدایا۔۔۔“ اس کے ہاتھ پیر سنسانے لگے تھے۔

”میں نے کبھی دانستہ تمہیں نہیں سوچا۔“ وہ دو قدم آگے بڑھا۔
 ”نہ ہی میں جان بوجھ کر تمہارے راستوں میں آتا ہوں۔ یہ سب میرے لیے ایک نئی چیز ہے۔“

میں خود نہیں جانتا، میں گھنٹوں لائبریری میں کیوں بیٹھا رہتا ہوں۔ تمہیں دیکھنے کی خواہش کیوں مجھے اپنے دوستوں سے بھی بے زار کر دیتی ہے۔ میں ایسا تو نہیں تھا پھر۔۔۔“
 ”خربوزے لے لو، خربوزے۔“ کوئی پاٹ دار آواز دروازے کے بے حد قریب ابھری تھی۔
 زرد لباس پہنے ایک لڑکی بے تحاشا ہنستی ہوئی کلاس روم میں آئی تو ان دونوں کو دیکھ کر ایک پل کے لیے سنبھلی اور پھر سامنے کھڑکی میں جا بیٹھی۔ اس کے پیچھے ایک اور گروپ انگیلیاں کرتا کمرے میں آیا تھا۔
 کہہ رہا ہے دل او جاناں
 بے تکلم آوازیں چاروں طرف پھیل رہی تھیں۔ ہارون اسرار لب بچھنے کھڑا تھا اور بحرمانہ انداز میں سر جھکائے۔

”کس نے کیا دیکھا اور کیا سوچا ہوگا؟“ وہ بھر بھری مٹی کی طرح ڈھسے جانے کو تھی، جب ہارون اسرار کے عقب سے ایک چہرہ نمودار ہوا۔ متلاشی نگاہوں میں بے قراری تھی۔
 ”سلیم!“ اس کے وجود میں جیسے کوئی نئی روح پھونک دی تھی اس کی آمد نے۔ اسے پکارتے ہوئے وہ تیزی سے اس کی طرف لپکی تھی۔
 ”کہاں تھے تم۔۔۔ کتنی دیر سے۔“ اس کی آواز رُندہ گئی۔ کچھ بولا ہی نہ گیا تو اسی تیزی سے وہ اس کے ساتھ باہر آ گئی۔

”بارش ہی رکنے میں نہ آ رہی تھی۔ اب ذرا کم ہوئی تو میں بھاگ بھاگ۔۔۔“
 ”یہاں نہیں آگے چلتے ہیں۔“ ماورانے اسے وہیں کھڑے ہوتے دیکھ کر اس کی بات کاٹی۔
 ”ابھی بارش تیز ہے، ہم گھر نہیں جاسکیں گے۔“
 سلیم کو اس کی جلد بازی پر حیرت ہوئی۔ وہ بغیر کوئی جواب دیے کوریڈور کے آخری سرے پہ جا کھڑی ہوئی تھی۔

بارش کا زور پہلے سے ٹوٹ چکا تھا۔ تاہم تیز ہوا کے ساتھ آتی بارش کی بو چھاڑا اسے بھگوئے دے رہی تھی۔ اسے پہلے کی طرح ڈرنے لگا۔ اس طوفان سے زیادہ خطرناک طوفان وہ تھا جسے وہ اپنے پیچھے چھوڑ آئی تھی۔
 ”تم بہت دیر سے آئے تھے سلیم! مجھے اس سے بہت ڈر لگنے لگا تھا۔“ اس کی مدھم آواز سلیم بمشکل سن پایا تھا۔

”کس سے؟“ سلیم نے آگے بڑھ کر اس سے پوچھا تو وہ ایک پل کے لیے چونک گئی۔
 ہارون اسرار کی تیز نگاہوں نے جس سرعت سے سلیم کو جالیا تھا، وہ ماورا سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔ اس کے دیکھنے کا انداز، ماورا کو بے اختیار جھرجھری سی آ گئی۔
 ”کس سے ڈر لگ رہا تھا ماورا!“ سلیم دوبارہ پوچھنے لگا۔
 ”موسم سے۔“ بارش کا کڑوا پانی آنکھوں میں جھری گیا تھا۔ اس نے ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور پیچھے ہٹ کر دیوار سے ٹیک لگالی۔

☆☆☆

سلیم اسٹاپ سے گھر تک اس کے ساتھ ہی گیا تھا۔ گھر کا دروازہ کھلا دیکھا تو سلیم کو اندر آنے کی

آفر کے بغیر تیز قدم اٹھاتی وہ غائب دماغی سے اندر داخل ہوئی۔ بارش ابھی بھی ہو رہی تھی مگر باریک بوندوں کی شکل میں۔ روش اور اس کے برابر سبز قطے بارش کے گدے پانی تلے چھپ چکے تھے۔ وہ معمول سے دوڑھائی گھٹنے لیٹ آئی تھی مگر یہاں انتظار کی وہ بے چینی نہ تھی جو اس کے خیال میں ہو سکتی تھی۔ ایک لحاظ سے یہ بھی بہت بہتر تھا۔ گزشتہ چند گھنٹوں میں وہ بہت کچھ سوچ کر تائبان ہوئی تھی کہ اب کسی کا سامنا کرنے کی ہمت نہ رہی تھی۔

یہ ہلکی پھلکی بارش بھی اسٹاپ سے گھر تک اسے پوری طرح بھگو چکی تھی، اس لیے بغیر کسی تکلف کے کھڑے پانی میں چھپاک چھپاک قدم رکھتی وہ برآمدہ عبور کر کے اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ دروازہ بند کر کے، گیلے کپڑوں سے چھٹکارا پا کر وہ چارپائی پہ گر گئی۔ تب اسے احساس ہوا کہ جسم سرد ہو رہا ہے۔ ذرا سی دیر کے بعد ہلکی سی پچی طاری ہونے لگی تو نہ چاہنے کے باوجود اس نے اسٹھ کر الماری سے چادر نکالی اور اپنے اوپر ڈال کر لیٹ گئی۔

”نہ سلام کیا نہ کلام اور آکر یہاں پڑ گئی۔ کا کا جان بھی کیا سوچیں گے، یہ نہ ہو میری تلاش میں اسٹاپ تک ہی جاتے ہوں۔ ابابو بھی شکل نہ دکھائی۔ بے چارے پریشان ہو رہے ہوں گے۔“ غنودگی میں جاتے جاتے اس کے دماغ نے غوط کھایا تو چادر ہٹا کر اٹھ بیٹھی۔

”آہ۔۔۔“ بدن ٹوٹ رہا تھا۔ وہ ذرا دیر کے لیے دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گئی۔ دماغ میں کیا کچھڑی سی پک رہی تھی، رہ رہ کر کچھ یاد آ رہا تھا۔ کوئی ادھورا فقرہ، کوئی مکمل بات۔ دھواں دھار بارش کے شور میں اس کا مدھم لہجہ، گیلی مٹی کی خوشبو، جیسی کسی قیمتی پرفیوم کی مہک۔

اس نے سر جھٹک کر جیسے ایک ایک پل کو بھول جانے کی کوشش کی۔

”کس مشکل میں ڈال رہا ہے یہ مجھے۔ نجانے کون ہے، کیا چاہتا ہے۔“ وہ چارپائی سے اتر کر اپنی چپل ڈھونڈنے لگی۔

”ہا۔۔۔ ایک سو صدی میں محبت کی باتیں کرتا ہے، انجانے جذباؤں کا شکار۔ معلوم نہیں خود بے وقوف ہے یا مجھے بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔“ اس نے سیاہ انگوٹھے کی چپل پیروں میں پھنسائی۔

”ایسا نہ ہو پہلی ملاقات کا بدلہ لے رہا ہو۔ سختی سے بولی تھی۔ اگر کبھی کوئی بدتمیزی کر ڈالی تو۔۔۔“ وہ بری طرح فکر میں گھری تھی۔ کمرے سے باہر نکلتے ہی پہلی شکل کا کا جان کی دکھائی دی۔

”آئی ہو بٹو! جاؤ باورچی خانے میں، کھانا کھاؤ۔“ ان کا انداز غلجٹ بھرا تھا۔ اتنا کہہ کر باہر کو لپکے تو وہ حیرت سے انہیں دیکھتی باورچی خانے میں آگئی۔

”خبر نہیں، کن چکروں میں ہیں۔ بھول ہی گئے کہ بٹو اتنی دیر سے گھر آئی ہے۔ شدید موسم کا شکار، کیسے پہنچی، کب آئی؟“ وہ تو ہزاروں سوالوں کا جواب دینے کو تیار تھی مگر یہاں تو پروا ہی نہ تھی۔

وہ باورچی خانے میں آگئی۔

صبح ناشتے کے بعد اب شام ہو رہی تھی کہ وہ کچن میں آئی تھی۔ بھوک لگ رہی تھی، سودا نہ چاہنے کے باوجود چند تھوے لقمے کھانے ہی تھے۔ اس نے مختلف برتن اٹھا کر دیکھے۔ سب کے سب خالی، دو پہر کا بچا کچھا بھی نہ تھا۔ اسے حیرت کے ساتھ قدرے پریشانی بھی ہوئی۔ ایسا تو کبھی نہ ہوا تھا۔ کا کا گھر میں

کوئی دال، ہنری گھار کر چاول ابال لیا کرتے یا چپتی ڈال لیا کرتے تھے پھر آج۔۔۔؟

اسے ایک دم ہی ان کا پریشان سا چہرہ نظر آیا پھر نجانے جی میں کیا آئی کہ لپک کر ابا کے کمرے کی طرف بھاگی۔ دھیان آیا کہ باورچی خانے میں دلے کا پیالہ جوں کا توں دھرا ہے۔

”صبح سے اب تک کھایا کیوں نہیں؟ یا اللہ طبیعت ٹھیک ہوان کی۔“ کمرے کا بند دروازہ ٹھک سے کھول کر وہ اندر داخل ہوئی تو ابا اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”ابا! آپ ٹھیک تو ہیں نا، اس طرح کیوں لیٹے ہیں۔“ وہ غلجٹ میں ان کی طرف لپکی مگر ان کی نظریں بدستور دروازے پر جمی تھیں۔

”ابا!“ اس نے قریب ہو کر ان کا بازو ہلایا۔

ساکت پلکوں میں ذرا جنبش نہ ہوئی تھی، لب خاموش، وجود ساکت۔

”ابا!“ اس نے قدرے بلند آواز سے پکارتے ہوئے زور سے انہیں جھنجھوڑا مگر حرکت مفقود تھی۔

کسی انہونی کے ادراک کا جا بک دل و دماغ پر لہر آیا تو وہ جیسے کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی تھی۔ تب اسے احساس ہوا۔ ابا کے چہرے پر زندگی کی کوئی رمت نہ تھی۔ پکی پھٹک رنگت، آنکھوں کی پتلیاں جامد۔

”نہیں۔۔۔ میرا وہم ہے، دھوکا ہے۔“ وہ لٹے قدموں باہر کو بھاگی تو اندر آتے کا کا جان سے ٹکرا گئی تھی۔ ایک زوردار چیخ اس کے لبوں سے خارج ہوئی اور وہ لڑکھڑا کر کمرے سے باہر آگئی۔

”کا کا۔۔۔ ابا۔۔۔ میرے ابا۔۔۔“ اس نے بے یقین لہجے میں انہیں کچھ بتانے کی کوشش کی۔

”صبح سے طبیعت خراب ہے بھائی جان کی، یہاں شور مت کرو۔“ کا کا نے قدرے پریشان لہجے میں اسے ڈانٹ دیا۔

”نہیں کا کا۔۔۔ ابا۔۔۔ آہ۔۔۔“ اسے لگا روح اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ رہی ہے۔

کا کا جان نے از حد حیرت سے اس کے سفید پڑتے چہرے کو دیکھا۔

”کیا ہو رہا ہے تمہیں؟“

”ابا مر گئے، گھٹھے لگتا ہے ابا مر گئے۔“ ٹوٹی پھوٹی سانسوں میں اس نے بہت مشکل سے کہا۔

”کیا۔۔۔؟ پاگل ہوئی ہو کیا۔“ کا کا دھاڑتے ہوئے کمرے کی طرف بھاگے۔

وہ برآمدے میں سینے پہ ہاتھ رکھے جھکتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اگر وہ زندہ ہے تو اسے سانس کیوں نہیں آرہی۔ زور زور سے سینے میں دم توڑتی سانس کو کھینچتے ہوئے وہ گرتی پڑتی کمرے کی طرف بھاگی کہ کا کا جان کی دلدادہ چیخوں نے اس کے سارے واہموں، خدشوں کی تصدیق کر دی تھی۔ وہ وہیں گھٹنوں کے بل فرش پہ گر گئی۔

”آہ۔۔۔ بھائی جان۔۔۔ ماورا! بھائی جان مر گئے، ماورا! بھائی جان مر گئے۔“ وہ اپنا سر پیٹتے باہر آئے۔ ماورا کو لگا اس کا دل پکلا جا رہا ہے۔

”نہ رو میں کا کا! اس طرح مت رو میں۔“ ڈوبتی آواز کے ساتھ وہ بمشکل چیخی۔ اسے رونا نہیں آ رہا تھا۔ اسے ڈر لگ رہا تھا اور کا کا جان کے روتے کر لاتے تین اس کا دل بند کر رہے تھے۔

”ہم یتیم ہو گئے بٹو! گھر بھر گیا۔ ہمارا سایہ چھن گیا بٹو! ہم تنہا رہ گئے۔“ وہ اپنے بال نوچتے نوچتے دیوانے ہو رہے تھے۔

”کوئی ہے۔۔۔ ارے دیکھو، ہم ایک بار پھر اُڑ گئے۔ دل نوج لیا ہمارا۔“ وہ سینہ کو پی کر رہے تھے۔

”کا کا!“ وہ پوری قوت سے چلائی۔

کا کا آہ وزاری کرتے بیرونی دروازے تک جا پہنچے تھے۔

”کا کا! مجھے چھوڑ کر نہ جائیں، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ وہ اٹھ کر ان کے پیچھے بھاگی۔

”مجھے ڈر لگ رہا ہے کا کا! رک جائیں، میرے پاس آ جائیں۔ آہ۔۔۔“ راہ میں نجانے کس چیز سے ٹھوکر کھائی تھی کہ وہ منہ کے بل کئی قدم آگے جا کر کڑی۔ جانے چوٹ آئی تھی یا نہیں مگر چاروں جانب پھیلے ملگجے سے اندھیرے پر گھورتا رہی اس طرح غالب آئی تھی کہ پھر اسے کچھ سمجھائی نہ دیا۔ بہت دیر بعد اس کی آنکھ کھلی۔

کتنی ہی دیر تک ایک عجیب و غریب کیفیت نے اسے اپنی گرفت میں لیے رکھا۔ احساسات تک منجمد تھے۔ نہ پوری طرح دکھائی دے رہا تھا، نہ سنائی۔ دماغ کچھ بھی سوچنے سے قاصر پھر رفتہ رفتہ کوئی احساس جاگا۔ چہرے پہ قطرہ قطرہ پانی گر رہا تھا۔ اس نے بمشکل بند پونوں کو حرکت دی۔ آس پاس تاریکی بھی بے حد گہری اور خاموش تھی۔ اس نے اپنے ساکت وجود کو حرکت دینا چاہا تو احساس ہوا اس کے ارد گرد بہت سا پانی جمع ہے اور اس پانی میں پڑا اس کا وجود شاید حرکت کرنے سے محروم ہو چکا ہے۔ ”کیا یہ کوئی خواب ہے، میں کہاں ہوں؟“ اس کا سویا ہوا ذہن بیدار ہونے میں نہ آ رہا تھا۔ بھی کسی چپوٹنے نے یکنخت کیاری کے پانی میں ڈوبی اس کی بے جان کلائی پہ اپنے دانت گاڑے تو وہ ٹپ کر اٹھ بیٹھی۔

آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو رہی تھیں۔ اپنی کلائی مسلتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے اٹھ کھڑی ہوئی۔ دوپٹہ غائب، چپل اندر۔

”کیا میں سوئے میں یہاں آگئی تھی۔“ اسے کچھ یاد نہ آ رہا تھا۔

برآمدے میں اندھیرا تھا۔ صرف ابا کے کمرے میں روشنی تھی اور وہ ان ہی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ برآمدے کی پہلی سیڑھی پہ قدم رکھتے ہی وہ ذرا سا چونک گئی۔

”ماورا! ہم یتیم ہو گئے۔“ صدے سے چور آہوں کا فضا میں گونجی تو اس کے وجود میں ہلکا سا چھٹکا ہوا۔ یوں جیسے کالج کی بہت ہی نازک سی چیز زمین پہ گر کر ہزار ریزوں میں بٹ جائے۔ اس چھٹکے سے اس کے ذہن پہ چھایا جمود یونہی ٹوٹ کر نکلا تو ساتھ ہی کوئی رونی کر لانی آواز ساعتوں میں جاگ اٹھی، وہ ٹھنک کر رک گئی۔

کھلے دروازے سے اندر کا منظر واضح تھا۔ ابا دروازے پر نگاہیں ٹکائے وہیں تھے، کچھ بھی خواب نہ تھا، سب کچھ حقیقت تھا۔ بھیا تک، بے رحم اور سفاک حقیقت۔ وہ دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھیجنے کر چیخی تو زمین و آسمان کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح کا سورج طلوع ہوا بھی تو یوں کہ آس پاس کہیں کوئی روشنی نہ تھی اور اگر تھی بھی تو کم از کم اسے دکھائی نہ دے رہی تھی۔

رات گئے اس کی چیخ و پکار سن کر آس پاس کے چند لوگ وہاں نہ آتے تو نجانے کیا ہو جاتا۔ شاید اس گھر سے انہیں ایک کے بجائے دولاٹھیں اٹھانی پڑیں۔ ڈر، خوف، صدے سے اس کی حالت اتنی دگرگوں تھی کہ ایک کونے میں کئی وہ پہلے جیسی ماورا لگ ہی نہ رہی تھی۔ آنے والے پوچھ رہے تھے۔ ”کسی رشتے دار، دوست، عزیز کا پتا۔۔۔ کوئی تو ہو جسے اطلاع کی جاسکے۔“ وہ ٹکر ٹکران کا منہ دیکھتی رہی۔ کس کا کہتی، کون سا بتاتی۔

”کا کا جان کو ڈھونڈ، وہ کہاں چلے گئے، ان کا پتا چلاؤ۔ وہی سب کچھ تھے، ہر رشتہ ان ہی سے تھا، کہاں کھو گئے۔ مصیبت کی اس گھڑی میں مجھے تنہا چھوڑ دیا۔“ وہ ہلکے ہلکے کر رونی رہی۔ کوئی کرن ایسی نہ تھی جو اس کے آس پاس کے بڑھتے ہوئے اندھیروں کو کاٹ سکتی۔ وہ رورور کر تھک چکی، تب خیال آیا۔

”سلیم۔۔۔ مگر اس کا اتنا پتا خدا جانے۔“ وہ تیز بخار میں پھٹکتی گرتی پڑتی اٹھی۔ سلیم کا نام اور ڈپارٹمنٹ لکھ کر دیا۔

”یونیورسٹی میں پڑھتا ہے، کا کا جان کے بعد بس اسی سے واقفیت ہے۔“

”میں جانتا ہوں اسے۔ اکثر آتے جاتے دیکھا ہے۔“ کوئی ایک وہ چٹ پکڑ کر فوراً روانہ ہو گیا۔ ”کا کا جان! خدا رالوٹ آئے، غیروں کے ہاتھ ابا کو قبر میں ڈالیں گے، میرے آنسو پونچھیں گے۔ کیا لگے گا کا کا۔۔۔ ہم ہمیشہ مل کر رہے تھے، اب کیسے تنہا چھوڑ دیا مجھے آپ نے۔“ وہ سسکتی ہوئی ابا کی چار پائی کے پاس آ بیٹھی۔

رات سے وہ اس بے جان وجود سے خوفزدہ تھی مگر اب وہ خوف درد میں ڈھل گیا تھا۔ ”ابا میرے پیارے ابا۔۔۔ کس مفلسی میں دن کاٹے آپ نے اور کس خاموشی سے مر گئے۔ میرا انتظار بھی نہ کیا۔ جاتے سے کچھ باتیں تو کرتے مجھ سے۔“ وہ ان کے ہاتھ چوم کر بے آواز رونی رہی۔ وہ لب جن پر ہمیشہ ایک صبر آمیز مسکراہٹ رہتی تھی، بالکل خاموش تھے۔ آنکھیں جو اس سے ہزار باتیں کہتی تھیں، ہر جذبے سے عاری تھیں۔ ان کا کمزور، لاغر وجود جھریوں زدہ نرم ہاتھ اور دکھوں کی گرد سے اٹے سفید بال۔ وہ بار بار آنسو پونچھتی انہیں غور سے دیکھتی رہی۔

”آج کے بعد یہ چہرہ دیکھنا کہاں نصیب ہوگا۔“

کوئی تیز رفتاری سے قدم اٹھا تا قریب آیا تھا۔

”آگیا۔۔۔ سلیم آگیا۔۔۔“

ماورا نے ایک جھٹکے سے سراٹھا کر دیکھا۔ وہ دل گرفتگی سے ابا کی چار پائی پہ جھکا غم آنکھوں سے بغور ان کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

”جوان! بہت دیر ہو چکی ہے۔ جلد از جلد کفن و دفن کا انتظام کرو۔“ کسی نے کہا تھا۔

ماورا نے ابا کا ہاتھ پیچ کر لبوں سے لگا لیا۔

☆☆☆

دھوپ اتنی تیز تھی کہ درختوں کی جڑوں کو گرمائے دے رہی تھی۔ ننھی جڑیاں کیاری میں جمع پانی میں پڑ پھلا پھلا کر نہاتیں اور پھر سے اڑ کر درختوں کی شاخوں میں جا چھپتیں۔ ایک پیاسی جڑ یا اپنی پیلی

چونچ کھولے حوض کنارے کھڑی تھی۔ بارش کے پانی کی باس نمی سبز گھاس کی جڑوں میں ابھی بھی موجود تھی۔ روش کے کناروں کی بوسیدہ اینٹیں تیز دھار بارش سے اکھڑی ہوئی تھیں اور روش کے دوسرے سرے پر دروازے کی لکڑی مزید خستہ ہو گئی تھی۔

برآمدے کی سیڑھیوں کے سامنے لگی اینٹوں کے پتھوں بیچ سبزہ خود بخود سہرا اٹھا رہا تھا۔ سلیم نے تادیر اس پر نگاہ جمائے رکھنے کے بعد جیسے کسی سوچ کے خاتمے تک پہنچ کر طویل سانس لی اور پھر مڑ کر مادرا کو دیکھنے لگا۔ گزشتہ چند روز سے وہ گوئی بوا کے رحم و کرم پر تھی۔ دن میں وہ خود چکر لگا لیا کرتا، رات کو بوا اس کے پاس سو جاتی۔ ان چند دنوں کی بے خوابی اور بخار نے اسے کافی متاثر کیا تھا۔ گہری سوچ اور تفکر نے آنکھوں کے گرد حلقے سے ڈال دیے تھے۔

”کا کا جان کا کہیں کچھ پتا نہیں چلا۔“ اس نے آزر دہ سی چپ کو توڑنے کی کوشش کی۔ مادرا نے قدرے چونک کر اسے دیکھا۔

”بہت سے لوگوں سے پوچھا ہے، بہت سی جگہوں پر گیا ہوں مگر۔۔۔“

”مجھے ڈر ہے، انہیں کوئی حادثہ نہ پیش آ گیا ہو۔ انہیں خبر تھی کہ ابا کے بعد مجھے ان کی کتنی ضرورت ہے۔ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا سلیم کہ وہ جانتے بوجھتے کہیں چلے گئے ہوں۔“ وہ از حد پریشانی کے عالم میں سر تھامے بیٹھی تھی۔ گوئی بوا کب تک اس کا ساتھ دے سکتی تھیں۔ آج نہیں تو کل وہ ساتھ چھوڑ جائیں، تب۔۔۔؟ وہ بے چین ہو کر پیشانی مسلتے لگا۔

”اگر کا کا جان نہ آئے سلیم! خدا نہ کرے کہ ایسا ہو لیکن فرض کرو اگر کا کا جان نہ آئے تو میرا کیا ہوگا، میں یہاں انکی کیسی رہوں گی؟“ سو فکر، پریشانی اس کی جان سے لپٹی تھیں۔ ہزاروں خدشوں، واہموں نے اسے ہلکان کر رکھا تھا۔

”کیا مجھے دارالامان جانا پڑے گا لیکن میں، میں وہاں کیسے رہوں گی سلیم!“ بے بسی کے شدید احساس نے اسے رلا دیا۔

سلیم چپ چاپ بیٹھا ہونٹ کاٹا رہا۔ وہ یقیناً اس سے مدد کی خواہاں تھی مگر وہ خود ایک کمرے کو چار لڑکوں میں بانٹ کے رہنے والا۔

”کیا مدد کروں میں اس کی، کیسے۔“ وہ بالوں میں انگلیاں پھنسائے بیٹھا تھا۔ کا کا جان کے بڑے احسانات تھے اس پر۔ اس گھڑی احسانوں کا بدلہ نہ چکا تھا تو احسان فراموش کہلاتا۔

”مادرا! تم میرے ساتھ چلو گی؟“

”آہ۔۔۔“ مادرا کے دل پر خچر کی طرح لگا تھا یہ جملہ۔ میری کم مائیگی کہ خود اس کے سامنے دست سوال دراز کر بیٹھی ہوں۔ اب انکار کی جرات سے نہ رڈ کرنے کا حوصلہ۔

”کہاں؟“ اس نے آنسوؤں سے بھری آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”ہے ایک جگہ۔ اس سے بڑھ کر جائے پناہ تمہارے لیے اس وقت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔“

☆☆☆

بڑے سے بازار کی قدرے تنگ اور تاریک گلی جس کے اوپر دھوپ، بارش اور سردی سے بچنے کے لیے کہیں ترپال، کہیں ٹین اور کہیں سرکنڈوں کی چھت ڈالی گئی تھی۔ اس گلی میں بیسیوں دکانیں تھیں۔

پر چون کی، نیاری کی، دودھ دہی کی، پان کی اور درزیوں کی دکانیں اور ان ہی دکانوں جیسی تیسرے درجے کی انسانی مخلوق اپنے مدقوق چہروں اور زرد آنکھوں سمیت اس کے آس پاس ہنس رہی تھی، بول رہی تھی۔

مادرا کو یکدم سانس لینے میں دشواری سی محسوس ہونے لگی تو ہاتھ میں پکڑے بیگ پر اس کی گرفت کمزور پڑ گئی۔

”لاؤ، یہ مجھے دے دو۔“ سلیم نے آگے بڑھ کر بیگ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور خود اسی گلی میں جانے والے کی دکان کے ساتھ اوپر جاتی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ جن پر پہلا قدم رکھتے ہی اس کی ہانگوں میں لرزش سی اتر آئی تھی۔

”اس اندھیر گمری کا اختتام جانے کہاں ہوگا۔“ خستہ حال سیڑھیوں پہ بہت سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ گول گول انداز میں گھومتی اوپر کو جاتی سیڑھیاں تاریکی میں غرق تھیں۔

تب ہی اس کے عقب سے دھڑ دھڑ سیڑھیاں چڑھنے کی آواز آئی۔ اس نے دیوار پر ہاتھ جما کر پلٹ کر دیکھا۔

کوئی لڑکی تھی، دوپٹہ لا پرواہی سے گلے میں پڑا تھا، ہاتھ میں دودھ کا برتن پکڑے سرسری سی نگاہ اس پر ڈالتی وہ ان کے برابر سے ہو کر آگے نکلے اور پھر لڑکوں میں چھلاوے کی طرح غائب ہو گئی۔ مادرا نے حیرت سے اس لڑکی اور پھر سلیم کو دیکھا جو آخری سیڑھی پہ یقیناً اسی کا منتظر تھا۔

سیڑھیوں کا خاتمہ ڈیوڑھی نما کمرے میں ہوا تھا جس کے فرش پہ پانی۔ چھڑکا ہوا تھا اور اس کی نم آلود ٹھنڈک میں دو لڑکیاں کھڑی با آواز بلند قہقہے لگا رہی تھیں۔ انہیں آتے دیکھ کر وہ ایک دم ہی خاموش ہوئیں مگر سلیم انہیں مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ مادرا اس کی تقلید میں جس کمرے میں داخل ہوئی، وہاں کے نیم تاریک ماحول میں بلب کی زرد روشنی ناکافی لگ رہی تھی۔ کمرے کے دائیں طرف کچھ جستی ٹرنگ پڑے تھے، جن پر کپڑوں کا ڈھیر تھا۔ کچھ کپڑے استری شدہ حالت میں کھوئی سے لپک رہے تھے۔ دیواروں پر لکڑی کے سیاہ فریم میں کچھ تصویریں لٹکی تھیں، جن کے شیشے دھندلا چکے تھے۔ بائیں طرف نو آڑی پلنگ پہ ایک عورت بیٹھی اپنے بال بنا رہی تھی۔ باہر کی جانب کھلنے والی دونوں کھڑکیاں بند تھیں اور کمرے میں سیلن زدہ سی تنہائی کی باس منڈلائی پھر رہی تھی۔

سلیم نے اس کا بیگ رکھتے ہوئے اسے ایک خالی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود ایک میلی سی تیلی پر بٹک گیا۔ وہ عورت کئی لمحوں کی حیرت کے بعد چونکی تو فوراً ہی تنگٹنگا پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے بال بھر کر اس کے سینے پہ آگئے تھے اور دوپٹہ پلنگ پہ پڑا رہ گیا تھا اور وہ خود ایک عجیب ہی سرخوشی کے عالم میں آگے بڑھی اور دونوں ہاتھوں میں سلیم کا چہرہ تھام کر اپنے کپکپاتے ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھ دیے تھے۔

مادرا نے از حد حیرت سے اس عورت کو اور پھر بیزاری و اکتاہٹ کے ساتھ سلیم کو اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہوتے دیکھا۔

”بس ٹھیک ہے۔“ اس نے قدرے رکھائی سے اس عورت کے ہاتھ اپنے چہرے سے ہٹائے۔

”یہ ماورا۔۔۔ کچھ دن پہلے رہے گی۔ بہت ہی شریف اور معتبر گھرانے سے اس کا تعلق ہے۔ پڑھائی کے سوا کچھ بھی گھر سے باہر نہیں نکلی۔ اب مجبوری آن پڑی ہے سو۔۔۔“

وہ اس کی بے بسی دے چارگی کی کہانی سنانے جا رہا تھا۔

ماورا کے حلق میں ممکن آنسوؤں کا گولہ سا انگ گیا۔

”کل تک سب کچھ تھا میرے پاس۔۔۔ گھر، سانبان، نگران، محافظ۔۔۔ اور آج۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔ ایک معذور باپ اور ایک بے شناخت سے انسان نے کس قدر مضبوط حصار میں لے رکھا تھا مجھے۔ ابا تو آٹل کے سامنے مجبور ہو گئے۔ مگر آپ نے میرے ساتھ کیا کیا کا کا!“ گرم گرم آنسو اس کے گال بھگو گئے تھے۔

سلیم دروازے سے باہر نکل گیا اور سلیم جاتے جاتے اسے کچھ کہہ رہا تھا مگر اسے کچھ سنائی نہ دیا۔

ہاں جب عورت اس کے پاس آ کر بڑی شفقت سے اس کا سر سہلانے لگی۔ کچھ اور لڑکیاں اس کے آس پاس آ کر کھڑی ہوئیں۔ تو وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر زار و قطار رو دی تھیں۔ اس کے ارد گرد سب لوگ اجنبی تھے۔

اور وہ خود۔۔۔ اکیلی تھی۔

☆☆☆

”پہلے قلم کھو گیا۔۔۔ اور پھر قدکار، آج بیس دن ہو گئے ہیں کہ کا کا جان کا کہیں کچھ بتائیں چلا۔ سلیم اس دن سے سڑکوں کی خاک چھانتا پھرتا ہے مگر حاصل وصول کچھ نہیں۔ خدا جانے زمین نکل گئی یا آسمان کھا گیا۔ ابا کے مرنے کا سانحہ ایسا ہی جاں گسل ہوتا تو سب سے پہلے میں دیوانی ہو کر کہیں کھڑی ہوتی۔ ہاں، کوئی پرانا زخم کھل گیا ہوگا۔ درد بس سے باہر ہوا اور وہ ہوش گنوا بیٹھے۔ ہائے کا کا! کہاں سے ڈھونڈوں آپ کو۔ کیسی چھپر چھایہ تھا آپ کا وجود کہ دھوپ کی ہلکی سی پیش کا احساس بھی نہ ہوتا تھا۔ اور اب دیکھیے۔ کہاں آن پڑی ہوں۔۔۔“ اس نے بھاری ہوتے سرخ پتھوں کو بمشکل حرکت دیتے ہوئے اپنی جلتی آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا۔

زمانی بیگم! اپنے پلنگ پہ بیٹھی تھیں۔۔۔ تیسری منزل کے اس کمرے کی بیرونی کھڑکی کھلی تھی۔

باہر آسمان سیاہ تھا اور ہوا تیز تھی۔ سو کمرے میں ہلکی سی خنکی بند کمرے میں بھی محسوس ہو رہی تھی شام سے رات بہت بیت چکی تھی۔

اس جس زدہ کمرے میں بند ہو کر، بچھے کے گھر گھر رستے ہوئے اس نے کوئی ہزار بار ابا اور کا کا جان کے بارے میں سوچا تھا۔ جہاں کہیں سوچ کا سلسلہ ٹوٹتا۔ وہ آنکھیں کھول کر زمانی بیگم کو دیکھنے لگتی۔

وہ دونوں ہاتھ گود میں دھرے بے حد خاموش بیٹھی تھیں۔ اور نگاہیں کھڑکی سے باہر آسمان پر کچھ کھوج رہی تھیں۔

ماورا کو یاد آیا۔ وہ اسے اپنی کہانی سنار ہی تھیں اور انہوں نے کہا تھا۔

”سلیم میرا اکھوتا بیٹا ہے۔“ اس نے سنا تھا وہ سن کر سوچ میں ڈوب گئی۔

”آپ نے کہا تھا سلیم آپ کا اکھوتا بیٹا ہے۔“ ماورا کے کہے پر وہ بری طرح چونکیں تو اسے خیال آیا کہ انہوں نے بہت دیر پہلے یہ بات کی تھی اور نہیں معلوم وہ اپنی کہانی کو کس موڑ پر لے جا کر چپ ہوئی

تھیں۔“ ہاں، سلیم میرا اکھوتا بیٹا ہے۔“ وہ خود بھی سوچ کے لمبے سفر سے پلٹ کر آئی تھیں۔ جوڑ جوڑ میں تھکن سی محسوس ہوئی تو نیم دراز ہو کر ریخ اس کی طرف موڑ لیا۔

”پہلے میں ریڈیو پہ سنگیت کرتی تھی۔ پرانا زمانہ تھا پھر وقت بدلا تو حالات اور زمانے بھی بدل گئے۔ پیٹ پالنے کو کئی محفلوں میں گانے لگی۔ بیٹا سال کا ہوا تو شوہر مر گیا۔ ان دنوں تنہائی سے گھبراہٹ ہونے لگی تو اپنے استاد فضل حسین کو ان کی بیٹی سمیت اپنے پاس لے آئی، استاد صاحب بوجہ ضعف چلنے پھرنے سے معذور تھے۔ یہیں ایک کمرے میں چاہنے والوں کو تربیت دینے لگے۔ ایک ہمارے طلبہ نواز کی بیٹی تھی نرگس۔۔۔ ہم دونوں محفلوں میں جا میں جو ملتا، مل بانٹ کر کھا لیتے۔ پھر استاد صاحب چل لے۔ ان کی بیٹی بھی میرے پاس نہ رہی۔ تب دو چار لڑکیوں کو اپنے پاس رکھ لیا۔ ان ہی سے گوانے لگی۔ سلیم ہمیشہ ہر محفل میں میرے ساتھ جایا کرتا تھا۔۔۔“

”اور سلیم نے ایک مرتبہ کہا تھا، میرے گھر والے دیہات میں رہتے ہیں اور بغرض تعلیم یہاں شہر میں۔۔۔ یا اللہ! لوگ جھوٹ بھی بولتے ہیں تو کس صفائی سے۔“ اس نے کروٹ بدلی اور باز دموز کر سر کے نیچے رکھ لیا۔

”پھر خبر نہ ہوئی سلیم کب بڑا ہو گیا۔ اندر، باہر جانے لگا تو کچھ اچھی بری بھی کانوں میں پڑی ایک روز کہنے لگا۔

”ماں! یہ گانا بجانا چھوڑ دو۔۔۔“

میں ہنس دی اور کہا۔

”جس روز تو کما کر کھلانے والا بنے گا، اس روز چھوڑ دوں گی۔“ میں نے تو بات مذاق میں ٹالی تھی۔ مجھے خبر ہی نہ ہو سکی۔ کب وہ آٹھ سے اٹھارہ سال کا ہو گیا۔۔۔ ایک صبح سامان باندھ کر کمرے سے نکلا اور کہنے لگا۔

”ہاسٹل میں رہ کر پڑھوں گا۔ اگر کبھی راہ چلتے ملاقات ہو تو بیٹا کہہ کر مت پکارنا۔۔۔ تجھے ماں کہتے ہوئے شرم آئے گی۔“

وہ کہہ کر چلا گیا۔۔۔ میں بت بنی بیٹھی رہ گئی۔۔۔ دو سال اس شہر سے باہر گزرے۔۔۔ لوٹ کر آیا بھی تو میری دہلیز پر قدم نہیں رکھا۔ میں نے بھی دل مار لیا۔ خود ”بو“ بن کر گھر میں بیٹھ جانی تو جو چار، چھ گھر میں رکھ چھوڑی تھیں۔ انہیں کہاں سے کھلانی۔۔۔ ایک کی ماں فلم کی ایک شراہی۔ شوٹنگ کے دوران پہاڑی سے گر کر مر گئی۔ بیٹی روٹی دھونی میرے پاس آ گئی۔ ایک کسی لڑکے کے ساتھ گھر سے بھاگ کر آئی تھی۔ لڑکا یہاں آ کر غائب اور یہ میرے ہتھے لگ گئی۔ دو تیم خانے میں پبی بڑھی تھیں انہیں وہاں سے نکال کر یہاں لے آئی۔

یہ چاروں شادی بیاہ پہ جا کر گاتی ہیں۔ ماہی، ٹپے، فلمی گانے۔ اچھے گھروں کی شریف عورتیں خود بلاتی ہیں انہیں۔ غزل کے لیے تہینہ کو لے کر جاتی ہوں۔ اس کی آواز میں سوز بہت ہے۔ لوگ اپنے اپنے غموں پہ روتے ہیں جس پل وہ گارہی ہو۔ اس کے لے پر شام سکے لگتی ہے اور رات آنسوؤں سے تم ہو جاتی ہے۔ اس بے چاری کا دل ٹوٹ چکا ہے۔ سر میں درد نہ جھلکے تو اور کیا ہو۔۔۔ ہا۔۔۔ میرے

مالک! کیسے کیسے لوگوں سے بھردی ہے یہ کائنات۔۔۔ کیا کیا غم نہیں ملتے دیکھنے کو۔۔۔ انہوں نے طویل سانس لی اور گروٹ بدل کر چند لمحے بڑبڑاتے رہنے کے بعد خاموش ہو گئیں۔ اس ایک عورت کی کہانی، کئی کہانیوں میں بدل کر رات کے سیاہ سینے پہ کندہ ہو گئی تھیں۔ ماوراجت لیٹی ان کہانیوں کو اپنی نگاہوں سے ٹوٹتی رہی۔

”ایسا کیوں ہوتا ہے؟“ کوئی کٹنا سادل میں پُچھا تو وہ اٹھ بیٹھی۔

”کسی بہت ہی اپنے کو خود سے کاٹ کر الگ کر دینا۔ اس کے وجود کی مکمل نفی کرنا محض اس لیے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے، وہ ہمیں اور ان لوگوں کو پسند نہیں جن کے درمیان ہم رہ رہے ہیں۔“
زمانی بیگم کی گہری سانسوں کی سرسراہٹ کمرے کی خاموشی میں ہلکورے لے رہی تھی۔ وہ چپکے سے اٹھی اور کمرے کا دروازہ کھول کر وہیں دہلیز پہ بیٹھ گئی۔

”اور کا کا جان کہا کرتے تھے۔۔۔“ تمہارا باپ سید زادہ تھا۔ اور اس نے شادی اس لڑکی سے کی جو نالک کرنے کے لیے شہر شہر گھوما کرتی تھی۔ نتیجتاً گھر کے سب دروازے اس پر بند، ماں نے دودھ نہ بخشے کی قسم کھائی اور باپ نے اپنی ساری بددعا میں اس کے نام لکھ دیں۔“
”اور ان بددعاؤں نے تا عمر میرے باپ کا ساتھ نبھایا تھا۔“ ابا کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آیا تو آنکھ ایک بار پھر بھڑائی۔

”ساری عمر صبر شکر سے کاٹ لی مگر مفلسی کا عالم تو یہ تھا کہ مرتے ہوئے کسی اپنے کا کندھا بھی نصیب نہ ہوا۔“ اس نے نڈھال ہوتے ہوئے اپنا سر دروازے کی چوکھٹ سے ٹکا دیا۔
رات کا آخری پہر چل رہا تھا۔ اس کے سامنے ڈیوڑھی اور چکر کھاتی سیڑھیوں پہ سناٹا دم سادھے پڑا تھا۔

تیسری منزل گھپ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ہوا سبک رفتار ہو چکی تھی۔ اور قریب کے کمرے سے ہولے ہولے لنگھنے کی آواز آرہی تھی۔
زمانی بیگم سوتے میں ایک دم ہی اٹھ گئیں۔ ماوراجت جگہ پر چونکی اور پھر دروازہ بند کر کے چپ چاپ واپس آ لی۔

☆☆☆

سورج کب کا نکل چکا تھا۔ وہ بہت دیر تک اکڑوں بیٹھی زمانی بیگم کے اٹھنے کا انتظار کر رہی تھی۔۔۔ اور پھر آپس بے سُدھ دیکھ کر کمرے سے باہر آ گئی۔ برآمدے میں تین چار پائیوں پہ چادروں پہ لپٹے وجود ابھی تک گہری نیند میں غرق تھے۔ وہ چار پائیوں کے درمیان کھڑی ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ گروٹ بدلتے ہوئے ایک لڑکی نے چادر ہٹا کر ایک پل کے لیے شمار آلود آنکھوں سے اسے دیکھا۔۔۔ اور پھر غراب سے چادر کے اندر غائب ہو گئی۔

سیڑھیوں پہ کسی کے قدموں کی آواز آرہی تھی۔ وہ محتاط انداز میں قدم اٹھاتی برآمدے سے نکل کر چپ بھر کھلے آسمان تلے آ گئی، جسے صحن کہا جاسکتا تھا۔ کافی دیر بعد ایک لڑکی کا چہرہ سیڑھیوں سے نمودار ہوا۔ گوری رنگت۔۔۔ سیاہ بال اونچے سے جوڑے کی شکل میں باندھے ہوئے تھے۔ چہرے کے اطراف میں بھری ہوئی چند آوارہ لٹوں میں اس کا چہرہ بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔

پانی سے بھری ہوئی بالٹی بمشکل اٹھا کر ایک سیڑھی سے دوسری سیڑھی تک رکھتے ہوئے وہ بالآخر اوپر پہنچ گئی تھی۔ دونوں ہاتھ کمر پہ رکھ کر سانس ہموار کرتے ہوئے اس کی نظر ماوراجت پر پڑی تو فوراً مسکرا کر اس کی طرف آ گئی۔
”اٹھ گئیں تم۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔ پانی کہیں اور سے لانا پڑتا ہے؟“

”کئی ماہ سے ٹل خراب ہے۔ مالک مکان کہتا ہے، خود سے ٹھیک کراؤ۔ اور ہمارے لیے یہ زیادہ آسان ہے کہ جا کر دوسری منزل سے پانی لے آئیں۔ آؤ پہلے تم منہ ہاتھ دھولو۔ میں بعد میں نہالوں گی۔“ اس نے بالٹی اٹھا کر غسل خانے میں رکھی جس کے دروازے پر صرف پردہ لٹک رہا تھا۔
ماوراجت اس عنایت پر اس کا شکریہ ادا کرتی غسل خانے میں چلی گئی۔ فارغ ہو کر باہر نکلی تو وہ لڑکی باقی لڑکیوں کو جگانے کی تنگ دود کر رہی تھی۔ کسی کا پاؤں ہلا کر کسی کی چادر کھینچ کر وہ نہانے چلی گئی۔ ماوراجت کچھ پل وہاں کھڑی رہی۔ پھر دوبارہ کمرے میں آ گئی۔ زمانی بیگم کے جاگنے کے ابھی تک کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ وہ اپنی چار پائی پہ بیٹھ کر یونہی کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ تب کافی دیر بعد وہ لڑکی نہاد ہو کر کچیلے بال جھٹکتے ہوئے آئی۔

”تم میرے کمرے میں آ جاؤ۔“

ماوراجت چپل پہن کر اس کے پیچھے چلی آئی۔ اس کا کمرہ زمانی بیگم کے کمرے سے کہیں بہتر حالت میں تھا بیگم پہ پچھی چادر ملنے لگی، صاف ستھری اور بے خنک تھی۔
”میں ناشتے کا کبہ کرا آئی تھی۔ لڑکا آتا ہی ہوگا۔ تب تک تم یہ بسکٹ کھا لو۔“ اس لڑکی نے الماری کھول کر بسکٹوں کا ڈبّا نکالا اور پلیٹ میں بسکٹ ڈال کر لیس کے سامنے رکھ دیے۔
”میرا نام تمہینہ ہے۔“ وہ آئینے کے سامنے جا کر لکھی کرنے لگی۔

”یہاں پر دو ہی کمرے ہیں؟“ ماوراجت نے کسی سوچ کے زیر اثر پوچھا۔

”ہاں۔۔۔“

”بانی لڑکیاں کہاں رہتی ہیں؟“

”میرے کمرے کے علاوہ پورے گھر میں رہتی ہیں۔“ تمہینہ ذرا سانس ہی پھر کنگھارکھ کر اس کے پاس آ بیٹھی۔

”میرے اور ان کے مزاج میں بہت فرق ہے ماوراجت! میرے لیے ان کے ساتھ رہنا بہت مشکل ہے۔ اس کمرے کے بدلے مجھے ان تینوں کے برابر کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے۔“

ماوراجت کے حلق میں پہلا بسکٹ ہی پھنسے لگا۔

”اس ڈر بے میں تمہاری گنجائش کہاں نکلے گی ماوراجت؟“ اس نے بے بسی سے سوچا اور پلیٹ پر سے کھسکا دی۔

تمہینہ نے کچھ کہے بغیر اس کے اترے اترے چہرے کو دیکھا اور پھر خاموشی سے اٹھ کر اپنی کچھ چیزیں سمیٹنے لگی۔

تب ہی باہر سے کسی نے آواز لگائی تھی۔ ماوراجت کی طرح چونکی جب کہ تمہینہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

واپس آئی تو ایک ٹرے میں جلوہ پوری اور چنے کا ناشتہ لاکر اس کے سامنے رکھ دیا۔

”رات بھی تم نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ لو اب آرام سے بیٹھ کر کھاؤ۔“

”مجھے بھوک نہیں ہے تمہیں! تم نے خواجواہ رحمت کی۔“

”بھوک کیسے نہیں ہے۔ اور اب نہیں لگی تو تھوڑی دیر بعد لگ جائے گی۔“ وہ اس کے برابر بیٹھ گئی۔

”یہ پیٹ کا کنواں ہے پیاری۔۔۔ جیتے جی کبھی نہیں بھرتا۔۔۔ دل بھج جاتے ہیں روح مرجاتی ہے مگر بھوک نہیں مرنی۔ تمہارا تو صرف باب مرا ہے ماورا! مجھے دیکھو۔۔۔ سب کچھ کھو چکی ہوں۔ پھر بھی پیٹ بھر کر کھائی ہوں۔“ وہ آنکھوں میں آنی کی کو چھپانے کے لیے ہنس ہنس کر نوالے بنانے لگی۔

ناشتا کرنے کے بعد ماورا اس کے کہنے پر وہ لیٹ گئی تھی۔

رات بہت کم سونے کی وجہ سے سر بھاری بھاری سا ہو رہا تھا۔ لیٹنے کے کچھ ہی دیر بعد اس پر ہلکی ہلکی غنودگی سی چھانے لگی تھی۔

”تمہیں! ماورا کو جگاؤ۔ ناشتا کر لے۔“ زمانی بیگم کی آواز ماورا کو کہیں دہرے سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

”ناشتا کر چکی ہے وہ۔“

”سنو تمہیں! اگر برا نہ مانو تو کیا تم اسے اپنے کمرے میں رکھ سکتی ہو؟ تم جانتی ہونا؟ یہ سلیم کی مہمان ہے۔ میں نہیں چاہتی۔۔۔ اسے ہماری پاس کوئی تکلف ہو۔“

”آپ بے فکر رہیں آپا! یہ میرے پاس رہے گی۔“

ان دونوں کی بات چیت کے دوران ہی نیند اس کے ذہن پر پوری طرح غلبہ پا چکی تھی۔

☆☆☆

بہت سے تعزیتی جملے۔ بہت سا اظہارِ انسوس۔۔۔ مغفرت کی بہت سی دعائیں۔ آج کئی دنوں بعد اسے اپنا غم ایک بار پھر تازہ ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ کامن روم میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ فاسٹل ایئر کے تمام طلباء و طالبات آئے تھے۔ وہ سر جھکائے۔ نم پلکوں سے ان سب کی باتیں سنتی رہی۔ صبر کی تلقین۔۔۔ تسلیم و رضا کی نصیحت۔۔۔ وہ ایک ایک کی بات پر اثبات میں سر ہلاتی رہی۔

پھر رفتہ رفتہ سب لوگ اٹھتے گئے۔ کامن روم تقریباً خالی ہو رہا تھا۔ وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں پونچھتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ تب ایک لڑکا اس کے قریب آیا۔

”میرا نام احمد کیانی ہے۔ فاسٹل ایئر میں ہوں۔ یہاں ڈرامیٹک سوسائٹی کا رکن ہوں اور یونیورسٹی کے سالانہ میگزین کا ایڈیٹر بھی ہوں۔ آپ کے والد صاحب کا سن کر بہت دکھ ہوا، اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ ہم آپ کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں۔“ وہ لڑکا بے حد شائستہ لہجے میں بول رہا تھا۔

”آپ بہت دنوں کے بعد یونیورسٹی آئی ہیں۔ اگر چہ اتنا آسان تو نہیں ہوگا، مگر کوشش کر کے اپنی پڑھائی پر توجہ دیں۔ اس سے آپ کا ذہن بٹ جائے گا۔ اور ہاں میں یونیورسٹی کا بہت پیسا سا اسٹوڈنٹ ہوں۔ لڑکیوں کو کوئی بھی مشکل درپیش ہو بلا جھجک احمد کیانی کو یاد کر لیتی ہیں۔ آپ کو خدا خواستہ کبھی کوئی

پڑھائی پر توجہ دیں۔ اس سے آپ کا ذہن بٹ جائے گا۔ اور ہاں میں یونیورسٹی کا بہت پیسا سا اسٹوڈنٹ ہوں۔ لڑکیوں کو کوئی بھی مشکل درپیش ہو بلا جھجک احمد کیانی کو یاد کر لیتی ہیں۔ آپ کو خدا خواستہ کبھی کوئی

پڑھائی پر توجہ دیں۔ اس سے آپ کا ذہن بٹ جائے گا۔ اور ہاں میں یونیورسٹی کا بہت پیسا سا اسٹوڈنٹ ہوں۔ لڑکیوں کو کوئی بھی مشکل درپیش ہو بلا جھجک احمد کیانی کو یاد کر لیتی ہیں۔ آپ کو خدا خواستہ کبھی کوئی

پڑھائی پر توجہ دیں۔ اس سے آپ کا ذہن بٹ جائے گا۔ اور ہاں میں یونیورسٹی کا بہت پیسا سا اسٹوڈنٹ ہوں۔ لڑکیوں کو کوئی بھی مشکل درپیش ہو بلا جھجک احمد کیانی کو یاد کر لیتی ہیں۔ آپ کو خدا خواستہ کبھی کوئی

براہم ہو تو مجھے یاد رکھیے گا۔ ہو سکتا ہے میں آپ کے کسی کام آسکوں۔“ احمد کیانی رواں لہجے میں بہت سادگی سے بولتا تھا اور یہ ہی سادگی بولنے والے کو سب سے پہلے متاثر کرتی تھی۔

”شکریہ۔۔۔ اگر ایسا کوئی موقع آیا میں ضرور زحمت دوں گی۔“

”اوکے۔۔۔ پھر میں چلتا ہوں۔ اور ہاں۔۔۔“ وہ الوداعی مسکراہٹ کے ساتھ دروازے کی طرف جاتے جاتے پلٹا۔ اور پھر اسے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”بارون اسرار آپ کے بارے میں بہت پوچھتا رہا۔ میرا خیال ہے اسے آپ کے والد کے انتقال کی خبر نہیں ہو سکی ورنہ وہ ضرور آتا۔ گزشتہ دو دن سے وہ بھی یونیورسٹی سے غائب ہے۔“

ماورا خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

”بھلاں شخص کو کیا ضرورت ہے اس خصوصیت سے اس کا ذکر کرنے کی؟“

احمد کیانی جا چکا تھا۔ اس نے بشکل دو کلاسز لی تھیں۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد یونیورسٹی آنے کے بعد آج پہلے دن اس کا دل کسی طور پر کتابوں میں نہ لگا تو وہ جلد ہی واپس چلی گئی تھی۔

☆☆☆

صبح، نالکہ اور ارم شادی پر جانے کے لیے تیار ہو چکی تھیں۔ آج مہندی تھی۔ لڑکے والے آرہے تھے۔۔۔ لڑکی والوں کی خاص تاکید تھی۔

”بھر پور تیاری کر کے آنا، مقابلہ ہار گئے تو ایک انٹسٹی نہ ملے گی۔“

گانوں کی آہیں کوئی فکر نہ تھی۔ سینکڑوں کیدٹیں جمع تھیں ان کے پاس، دن رات، چلا چلا کر سنا کرتی تھیں۔ ایک سے ایک نیا گانا زبر تھا۔ اب تو بس کپڑے لٹے، میک اپ کی فکر تھی۔ تاکہ کسی سے کم نظر نہ آئیں۔ نالکہ ابھی ابھی تمہینہ سے اپنے سوٹ کا ہم رنگ گھسٹہ مانگ کر لگی تھی۔ زمانی بیگم، ارم پر خوب برس رہی تھیں نالکہ کی بھی جگہ جارہی تھی۔

”اور چڑھاؤ کسی کے گلاس پر گلاس، کہاں نکلے گی آواز تمہاری۔ پھٹا ہوا بانس، ہزار بار پہلوان سے کہا ہے یہ کھنٹی میٹھی چیزیں ہمیں راس نہیں آتیں۔ مگر وہ بھی ایک نمبر کا ڈھیٹ ہے۔“

”تمہینہ! یہ گجرے بالوں میں سیٹ نہیں ہو رہے۔۔۔“ صبیحہ، تمہینہ کے سامنے آکر جگمگاتی تھی۔

”اور تو بھی سن لے۔۔۔ پچھلی بار کی طرح مرے ہوئے ہاتھوں سے ڈھولک تھاپی تو پھر دیکھنا سچ بچا ٹنڈی کر کے بٹھا دوں گی ہاں۔۔۔“ زمانی بیگم نالکہ کی طرف پلٹیں تو بھی کھنٹی ہوئے آخری فقرے یہ وہ بے اختیار قبضہ لگا کر بننے لگی۔

زمانی بیگم کتنے پل غصیلی نظروں سے اسے گھورتی رہیں اور پھر یکدم سے ان کی ہنسی نکلی تو وہ چھپانہ نکلیں۔ نالکہ کے ہنسنے مزید آزاد ہو گئے تھے۔ ارم اور صبیحہ ان کا موڈ خوشگوار ہوتے دیکھ کر جبکے لگیں۔

ارم مہندی سے رنگے ہوئے ہاتھوں میں ڈھیروں ڈھیر چوڑیاں پہن کر وہ ہنستی کھلکھلائی نیچے اتر گئیں۔ پیچھے بچھے زمانی بیگم تھیں۔ ان کی آوازیں کچھ دیر تک گھر میں گونجتی رہیں، پھر ایک دم ہر طرف سا ناسا اتر آیا تھا۔

تمہینہ جانے کس سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ماورا ان تینوں کی پھیلائی ہوئی چیزوں کو دیکھنے لگی۔

”ماورا! اچھت پر چلیں؟“ تمہینہ نے اچانک کہا تو وہ چونک گئی۔

”چھت پر۔۔۔؟“
 ”ہاں، میں اکثر جایا کرتی ہوں آؤ۔۔۔“ تہینہ نے اٹھ کر لکڑی کی سیڑھی دیوار سے لگائی۔
 نیچے کے جس زدہ ماحول کی نسبت اوپر کی کشادہ فضا بہت دلفریب لگ رہی تھی۔ آسمان ان کے
 اوپر جھکا ہوا تھا اور چاند اتنا قریب کہ ہاتھ بڑھا کر چھو لینے کو دل چاہے، تہینہ بازو پھیلائے۔ چہرہ اوپر
 کیے۔ سب رفتار ہوا کی ٹھنڈک کو محسوس کر رہی تھی۔
 ماورا کو اس بلندی سے شہر کو دیکھنے کا موقع پہلی بار ملا تھا۔ وہ چھت کے نیچوں بیچ کھڑی دور دور تک
 شہر کی جلتی بجتی روشنیوں کو دیکھتی رہی۔
 ”اتنی روشنیاں ہیں شہر میں کا کا! آپ کو کن اندھیروں نے نگل لیا کہ واپسی کا راستہ ہی بھول
 گئے۔“ اس کے دل میں ہوک سی اگھی تو وہ اداس ہو کر منڈیر پر بیٹھ گئی۔
 ”مجھے یہ خاموشی اور سکوت بہت اچھا لگتا ہے۔ اتنی آواز فضا ہے یہاں کی۔ دل چاہتا ہے اڑان
 بھروں، اور سیاہ آسمان کی وسعتوں میں کہیں کھو جاؤں۔۔۔“ تہینہ کہہ رہی تھی۔
 ”اور ان روشنیوں سے سچے آباد گھروں سے بہت دور۔۔۔ کچھ راستے پر ایک کھنڈر مکان ہے ج
 چند روز پہلے میرا گھر ہوا کرتا تھا۔ وہاں کوئی روشنی نہیں اور میں اس تاریکی میں بھی کلیوں کے جھنڈ کے
 پاس بہت سے جگنوؤں کو اڑتا ہوا دیکھ رہی ہوں۔ دم سادھے درختوں کی شاخوں میں چھپے پرندوں ک
 آداس بولیاں مجھے یہاں بھی سنائی دے رہی ہیں۔“ وہ گھٹوں پر سر رکھ کر سسکنے لگی۔
 ”تھکی چڑیوں کا کٹورا خالی ہوگا۔ حوض کے پانی پر کائی جم گئی ہوگی اور سبز رنگ پر پیلا ہٹ اتر آؤ
 ہوگی۔“

دھیرے دھیرے بہتی ہوئی رات اس کے آنسوؤں سے نم ہونے لگی تو تہینہ اس کے پاس آ بیٹھی۔
 بالکل خاموش، چپ چاپ نہ کوئی سلی نہ دلاسا۔ کچھ دیر بعد وہ خود ہی رو دھو کر چپ ہو گئی۔ آنسوؤں سے
 چہرہ دوپٹے سے اچھی طرح خشک کر کے اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ بالکل ساکت اور خاموش بیٹھ
 تھی۔

ماورا نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور دوسری جانب دیکھنے لگی۔

”زمانی بیگم بتا رہی تھیں کہ تم غزل بہت اچھی گاتی ہو۔ کیا واقعی؟“

”شاید۔۔۔“ تہینہ نے مختصر سا جواب دیا۔

”مجھے سناؤ گی؟“

”تم سنو گی۔۔۔؟“ اس نے اتنا سی سے پوچھا تو ماورا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ کچھ دیر کے لیے خاموش رہی پھر بہت دھیرے دھیرے اسے سنانے لگی۔

یہ دل، یہ اجڑی ہوئی چشم نم، یہ تنہائی

ہمارے پاس تو جو بھی ہے مال درد کا ہے

اسیر ہے میری شاخ نصیب پت جھڑ میں

میرے پرندہ دل پر بھی جال درد کا ہے

ہم اس کو دیکھتے جاتے ہیں، روتے جاتے ہیں

یہ صحن شب میں پڑا ہے جو تھال درد کا ہے
 رات دھیرے دھیرے بیت رہی تھی۔ چاندنی تہینہ کے نم گالوں پر بوسہ دینے زمین پر اتر آئی
 تھی۔ اس کی آواز وائلسن کے سروں سے مشابہ تھی۔ دردناک دل کی دشتوں کو جگائی ہوئی۔ زمانی بیگم
 نے اس کے متعلق کچھ بھی غلط نہ کہا تھا۔

اب اس کے بعد کوئی رابطہ نہیں رکھنا

یہ بات طے ہوئی لیکن سوال درد کا ہے

وہیں کہیں کسی گھائی میں تیرا ہجر بھی ہے

میرے لہو سے جہاں اتصال درد کا ہے

”تمہاری آواز میں سوز بہت ہے۔“ وہ چپ ہوئی تو ماورا نے بے اختیار کہہ دیا، تہینہ ہولے سے
 ہنس دی۔

”سارا جو وہی سوز میں ڈھل گیا ہے پیاری! ریشے ریشے میں غم بتا ہے۔ میرے شعر کے پردے میں
 غم دل کہتا تھا، میں نے گائی کی آڑے لی۔“

”محفلوں میں گانا کیسا لگتا ہے تہینہ!“ ماورا دل کی بات زبان پر لے آئی تھی۔

”محفل مجھ پر نشہ طاری کر دیتی ہے ماورا! بہت سے لوگوں کے درمیان وہ سب کہہ جاتی ہوں جو کسی
 سے کہہ نہیں سکتی۔ اور مزے کی بات، اس پل کوئی مرے دکھ کو سمجھ نہیں پاتا۔ خود ہی کہتی ہوں پھر خود ہی
 سسکنے لگتی ہوں۔“ تہینہ نے اپنا سر اس کے کندھے سے ٹکا دیا۔ اس کے وجود کی ہلکی سی لرزش ماورا سے
 چھپی نہ رہے کی تھی۔

”چھتاؤ! میرے اندر پنچے گاڑے بیٹھا ہے ماورا! سوچتی ہوں، میں نے کیا کیا تھا؟ کس کے لیے
 اپنا سب کچھ چھوڑا۔؟ ہاتھ میں سوئی بھی چھب جاتی تو ماں باپ، بھائی بہنیں بھاگ کھڑے ہوتے تھے مگر
 میں نے ان کے ساتھ کیا کیا؟ اور اپنے ساتھ۔۔۔ اب رات رات بھر روتی ہوں کوئی آنسو پونچھنے کو نہیں
 ملتا۔“ اس کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

”وہ خود تو بہت مزے میں ہو گا نا ماورا! مجھ جیسی کوئی اور مل گئی ہوگی۔ ہم نادان لڑکیوں کی کوئی کمی
 تھوڑی ہے۔ کسی نے محبت کے دو چار بول بولے اور ہم نے اپنا آپ رول ڈالا اس کے لیے۔۔۔
 ہا۔۔۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

”محبت کے راستے میں کوئی قدم نہ رکھے پیاری! محبت دکھ دیوے ہے۔ مار ڈالے ہے۔ زندگی
 بھر کا روگ ہووے ہے۔ چار دن کا کھلوڑا ہے رے اور بس۔۔۔“ وہ ایک دم لہجہ بدل کر بولی اور پھر
 کلکھلا کر ہنس دی۔

”ناکمل ایسے ہی بولتی ہے اور مجھے اس کا بولنا بہت اچھا لگتا ہے۔“ عام سے انداز میں بات کرتی
 تہینہ دوبارہ سے اپنے خول میں سمٹ گئی۔

ماورا کی آنکھوں میں جانے کیوں ایک چہرہ بار بار سامنے آتا رہا۔

عشق میں چند جھکتے ہوئے پل

بیت جانے تھے جس بیت گئے

تہینہ چھت پر ٹہلتے ہوئے گنگنا رہی تھی۔ ماورا گھٹنوں پہ سر رکھے اپنی سوچوں میں گم ہو گئی۔

☆☆☆

”یونیورسٹی کا کوئی گوشہ ایسا بھی ہوگا جہاں یہ شخص میرے پیچھے نہ آ سکے۔“ وہ ہارون اسرار کو اپنے مقابل بیٹھے دیکھ رہی تھی۔

”لابریری، کیفے میرا۔۔۔ سیمینار روم، وہ کہاں کہاں سے کترا کر نکلتی تھی۔ مگر کہیں نہ کہیں بے تاب نگاہوں میں بہت سی آنکھیں لیے وہ اس کے سامنے اکھڑا ہوتا تھا۔

”میری طرف دیکھو۔۔۔ میری آنکھوں میں جھانکو۔ کیا تمہیں میری باتوں میں، میرے جذباتوں میں کوئی سچائی نظر نہیں آتی۔“ وہ جیسے اس کی سنگ دلی پر حیران تھا۔ ماورا نے ساری توجہ کتاب کی طرف مبذول کرنی چاہی مگر وہاں بھی تو یہ لفظ تحریر تھا۔ اس نے کتاب بند کی اور سیاہ جلد پر یونیورسٹی کی لکیریں کی پچھنے لگی۔

”لوگ کہتے ہیں، لڑکیاں، ہارون اسرار پر مرتی ہیں۔ اور یہ کہتا ہے کہ مجھے تم جیسی کوئی دوسری دکھائی نہیں دیتی۔“ وہ پشیمانی مسکراہٹ لبوں پہ بچائے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔

وہ بنانے کیا کیا کھیتا رہا۔ رت جگے کی اذیتیں۔ کج ادائی کا زخم، بے قراری کی پیش، اس کی آنکھوں کی سرخی کچھ غلط نہ کہہ رہی تھی۔

”میں نہیں جانتا، میں کن راستوں پر قدم رکھ چکا ہوں۔ مجھے نہیں خبر یہاں سے واپسی کا کوئی راستہ ہے بھی یا نہیں۔ مگر یہ کک جو محبت کی دین ہے۔ مجھے جاں سے بھی عزیز تر ہے۔“ وہ پوری سچائی سے کہہ رہا تھا۔

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب

ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

”مت گھسیٹو مجھے اپنے ساتھ کانٹوں پر۔ ابھی اتنا درد سننے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔“ وہ کتابیں

سمیٹنے لگی۔

”تم بات کیوں نہیں کرتیں ہو مجھ سے؟“ وہ پوچھنے لگا۔

”کیا بات کروں میں تم سے؟ جو کچھ تم مجھ سے کہتے ہو ان میں سے کسی بات کا جواب میرے پاس

نہیں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ماورا! تم میرے ساتھ زیادتی کر رہی ہو۔“ وہ اس کے پیچھے چلا آیا۔ تب وہ اس کی طرف پلٹی۔

”کیا چاہتے ہو۔۔۔ کیا بات کروں میں تم سے۔۔۔؟“ وہ بہت سادہ لہجے میں پوچھنے لگی۔

”تم کہتے ہو تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ ٹھیک ہے کرتے رہو محبت۔۔۔ اس میں میرا نقصان کیا

ہے؟ لیکن جواب میں مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ اس کے بے تاثر لہجے پر ہارون کا چہرہ ایک پل کے لیے

متحیر ہوا۔

”کیا میں بھی تم سے ویسی ہی محبت کا دعوا کروں۔۔۔ جیسی تم مجھ سے کرتے ہو۔۔۔؟ لیکن

میرے لیے تو یہ ممکن نہیں ہے۔۔۔ پھر۔۔۔؟ کیا یہ ضروری ہے کہ میں تمہارے ساتھ محبت کا راگ

الاپوں، جب کہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔۔۔؟ ماورا کو خود معلوم نہ تھا کہ وہ اتنی کھور بھی ہو سکتی ہے۔

وہ لب بچھے چپ چاپ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”محبت کا راستہ میرے لیے بنا ہی نہیں ہے ہارون اسرار۔“ وہ سر جھٹک کر بڑبڑاتے ہوئے وہاں

سے پلٹی۔

”میں جن خازنوں میں ابھی ہوں۔ وہاں محبت کی گنجائش نہیں نکلتی۔ ابھی تو میں خود زمین و

آسمان کے درمیان معلق ہوں۔ اپنا آپ بھائی نہیں دیتا تمہارے لیے کہاں سے سوچوں۔۔۔؟“ وہ

تھکے تھکے قدم اٹھاتی اس سے دور ہوتی چلی جا رہی تھی۔

”دستک ان دروازوں پر دی جانی ہے جن کے کھلنے کی امید ہو۔ میں جن بند کواڑوں کے پیچھے

رہتی ہوں۔ وہ وقت اور حالات کے ہاتھوں سیل ہو چکے ہیں۔ میں چاہوں بھی تو انہیں تمہارے لیے نہیں

کھول سکتی۔“

☆☆☆

”چھوٹے۔۔۔ ارے اوچھوٹے۔۔۔ کتنی دیر سے تجھ کو دو جائے کا بولا ہے رے۔۔۔ دیوے

گا کہ میں خود آؤں نیچے۔“ نائلہ کی پاٹ دار آواز تیسری منزل سے گونجی تو ہر کوئی ہڑبڑا کر اس کی طرف

متوجہ ہوا تھا۔ ڈھلتی شام کی گلابی میں وہ دیوار سے لٹکی براہ راست اپنے پیغامات نیچے بازار میں بھجوا رہی

تھی۔

”پر اتنا یاد رکھو پہلوان جی! نائلہ خود آئی تو جرمانے میں پاؤ بھر مٹھائی ساتھ لے جاوے گی۔“

”آ۔۔۔ آ۔۔۔“ زمانی بیگم نے نائلہ کو کمر سے دو چا تو سیدھا چار پائی پر لا پٹا تھا۔

”ہائے۔۔۔ کیوں موری پکلی کر یا راتنا ظلم ڈھاوے ہے جالم۔۔۔ کوئی چک مک پڑ گئی تو

پد بخت پروڈیوسر فلم میں کسی کبڑی ہیر و دن کا چاکس بھی نہ دیوے گا۔“ اس کی ٹھٹھکیاں بڑی جاندار ہوتی

تھیں۔ زندگی سے بھرپور مسکراہٹ آنکھوں سے ہمہ وقت چھلکا کرتی وہ ماورا کرہ بڑبڑا کر جوش زندگی کی بے حد

خوبصورت اور نٹ کھٹ مثال نکلتی تھی۔

”ایکسٹرا بننے کی ماں کی طرح۔۔۔“ زمانی بیگم، ارم سے ساڑھی کی فال درست کروا رہی تھیں۔

”اور اسی کی طرح پہاڑی سے کود کر مرے گی۔“ صبیحہ نے لقمہ دیا۔

”ارے جا۔۔۔ نائلہ، ماں جیسی پاگل نہ ہووے۔ چالیس کے بیٹے میں آئے ہیر و کے ساتھ

پہاڑی پہ چڑھ کر بس وہی ٹھیکے لگاوے۔۔۔“ وہ چار پائی پہ اونٹنی ٹائٹل ہلائی بڑے اطمینان سے

جواب پہ جواب دیے جا رہی تھی۔ تب ہی کسی بچے نے آخری سیڑھی سے جھانک کر آواز لگائی تو نائلہ

اچھل کر بھاگ گئی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔

”پہلوان جی نے کہا ہے۔۔۔ نائلہ جی سے کہنا پاؤ بھر مٹھائی جرمانے میں بھجوا رہا ہوں، اب نیچے

آ کر اپنا کہا پورا کریں۔“ رُٹو ٹونٹے نے جواب دیا۔

”کیا۔۔۔؟“ زمانی بیگم کے کان کھڑے ہو گئے۔

”ہزار بار بولا ہے، اپنی حد میں رہا کرو۔ اب دیکھ لیا۔۔۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”کسی روز یونیورسٹی کا بھڑبھڑائی کے بدلے نیچے اپنی بجوری میں بند کر لے گا وہ بد معاش۔ ابھی پوچھ

کر آتی ہوں اس سے۔۔۔“ وہ سیڑھیوں سے کھٹ کھٹ کر کے اترتے ہوئے بھی بڑبڑا رہی تھیں۔

”اب ہوش آویں گے پہلوان جی کو۔۔۔“ ناکہ مزے سے برنی چائے میں ڈبو کر کھانے لگی تھی۔
”تم کیا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہو۔ یہ تو ان کے روز کا ڈراما ہے۔۔۔“ تمہینہ نے اسے
ٹوکا تو وہ ذرا سا مسکرا دی۔

”آج ہم ایک محفل میں جا رہے ہیں ماورا! آپا کہہ رہی تھیں، تمہیں بھی ساتھ لے چلوں۔“
”دل نہیں چاہ رہا۔ تم لوگ ہو آؤ۔“ اس نے بڑی آسانی سے اسے ٹال دیا۔ مگر زمانی بیگم اس کے
بچھے بچھے چہرے کو دیکھ کر اس کے پیچھے ہی پڑ گئیں۔
”ذرا دیر کو دل بہل جائے گا پکی اچلی چلو۔۔۔ تمہارا بون گم صبر رہنا دل کو ذرا نہیں بھاتا۔ ان
لڑکیوں کو دیکھو۔ کہاں کی آسودگی دیکھی ہے انہوں نے۔ پھر بھی ہنستے کھیلتے دن بتا رہی ہیں۔ چلو تیار
ہو جاؤ، شاہباش۔۔۔“

ان کے اپنائیت بھرے انداز پر وہ مزید انکار نہ کر سکی تو اٹھ کر تمہینہ کے پاس چلی آئی۔
”ان دونوں میں سے کوئی ایک سوٹ پہن لو۔“ تمہینہ نے سیاہ اور سفید رنگ کے سوٹ نکال کر اس
کے سامنے لہرائے۔
”کون سا پہنوں؟“

”میرا خیال ہے سیاہ رنگ مجھ پہ چنچے گا اور سفید رنگ میں تم پیاری لگو گی۔“
تمہینہ نے ایک اداسے کہا تو ماورا نے سفید سوٹ کی طرف ہاتھ بڑھا دیا تھا۔

☆☆☆

جس پل وہ تینوں وہاں پہنچیں آسمان کے کنارے سیاہ پڑنے لگے تھے۔ گلابوں سے مہکتی شام رنگ
رنگ روشنیوں میں ڈوب گئی تھی اور ان روشنیوں میں گھرے زندگی کے غموں سے بے نیاز، پر نور، خوش
باش چہرے ماورا کو ایک پل کے لیے اتنے خوبصورت لگے کہ وہ مہبوت رہ گئی۔
”ارے مجھے تو خبر ہی نہ تھی۔ دنیا اتنے رنگوں، اتنی خوشبوؤں، اتنی خوبصورتیوں سے بھری ہوئی
ہے۔“ اسے اپنا آپ ایک ایسے بچے کی طرح لگا جس نے اس حیرت کدے میں ابھی ابھی آنکھ کھولی ہو۔
تمہینہ اسے ساتھ لے کر کوئی میز پر جا گئی تھی۔ زمانی بیگم ادھر ادھر کے لوگوں میں جان پہچان
ڈھونڈنے لگیں۔ وہ تمہینہ کے ساتھ حیران حیران سی رنگ محفل دیکھتی رہی۔ کھانا، پینا، ہنسا بولنا سب
ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

ذرا دیر بعد زمانی بیگم خود ہی اسے لینے چلی آئیں۔
”یوں کونے میں چھپ کر بیٹھنے سے کیا خاک مزہ آئے گا۔ آؤ میں تمہیں کچھ لوگوں سے ملواتی
ہوں۔۔۔“ وہ زبردستی اسے اپنے ساتھ لے گئیں۔

”یہ فاروق صاحب ہیں، ہمارے بہت بڑے قدردان۔۔۔ ان کے گھر کی کوئی محفل آج تک
ہمارے بغیر نہیں بنی۔۔۔“ وہ بڑے فخر سے بتا رہی تھیں۔

”اور یہ ماورا ہے فاروق صاحب! ہماری بیٹی۔“ فاروق صاحب کے عقب میں کوئی بجلی کی سی
تیزی سے پلٹا تھا۔ ماورا کی نگاہ ایک پل کے لیے اس کی جانب اٹھی تو پھر کئی لمحوں کے لیے پلٹنا بھول گئی
تھی۔

فاروق صاحب غالباً کچھ کہہ رہے تھے۔ اس کی غائب دماغی پر زمانی بیگم نے ٹھوکا دیا تو وہ تیزی
سے سر جھکا گئی۔

”خوبصورت تو تمہینہ بھی ہے زمانی بیگم! لیکن ماورا کے مقابلے کی نہیں۔ انہیں کب سنوار رہی
ہیں۔ بلکہ آپ کہیں توکل ہی ایک محفل۔۔۔“ فاروق صاحب بڑی بے تکلفی سے کہہ رہے تھے۔ ان کی
بات سن کر زمانی بیگم گڑبڑا سئیں۔

”نہ جی۔۔۔ اسے غزل کا کوئی شوق نہیں۔ یہ تو کتابوں کی رسیا۔۔۔“ زمانی بیگم انہیں ٹال رہی
تھیں۔۔۔ مگر جو کچھ اس کے بارے میں کہا جا چکا تھا۔ اس کا رد عمل ان شرارا انگلی آنکھوں میں بخوبی
دیکھا جاسکتا تھا۔

”کاش۔۔۔ کاش۔۔۔“ اس کے دل سے خواہش ابھری تھی۔
”کاش۔۔۔!“ میں نے زمانی بیگم کی بات نہ مانی ہوتی۔ کاش! میں یہاں نہ آئی ہوتی۔ یا پھر
”وہ“ نہ آیا ہوتا۔

زمانی بیگم آگے بڑھ گئیں۔ وہ ان سے معذرت کر کے وہیں ایک کرسی پر ڈھسے گئی۔ ”بھلا مجھے کیا
ضرورت ہے پروا کرنے کی۔“

تمہینہ غزل سنانے کے لیے اسٹیج پر جا چکی تھی۔ اس نے پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو جانا چاہا۔
مگر نگاہ ہٹک کر اس تک جاتی رہی، جس کے چہرے پہ ٹھہرے گداز تاثرات کو ایک پل میں پھرتی
شیدگی میں ڈھلتے اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

”ہاں تو ٹھیک ہے، میں جو بھی ہوں۔۔۔ جیسی بھی ہوں۔ اسے اس سے کیا غرض؟“ اس نے خود
کو ہال کر غزل سننے کی کوشش کی۔

”کیا سوچا ہوگا اس نے میرے بارے میں۔۔۔؟“ تھک ہار کر ایک سوچ پھر سے اس کے ذہن
پر غلبہ پانے لگی تو اس نے خود کو جھڑک دیا۔

”یہ کن اندیشوں میں گھری ہوں۔۔۔ جب اس سے کوئی تعلق، کوئی واسطہ نہیں رکھتا تو پھر ڈر
کیا۔۔۔؟ خوف کیونکر۔۔۔؟“

”وہ محبت کرتا ہے تم سے۔۔۔ اپنے دل میں کس بلندی پر بٹھا رکھا ہوگا اس نے تمہیں۔ اور
ب۔۔۔؟“ یہ پتا نہیں کون اس کے آس پاس بول رہا تھا۔

”یہ محبت وحت کا خناس میرے دل میں کہاں سے آسایا۔۔۔؟“ اس نے اپنا سر جھکا کر اور اٹھ کر
زیر بکھی کرسی پر آگئی۔

تمہینہ دوسری غزل شروع کر چکی تھی اور اس کی آواز کا طلسم جیسے سب لوگوں پر سحر پھونک گیا تھا۔
بڑبان کی طرف سے تمام خواتین کو گجرے پیش کیے جا رہے تھے۔ بھرپور کھلی ہوئی مہکتی کلیاں اس تک
پہنچیں تو نگاہ بے اختیار ہی اس نیم تاریک گوشے کی طرف اٹھ گئی۔ جہاں وہ سر جھکاے، رخ کافی گھونٹ
گھونٹ اپنے اندر اتار رہا تھا۔

مجھ سے ملنے کے وہ کرتا تھا بہانے کتنے
اب گزارے گا میرے ساتھ زمانے کتنے

”میں سلیم کی طرح کٹھور نہیں ہو سکتی۔ جن لوگوں سے دکھ سکھ کی سانجھ ہو۔۔۔ ان سے دستبردار نہیں ہوا جا سکتا۔ چلو اس یہاں نے تمہاری ”محبت“ کھل کر سامنے آگئی۔ اب راہ بدلو گے بھی تو کم از کم مجھے خود سے کوئی گنہ نہیں رہے گا۔“

☆☆☆

صبح آنکھ بہت دیر سے کھلی۔ ادھ کھلی کھڑکی سے روشن آسمان صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ چھٹی کا ارادہ کر کے یونہی کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ لیکن پھر جانے دل میں کیا آیا کہ اٹھ کر غسل خانے میں گھس گئی۔ تیار ہو کر یونیورسٹی پہنچی تو کلاس شروع ہو چکی تھی اور اس دوران کلاس میں جانے کا مطلب پروفیسر صاحب سے اپنی بے عزتی کرانا تھا۔ سوچ چاپ پلٹ کر لائبریری میں آگئی۔ ارادہ ٹوٹا بنانے کا تھا مگر آنکھوں میں ادھوری نیند کی کڑواہٹ بھری تھی۔ دو چار حرف پڑھتی تو آنکھوں میں پانی بھرا آتا تھا، سو بے دلی سے کتابیں بند کر کے بیٹھ گئی۔

ساتھ والی کرسی پر بیٹھی لڑکی نے پڑھتے پڑھتے اخبار کا اندرونی صفحہ کھول کر پھیلایا تو سرسری نگاہ سے اخبار کا جائزہ لیتی مورا بری طرح چونک گئی۔ اخبار کسی نا آشنا لڑکی کے ہاتھ میں تھا۔ مگر تصویر۔۔۔ اتنی اپنی تھی کہ اس نے جھپٹ کر اخبار اپنے سامنے پھیلایا۔

”کا کا جان!“ اس نے اس تڑپ سے انہیں پکارا گویا اخبار میں چھپی تصویر سے باہر نکال لینا چاہتی ہو۔ برق رفتاری سے اس کی نگاہوں نے تصویر کے نیچے تحریر عبارت کو پڑھا، دل ایک لمحے کے لیے سکڑ کر دوبارہ اپنی جگہ واپس آ گیا تھا۔

سلیم کی طرف سے تلاش گمشدہ کا اشتہار تھا۔ مورا نے مرے مرے سے انداز میں اس لڑکی کو اخبار واپس کیا اور خود وہاں سے اٹھ کر سلیم کے ڈیپارٹمنٹ تک چلی آئی۔ راستے میں اس کا دوست ملا تو وہ اسے کینے ٹیر یا میں بیٹھنے کا کہہ کر سلیم کو ڈھونڈنے چلا گیا۔

”کتنے دن ہو گئے مجھے سلیم کو دیکھنے ہوئے۔۔۔“ اس نے بیٹھ کر حساب کتاب کرنا شروع کیا۔

”اس گھر میں داخل ہونے کا گناہ گار بھی غالباً صرف میری وجہ سے ہوا تھا۔ جہاں اس کی ماں ہر روز ڈیوڑھی میں کھڑے ہو کر پوچھا کرتی ہے۔ آج سلیم سے ملی تھیں تم۔۔۔؟“

”تم یہاں کیسے؟ سب خیریت تو ہے نا؟“ سلیم ایک دم سے میز پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی طرف جھکا تو وہ بری طرح چونک گئی۔

”ہاں۔۔۔ خیریت ہے۔۔۔“ چند ثانیے بعد اس نے جواب دیا تو وہ کرسی گھٹ کر بیٹھ گیا۔

”کہاں گھر رہتے ہو آج کل؟“ مورا نے بغور اسے دیکھا۔ وہ پہلے سے بہت بہتر حالت میں لگ رہا تھا۔ صحت بھی اچھی ہو گئی تھی اور چہرے پر رہنے والا فکرمند بھی اب قدرے اطمینان کا تاثر دے رہا تھا۔

”کہیں نہیں۔۔۔ بس ذرا پڑھائی کی مصروفیت تھی۔“

”اچھا۔۔۔ وہ ذرا سنا ہی۔“

”میں بھی مجھے اس گھرانے میں شامل کر کے مجھے سے بھی قطع تعلق کر بیٹھے ہو۔ یا پھر اپنے جھوٹ پر نام ہوا سی لیے نظریں چرائے پھرتے ہو۔“

”فکر کر رہی ہو۔۔۔؟“ سلیم کا جھکا ہوا سرا سے ذرا بھی اچھا نہ لگ رہا تھا۔

مورا کی آنکھیں جھلملا سی گئیں۔ ان آنکھوں کا تنہا ایک پل کے لیے یاد آ کر معدوم ہو گیا تھا۔ تمہیں کی آواز دل کی آواز سے ہم آہنگ ہو رہی تھی۔ وہ نم پلکوں کے ساتھ گجرے کا ایک ایک پھول توڑتی رہی۔

میں گرہ تھا تو بہت لوگ رکے تھے لیکن

سوچتا ہوں مجھے آئے تھے اٹھانے کتنے

”تو یہ تھی تمہاری اصلیت۔۔۔۔“ مورا کے ہاتھ اپنی جگہ قہقہے سے گئے۔ وہ نجانے کب اس کے پیچھے

آکھڑا ہوا تھا۔

”اور میں سمجھا کرتا تھا مورا اسکندر! کہ تم کسی انتہائی مولوی ٹائپ گھرانے سے تعلق رکھتی ہو۔ کسی لڑکے سے بات کرنا، اس کی حوصلہ افزائی کرنا تمہارے نزدیک گناہ ہے۔“ اس کی آواز کا سرد تاثر مورا کے لیے غیر متوقع قطعاً تھا۔

”اور تم۔۔۔ تم ایک گائیکہ کی بیٹی ہو۔ دوسری گائیکہ کی بہن، ایک ریڈیو پے آواز کا جادو چکاٹی تھی۔ دوسری محفل میں گارہی ہے۔ اور تم۔۔۔ تم ایک مرد سے بات کرتے ہوئے کتراتی تھیں۔“ وہ کرسی کھینچ کر سامنے آ بیٹھا تھا۔ مورا نے رخ موڑ کر نگاہیں تمہیں پر جمادیں۔

تم نیازم لگاؤ، تمہیں اس سے کیا ہے

”کس بات کا زعم تھا تمہیں مورا! اور کیا مجھ رکھا تھا تم نے مجھے۔۔۔ میں کوئی گرا پڑا انسان تو نہیں

تھا۔

میرے جذبوں میں کوئی کھوٹ نہ تھی۔ پھر۔۔۔؟“

اس کے لب و لہجے کی نئی ناقابل برداشت تھی مگر اسے اپنا آپ آزمانا تھا۔

تم نیا زخم لگاؤ تمہیں اس سے کیا ہے

بھرنے والے ہیں ابھی زخم پرانے کتنے

تمہیں جانے کیوں بار بار ایک ہی شعر دہرا رہی تھی۔ مورا کو اپنے حلق میں کوئی نمکین سی چیز گھٹی

محسوس ہو رہی تھی۔ روشنیاں آنکھوں کو چھینے لگی تھیں۔

”بیسویں لوگوں کا دل بہلاتی ہو تم لوگ، صرف اس لیے کہ یہ تم لوگوں پر روپے بچھاؤ کرتے

ہیں۔ سچے جذبے لٹانے والوں کی تمہارے نزدیک کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ارے اظہار تو کرتیں مورا!

میں تمہیں روپوں میں تول دیتا۔ ان گنت لڑکیاں مجھ پہ مرنی ہیں مورا اسکندر! مگر افسوس۔۔۔ صد

افسوس۔۔۔ میرا دل تمہارا بھی تو کس مقام پر۔۔۔؟“

وہ ناراض تھا یا خفا۔۔۔ تحقیر کر رہا تھا یا طنز۔۔۔ مگر کچھ تو ایسا تھا جو اس کی باتوں سے ٹوٹنے کا کچھ کی

سی صدا دے رہا تھا۔ وہ کیا تھا جو اس کی آنکھوں میں جھلملا رہا تھا۔ جو ہونٹوں پر کپکپاہٹ بن کر اتر رہا

تھا۔ اور یہ قدموں میں ڈگدگاہٹ کیسی؟

وہ اپنی جگہ ساکت بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ لمحوں میں نگاہوں سے ادھ جھل ہو گیا

تھا۔

”یہ عورت میری ماں ہے نہ وہ لڑکی میری بہن! میں ایک سید زادی ہوں۔ میرا ان لوگوں سے کیا واسطہ۔۔۔؟ وہ چیخ کر بتا دینا چاہتی تھی مگر کہیں نہیں پائی۔

”نہیں۔۔۔“ اس نے سادگی سے نفی میں سر ہلادیا تھا۔
 ”وہاں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟“ ”چند گھنٹوں کی خاموشی کے بعد سلیم نے سر اٹھایا۔
 ”نہیں۔۔۔ سب لوگ بہت خیال رکھتے ہیں۔“ اس کے جواب میں سلیم کچھ کہے بغیر ہاتھ میں
 پکڑے کی رنگ کو میز پر گھماتا رہا۔
 ”اخبار میں کا کا جان کی تصویر تم نے دی تھی؟“
 ”ہاں۔۔۔ ہمارے پاس آخری راستہ بس یہ ہی تھا۔“
 ”پھر۔۔۔؟“

”تا حال کسی نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔ حالانکہ یہ اشتہار گزشتہ تین روز سے چھپ رہا ہے۔“ سلیم
 کے جواب نے اس کے دل سے رہی سہی امید بھی نوج کر پھینک ڈالی تھی۔
 ”پتا نہیں کیوں سلیم! کبھی مجھے لگتا ہے۔ اب میں ان سے کبھی نہیں مل پاؤں گی۔“ وہ بری طرح
 مایوس ہو رہی تھی۔

”اللہ نہ کرے کہ ایسا ہو۔ ہم اپنی کوشش جاری رکھیں گے۔“
 اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”بیٹھو۔۔۔ میں ابھی تمہارے لیے کچھ کھانے پینے کو منگواتا ہوں۔۔۔“ سلیم نے اسے اٹھتے
 دیکھ کر اصرار کیا۔

”نہیں۔۔۔ میری کلاس شروع ہونے والی ہے۔ چلتی ہوں اب۔۔۔“ سلیم کے انداز میں پہلے
 کی سی اپنائیت مفقود تھی۔ سو وہ جلد ہی وہاں سے اٹھ آئی۔

☆☆☆

”مجھے ایک ایسی لڑکی کی ضرورت ہے جس کی آواز میں جھرنوں کی سی روانی بھلے نہ ہو مگر کوکل کی
 کوک جیسی ضرور ہونی چاہیے۔“ احمد کیانی نے اپنے تمام کریکٹرز کے چناؤ کے بعد ایک دم کھڑے ہو کر
 اعلان کیا تو اظفر کے ساتھ ڈائلاگ کی کھج کرتے ہارون اسرار نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔
 ”مار یہ کہاں گئی۔۔۔؟“ کسی اور نے پوچھا۔ وہ ان کی مستقل فنکارہ تھی۔ ایکٹنگ کے ساتھ
 ساتھ سنسنگنگ کی ماہر۔

”انگلینڈ۔۔۔ اور دو ماہ سے قبل وہ ایسی کا کوئی امکان نہیں ہے۔“
 ”ایک لڑکی ہے تو سہی کیانی! لیکن اس کی آواز میں کوکل جیسی کوک نہیں۔ ہاں البتہ ابابیل کی
 گنگنا ہٹوں جیسی مٹھاس اور تنگی ضرور ہے۔ سنو! تم نے کبھی صبح کے طلسم سے اجالوں میں ابابیل کو
 گنگناتے سنا ہے۔۔۔؟“ وہ کرسی جھلاتے جھلاتے ایک دم سیدھا ہو بیٹھا تھا۔ احمد کیانی کو اس کا انداز بتا
 رہا تھا کہ وہ کس کے متعلق بات کر رہا ہے۔

”بہت آگاہ ہو گئے ہو اس کی خوبیوں سے۔۔۔“ احمد کیانی نے کرسی کی ہتھیوں پہ ہاتھ رکھ کر اس
 کی طرف جھکتے ہوئے بڑے راز دارانہ انداز میں کہا تو وہ بے اختیار ہی ہنس دیا۔
 ”چاہنے والوں کی خبر تو رکھنی پڑتی ہے نا؟“
 ”اوہ! تو مانتے ہو اس بات کو کہ تم بھی چاہنے والوں میں شامل ہو چکے ہو۔“

”ہاں۔۔۔“ اس کا سادگی سے کیا گیا اعتراف احمد کیانی کو حیران کر گیا۔
 ”کیا یہ وہی ہارون اسرار ہے جو ہڑنگی کے ہاتھ بڑھانے پر کہا کرتا تھا۔“
 ”یہ میرا دل ہے، میں اسے چنگی چنگی دوسروں میں باشتا نہیں چاہتا۔ بس ایک ہی دفعہ پورے کا
 پورا دل دے گا، جسے میرا دل چاہے گا۔“ احمد کیانی سیدھا ہو کر اس کے برابر بیٹھ گیا۔
 ”میرا خیال ہے، ہم کسی اور ٹاپک پر بات کر رہے تھے۔“ ہارون اسرار نے بات بدلی۔
 ”تب ہارون اسرار کو یہ خبر نہ تھی کہ دل جیسی چیز کو لوگ چٹکیوں میں مسل کر پھینک دیتے ہیں۔ یہ
 کہانی قریب الختم ہے کیانی! جسے تم آغاز سے دیکھ رہے ہو۔“ دھندلائی آنکھوں سے احمد کیانی کو دیکھتے
 ہوئے اس نے سوچا۔

”اس کی آواز بلاشبہ بہت خوبصورت ہے مگر اس میں اسٹج کا نفیڈنس نہیں ہوگا۔۔۔“
 ”تم ایک بار پھر اسے اسٹج تک لاؤ تو سہی۔ تم سب کو حیران نہ کر دے تو کہنا۔۔۔“ اس نے بہت
 سادگی سے دہرایا۔

”چلو دیکھتے ہیں۔“ احمد کیانی پی کیپ اپنے سر پہ لٹکا تا اسی وقت باہر نکل گیا تھا۔
 ”یہ کافینڈنس تو اس کی گٹھی میں پڑا ہوگا احمد کیانی! تم کیا جانو۔۔۔؟“ وہ گہری سانس لے کر
 دوبارہ اظفر کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

”یہ کیا کہا ہے اس نے؟“
 احمد کیانی کی بات سن کر وہ بہت دیر تک بس اس کا چہرہ دیکھتی رہی تھی۔
 ”آپ کی آواز اتنی خوبصورت ہے کہ یہ کام آپ کے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوگا۔“

اسے لگا وہ اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔
 ”آپ جیسی پرفیشنل کے لیے یہ کام ذرا بھی مشکل
 ثابت نہیں ہوگا۔“

”تو کیا یہ بات پوری یونیورسٹی میں پھیل چکی ہے۔“ اسے کھڑا ہونے کے لیے کرسی کا سہارا لینا
 پڑا۔

”یہ ایک چیریٹی شو ہے ماورا! اس کا خیر میں۔“
 وہ احمد کیانی کے ہلتے ہوئے ہونٹ دیکھ رہی تھی مگر مفہوم سمجھنے سے قاصر تھی۔
 ”واہ ہارون اسرار! خوب بدلہ لیا ہے تم نے۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تم کبھی یوں میری
 تذلیل کا باعث بھی بنو گے۔“

”ہا۔۔۔ ایک گائیکہ کی بیٹی۔۔۔ دوسری گائیکہ کی بہن۔۔۔“ کوئی طنزیہ آواز میں اس کے قریب
 آکر ہنسا۔

”آپ فوری طور پر جواب نہیں دینا چاہتیں تو میں کل اسی وقت دوبارہ آ جاؤں گا۔“ احمد اسے گم صم
 ہوتے دیکھ کر اسی وقت لوٹ گیا۔
 ”تمہیں دوبارہ آنے کی ضرورت نہیں پڑے گی احمد کیانی! تمہارے آنے سے پہلے میرا انکار تم

ہم جنہیں سوزِ محبت کے سوا
کوئی بت، کوئی خدایا نہیں

اس کی آواز سننے والوں کو مبہوت کر گئی تھی۔
افسردگی سے بوجھل، غم کے اثر سے گونجتی۔۔۔ بانسری کے ریلے سروں کی سی آواز مائیک سے
ابھری تو احمد کیانی نے ہارون اسرار کے دعوے کو سو فیصد درست قرار دے دیا تھا۔

برفِ ارم کرنے والے بیٹی اور وصی تھے۔
ڈیپارٹمنٹ لڑکی کی آواز اور اس نظم نے ڈرامے کے تاثر کو کس قدر پاورفل بنا دیا ہے۔ مجھے لگتا ہے
ہماری ساری محنت وصول ہو گئی ہے۔ احمد کیانی پردے کے پیچھے اپنی کامیابی پر پر جوش ہو رہا تھا۔

ماوراء اور ہارون اسرار مائیک پر موجود تھے۔
ماوراء جس بند کو ترنم سے پڑھتی تھی۔ اسی بند کو بیک گراؤنڈ میں ہارون اسرار تحت اللفظ میں پڑھتا۔
ماوراء کی مدھم ہونی آواز پر ہارون اسرار کا لب و لہجہ ایک دم ہی غالب آ جاتا تھا۔

عشق کا سر نہاں جان تیاں ہے جس سے
آج اقرار کریں اور پیش مٹ جائے
حرف حق دل میں کھٹکتا ہے جو کانٹے کی طرح
آج اظہار کریں اور غلش مٹ جائے
اور اس کی آواز کی سرسراہٹوں میں کسی تپتی کے نازک پروں کی سی کول آواز رفتہ رفتہ ابھر کر ماحول پہ
چھانے لگی تھی۔

جن کی آنکھوں کو رخ صبح کا یارا بھی نہیں
ان کی راتوں میں کوئی شمع منور کر دے
جن کے قدموں کو کسی رہ کا سہارا بھی نہیں
ان کی نظروں پہ کوئی راہ اجاگر کر دے
اسی نظم پر ڈرامے کا اختتام ہوا تھا۔ پردے برابر ہوئے تو تالیوں کا شور سن کر پردے کے پیچھے تمام
طلباء طالبات چیخیں مار مار کر اپنی کامیابی کو ٹیلیویریٹ کرنے لگے تھے۔ ماوراء کسی کو اپنی طرف متوجہ ہونے
کا موقع دیے بغیر وہاں سے نکل آئی۔ گلابی شام میں سرمئی رنگ گھٹنے لگا تھا۔ دن بھر کی پیش کا زور ٹوٹ گیا
تھا اور ہوا میں قدرے ٹھنڈک سی محسوس ہو رہی تھی۔ ابھی وہاں چائے کا دور چلنا تھا۔ اس لیے اکا دکا
اسٹوڈنٹ ہی باہر نکلتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ دھیمی رفتار سے چلتے ہوئے روش تک آ گئی تھی۔ بیک
کندھے سے لٹکا کر اس نے روش کے کنارے لگے پودوں سے خوب کھلے کھلے دو چار پھول توڑ
کر ہاتھوں میں بھر لیے۔

عشق کا سر نہاں جان تیاں ہے جس سے
آج اقرار کریں اور پیش مٹ جائے
اس کی نگاہ ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخی پر جمی تھی۔
عشق کا سر نہاں جان تیاں ہے جس سے

تک پہنچ جائے گا۔“ وہ پختہ ارادوں کے ساتھ وہاں سے ابھی مگر ایک ہیو لے نے اس کی راہ روک لی تھی۔
”کیوں انکار کر رہی ہو تم۔۔۔؟ محفلوں میں گاسکتی ہو۔ یونیورسٹی میں نہیں۔ روپوں کے لیے گا
سکتی ہو تو کارخیر کے لیے کیوں نہیں؟“

”تم صرف طعنہ دینے کے لیے مجھے ہزاروں تماش بینوں کے سامنے لانا چاہتے ہو۔“ وہ بہت
تیزی سے کلاس روم سے باہر نکل آئی۔

”تم مجھے میری اوقات یاد دلا کر میری تذلیل کرنا چاہتے ہو۔ اور بس۔۔۔ تم مجھے صرف یہ باور
کرانا چاہتے ہو کہ میں ایک گائیکہ کی بیٹی ہوں۔ دوسری گائیکہ کی بہن، اس کے باوجود میں نے تمہاری
پذیرائی نہیں کی۔“ اس نے راستے میں آنے والے ہر پھر کو اپنی ٹھوک سے اڑا دیا۔

”اوہ خدایا! یہ ذلت بھی میرے حصے میں لکھی جانی تھی۔۔۔“ وہ اندھا دھند بھاگتی ہوئی پوائنٹ پر
سوار ہو گئی۔

”ذلت۔۔۔ کیسی ذلت۔۔۔؟“ زمانی بیگم کی شرارے اگلی آنکھیں اس کی فائل پر آگ آئی
تھیں۔

”میرے پاس ہو تو گائیکہ کی بیٹی کہلائی ہو۔ سگی ماں زندہ ہوتی تو نائیک والی کی بیٹی کہلاتیں۔۔۔
درجہ تو گائیکہ کا بھی وہی۔ ٹیٹوئی والی کا بھی وہی۔ تو ذلت کیسی بنو۔۔۔ اپنی اصلیت پہچانو۔۔۔ ایسی کہاں
کی اعلا وار فہم ہو تم۔۔۔“ اس نے تیزی سے فائل کو اوندھا کر دیا۔

”ارے۔۔۔ جب ہم لوگوں کا کھادے ہے تب تیری تذلیل نہ ہووے ہے۔ جب ہماری چھت
کے نیچے سووے ہے۔ ہماری آسائشوں کو جی بھر کے لوٹے ہے۔ ہمارے ساتھ ٹیل کر بنے، رووے ہے۔
تب تیری تذلیل نہ ہووے ہے۔“ نائیکہ کی پاٹ دار آواز بس کے ہارن سے نکلی تھی۔

”جب تم ہمارے حوالے سے جانی جاتی ہو تو پھر خود کو ہم سے الگ کیوں کرنا چاہتی ہو؟ اسٹیج پر گانا
نہیں چاہتیں کہ ایک گائیکہ گھرانے سے تعلق برتھدین کی مہر لگ جائے گی تو لگ جانے دو۔ ایسا کون
سایت لگ جائے گا تمہارے نام پر جو کچھ وہ اپنی آنکھوں اور کانوں سے دیکھن چکا ہے۔ اسے کیسے جھٹلاؤ
گی تم۔۔۔ تردید کرنا چاہتی ہو؟“ تہمینہ کتاب کے صفحے سے جھانک رہی تھی۔

”نہیں نا؟ تو صرف اپنی ذات کو سامنے رکھو۔ اپنی خوبیوں اور صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاؤ۔ گائیکہ
کچھ نہیں ہوتے کہ جن سے تعلق کا چھیننا تمہیں داغدار کر دے گا۔“ تہمینہ کے بولنے کا اپنا ایک انداز تھا۔
مدھم سروں سے لبریز۔

”گائیکہ کنول کا پھول بھی تو ہو سکتا ہے نا ماوراء! جس کی اوک میں پانی کا ننھا، شفاف اور معطر قطرہ
کبھی کبھی دوسروں کی پیاس بھی بجھا دیتا ہے۔“

پورے جاودہ گرتھے یہ سب لوگ۔۔۔ وہ پوائنٹ سے اتری تو وہی کیفیت کسی نتیجے پر پہنچ جانے
کے بعد میسر بدل چکی تھی۔

☆☆☆

آئیے ہاتھ اٹھائیں، ہم بھی
ہم جنہیں رسم دعا یاد نہیں

تہائی میں گانے کا اپنا ہی لطف تھا۔ وہ ایک ہی شعر کی تکرار کر رہی تھی نجانے کیوں۔
اپنی آواز کے پس منظر میں ابھرتی ایک اور آواز۔ کسی قدر واضح اور دلفریب تھی۔
آج اقرار کریں اور پیش مٹ جائے
آج اقرار کریں اور۔۔۔۔۔

قدموں کی آواز قریب آرہی تھی۔ اس نے لب بھینچ لیے اور سر جھکا کر اپنے قدم گننے لگی۔ نجانے
کیوں تھکن سے محسوس ہو رہی تھی۔
کام بھی تو بہت مشقت طلب تھا۔ دو دن تک مسلسل ایک ہی نظم کی ریہرسل اودہ بھی ہارون اسرار
کی معیت میں۔ اس نے پھکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکا۔
”خود کو صاف شفاف دکھانا ثابت کرنے کے لیے اپنی ضمیر کی عدالت میں سرخرو ہونے کے لیے
انسان کتنے نشٹ اٹھاتا ہے۔“

اس نے سراٹھایا اور پھر اپنے برابر چلتے ہارون اسرار کو دیکھ کر بری طرح چونک گئی۔
”اندھیرا ہونے کو ہے۔۔۔ کہو تو میں پھوڑ آؤں؟“ اس نے راہ میں آئے کنکر کو اپنی ٹھوک سے
اڑایا۔

ہارون اپنے چلتے چلتے گردن موڑ کر بغور اسے دیکھا۔ اس روز کا کوئی ایک تاثر بھی اس کے چہرے پہ
نہ تھا۔

”اور یہ شخص ایک بار پھر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر چلا آیا ہے۔“

اس کا دل چاہا ایک لمحے کے لیے رک کر اسے کہہ دے۔

”تم ناز و نعم میں پلے ہو ہارون اسرار! محبت کا ذرا سا دکھ تمہاری برداشت سے باہر ہوا تو تم سب
کچھ بھلائے ایک بار پھر میرے سامنے کھڑے ہو۔۔۔ مجھے دیکھو۔۔۔ دکھوں کی تیگی میں روشنیوں کو
کھوجتی ہوں کہ زندگی بتا سکوں۔ محبت کی راہ میں قدم رکھتے ہوئے ڈرتی ہوں کہ اس کا اختتام بھی کسی
تاریک منزل پر ہوا تو شاید جی نہ پاؤں۔ اعتبار کرنے میں وقت تو لگتا ہے نا؟“ وہ دونوں یونیورسٹی سے
باہر آ چکے تھے۔

گس اس کے عین سامنے آ کر رکی تو وہ بغیر وقت ضائع کیے اس پر سوار ہو گئی۔ ہارون اسرار نے
وہیں سے اپنے قدم واپس موڑ لیے۔

کلاس روم میں بیٹھے بیٹھے اس نے کوئی چوتھی مرتبہ اپنا بیگ کھول کر دیکھا اور پھر بند کر دیا۔ تہینہ
سے ادھار لیے گئے روپوں میں سے بس اتنے بانی تھے کہ وہ واپسی کا کرایہ ہو جاتا۔ اور اس کے بعد۔۔۔
ذہن پر ایک نئی فکر سوار ہوئی تو پھر میں اس کی ساری دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔

زمانی بیگم سے کچھ مانگنا اس کے لیے باعث شرم تھا۔ یہ کیا کم تھا کہ دو کمروں کے اس مکان میں
پانچ افراد کے ساتھ رہنے کے لیے اسے چھت فراہم کر دی گئی تھی۔ ان کا تو پہلے پورا نہ پڑتا تھا، تعلیمی
اخراجات کہاں سے اٹھائیں۔ اور کیوں۔۔۔؟“ آخر اس کا ان سے رشتہ ہی کیا تھا۔

”تو پھر۔۔۔؟ کیا کروں۔۔۔؟“ وہ سر ہٹا کر بیٹھ گئی، خبر ہی نہ ہوئی کب پیرید ختم ہوا۔ کب
کلاس روم خالی ہوا۔ اور کب یلی اور احمد کیانی اس کے سر پر آ پہنچے۔

”اٹھ جائیے محترمہ! اٹھ جائیے۔ وہاں ایک پوری بیالین آپ کا انتظار کر رہی ہے۔“ اس نے سراٹھا
کر ناہنجی کے عالم میں ان دونوں کو دیکھا۔

”آپ کو تو پکا پکا ملے گا، آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔ ذرا ہم سے پوچھئے، کیا کیا پڑیلے
ہیں؟“ یلی نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھایا۔ احمد کیانی ٹھنڈی آہیں بھر کے خود کو آزرده افسردہ ظاہر کرنے
کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

”یہ جو ہمارے ڈرامیٹک سوسائٹی کے صدر ہیں نا۔ اول نمبر کے کنجوس۔ پیسہ ان کی جیب سے بڑی
مشکل سے نکلتا ہے۔ ابھی بھی بڑی دقتوں سے انہیں یہ ٹریٹ دینے پر آمادہ کیا ہے۔“ وہ اسے ساتھ لے
کر لان کے ایک سرسبز گوشے میں چلی آئی تھی۔ جہاں ڈرامے میں حصہ لینے والے تمام اسٹوڈنٹس موجود
تھے اور خوب ہلو بازی کر رہے تھے۔

”ارے واہ۔۔۔ واہ لڑکی! تم نے تو کل کمال ہی کر دیا۔۔۔“ اسے دیکھتے ہی کسی ایک نے نعرہ لگایا
تھا۔

”اب پتا چلا یہ اتنا کم کیوں بولتی ہیں؟“
”کیوں؟“

”تاکہ اس کی آواز کو نظر نہ لگے۔۔۔“ ان لوگوں کی تعریف کا اپنا ایک انداز تھا۔ سو وہ ذرا سا
مسکراتے ہوئے ایک کونے میں جا بیٹھی۔

”آکس کریم پھل رہی ہے۔ خدا را اسے جلد از جلد کھا لیا جائے۔“ علی نور کے اعلان پر وہ سب
آکس کریم پر ٹوٹ پڑے۔

وہ پچھلتی ہوئی آکس کریم کو چھپے سے مزید پگھلاتے ہوئے ان سب کے خوش باش چہروں کو دیکھنے
لگی۔

”تم سا خوش قسمت اس دنیا میں کوئی نہیں۔ تم لوگ اپنے گھر دوں سے آتے ہو؟ واپسی پر تمہارے
ماں باپ، بہن بھائی تمہاری راہ تنگتے ہوں گے۔“ کیسی حسرت تڑپ رہی تھی اس کی آنکھوں میں۔ کوئی
دیکھ لیتا تو کم از کم ایک بار اپنی ساری خوشیاں اس کے نام کر دینے کی دعا ضرور کر دیتا۔

”تم لوگ یہ عیاشیاں کر سکتے ہو کہ تمہیں عیش کرانے والے سلامت۔۔۔ یہاں تو خرچا پورا نہیں
پڑتا۔۔۔ وہ انہیں چھوٹے چھوٹے بچوں کی طرح کیک اور پز اپرٹوٹے ہوئے دیکھنے لگی۔

”یہ لباس جو روز بروز اپنا رنگ کھوتا جا رہا ہے۔۔۔ یہ کب تک میرا ساتھ دے گا۔ اور کرائے کے
لیے مزید روپے آنے تک مجھے کتنی چھٹیاں کرنی پڑیں گی۔“ وہ ایک ایک کا چہرہ دیکھ کر خود کو سوچنے لگتی۔

اسے اپنا آب بہت سے کھلے ہوئے پھولوں کے درمیان مرجھاتے ہوئے پھول کا سالگ رہا تھا۔
”اللہ تم سب کی خوشیوں کو دوبارہ کراے۔ تمہیں بری نظروں سے بچائے۔“ وہ رخ بدل کر پلکیں

جھپک جھپک کر آنکھوں میں آیا بانی اپنے اندر اتارنے لگی۔

”ماورا سے کہو، ہمیں وہ نظم دوبارہ سنائے۔ کل تو ڈھنگ سے سن ہی نہ پائے تھے۔“

”ہاں۔۔۔ ہاں ضرور۔۔۔“ وہ سب اس کی طرف متوجہ ہوئے تو وہہ بمشکل مسکرایا۔

”آج نہیں۔۔۔ پھر کسی دن سناؤں گی۔ اور پلیز اگر آپ لوگ ناراض نہ ہوں تو مجھے ایک بہت

ضروری کام سے جانا ہے۔“ وہ ان سے اجازت لے کر اٹھ آئی تھی۔

آئیے ہاتھ اٹھائیں، ہم بھی ہم جنہیں رسم دعا یاد نہیں

وہ سب لوگ اپنی اپنی آوازوں میں گارہے تھے۔

”اے۔۔۔ اے رگو۔۔۔“ وہ ابھی تھوڑی دور ہی گئی تھی کہ احمد کیانی نے اسے جالیا تھا۔

”یہ کل شام کی رپورٹ کے کچھ چیدہ چیدہ پوائنٹس ہیں۔ تمہیں اس رپورٹ کو بہت تفصیل سے لکھنا ہوگا۔“

”مجھے۔۔۔؟“ اس نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔

”ہاں۔۔۔ اسی شرط پہ تو میں ایک ہفتے کی چھٹی پر جا رہا ہوں کہ میری غیر موجودگی میں بھی سارے کام بحسن و خوبی انجام پاتے جائیں گے۔ وہ ہارون اسرار صاحب پڑھائی کے ساتھ ساتھ بزنس سنبھالنے کا کھراگ نہ پال رہے ہوتے تو شاید مجھے آپ کے نازک کندھوں پر یہ ذمہ داری نہ ڈالنی پڑتی۔۔۔“ اس نے بڑے اطمینان سے وہ چند کاغذات اس کی طرف بڑھائے۔ ساتھ ہی ایک وزیٹنگ کارڈ۔۔۔

”باسم بھٹی سے بہت اچھے تعلقات ہیں میرے۔ یہ رپورٹ اسی کو پہنچانی ہے۔“

وہ کارڈ اس کے ہاتھ میں تھا کہ واپس ہوا، مگر دو قدم چل کر پھر سے رک گیا۔
”مجھے یقین ہے، اس نظم کی طرح تم یہ رپورٹ بھی بہت خوبصورتی سے پیش کرو گی۔ وہ بہت آرام سے کہہ کر چلتا بنا۔

اس کا دل چاہا۔۔۔ ان کاغذات کو پھاڑ کر پڑے پڑے کر کے اڑا ڈالے۔

”ماوراء اللہ جانے کل یہاں آئی بھی ہے یا نہیں۔ تم اپنی ذمہ داریاں بھی سوچ دو اسے۔ یہاں دو وقت کی روٹی کے لالے پڑے ہیں۔ رپورٹ میں کیا خاک پیش ہوں گی۔“
وہ دانت کچکچاتی وہاں سے چل دی۔

☆☆☆

رات آدھی سے زیادہ بیت گئی تھی۔ احمد کیانی کے دیے گئے نکات کو اس نے خالص اپنے انداز میں لکھا تھا، اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ کھلی کھڑکی میں آ بیٹھی۔۔۔ اب اسے اپنے بارے میں بھی کچھ سوچنا تھا۔

”ٹیوشنز، نوکری، یا۔۔۔“ اس نے پلٹ کر محو خواب تہینہ کو دیکھا۔

”یونیورسٹی چھوڑ دی تو شاید، اس میں اور مجھ میں کوئی فرق نہ رہے۔“ اس نے سیدھے ہوتے ہوئے اپنا سر کھڑکی کے کھلے پٹ سے ٹکا دیا تھا۔

”اور شاید اسی دن کے لیے کا کا جان کہا کرتے تھے۔“ ڈگری بڑے کام کی چیز ہے۔ علم ہونہ ہو۔ ڈگری ضرور ہونی چاہیے۔“ کا کا جان کا خیال آتے ہی وہ بری طرح چونکی۔

”اور ایک کام وہ بھی تو تھا جس کے ذریعے کا کا جان سارا گھر چلایا کرتے تھے۔ میری بھاری بھاری فیس بھی تو انہوں نے ہی ادا کی تھیں، تو پھر۔۔۔؟“

وہ قدرے پُر جوش ہو کر بستر تک آئی۔ کاغذات کا پلندا ابھی بھی وہاں پڑا تھا۔۔۔ اس نے جھٹ سے قلم ہاتھ میں لے لیا۔
”لکھنے کو تو بہت کچھ ہوتا ہے۔۔۔ ادب، سیاست، خواتین کے مسائل، طلباء کے مسائل، حالات حاضرہ۔۔۔؟ کیا لکھوں۔۔۔؟“ وہ تھوڑی دیر تک سوچ میں ڈوبی رہی پھر جانے کیا سوچ کر عنوان لکھ ڈالا۔

”میرے گمشدہ۔۔۔“

دو مہر بان ہاتھوں نے بہت نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر خبر ہی نہ ہوئی اور وہ صفحے کے صفحے بھرتی چلی گئی اور جس وقت اس نے اختتامی لکیر کھینچی۔ گھڑی کی سوئی چار پر ٹھہر کر رہی تھی۔ اس نے سب کاغذات سمیٹ کر تینکے پر سر رکھا تو لمحوں میں غافل ہو گئی تھی۔
صبح آنکھ کھلی تو پہلی نظر تہینہ پر پڑی تھی جو گیلیے بالوں میں سنگھسی چلانے کے ساتھ ساتھ اسے جگانے کے لیے آوازیں لگا رہی تھی۔

”یونیورسٹی جانے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟“

”نہیں۔۔۔ آج کہیں اور جاؤں گی۔۔۔“ کر وٹ بدلتے ہوئے اس نے سوئی سوئی سی آواز میں جواب دیا۔

”کہاں۔۔۔؟“

”پہلے اپنے گھر، پھر ایک اخبار کے دفتر۔۔۔؟“ تہینہ نے اس کے جواب پر خاصی حیرت سے دیکھا۔

”گھر کیا کرنے جاؤ گی؟“

”کا کا جان ہر وقت کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ ہو سکتا ہے کوئی ادھورا، پورا ناول یا کالم ایسا ہو جو میرے کام آ سکے۔ ان کی سب ہی چیزیں سمیٹ لاؤں گی۔۔۔“ وہ بال سمیٹتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔
”بلکہ دل چاہے تو تم بھی میرے ساتھ چلنا۔۔۔ اور دیکھنا، میرا گھر کتنا خوبصورت ہے۔؟ آؤ دو خوب پک چکے ہوں۔۔۔ ہم سارا پھل توڑ لائیں گے مینا! واپسی پر ایک اخبار کے دفتر اور وہاں سے یہاں۔۔۔“

”چلیں گے، ضرور چلیں گے۔۔۔ لیکن پہلے تم غسل خانے سے ہو آؤ۔۔۔ ورنہ بعد میں پانی نہ ملنے پر مجھ سے شکایت مت کرنا۔“ تہینہ نے کہا تو وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

لکڑی کا خستہ جال دروازہ جس پر دستک دینے کے لیے اس کی ساری توانائی اس کے ہاتھ کی انگلیوں میں سمٹ آئی تھی، آج کھلا ہوا تھا۔۔۔ وہ ایک پل کے لیے دہلیز پہ ٹھنک گئی اور پھر دروازے کو جو پٹ کھولتے ہوئے وہ اندر داخل ہو گئی۔

”ارے، اللہ کی زمین جان کر یہ کن لوگوں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں یہاں؟“ اس نے بے اختیار ہی ساتھ چلتی تہینہ کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ وہ آٹھ دس لڑکے تھے جو آزادانہ پورے گھر میں گھوم رہے تھے۔ ان کے قہقہے، ان کی باتیں۔ فضا میں جیسے رچ بس گئی تھیں۔

برآمدے سے باہر آتے ددلوں نے انہیں وہاں کھڑا دیکھا تو اسی طرف چلے آئے۔
 ”جی فرمائیے۔۔۔“ ان کی سوالیہ نظروں نے ماورا کا دل بھی میں بھیج لیا۔

تہینہ اس سے آگے بڑھ آئی تھی۔

”کون ہو تم لوگ۔۔۔؟“ کب سے یہاں رہ رہے ہو؟“

تہینہ پوچھ کچھ کرنے لگی تھی۔ وہ دوسری طرف چلی آئی۔

گھاس منسلی ہوئی اور درخت پھلوں سے خالی تھے۔ حوض کنارے شیونگ کا سامان پڑا تھا اور گدلے پانی پر جھاگ تیر رہی تھی۔۔۔ شاخوں میں رکھے چڑیوں کے پانی کے کٹورے غائب، اور منسلی چڑیاں شور مچا چکا جیسے اس سے شکایت کر رہی تھیں۔

”ایک ایک کمرے میں پانچ پانچ لڑکے ہیں۔ اور سبھی کرایہ دیتے ہیں۔ مفت تو کوئی نہیں رہتا۔۔۔“ ایک لڑکا بتانے لگا۔

وہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ آئی۔ ابا کے کمرے میں جھانکتے ہوئے اس کا دل ڈوب کر ابھرا تھا۔

وہاں ابا کی چار پائی ہوئی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی پہلی نظر ان پر پڑتی تھی۔ اب وہاں چار پائی کی جگہ زمین پر بستر بچھے تھے۔۔۔ اور ایک لڑکا تندہی سے کپڑوں پر استری کر رہا تھا۔

”یہ کا کا جان کا کمرہ۔۔۔ یہ میرا۔۔۔ یہ باورچی خانہ۔۔۔“ باورچی خانے کے سوادوں کو کمرے بند تھے، اور ان پر لگے تالوں میں اس کے پاس موجود چابیوں میں سے کوئی چابی نہ لگی تھی۔ تب ہی تہینہ تیزی سے اس کی طرف آئی اور تقریباً کھینچے ہوئے باہر نکلی۔

”اس سے پہلے کہ سلیم آجائے۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“

دروازے سے باہر نکلتے ہی وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ مگر تہینہ رکی نہیں۔ گھر سے دور سڑک کے قریب پہنچ کر وہ درادیر کے لیے ٹھہری۔ اس کے روانی سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھا۔

”سلیم نے بہت برا کیا ہے۔۔۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اپنے فائدے کے لیے۔۔۔“
 ”آبادی سے دور۔۔۔ فصلوں، کھیتوں کو درمیان تنہا گھر، دو چار گھر آس پاس بس رہے ہوتے تو سلیم کی اتنی جرات نہ ہوتی۔ اسے تو ہر مہینے اچھی خاص آمدنی ہو رہی ہے۔“ تہینہ اس کے دکھ میں برابر کی شریک تھی۔

”اب کہاں چلنا ہے؟“

”گھر چلتے ہیں۔“

”گھر۔۔۔“ تہینہ نے ایک بل کے لیے سوچا اور پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

”اس حالت میں، میں تمہیں بھی گھر نہیں لے جاؤں گی۔ زمانی بیگم ذرا پوچھیں گی اور تم جھران کے سامنے آنسو بہانے لگو گی۔“ تہینہ وہیں اس کے ساتھ سڑک کے کنارے بیٹھ گئی تھی۔

”میری ایک بات دھیان سے سن لو ماورا!! اس معاملے کی زمانی بیگم کو بھنگ نہ پڑنے دینا۔ وہ لاکھ اچھی عورت سہی مگر ہے تو سلیم کی ماں۔۔۔ کرائے کے گھر میں رہتی ہے۔ سلیم نے تو در پردہ تمہیں دھوکا دیا ہے۔ وہ تمہارے سامنے بیٹھ کر کاغذات پہ تم سے دستخط لے گی۔ اور تم اس کے لہجے کی مٹھاس میں کوئی

کھوٹ نہ تلاش کر پاؤ گی۔“

”تہینہ!“ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھنے لگی۔

وہ غمزدہ سی ہو کر بس دی۔

”تم نے ابھی صرف دنیا دیکھی ہے ماورا!! میں نے پرکھی ہے۔ چلو اخبار کے دفتر چلتے ہیں۔“ ماورا گم صم سے انداز میں اس کے ساتھ چل دی تھی۔

”تہینہ! وہ میرا گھر ہے نا۔۔۔؟ مجھ سے جھمن تو نہ جائے گا۔“ وہ چلتے چلتے یونہی پوچھ رہی تھی۔

”کا کا جان بھی تو لوٹ کر نہیں آئے مینا! یہ اتنے سارے دکھ اللہ نے صرف ہماری قسمت میں ہی کیوں لکھ دیے ہیں؟“ کوئٹا کی سیاہ سڑک پر ان کے تھکے تھکے قدموں کے نشان لمحہ بہ لمحہ معدوم ہوتے جا رہے تھے۔

باہر کے آگ برساتے ماحول کی نسبت اندر کی فضا بے حد پرسکون اور ٹھنڈی تھی۔ نرم صوفے میں دھنتے ہوئے ماورا نے کارڈ نکال کر پیون کے حوالے کر دیا تھا۔

”باسم بھٹی کے ہاں میں دو بار جا چکی ہوں۔ ایک بار اس کے والد کا جشن صحت منایا گیا تب اور دوسری بار غالباً اس اخبار کو کوئی ایوارڈ ملنے پر۔۔۔ اس کا پورا گھر انہ بہت ملنسار ہے۔“ تہینہ اس کے چہرے پر پھیلے سوچ اور تشکر کو اپنی باتوں سے کم کرنا چاہ رہی تھی۔

”تہینہ! اگر کا کا جان۔۔۔ سبھی واپس نہ آئے۔ تو کیا میں ہمیشہ تم لوگوں کے ساتھ ہی رہوں گی؟“

اپنی سوچ میں ڈوبے ابھرتے اس نے معلوم نہیں تہینہ کی بات سنی بھی یا نہیں۔
 تہینہ کو ایک دم چپ نے آلیا تو وہ ہتھیلیاں کھول کر یونہی اپنی لکیروں کو دیکھتی رہی۔ تب ہی باسم بھٹی نے انہیں اندر بلوایا تھا۔

روشن، سرد ماحول میں اسے سی کی سرسراہٹوں کے ساتھ مروانہ گفتگو اور ہنسی کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ شیشے کی وسیع میز پر بہت سی تصاویر بکھری ہوئی تھیں۔ باسم بھٹی ریوا لونگ چیئر پر بیٹھا تھا اس کی کرسی کی پشت پر ایک ہاتھ نکائے دوسرے ہاتھ میں ایک تصویر تھام کر کچھ کہتا ہوا ہارون اسرار ماورا کو اندر آتے دیکھ کر بری طرح چونکا تھا تو ایک بل کے لیے اس کے جسم میں بھی خون کی گردش تیز ہو گئی تھی۔ ان کے بیٹھے ہی ہارون اسرار نے ایک ایک کر کے وہ تصاویر اکٹھی کیں اور میز کی پہلی دراز میں رکھ کر خود بہت اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے کرسی پر بیٹھ گیا۔

باسم بھٹی، تہینہ سے حال چال دریافت کرنے لگا۔ ماورا نے فائل میں سے رپورٹ نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔

”بہت اچھا ہوا جو آپ جلدی آگئیں۔ میں نے احمد کیانی سے وعدہ کر رکھا تھا کہ کل کے اخبار میں رنگین تصاویر کے ساتھ پہلے صفحے پہ یہ رپورٹ لگ جائے گی۔۔۔“ باسم نے کہتے ہوئے انٹرکام کا ریسیور اٹھایا۔

”کیا پیسے گی آپ لوگ۔۔۔؟“ وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

”شکریہ۔۔۔ ہم لوگ ذرا جلدی میں ہیں۔“ ماورا نے ایک نظر اپنے ہاتھ میں پکڑے کاغذات پر ڈالی اور پھر انہیں فائل میں رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

اے اٹھتے دیکھ کر تہینہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”تم اپنے کالم بھی تو ساتھ لائی تھیں؟“

”ابھی تجھے جلدی ہے تہینہ! پھر کبھی سہی۔۔۔“ اس نے بے بسی سے تہینہ کو دیکھا۔

”کیسا کالم؟“ باسم بھٹی نے باری باری دونوں کی شکل دیکھی تو تہینہ نے فائل اس کے ہاتھوں

سے لے کر باسم کے سامنے رکھ دی۔

ماورا اپنی سر دہونی پوروں کے ساتھ جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی تھی۔ خود پر مرکوز دو آنکھیں اسے

بری طرح ڈسٹرپ کر رہی تھیں۔

”میرے گم شدہ!“ باسم نے با آواز بلند پڑھا اور پھر قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔ خود پر ضبط

کرنے کی کوشش میں اس کے لب کپکپا رہے تھے۔ آنکھیں جھکائے نہ کھڑی ہوئی تو آنسو بہہ کر اس کے

سارے ہید کھول چکے ہوتے۔

”اب انہیں دراز کی پگلی تہہ میں گٹنے سڑنے کے لیے مت رکھ لیجئے گا باسم صاحب! آپ انہیں

پڑھیے اور بتائیے یہ چھپنے لائق ہیں یا نہیں۔“

”میں جا رہی ہوں تہینہ! وہ دروازے کی طرف پلٹی جب بہت اطمینان سے بیٹھا ہوا ہارون ایک

دم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”بیٹھ جاؤ ماورا! میں جا رہا ہوں۔“

”میں نے آپ سے تو کچھ نہیں کہا۔“ وہ بھڑائی ہوئی آواز میں بمشکل کہہ پائی۔

”یہ حسرت تو شاید ہارون اسرار دل میں لیے ہی مر جائے گا کہ آپ کچھ نہیں اور وہ سنے۔“ اس

کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے مدھم لہجے میں کہا مگر تہینہ اپنی جگہ بری طرح چونک گئی۔

”ہارون اسرار۔۔۔“ وہ زیر لب بڑبڑائی اور پھر فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ایک منٹ۔۔۔“ اس نے دروازے سے باہر نکلتے ہارون اسرار کو روکا۔

”آپ ہارون اسرار ہیں؟“

”جی۔۔۔“ وہ سنجیدگی سے اسے دیکھنے لگا۔

”کیا آپ چند منٹ کے لیے مجھ سے بات کرنا پسند کریں گے۔“ تہینہ کی بات سن کر ماورا کے

چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ جی بھر کر اس ایک دن کے لیے پچھتائی جب کسی کمزور لمحے کی زد میں خود پر قابو نہ

رکھتے ہوئے اس نے کہہ ڈالا تھا۔

”تہینہ! ایک لڑکا ہے ہارون اسرار۔۔۔ اور وہ دعو کر تا ہے کہ اسے مجھ سے محبت ہے۔“ اس وقت

تہینہ نے محبت کی تباہ کاریوں پر پورا لیکچر دیا تھا اسے۔

”اور اب یہ کیا بات کرنے جا رہی ہے اس سے۔“ وہ تیز تیز قدم چلتی آفس سے باہر نکل کر ان

دونوں تک پہنچی۔

”تہینہ! جلدی کرو مجھے دیر ہو رہی ہے۔“

”مجھے ذرا۔۔۔“

”تہینہ۔۔۔ تم۔۔۔ میں نے کہا نا تم چلو یہاں سے ابھی اور اسی وقت۔۔۔“

وہ اسے تقریباً کھینچ کر لے جانا چاہ رہی تھی مگر تہینہ بھی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہو رہی تھی۔

”یاگل ہوئی ہو ماورا! مجھے اس سے بات تو کرنے دو۔“ تہینہ بری طرح چڑی۔

”تم میرے معاملات میں حد سے زیادہ دخل اندازی کر رہی ہو۔۔۔“ بے بسی کے شدید احساس

سے اس کی آنکھیں بھرا آئی تھیں۔

”ہاں۔۔۔ کر رہی ہوں تو۔۔۔“ تہینہ کٹھور ہو سکتی ہے اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ چند لمحے اسے

غصے سے گھورتے رہنے کے بعد اس نے ایک دم تہینہ کو دکھا دیا اور خود بری طرح روتی ہوئی بھاگ کر

سیڑھیاں اتر گئی۔

”میں تم سے زندگی بھر بات نہیں کروں گی تہینہ۔“

☆☆☆

”محبت کا کوئی وجود نہیں ہوتا ہارون اسرار! اس کے لیے ثبوت دینا پڑتا ہے۔ تمہیں اس لڑکی سے

محبت ہے تو جاؤ اور اس کا ہاتھ تھام کر اپنی محبت کو ثبوت دو، تمہاری خالی خولی محبت اس کے کسی کام کی

نہیں۔۔۔“ وہ بہت اطمینان سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کہنے لگی۔

”اس کا گھر چھینا جا رہا ہے اس سے۔۔۔ زمانے کی سنگدلی نے ایک سید زادی کو ہم جیسوں

کی صحبت میں لا پھینکا ہے۔ وہ کہاں تک مقابلہ کر پائے گی حالات کا، ایسا نہ ہو کہ کوئی دن آئے اور

تمہیں ماورا اور تہینہ میں کوئی فرق نظر نہ آئے۔ یہ کم مائیگی وقت کے سیاہ ہاتھوں نے میرے نصیب

میں تو لکھ دی ہے لیکن میں نہیں چاہتی کہ اس معصوم لڑکی کی شامیں بھی یوگمی داغدار ہوں۔۔۔ جو غم

اور دکھ میرے حصے میں آیا ہے۔ میں نہیں چاہتی وہ بھی ان ہی کیفیات سے گزرے۔“ اس کی نیت

کی سچائی اس کے لہجے سے چمک رہی تھی۔

ہارون اسرار کو اس لڑکی کے لیے اپنے دل میں گہرا دکھ محسوس ہوا تھا۔

”لڑکیوں کو محبت کی، عاشق کی ضرورت نہیں ہوتی ہارون۔۔۔! انہیں ایک محافظ درکار ہوتا ہے۔

ایک ایسا سایہ جو انہیں زمانے کے سرد و گرم سے محفوظ رکھ سکے۔ وہ نادان ہے، انا کے خول میں جکڑی

ہے۔ وہ کم مایہ نہیں مگر کم مائیگی کے خوف میں جکڑی ہوئی ہے اور یہی خوف اسے تم تک آنے نہیں

دیتا۔“

ہارون اسرار نے جیسے بہت کچھ سوچتے ہوئے بے چینی سے پہلو بدلا۔

”اس نے مجھے بھی اپنے بارے میں نہیں بتایا۔ اگر وہ ذرا سا بھی اشارہ دیتی اپنے حالات سے

متعلق تو۔۔۔“

”وہ مر کے بھی تمہیں آگاہ نہ کرتی ہارون اسرار۔۔۔! لیکن اب تو جو بھی ہے تمہارے سامنے

ہے۔۔۔ دیکھتی ہوں تمہاری محبت میں کتنا دم ختم ہے۔۔۔؟“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتی ایک دم سے

اپنی جگہ سے اٹھی تو اس کے چلبلیک انداز پر ہارون بے اختیار مسکرا دیا۔

”اگر ایسی بات ہے تو جاؤ۔۔۔ اور کل تک کے لیے میرا انتظار کرو۔۔۔ مجھے ایک وقت میں بہت

سے محاذوں پر لڑنا پڑے گا۔ پھر بھی تمہیں یقین سے کہتا ہوں کہ دیر ہو سکتی ہے اندھیر نہیں۔ اس سے کہنا

کچھ انتظار کرنا پڑے تو مایوس مت ہو۔“

اس کے انداز میں کوئی ہچکچاہٹ نہ تھی۔ تہینہ سر ہلاتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی تھی۔
☆☆☆

وہ رورو کر ہلکان ہو چکی تھی۔

تہینہ چپ چاپ بیٹھی بے تاثر نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔

”رولو۔۔۔ جی بھر کے رولو۔۔۔ کہ آج تم پھانسی کے تختے پہ کھڑی ہو، اور فیصلہ کسی اور کو کرنا ہے۔۔۔ یا تو بچالے گا تمہیں۔۔۔ یا تختہ پھینچ لے گا۔“ کرسی جھلاتے ہوئے وہ ایکدم ہی اٹھ کر ٹپلنے لگی۔

”تم نے برا کیا ہے تہینہ۔۔۔! تم نے میرے ساتھ بہت برا کیا؟“ وہ روتے روتے چلا اٹھی۔

”کیا برا کیا میں نے بھئی۔۔۔!“

”مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا، کیا کیا کہانیاں سنائی ہوں گی تم نے اسے۔ میری مجبوری کی۔ بے بسی کی، لاچارگی کی۔“

”میں نے اسے صرف حقیقت بتائی تھی، یہ مصیبتیں، یہ آفتیں ہماری اپنی نازل کردہ نہیں ہوتیں۔ حالات اور مسائل کا شکار کوئی بھی ہو سکتا۔۔۔ اور پاتال میں گرنے سے بہتر ہے تم اپنی نظروں سے گر جاؤ۔“ اس کا اطمینان قابل دید تھا۔

”وہ مجھے اپنا بھی لے گا تہینہ! تو بتاؤ میری کیا حیثیت ہوگی اس کے نزدیک۔ کیا مقام، کیا مرتبہ دے پائے گا وہ مجھے۔۔۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے ٹائپ آنسو بہا رہی تھی۔

”نری پاگل ہو تم۔۔۔؟“ وہ اس کے پاس آ بیٹھی۔

”یہاں تمہاری کیا حیثیت ہے؟ کیا مقام ہے؟ ڈری سہی رہتی ہو۔ کسی نے کھانے کے لیے دیا تو کھالیا۔ جہاں لٹا دیا پڑ گئی۔ سنو! جو شخص معاشرے کے رسم و رواج سے، اپنوں سے لڑ کے تمہیں اپنانے کی جرات کر سکتا ہے۔ اس کا ظرف یقیناً اتنا بڑا ہوگا کہ تمہارے لیے درست مقام اور حیثیت کا تعین کر سکے۔“

”بابی تہینہ، مادرا۔۔۔!“ ناکلہ کی پاٹ دار آواز نے ان دونوں کو چونکا دیا۔ ”باہر لمبی سی گاڑی میں ایک لڑکا آوے ہے۔ اپنا نام ہارون اسرار بولے ہے۔۔۔ اب بولو، آگے بھیجوں کہ یہیں سے لوٹا دوں۔۔۔“

”تمہارے منہ میں خاک، خبردار جو لوٹانے کی بات کی۔“ تہینہ اٹھ کر باہر بھاگی۔

مادرا سرخ آنکھوں نم پلکوں سمیت کمرے کی دہلیز پر آ کھڑی ہوئی۔

”ہارون سچ سچ آ گیا۔۔۔“ وہ بے یقینی سے اسے دیکھے گی۔

”یہ وہی ہارون اسرار ہے جس نے ایک گائیکہ کی بیٹی اور دوسری گائیکہ کی بہن ہونے پر مجھے دس باتیں سنا ڈالی تھیں۔ اور آج، آج وہ اسی گائیکہ کے در پہ آ کھڑا ہوا ہے۔ صرف میرے لیے۔۔۔“ وہ لڑکھڑا کر دروازے سے جا گئی۔

”معاف کرنا تہینہ! سہرا باندھ کر نہیں آ سکا۔۔۔ اب بتاؤ جلدی سے نکاح کے دو بول پڑھوالوں، یا باجوں تقارود کے اہتمام کے ساتھ اسے لے جانے کے لیے آؤں؟“

”فی الحال تمہارا یہاں آنا ہی کافی ہے ہارون! اب تم یہیں سے لوٹ جاؤ۔ یہ جگہ یہ مقام تمہارے ثنایاں شان نہیں۔ ہم تمہیں سہرا باندھ کر وہیں بلائیں گے۔ جہاں تم سر اٹھا کر آ سکو۔۔۔“ تہینہ جھلملاتی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

”تمہاری محبت کو سلام ہے ہارون اسرار! تم نے مادرا کو تہینہ بننے سے بچالیا۔“

☆☆☆

”مادرا! مادرا۔۔۔!“ یہ آواز سلیم کی تھی۔

سامان سیٹھتے ہوئے اس کے ہاتھ رک سے گئے۔۔۔ کھلے دروازے پر زوردار دستک دے کر وہ کمرے میں داخل ہوا تھا۔

”یہ تم کیا کر رہی ہو۔۔۔؟“ اسے اپنے کپڑے بیک میں رکھتے دیکھ کر وہ بھونچکا رہ گیا۔

”اپنے گھر جانے کی تیاری کر رہی ہوں۔“ اس کا انداز ہی بدلا ہوا تھا۔

”ہاں۔۔۔ تم پہلے بھی وہاں آئی تھیں۔ مجھے آج ہی پتا چلا۔۔۔ لیکن وہاں میرا مطلب ہے ابھی تو۔۔۔؟“ سلیم اچھا خاصا پریشان ہو رہا تھا۔

”وہ میرا نہیں، تمہارا مسئلہ ہے سلیم! میں اس مکان کی مالک ہوں۔ اور کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ میرے علم میں لائے بغیر میری جائیداد کو کسی بھی طرح استعمال کرے۔“

وہ بہت عام سے انداز میں کہہ رہی تھی۔ سلیم کتنے ہی پل لب بھیجے کھڑا رہا۔

”اور یہ ہارون اسرار کا کیا معاملہ ہے؟ تم اس پر اندھا دھند اعتماد کر رہی ہو۔ جب کہ تم اسے جانتی بھی نہیں۔ کچھ خبر ہے وہ کتنا بڑا کرپٹ انسان ہے۔ ٹیو پیپر کی طرح استعمال کرے گا وہ تمہیں اور دوبارہ اسی ڈسٹ بن میں لا کر پھینکے گا۔“

وہ سب کا جم چھوڑ کر اس کے مقابل آ کھڑی ہوئی تھی۔ کتنی ہی دیر تک وہ تانتف سے اسے دیکھتی رہی پھر جیسے تھک ہار کر چارپائی پر جا بیٹھی۔

”تم کیسے ہوا کرتے تھے سلیم۔۔۔؟ سادہ۔۔۔ بے لوث۔۔۔ ذمہ دار۔۔۔ یا پھر شاید میں ہی تمہیں ایسا سمجھا کرتی تھی۔ تمہاری پہلی پہلی تصویر کے سارے رنگ کتنے شفاف تھے جو رفتہ رفتہ اتنے دھندلائے ہیں کہ تمہاری شکل کہیں گم ہی ہو گئی۔۔۔“ وہ چادر سے نادیدہ گرد جھاڑ رہی تھی۔

”اور ہارون اسرار کا کیا کہتے ہو سلیم! میں اسے نہیں جانتی مگر تم سے تو واقف تھی نا۔۔۔؟ تم نے میرے ساتھ کیا کیا تھا۔۔۔؟ پہلی بار تو تم نے ہی مجھے اس ڈسٹ بن میں لا پیچکا تھا۔“ وہ چھتے لہجے میں کہتے ہوئے کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔ نیچے بازار میں بلاکارش تھا اور شور یہاں تک پہنچ رہا تھا۔

”تم جانتی ہو کہ اس وقت ہمارے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔۔۔“ سلیم کی آنکھیں اس کا ہاتھ نہ دے رہی تھیں۔

”سو تم نے مجھے اس ماحول میں لا چھوڑا۔ اسی ماحول میں، جس سے نفرت کی بنا پر تم نے کبھی اپنے فونی رشتوں کو چھوڑ دیا تھا۔ اپنی ماں کو ممتا کے حق سے محروم کر دیا تھا۔“ وہ کھڑکی بند کر کے اس کی طرف بولی۔

”تم اتنے خود غرض ہو سلیم کہ اپنے مفاد کے لیے کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتے ہو۔ ہر رشتہ توڑ سکتے

ہو۔ ہر احساس بھلا سکتے ہو۔ مجھے یہاں دو وقت کی روٹی کے لالے بڑے تھے سلیم اور تم وہاں میرے ہی گھر میں، میری اجازت کے بغیر لڑکوں کی ایک فوج بٹھائے ان سے گریہ وصول کرتے رہے۔ تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ میرے جانے والے تم پر کتنا اعتماد کرتے تھے۔“

”میں تمہیں بتا دیتا ہوں۔۔۔! ابھی تو کچھ ہی دن۔۔۔“ وہ اپنا دفاع کرنے میں ناکام رہا۔

”چپ رہو سلیم! میں جانتی ہوں تمہارے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں۔ تم جاؤ یہاں سے۔ میں شام تک گھر واپس آنا چاہتی ہوں اور میرا گھر مجھے خالی ملنا چاہیے۔“

وہ دوبارہ سے اپنی چیزیں سمیٹنے لگی۔ سلیم کچھ دیر وہاں کھڑا اسے دیکھتا رہا اور پھر ہارے ہوئے قدموں سے باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی وہ بے دم سی ہو کر چار پائی پر گر گئی۔

”ایک تم ہی تو تھے سلیم! جو میرے ماضی کی خوبصورت یادوں کے امین تھے۔ تم نے کا کا جان کو سنا تھا۔ تم نے ابا کو دیکھا تھا۔ تمہیں ان دونوں کی شفقت ملی تھی۔ ابھی تو تمہارے ساتھ مجھے ان کی بہت سی باتیں کرنا تھیں۔ ان کی یادوں کو مل بانٹ کر یاد کرنا تھا۔ لیکن تم نے۔۔۔ سلیم! تم نے میری ہر خواہش کو پورا ہونے سے پہلے ہی روند ڈالا۔ تم بہت برے ہو سلیم! بہت برے۔“ اس کی آنکھوں کے گوشے بری طرح بھگینے لگے۔

☆☆☆

وہ اس کے سامنے محو خواب تھا۔ ٹیوب لائٹ کی تیز روشنی میں اس کی اجلی رنگت کا لودیتا سنہرا، کشادہ پیشانی پر بکھرے سیاہ بال، بھرے بھرے گداز عنابی ہونٹ اور ہونٹوں کے برابر دائیں گال پر ٹھہرا سیاہ تل۔

وہ حیران حیران سی اسے دیکھ رہی تھی۔

”یہ دیوتاؤں کا ساجسن مجھے اس شخص میں پہلے کبھی نظر کیوں نہ آیا تھا۔“

بہت آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر اس نے نرمی سے اس تل کو چھوا جو اس کے مسکرانے سے پہلے مسکرا

دیا کرتا تھا۔

”کس نیکی کا بدلہ ہو تم ہارون اسرار! کس کی دعاؤں کے عوض ملے ہو تم کہ خدا کا شکر ادا کرنا چاہوں بھی تو ادا نہیں کر سکتی۔“

وہ اٹھ کر دبے قدموں باہر آگئی۔ رات بھر کی آندھی اور بارش نے ڈھنگ سے سونے ہی نہ دیا تھا۔ سودہ اسے ڈسٹر ب کے بغیر نکل آئی۔ باہر کی ہوائیں بارش کی ٹھنڈک کا اثر تھا، بہت خوشگوار مساموں میں اتر کر وجود کو تازہ کر دینے والی ٹھنڈک۔

نہن بجاگ اٹھی تھی اور اب شراب شراب برآمدہ دھور ہی تھی۔ وہ برآمدے سے نکل کر لان میں آگئی۔ جس میں اب پہلے کی سی تہ تیہی نہ رہی تھی۔ تراشیدہ گھاس بارش کے پانی سے بھگی ہوئی تھی۔ درختوں سے قطرہ قطرہ پانی ابھی بھی ٹپک رہا تھا، بیری کے درخت پر طوطوں کی ٹائیں ٹائیں نے شور مچا رکھا تھا۔ وہ بونبی چلتی ہوئی حوض کنارے آگئی۔ صاف ستھرے پانی میں تیرتی سینکڑوں کلیوں نے پانی کو معطر کر رکھا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی اوک بنا کر اس میں کلیوں سمیت پانی بھرا ہی تھا جب ایک دم کسی نے آکر اسے کندھوں سے تھام لیا۔ اس نے بغیر دیکھے پلٹ کر وہ پانی اس کی طرف اچھالا تو ہارون

اسرار کا جاندار قہقہہ فضا کی خوشگواریت میں مزید اضافہ کر گیا۔

”یہ تو تمہارے بالوں میں ہی اچھی لگے گی۔“ اس نے گریبان میں انکی ایک کٹی اس کے بالوں میں سجائی جانی۔

”یہ کٹی تو ہماری رقیب ٹھہری صاحب! ہم اسے کیونکر سجا سکیں گے بالوں میں۔“

اس نے وہ کٹی دوبارہ سے حوض کی طرف اچھالی تو وہ قدرے حیران ہوتے ہوئے ہنس دیا تھا۔

”بہت باتیں بنانے لگی ہو تم؟“

”آپ کی صحبت کا اعجاز ہے۔“

”اچھا۔۔۔ اور کیا سیکھا ہے ہماری صحبت میں۔۔۔“ اس نے درخت کی شاخ کو جھٹکا دے کر پانی

کے بہت سے قطرے اس پر گرائے۔

”میں نے جانا ہے کہ

محبت موسم نہیں

اپنی مدت پوری کرے

اور رخصت ہو جائے

محبت ساون نہیں، ٹوٹ کر برے

محبت آگ نہیں، سلگے بھڑکے

اور بجھ جائے

محبت آفتاب نہیں، ابھرے چمکے اور ڈھل جائے

محبت تو چاند کی مانند ہے

جو بڑھتا ہے، گھٹتا ہے

نکلتا ہے، چھپتا ہے

مگر کبھی فنا نہیں ہوتا

وہ سر اٹھائے اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر ایک پل کو جانے کیا ہوا کہ اس نے فوراً اٹھ کر اس کا ہاتھ تھام

کراپے لبوں سے لگالیا۔

”پلگ! اس کی پلکوں پہ نمی سی محسوس کرتے ہوئے ہارون نے اسے بھرپور محبت سے اپنے ساتھ

لگالیا تھا۔

”میں نے تم سے تمہارے لیے نہیں اپنے لیے محبت کی تھی ماورا! بلکہ محبت کی نہیں ہو گئی تھی۔ شاید اس لیے کہ تم میری ذات کا حصہ تھیں اور مجھے مل کر بالآخر تمہیں مجھے مکمل کرنا ہی تھا۔“ اس نے ہمیشہ کی طرح اس کی جذباتیت کے سامنے بند باندھنے کی کوشش کی تھی۔

”چلو۔۔۔ ناشتا لگ گیا ہوگا۔۔۔“

”آپ چلیں، فریش ہو جائیں۔ میں تب تک آرہی ہوں۔“

”اوکے۔۔۔“ وہ سر ہلاتا کمرے کی طرف بڑھا۔

”مجھے معلوم ہے ہارون اسرار! تم اپنی محبت کو کبھی مجھ پر بوجھ نہیں بننے دو گے۔ باوجود اس کے کہ

میری محبت تم پر بہت سا بوجھ لاد چکی ہے۔“ وہ وہیں بیٹھ کر حوض کے پانی میں انگلیاں چلانے لگی تھی۔
 ”والدین کی ناراضی سہنا آسان کام نہیں، مگر دل کی حالت جو بھی ہو میرے لیے مسکراہٹ
 تمہارے لبوں سے کبھی جدا نہیں ہوتی۔ یہ فاصلے بھی ایک دن تمام ہو جائیں گے ہارون! تمہارے بچے
 اور کھرے جذبات پر مجھ سے بڑھ کر یقین اور کسے ہوگا؟“
 ”صاحب بلار ہے ہیں۔۔۔“ زینب نے قریب آ کر کہا تو وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اٹھ
 کھڑی ہوئی۔

دروازے پر آہٹ ہوئی تھی۔ وہ چونک کر بیٹھی۔ لڑکا دودھ لے کر آ رہا تھا۔ وہ گہری سانس لے کر
 سیدھی ہو گئی۔
 ”ابا کے آنے کی تو کوئی امید نہیں کا کا! مگر ہر آہٹ پر آپ کے آنے کا گمان ہوتا ہے، کبھی آئیے تو
 آپ کو دکھاؤں کہ۔“

درخت اپنا لباس تبدیل کر رہے ہیں

کہیں کسی شاخ سبز کی اور صحنی پہ

ہلکی سنہری گوٹ لگ رہی ہے

کہیں کسی زرد رنگ پتی کا حاشیہ سرخ ہو رہا ہے

کہیں قبائے شجر گلابی ہو گئی ہے

کہیں ہرے پیڑ زرد نارنج چادریں اور ٹھنڈے لگے ہیں

کہیں فقط قمر مزی روشنی درختوں پر اپنا بالہ کیے ہوئے ہے

کہیں یہ جیسے زمردیں شاخسار پر نقش کھل اٹھے ہیں

”کبھی آئیے کا کا! اور دیکھیے۔ ہمارا چمن کیسے جھلما رہا ہے۔۔۔“ تیز ہوا میں اڑتی زلفوں کو

سنجھالتے۔۔۔ بادلوں بھرے آسمان پر اڑتے پرندوں کو دیکھتے ہوئے وہ کمرے میں آئی تو زینب ناشتے
 کے برتن لگاتے ہوئے بڑی شد و مد سے ہارون کو بتا رہی تھی۔

”نزدیک ہی ایک مزار پر ایک بزرگ آیا بیٹھا ہے۔۔۔ سنا ہے۔۔۔ اس کی دعا میں بڑا اثر ہے۔

لمبی سی ڈاڑھی ہے۔ بڑی بڑی جٹائیں۔ پورا چہرہ نظر نہیں آتا۔ اس کے پاس جاؤ، پکارو، بلاؤ تو نگاہ نہیں

کرتا۔ سر جھکائے در دیں مصروف رہتا ہے۔ ہر جو لوگ اس پاس کے رہنے والے ہیں۔ بتاتے ہیں کہ

سائیں بڑا ہی رحمدل ہے۔ جس روز کسی چڑیا کا گھونسلہ بکھرے یا بوٹ گھونسلے سے گر جائے تو اس کے

رونے کر لانے کی آوازیں رات بھر آتی رہتی ہیں۔



سماون بر سے خوشیوں کے سنگ

سیاہ گھور بادل آنا فانا آسمان پر چھاتے چلے گئے تھے اور گھڑی بھر میں ایسا کھل کر بر سے تھے
 کہ ریلوے اسٹیشن سے نکل کر ٹیکسی اسٹینڈ تک پہنچتے پہنچتے نوروز پوری طرح بھیگ چکا تھا، اس پر تقریباً
 خالی ٹیکسی اسٹینڈ اور انکا دکا ٹیکسی ڈرائیوروں کی طرف سے مکمل انکار نے اسے مزید جھنجھلاہٹ میں
 مبتلا کر دیا تھا۔ گھر یہاں سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا اور سفر کی تھکاوٹ ایسی بھرپور تھی کہ نوری طور پر گھر
 پہنچنے اور بستر پر گر جانے کی شدید خواہش کے زیر اثر وہ کہیں رک کر بارش تھم جانے کا انتظار بھی نہیں
 کر سکتا تھا، سو منہ میں بڑبڑاتے ہوئے وہ پیدل ہی گھر کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔

کچھڑ، پھسلن، اس پر دھانس دھانس برستی بارش جس کا نمکین، بد ذائقہ پانی زبردستی منہ میں
 گھسا چلا جا رہا تھا۔ آنکھوں میں جلن الگ ہونے لگی تھی۔ پندرہ بیس منٹ کے پیدل مارچ میں اس
 نے کیلے اور مزید وزنی ہوتے سفر کی بیک کو پیچس مرتبہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا تھا۔
 ابھی اسے سر پہ رکھا تھا اور کبھی بازوؤں میں بھرا تھا۔ خدا خدا کر کے گھر کا دروازہ نظر آیا تھا۔ سو فوراً
 ہی نوروز اندر گھس گیا تھا۔ نیم تاریک ڈیوڑھی میں چھپا چھپ پانی اڑاتے وہ آگے ہی آگے بڑھتا
 چلا گیا تھا۔ بارش اگر دو گھنٹے برستی تھی تو یہ سال خوردہ ڈیوڑھی دو دن تک برستی رہتی تھی۔ وسیع و
 عریض محن میں سلیمان اور ارسلان بھائی کے بچوں نے خوب اودھم مچایا ہوا تھا۔

اسے دیکھ کر ”چاچو، چاچو۔“ کے ایسے فلک شگاف نعرے لگائے کہ اس کی آمد کی اطلاع گھر
 کے کونے کونے تک پہنچ گئی تھی اور پھر ایسی تھر تھلی مچی تھی کہ کچن میں پکوڑوں کے لیے بیسن گھولتی
 سدرہ نے مارے حیرت اور خوشی کے سارا امین زمین پر الٹ دیا تھا۔ چھوٹے چچا کی شہلا لکھی تو معیز

اس کے نیچے اور ایتھ اور پتھی۔ تائی اماں الگ دہائیاں دے رہی تھیں۔
”ارے! پہلے مجھے تو اس سے ملنے دو۔“

اور معلوم نہیں نوروز کا حوصلہ جواب دے گیا تھا یا سامنے کے جھوم اور پیچھے سے ہونے والی متوقع یلغار نے اسے حواس باختہ کر دیا تھا، لپک جھپک لیے لمبے ڈگ بھرتا برآمدے کی طرف بڑھا تو صحن میں ہی پاؤں پھسلا بلکہ پھسلتا چلا گیا اور اس سے پہلے کہ وہ خوب لمبا ہو کر صحن میں پڑا ہوتا، اظفر نے بروقت اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

”ارے ارے یار! آنے کی اطلاع تو دی ہوتی۔ ہم خود تجھے لینے اسٹیشن پہنچ جاتے۔“

اظفر کے عقب سے جھانکتے بے قرار چہروں پہ نگاہ پڑتے ہی اس نے اظفر کو ایک طرف دھکیلا اور آگے بڑھ گیا۔ اپنے بھیگے حلیے کے باعث وہ خاصی دور سے نظیما تائی اماں کے سامنے جھکا تھا مگر تائی اماں نے پروا نہ کرتے ہوئے ہمیشہ کی طرح اسے اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا تھا۔ گھر کے ہر فرد کا تقریباً یہی حال تھا۔

خوشی سے معمور چہرے، ہنسنے کھلکھلاتے، بے فکری، شوخی، ادھر ادھر کی چھیڑ چھاڑ۔

”کیا واقعی یہ سب لوگ میری آمد پر اتنے ہی خوش ہیں جتنے نظر آرہے ہیں۔“ وہ سمجھ نہیں پایا، بس یونہی بے زار سا بیٹھا ایک ایک کا چہرہ تکتا رہا تب ہی رشنا گرم گرم پکڑوں کی پلیٹ لے کر بھاگی چلی آئی تھی اس کے پیچھے چائے کا گگ تھا سے سویرا تھی، اس کی اکلونی بہن۔

”نوروز بھائی! یہ صرف آپ کے لیے ہیں۔“ رشنا نے پلیٹ اس کی طرف بڑھائی اور اگلے چند لمحوں میں صرف پلیٹ ہی اس کے ہاتھ میں آئی تھی کہ نندیدوں اور چٹوروں کی پوری فوج اس وقت اس کے گرد جمع تھی۔

”شرم تو نہیں آتی تم لوگوں کو، نوروز بھائی اتنی دور سے آئے ہیں۔“

سویرا نے خاص طور پر اظفر، معیز اور مہراں کو شرم دلانی چاہی تھی مگر وہ سب کے سب بے غیرت بنے مسکراتے رہے اور ڈھیٹ بنے پکڑے اڑاتے رہے۔ اظفر نے البتہ تھوڑی غیرت دکھاتے ہوئے ادھ کھایا پکڑا اس کی طرف بڑھایا تھا، مگر عین اسی وقت رشنا دوسری پلیٹ ہاتھ میں لیے آگئی تھی۔ ساتھ ہی ایک عدد کفیر بھی تمام رکھا تھا جو کہ ظاہر ہے حفظ ما تقدم کے طور پر لے کر آئی تھی۔

تب ہی نوروز کو احساس ہوا، سویرا اس کے کاندھے پر جھکی نہ جانے کیا مننارہی تھی۔ اس نے توجہ دینے کی کوشش کی، مگر بھانت بھانت کی آوازوں میں سوائے من من کے کچھ پلے نہیں پڑا تھا۔ اظفر کے چھت بھاڑنم کے تھقبے، معیز اور زوار کی دھینگا مٹتی، تائی اماں کی ڈانٹ پھٹکار، پن سے رشنا اور سدرہ کی چیخ و پکار، اس پر اس کے اپنے بالوں سے ٹپ ٹپ گرتا ہوا پانی، بارش میں بھیگے کپڑے اور چیچا ہٹ کا احساس۔

”افوہ کیا مصیبت ہے؟ میں کچھ سن نہیں پا رہا۔ تم کیا کہہ رہی ہو۔ دو منٹ صبر کرلو۔“

جھنجھلاہٹ کے شدید احساس کے زیر اثر اس نے تپ کر کہا تھا، سویرا چند لمحے شکایتی نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر اس کا دبوچا ہوا بازو ایک جھٹکے سے چھوڑا اور دھپ دھپ کرتی کمرے میں

غائب ہو گئی۔

”افوہ۔“ کوفت کا احساس بڑھتا چلا گیا تو وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

”کہاں۔۔۔“ سب کی نظریں بے اختیار اس کی طرف اٹھ گئی تھیں۔

”بہت الجھن ہو رہی ہے، میں ذرا چیخ کر لوں۔“ وہ کہہ کر تیز تیز قدم اٹھاتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ کمرہ جوں کا توں تھا، ایک دم صاف ستھرا۔

اس نے وارڈروپ سے دھلے دھلائے کپڑے نکالتے ہوئے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ وہ پورے ڈیڑھ ماہ بعد گھر واپس آیا تھا اور اس کمرے کی نش لاش کرتی حالت بتا رہی تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں بھی گھر کے لوگ اس کے خیال سے غافل نہیں رہتے۔ وہ خود کو ان محبتوں کا مقروض تصور کرتے ہوئے غسل خانے میں چلا گیا تھا۔ نہاتے ہی سفر کا میل پچیل اور آدھی ٹکان اتر گئی تھی۔ تو لیے سے کیلے بال ریگڑتے ہوئے وہ ڈریسنگ روم کے سامنے آکھڑا ہوا تھا جب عقب میں دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی تھی۔ چند ثانیے بعد آئینے میں اظفر کا عکس ابھرا تھا۔

”نہا لیے، ابا جان نیچے بلا رہے ہیں تمہیں۔ ہاں اگر تم آرام کرنا چاہو تو میں ان سے کہہ دیتا ہوں۔“

”نہیں۔۔۔ میں آ رہا ہوں۔“

اس نے کنگھے سے بال بناتے ہوئے کہا تو اظفر اثبات میں سر ہلاتا واپس پلٹ گیا تھا۔ کنگھا میز پر رکھنے کے بعد اس نے سلپر نکال کر پہنے اور آستین کے بٹن بند کرتا ہوا کھڑکی تک آیا۔ بارش اگرچہ اچھی بھی ہو رہی تھی مگر اس میں پہلے کی سی شدت نہ تھی۔ چند لمحے اس بے موسم کی بارش کو سکتے رہنے کے بعد وہ پلٹا تھا۔ کمرے کا پرسکون ماحول اس کے تھکے ہوئے اعصاب کو تھکیاں دے رہا تھا اور اسے ڈر تھا کہ اگر کچھ دیر وہ مزید یہاں ٹھہرا تو ہو سکتا ہے، سب کچھ بھول بھال کر بیڈ پہ گر جائے جبکہ تائیا ابا نیچے بڑی شدت سے اس کا انتظار کر رہے تھے، سو وہ سر جھٹک کر نیچے دروازہ کھولتا ہوا زینے کی طرف آگیا تھا۔ نیچے اب قدرے سکون تھا۔ تائیا ابا حسب معمول ٹی وی کھولے بیٹھے تھے۔ تائی اماں بے زار سا چہرے لیے تائیا ابا پر نگاہیں جمائے بیٹھی تھیں۔ رشنا اور ایتھ کوئی میگزین کھولے اس پر جھکی ہوئی تھیں۔ تائیا ابا ان کی سرگوشیوں اور ہنسی کی دہلی دبی آوازوں سے ڈسٹرب ہو کر بغیر کچھ کہے انہیں گھور رہے تھے۔

”آؤ، آؤ نوروز میاں! کہاں رہ گئے تھے بھئی؟“ اس پر نگاہ پڑتے ہی انہوں نے بشاش انداز میں کہتے ہوئے بازو پھیلائے تو وہ ان کے اٹھنے سے پیشتر ہی جھک کر ان کے سینے سے لگ گیا تھا۔ ”جیتے رہو، آؤ ادھر بیٹو۔“ انہوں نے ٹی وی بند کرتے ہوئے ریوٹ میز پر رکھا اور پھر پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”اصولاً تو اس وقت تمہیں آرام کرنا چاہیے تھا۔ مگر بھائی صاحب کی طرف سے فکر ہو رہی تھی۔ سوچا، ان کی خیریت معلوم کر لوں۔“ تائیا ابا نے کہا تو وہ رکھی سی مسکراہٹ کے ساتھ ”کوئی بات نہیں۔“ کہتا ہوا انہیں تفصیل سے بتانے لگا تھا۔

ڈیڑھ ماہ قبل اسے اپنے عزیز دوست وہاب کی شادی میں شرکت کے لیے وہاڑی جانا تھا۔ تاجا ابا کو معلوم ہوا تو وہ اپنی اسٹڈی ٹیبل سے اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھے تھے۔

”نوروز! جارہے ہو تو ذرا ہمارے بھائی میاں کی خبر بھی لیتے آنا، ہمیشہ محترمہ حیات تھیں تو آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اب تو چند برس بیت چلے انہیں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ ادھر بھائی میاں کی زندگی مشکل میں پڑی، ادھر ہم دنیا کے دھندوں میں ایسا پھنسے کہ وہ جو مہینوں بعد ایک دوسرے کی خبر لیتے تھے، اس سے بھی گئے، تم کن رہے ہوناں نوروز! ضرور جانا ان کی طرف۔“

وہ اٹھ کر دوبارہ اسٹڈی ٹیبل کی طرف بڑھے۔ کاغذ نکال کر دو چار سطریں گھسیٹیں اور پھر کاغذ تہ کر کے اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ایڈریس خود انہیں بھی ٹھیک طرح سے یاد نہیں تھا، ٹوٹا پھوٹا راستہ سمجھا دیا۔

نوروز نے جھنجھلاتے ہوئے دل ہی دل میں ٹھان لی تھی کہ اطمینان سے ولیمہ کھا کر واپسی کی راہ لے گا اور کہہ دے گا، گھر نہیں مل سکا۔

مہندی، بارات اور ولیمہ۔ وہاڑی میں اس کا صرف تین دن رکنے کا پروگرام تھا مگر اس پہلے دن ہی ٹھکانے لگ گئے تھے جب وہ اچھی خاصی گرمی میں بذریعہ ترین وہاڑی پہنچا اور پہلی فرصت میں ہی وہاب پر پل پڑا۔

”کیا ضرورت تھی تمہیں۔ اس موسم میں شادی کروانے کی۔ مگنیت کہیں بھاگی جارہی تھی یا تو خود اس دار فانی سے کوچ کرنے والا تھا۔“ نوروز غصے کا اظہار کرتا رہا اور وہاب شادی کی خوشی میں مزے سے دانت نکالتا رہا۔

”زمانہ بدل گیا مگر ایک میرا یا نوروز جہاں گھر خود کو نہ بدل سکا۔ ویسا ہی چڑچڑا، ویسا ہی بد مزاج اور ذرا سا بے وقوف۔ بات بات پر جلنا کڑھنا، تیری پرانی عادت ہے۔ اسی لیے تو کھایا پیا لگتا نہیں۔“ وہاب نے ایک زوردار دھپ اس کے لگاتے ہوئے سر تاپا اس کا جائزہ لیا۔

لباقد، دیلی پتلی جسامت، سیاٹولی رنگت اور چہرے پہ ہمہ وقت نظر آتی بے زار کن کیفیت جو شاذ و نادر ہی خوشگواریت میں بدلتی تھی اور یہ خوشگواریت اس کے چہرے پہ کتنی اجنبی سی لگتی تھی۔ یوں جیسے کسی خزاں رسیدہ ٹنڈ منڈ درخت پر کوئی بے موسم کا پھل کھل اٹھا ہو۔

وہ اس قدر بے ہودہ القابات پر ناراض سامنے بھلائے بیٹھا تھا جب مہندی کی رسم کا بلاوا آیا۔ وہاب سب کچھ بھول بھال کر خوشی سے اچھلتا سب سے پہلے لپکا تھا۔ اس کے بقیہ دوست پیچھے سے آوازیں لگا لگا کر اسے غیرت دلانے کی ناکام کوشش کرتے رہے مگر وہ ان کو منہ چراتا خود ہی جا کر گئی سبائی کر سی پہ جا بیٹھا تھا۔

یہ اور بات کہ مہندی کی رسم کرتے ہوئے اس کے سرال والوں نے اس کی وہ درگت بنائی تھی کہ وہ دردناک چیخ و پکار کے ساتھ میسوں بار اٹھ کر وہاں سے بھاگا تھا۔ اور میسوں بار ہی اسے پکڑ کر واپس لا بیٹھایا گیا تھا۔ اس موقع پر بڑی بوڑھیوں کے سوگوار اور لمبی لمبی سروں والے گیت سن کر

نوجوان لڑکیاں مہندی کی رسم کا بائیکاٹ کرنے کا پروگرام بنا رہی تھیں کہ بزرگ خواتین کی وجہ سے ان کے تمام تیار کردہ گانوں کا ستیاناس ہو گیا تھا۔ وہ تو شکر ہوا کہ گاتے گاتے ان کے سانس پھول گئے، رگیں تن گئیں۔ تب صورت حال سے فائدہ اٹھا کر ان بڑی بوڑھیوں کو پکڑ کر ان کی نشستوں پر بٹھایا گیا اور نوجوان لڑکیوں کو اپنے فن کے اظہار کا موقع مل گیا دنیا جہاں کے گانوں کے ساتھ ساتھ وہاب کا حلیہ بھی اس بے دردی سے بگاڑا گیا تھا کہ یاران وہاب نے اسی وقت کان پکڑ کر شادی کروانے سے توبہ کر لی تھی اور غالباً اسی توبہ نے لڑکیوں کو مزید اکساد دیا تھا۔

”بھائی صاحبان نے شادی سے توبہ کر لی ہے۔ تو پھر کیوں نہ آج ہی دل کے سب ارمان پورے کر لیے جائیں۔ چلو ہنو! دل کی سب حسرتیں پوری کر لو۔“

کسی ایک من چلی نے بہنوں کو لاکا رکھا اور پھر بدتہذیب بہنوں نے بھائیوں کو تیل میں ڈبونا اور مہندی میں دفن کرنا شروع کر دیا تھا اور بے حد شرافت کا مظاہرہ کرتا۔ ایک کو نے میں دیکھا نوروز ان سب کی خراب حالت پر ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا۔ تب ہی ایک محترمہ کی نظر اس پر پڑ گئی۔ وہ اپنی ہنسی کو بریک لگاتا وہاں سے ٹھکنے ہی والا تھا جب پوری فوج ظفر موج اس کے سر پہ آن کھڑی ہوئی تھی۔

”دیکھیں جی، اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔“ وہ گڑبڑا گیا تھا۔

”اجی تو ہم نے کب کہا کہ وہاب کی شادی میں آپ کا کوئی قصور ہے۔“

”مم میرا مطلب ہے، میں بہت دور سے آیا ہوں اور آپ کو بتا دوں کہ میں اس قسم کے مذاق بالکل پسند نہیں کرتا۔“ اس نے دانستہ تیوریاں ڈال کر خود کو بہت شجیدہ ورنجیدہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی مگر مخالفین پر اس کا بالکل الٹ اثر ہوا تھا۔

”اس قسم کے مذاق پسند نہیں تو پھر کس قسم کے مذاق پسند ہیں آپ کو اور بائی داوے، ہمیں بھی تو معلوم ہو آپ کتنی دور سے آئے ہیں۔“ سبز لہنگہ والی نے آنکھیں نہچاتے ہوئے پوچھا تو جواب سرخ سوٹ والی نے دیا تھا۔

”میرا خیال ہے، کوہ قاف سے آئے ہیں۔“

”کوہ قاف میں یا تو جن ہوتے ہیں یا پریاں۔“ ان کا تعلق کس مخلوق سے ہے۔“ زرد پٹواز والی خود کو معصوم ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

”پری زاد تو یہ ہونے سے رہے، دوسری مخلوق کے جانشین ہی لگ رہے ہیں۔“ کسی نے اندازہ لگایا تھا اور اس کے ساتھ ہی نسوانی قہقہے محفل کو کشت زعفران بنا گئے تھے۔

”دیکھیے، اب آپ بدتمیزی کر رہی ہیں۔“ اس نے غصہ دکھانا چاہا۔

”کیا؟ بدتمیزی، بدتمیزی تو ہم اب دکھائیں گے آپ کو۔“ کوئی غصے سے چیخ کر بولی تھی۔

رنگ برنگ زرتار پہناووں سے جہاں اس کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں وہاں ظالم تنکے نقوش کی قاتل اداؤں اور تیغ صفت قہقہوں نے ہوش و حواس بھی معطل کر دیے تھے اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے بچاؤ کا کوئی معقول طریقہ سوچتا، کتنے ہی نازک ہاتھ ایک ساتھ اس کی طرف بڑھے تھے اور لمحوں میں اس کا وہ حلیہ بنا گئے تھے کہ شرمندگی سے اپنا چہرہ چھپاتا وہ اس محفل سے ہی نہیں گھر سے بھی

باہر نکل گیا تھا۔

”آخر ضرورت ہی کیا تھا یہاں آنے کی، چلو آہی گئے تو کیا ضرورت تھی رسم مہندی میں شرکت کرنے کی۔ معلوم تھا وہاں اس کینے وہاں کا سارا خاندان جمع ہوگا اور اس کا خاندان ظاہر ہے ویسا ہی ہو سکتا ہے جیسا کہ ہونا چاہیے، کسی اچھی توقع کی امید؟ تو بہ کیجیے انسانیت تو نام کو نہیں۔“

وہ با آواز بلند ان کو کوستا، بڑبڑاتا یونہی کشادہ کلیوں میں مارچ کرتا رہا اور پھر دل کی بیڑ اس خوب اچھی طرح نکال کر الیکٹرک پول کی زرد مردہ روشنی میں کسی مکان کے پختہ ٹھڑے پہ بیٹھ کر اپنے چہرے اور گردن سے ابٹن چھڑانے لگا، بالوں میں ہاتھ پھیرا تو شدید چیچھاہٹ کا احساس ہوا۔

”بدبختوں نے تیل بھی جی بھر کے اٹھ بلا ہے۔“ اس نے دانت پیستے ہوئے گردن اونچی کر کے دیکھا۔ وہاں کے گھر کی تیسری منزل پہ جلتی روشنیاں یہاں سے بخوبی دکھائی دے رہی تھیں۔ بلکہ اسے تو وہ پیچم دھاڑ، شور شرابا بھی، بخوبی سنائی دے رہا تھا جو اس وقت وہاں پایا تھا یا شاید کان ہی بچ رہے تھے۔ اس نے زور زور سے دونوں کانوں کو کھجا کر گویا ان کی کارکردگی بحال کی اور اپنے ارد گرد پھیلے رات کے سنائے کو محسوس کرنے لگا تھا۔

رات کا دوسرا پہر چل رہا تھا۔ ہوا میں قدرے ٹھنڈک سی آگئی تھی اور کسی گھر میں لگے ناز بوی مہک پورے ماحول میں رچی بسی ہوئی تھی۔ پول کی نیم جان ہی روشنی کے گرد منڈلاتے کئی پروانے ابتر حالت میں اس کے آس پاس گر رہے تھے۔ اس نے یونہی اطراف میں دیکھتے ہوئے ٹھیک کا دامن اٹھا کر ایک بار پھر اپنے چہرے کو گرکڑا۔ تب ہی سڑک کے پار ایک گھر کے سامنے لگے پیپل کے تین درخت ایک قطار میں کھڑے تھے۔ وہ چونکا تھا بہت بری طرح، بلکہ ایک دم سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

پیپل کے تین درخت ایک ہی قطار میں، اس کے عین سامنے سینٹ کے ٹھڑے والا سرخ دروازوں والا گھر ”شمینہ پھوپھو اور اسماعیل پھوپھا کا گھر۔“ وہ بجلی کی سی تیزی سے پلٹا تھا اور ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گیا تھا۔ وہ سینٹ کے بنے ہوئے ٹھڑے پہ بیٹھا تھا جو جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا اور اس کے سامنے دو دروازے تھے۔ سرخ رنگ کے دروازے، دائیں طرف کا دروازہ صحن میں کھلتا تھا۔ بائیں طرف کا ڈرائنگ روم میں اور ان کے درمیان بڑی سی جالی کی کھڑکی تھی جس کے ذریعے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر باہر کا منظر بخوبی دیکھا جاسکتا تھا اور یہیں سے پھوپھو بڑی، فروٹ والے کو آواز دے کر روکا کرتی تھیں اور یہ سب باتیں اسے کسی نے نہیں بتائی تھیں۔ بس شعور کی سطح پر ایک کے بعد ایک نقش ابھرتا چلا گیا۔

وہ اس وقت پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا جب تایا ابا کے ساتھ پہلی اور شاید آخری مرتبہ شمینہ پھوپھو کے ہاں آیا تھا۔ وہ غالباً اس وقت بیمار تھیں۔ اس لیے بہت زرد اور پشمرہ دکھائی دے رہی تھیں۔ نوروز کو دیکھتے ہی انہوں نے بے تابی سے اسے گود میں لے لیا تھا اور جب آسٹوؤں کے بڑے بڑے قطرے ایک تو اتر سے ان کی آنکھوں سے پہنچے لگے تھے تو وہ ہراساں سا ہو کر ان کی گود سے اتر کر تایا جان کے پہلو میں بیٹھ گیا تھا۔ جب سے امی فوت ہوئی تھیں تب سے وہ بہت حساس اور زور بخس سا ہو گیا تھا۔ خود اسے بہت کم رونا آتا تھا مگر جب بہت سے دوسرے لوگ اسے پیار کرتے

ہوئے وہ خواہ مخواہ ہی آنسو بہانے لگتے تھے تو اسے بالکل بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ سینے پر بے تحاشا بوجھ پڑ جاتا تو پھر وہ کئی دن تک بالکل گم صم ہو کر رہ جاتا تھا اور اس وقت پھوپھو کو روتے دیکھ کر اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس سوگوار ماحول سے بہت دور چلا جائے۔

”یوں رو رو کر خود کو ہلکان مت کرو شمینہ! اب قسمت کے لکھے کو کون بدل سکتا ہے۔“ تایا ابا نے انہیں تسلی دینی چاہی تھی۔

”کیسے نہ روؤں بھیا؟ بھابھی بیگم کو تو خدا نے ہم سے چھین لیا تھا۔ مگر بھائی صاحب پرانی عورت سے دل لگاتے ہوئے انہیں نوروز اور سویرا کے متعلق تو سوچنا چاہیے تھا۔ اب یہ بے چارے کہاں درد در کی ٹھوکریں کھاتے پھریں گے۔“ ان کے رونے میں شدت آگئی تھی۔

”خدا نہ کرے شمینہ! جو یہ درد در کی ٹھوکریں کھائیں۔ میں ہوں ناں بھابھی بیگم کو ہمیشہ چھوٹی بہن سمجھا تھا۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہیں، تو ان دونوں کو ان کی نشانی سمجھ کر سینے سے لگا لوں گا۔ تم دیکھ لینا شمینہ! نوروز میرے لیے سلیمان، ارسلان اور اظفر سے بڑھ کر ہوگا۔ سویرا کو بھی سدرہ سے کمتر جانوں تو جو چاہے سزا سنا دینا۔“

تایا ابا نجمانے کن باتوں میں الجھ گئے تھے۔ وہ اکتایا اکتایا سا اٹھ کر باہر چلا آیا، دھلا دھلا صحن یہاں سے وہاں تک بالکل خالی تھا۔ وہ دھنی دیوار کے ساتھ بنی کیاری کے پاس آ بیٹھا۔ جہاں نہایت باریک سبز پتوں والی تیل کا سنی اور گلابی رنگ کے پھولوں سے بھری ہوئی تھی۔ وہ چند لمحے پھولوں سے چیخیر خانی کرتا رہا پھر کونے میں لگے لیوؤں کے بیڑ کا جائزہ لینے لگا۔ تب ہی کسی بچے کے رونے کی آواز کانوں میں بڑی تو بری طرح چونک گیا۔

”یہ کون ہو سکتا ہے؟“ وہ دبے دبے پاؤں اٹھا تا دوسرے کمرے کی طرف آ گیا اور وہاں سفید فراک میں ملبوس بچی کو بری طرح روتے دیکھ کر وہ گھبرا سا گیا تھا۔ وہ تقریباً سویرا جتنی ہی تھی اور اسی کی طرح چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ تب ہی نوروز کے پیچھے ہلکا سا کھٹکا ہوا، اس نے پلٹ کر دیکھا پھوپھو ہستہا چہرہ لیے کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔

”نوروز! ادھر کیوں کھڑے ہو بیٹا! یہاں آ کر بیٹھو نا۔“

پھوپھو نے ایک الماری کھول کر اس میں سے سسکت اور بہت سی ٹافیاں نکال کر اس کے سامنے رکھ دی تھیں اور خود اس بچی کو بہلانے لگی تھیں نوروز تایا ابا کے ساتھ صرف دو دن وہاں رکھا تھا اور دو دنوں میں اسماعیل پھوپھو نے اسے بہت سیر کرائی تھی۔ گھر آتا تو پھوپھو خاطر مدارات پر کمر بستہ ہو جاتیں۔ تایا ابا ٹوکتے رہتے۔

”تم بیمار ہو شمینہ! ہم صرف تمہیں دیکھنے، تم سے باتیں کرنے آئے ہیں خواہ مخواہ خود کو ہلکان مت کرو۔“ اور جابا شمینہ پھوپھو ہولے ہوئے مسکرائی رہی تھیں۔

”آپ کون سا روز روز آتے ہیں بھیا! اور اب آئے ہیں تو جی چاہتا ہے، اگلی بچھلی ساری کسریں نکال دوں۔“

”بس کام کی مصروفیت۔۔۔ مگر تم مطمئن رہو۔ آئندہ آتا جاتا رہوں گا۔“

تایا ابا نے دل سے کہا تھا مگر آئندہ آنے جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ بس ایک بار جانا پڑا تھا

انہیں، جب شہینہ پھوپھو کے انتقال کی خبر آئی تھی۔ چھوٹی چچی گھر میں بچوں کے پاس رہیں، باقی سب بڑے وہاں پہنچ گئے تھے اور وہاں سے واپس آنے کے بعد اس نے تایا بابا کو بہت مضطرب اور تالی اماں کو بے قراری سے روتے دیکھا تھا۔

”ارے الو کی دم! تو یہاں کھڑا ہے، لاحول ولا قوتہ اور ادھر میں پورے شہر میں تجھے ڈھونڈنا پھر رہا ہوں۔“

کمر پر لگنے والی کراڑی سی دھپ نے ڈھیلے ڈھالے کھڑے نوروز کو کئی قدم آگے لڑھکا دیا تھا۔ بے اختیار ہی سمجھتے ہوئے اس نے پلٹ کر دیکھا وہاں خشکیوں لگا ہوں سے اسے گھور رہا تھا۔

”کون سا خزانہ دفن ہے ان بند دروازوں کے پیچھے جو آدھی رات کو یہاں کھڑے چلہ کاٹ رہے ہو۔“

”بکواس نہیں کر دیا! وہ جھینپ سا گیا۔“

”ٹھیک ہے نہیں کرتا مگر یہ تو بتاؤ، یہ کیا حرکت کی ہے تم نے قسم خدا کی، شرمندہ کروا دیا سب کے سامنے۔“

بھائی! ہم ذرا شرارت کے موڈ میں ہیں۔ دیکھ لیجئے مزاج یا رہم تو نہیں۔۔۔؟“

ہر کسی نے اپنے اپنے انداز میں اس برطرز کیا تھا۔ وہاں کی گھوریوں نے اکثریت کو خاموش تو کروا دیا تھا مگر وہ کچھ مزید چپ ہو گیا تھا۔ بچپن کے اندوہناک حادثات نے اس کی شخصیت میں نجانے کیسے خلا پیدا کر دیے تھے کہ جو بھرنے میں ہی نہ آتے تھے۔

پہلے ماں کی تکلیف دہ بیماری کے بعد موت پھر باپ کی دوسری شادی اور پھر اس کی موت، رشتہ دار یاں، ہمدردیاں، ترحم بھری نظریں، مصنوعی دلا سے، جھوٹی تسلیاں وہ سب سے چھپ کر اندر ہی اندر سمٹتا چلا گیا۔

اور اب بھی کبھی اس کا دل چاہتا تھا وہ بھی عام لوگوں میں گھل مل کر بیٹھے، چھوٹی چھوٹی بے نیکی باتوں پر بے ہنگم تہققے لگائے۔ چچے دھاڑے بھی خوش ہو، تو اچھل اچھل کر اپنی خوشی کا بے ساختہ اظہار کرے، کبھی ناراض ہو تو واضح طور پر دکھائی دے مگر ایسا بھی نہیں ہوا تھا، خوش ہو یا غم غصہ، پریشانی تھکان ہو یا کام کرنے کی دھن۔

وہ ہر کیفیت میں بس ایک سا ہی دکھائی دیتا تھا۔

الجھا الجھا، کھویا کھویا، گم صم۔

جذبات اس کے اندر سر پیچھے رہتے کسی ڈوبتے مسافر کی طرح جو باوجود کوشش کے سطح آب پر نہ ابھر سکتا ہو۔

دوباب ناراضی سے بولتا رہا اور نوروز غائب دماغی سے سنتا رہا۔ ذہن درحقیقت ان بند کواڑوں کے پیچھے بھری یادوں کو سمیٹ رہا تھا۔

”اب چلتے ہو یا چلے کا وقت ابھی باقی ہے۔“ نوروز نے پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا، ناراضی سے پھولا ہوا منہ بالکل غبارے کی طرح، تیل میں بھیکے بال ماتھے سے چپکے ہوئے تھے، لگبجا لباس جگہ جگہ مہندی سے رنگا ہوا۔۔۔ پیروں میں دورنگی چپل۔۔۔ وہ واقعی بہت پریشانی میں گھر سے نکلا تھا، نوروز نے ایک طویل سانس لے کر پلٹ کر دیکھا۔ سرخ دروازے پر نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی اس نے آگے بڑھ کر آنکھیں میکیں۔

”اسماعیل حسن B iv 698“ زیر لب پڑھ کر دل ہی دل میں دہراتا وہاں کی طرف پلٹا۔

”یہ میرے پھوپھا جان کا گھر ہے۔“ وہ وہاں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چلنے لگا۔

”ہیں کیا واقعی؟“ وہاں ٹھٹھا تھا۔

”ہاں۔“

”کمال ہے مجھے تو علم ہی نہیں تھا اور نہ اسماعیل صاحب سے تو میں اچھی طرح واقف ہوں۔ بہت ہی بھلے انسان ہیں۔“ وہاں اس سے ان کے متعلق باتیں کرنے لگا تھا اور یونی چلتے چلتے وہ وہاں کے گھر تک پہنچ گئے تھے۔ گھر میں داخل ہونے سے پہلے اس نے رک کر وہاں سے معذرت کرنی چاہی تو وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔

”غصہ تو وہ کرے جسے تمہاری عادت کا علم نہ ہو اور میں تو اچھی طرح جانتا ہوں۔ بات بعد میں

ہوتی ہے موصوف خفا پہلے ہو جاتے ہیں۔“

وہاں نے اسے اندر دھکیلا تو وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔ مگر وہ تو وہاں تھا، اس کی رگ رگ سے واقف، یوں ظاہر کر گیا تھا جیسے مسئلہ ہی کوئی نہ ہو، باقی سب نے البتہ اس کا خوب ریکارڈ لگایا تھا۔

”بھئی، وہاں کے دوستوں سے چائے پانی کا پوچھ لو مگر ذرا خیال سے مزاج بہت نازک ہیں۔“

”خبردار! سب لوگ تمیز کے دائرے میں رہیں ورنہ لوگ گھر سے بھاگ نکلیں گے۔“

”وہاں بھائی! ہم ذرا شرارت کے موڈ میں ہیں۔ دیکھ لیجئے مزاج یا رہم تو نہیں۔۔۔؟“

ہر کسی نے اپنے اپنے انداز میں اس برطرز کیا تھا۔ وہاں کی گھوریوں نے اکثریت کو خاموش تو کروا دیا تھا مگر وہ کچھ مزید چپ ہو گیا تھا۔ بچپن کے اندوہناک حادثات نے اس کی شخصیت میں نجانے کیسے خلا پیدا کر دیے تھے کہ جو بھرنے میں ہی نہ آتے تھے۔

پہلے ماں کی تکلیف دہ بیماری کے بعد موت پھر باپ کی دوسری شادی اور پھر اس کی موت، رشتہ دار یاں، ہمدردیاں، ترحم بھری نظریں، مصنوعی دلا سے، جھوٹی تسلیاں وہ سب سے چھپ کر اندر ہی اندر سمٹتا چلا گیا۔

اور اب بھی کبھی اس کا دل چاہتا تھا وہ بھی عام لوگوں میں گھل مل کر بیٹھے، چھوٹی چھوٹی بے نیکی باتوں پر بے ہنگم تہققے لگائے۔ چچے دھاڑے بھی خوش ہو، تو اچھل اچھل کر اپنی خوشی کا بے ساختہ اظہار کرے، کبھی ناراض ہو تو واضح طور پر دکھائی دے مگر ایسا بھی نہیں ہوا تھا، خوش ہو یا غم غصہ، پریشانی تھکان ہو یا کام کرنے کی دھن۔

وہ ہر کیفیت میں بس ایک سا ہی دکھائی دیتا تھا۔

الجھا الجھا، کھویا کھویا، گم صم۔

جذبات اس کے اندر سر پیچھے رہتے کسی ڈوبتے مسافر کی طرح جو باوجود کوشش کے سطح آب پر نہ ابھر سکتا ہو۔

دل کے موسم بدلتے رہتے مگر چہرے کے بھلے سے نقوش میں بس ایک ہی کیفیت سمائی رہتی تھی، وہی اکتا ہٹ بھری بے زاری جسے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ اس دنیا سے، اس کے لوگوں سے، اس کے شب و روز اور صبح و شام کے دھندوں سے بچ کر کہیں دور بھاگ جانا چاہتا ہو مگر اس کے باوجود وہ ہر کام کرتا ہوا نظر آتا۔ ہر وہ کام جو اس گھر میں کوئی دوسرا فراموش نہیں کرتا تھا، وہ نوروز کو کرنا پڑتا تھا اور وہ کیا کرتا تھا۔

بغیر کسی جھجک کے، بغیر ہچکچاہٹ کے، کسی روباوٹ کی طرح۔

اور کبھی کبھی سویرا بہت حیرت سے اس سے پوچھا کرتی تھی۔

”نوروز بھائی! آپ تھکتے نہیں؟“ اور وہ ایک خاموش سی نگاہ اس پر ڈال کر بغیر کوئی جواب دیے پھر سے کسی کام میں مشغول ہو جاتا تھا۔

اور خود اسے کئی بار اپنا آپ ایک ایسے کلیشہ کی مانند لگا کرتا تھا جس پر سورج کی شعاعیں اپنی

تمازت نمازت کے ساتھ حملہ آور ہوئی ہوں۔ اندر سے سب پانی بن کر بہہ نکلا ہو، مگر بظاہر کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی ہو۔

یا پھر وہ زمین کا ایک ایسا بخر نکلا بن چکا تھا جس پر تمام موسم بہت شدتوں کے ساتھ وارد ہوئے ہوں مگر اس کی سطح پر کوئی پھول اگا ہونہ کسی کو نیل نے سر اٹھایا ہو۔ بس سچی کسی تہ میں کوئی سبزہ سا پھوٹ نکلا ہونہ کسی ہر روپ میں اس کی روح پر برسی تھی مگر اس کے منہ پر ہرے ہوئے اعصاب پر اثر انداز نہ ہو سکی تھی۔

وہ خوش ہوتا تھا مگر مسکراہٹ اس کے لبوں پر نہ پھیلتی تھی، اس کا دل دکھ سے بھر جاتا مگر آنکھ آنسوؤں سے نا آشنا رہتی، ابھی بہت غصہ آتا تو ماتھے پہ چند ایک تپوں کا اضافہ ہو جاتا اور بس، وہ اپنے تاثرات کے اظہار اور اپنی کیفیتوں کے بیان کے سلسلے میں خود کو فطری طور پر بے بس محسوس کرتا تھا۔

وہ سب کی سنتا تھا مگر اپنی کہنا اس کے لیے بے حد دشوار تھا۔
اور وہاب کی شادی میں اس پر طنز کرنے والے اس کی گہری خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے خود بخود چپ کر گئے تھے۔

☆☆☆

بارات کی واپسی کا وقت سات بجے کا تھا۔ مگر وہ لوگ نو، ساڑھے نو بجے گھر پہنچے تھے۔ دلہن کی آمد پر سب لوگوں میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ نجائے کون کون سی رسمیں ادا کی جا رہی تھیں۔ وہاب اپنے گزرنے میں پھنسا بیٹھا تھا۔ خوب ہنسی مذاق ہو رہا تھا پورے دن کی بھاگ دوڑ کے بعد بھی سب لوگ اتنے فریش نظر آ رہے تھے جتنے صبح رو اگی سے نکل تھے۔ ان ہنستے کھلکھلاتے لوگوں کے درمیان اسے اپنا وجود بہت بے معنی سا لگ رہا تھا۔ سو وہ اٹھ کر باہر لان میں چلا آیا، یہاں مرد حیفیات کر سیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ ان لوگوں کا کافی الحال سونے کا کوئی ارادہ نہیں لگ رہا تھا۔ جبکہ اس کا ٹھن، نیند اور بھوک کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔

کل رات بھی شور اور ہنگامے کے باعث وہ ٹھیک طرح سے سو نہیں پایا تھا۔ سو وہ وہاب کے کسی کزن سے کہتا ہوا باہر نکل آیا تھا۔ اس کا رخ سیدھا اسماعیل پھوپھا کے گھر کی طرف تھا۔ وہ آج کی رات پرسکون اور بھرپور نیند لینا چاہتا تھا تاکہ اگلی صبح ویسے میں شرکت کے بعد واپسی کا سفر اختیار کر سکے۔

اسماعیل پھوپھا کے گھر کے قریب پہنچ کر اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر وقت دیکھا۔ دس بج رہے تھے۔ سرخ دروازوں کے دوسری جانب مکمل خاموشی تھی۔ اس چھوٹے سے آنگن کے کین بہت جلد سو جانے کے عادی تھے۔ چند لمبے تذبذب کے بعد اس نے ڈور بیل پہ تھڑکھ دیا تھا۔ تیسری بیل پر دروازے کے پیچھے قدموں کی آہٹ سنائی دی تھی۔ اس نے جیب میں رکھے کاغذ کو تھپتھا کر اس کی موجودگی کا یقین کیا اور پھر منتظر نگاہیں دروازے پر جمادیں۔

دروازہ کھلنے کے بعد جو شخص سامنے آیا تھا، اس پر گزرتے وقت نے اگرچہ بہت سی نشانیاں

چھوڑ دی تھیں، مگر اس کے باوجود وہ بخوبی انہیں پہچان گیا تھا۔

”کون ہو میاں؟“ انہوں نے بغور اسے دیکھتے ہوئے خمار آلود لہجے میں استفسار کیا تھا۔ اس نے تعارف کروانے کے بجائے تائیا ابا کا دیا ہوا خط ان کی طرف بڑھا دیا تھا وہ خط لے کر چند لمحوں کے لیے دروازے کے پیچھے غائب ہو گئے تھے اور جب واپس پلٹے تو ان کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ ”نوروز میاں! حد کرتے ہو تم بھی۔ دن کی روشنی میں کیوں نہ آئے؟ اب تو میں تمہیں ٹھیک طرح سے دکھ بھی نہیں پارہا۔“ انہوں نے بازو سے پکڑ کر اسے اندر کھینچا اور تاریکی سے نکال کر ایک دم روشنی میں لا کھڑا کیا تھا۔

”ماشاء اللہ، بہت بڑے ہو گئے ہو مگر میں تمہارے بچپن کی شبیہ ابھی بھی تم میں دیکھ رہا ہوں۔“ انہوں نے بغور اسے دیکھا تو وہ جھینپ سا گیا تھا۔ پھوپھا جان اسے لیے کمرے میں چلے آئے تھے۔ صحن کے عین وسط میں دو چار پائیاں پھینکی تھیں۔ ایک چار پائی خالی تھی دوسری پر چادر میں لپیٹا وجود خواب تھا۔ وہ نظریں جھکائے قریب سے گزر گیا۔ پھوپھا جان اسے کمرے میں بٹھا کر خود باہر نکل گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئے۔

”نوروز بیٹا! کھانا تو کھاؤ گے نا۔۔۔؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی نہیں۔ کھا کر آیا ہوں۔“ وہ جی ہاں کہتے کہتے نجائے کیوں جھجک سا گیا تھا حالانکہ حقیقت تو یہ تھی کہ آج دوپہر میں اس نے چائے کا کپ اور ایک آدھ بیٹر لے کر ہی کام چلایا تھا اور ڈنر کی نوبت ابھی تک آئی ہی نہیں تھی۔

”اچھا، اچھا نایاب بیٹی! چائے بنا لو۔ چائے تو بیو گے نا۔۔۔؟“ انہوں نے پہلی بار آواز لگائی پھر خوش دلی سے اس سے مخاطب ہوئے۔

وہ بس ہلکا سا مسکرا کر رہ گیا تھا۔ پھر کچھ دیر یونہی باتوں کا دور چلا پھوپھا جان اس سے ایک ایک کے متعلق پوچھتے رہے۔

”پھوپھا جان! آپ بہت بوڑھے ہو گئے ہیں۔“ اس نے اچانک کہا تو وہ ذرا سا چونکے تھے اور پھر مسکرا دیے تھے۔

”تم بھی تو جوان ہو گئے ہو میاں۔“ انہوں نے جیسے گزرے ہوئے وقت کا احساس دلانا چاہا تھا۔ ”وقت کی چاب سنائی نہیں دیتی بیٹا! دے پاؤں گزرتا ہے۔ ہم کو احساس ہی نہیں ہو پاتا اور جب ہوتا ہے تو ہی معلوم پڑتا ہے کہ ہم تو اپنے پیچھے کئی زمانے چھوڑ آئے اور میں تو اسی دن بوڑھا ہو گیا تھا جس دن تمہاری پھوپھو مجھے تنہا چھوڑ گئی تھی۔“ ان کے ناتواں سے لہجے میں ہلکی سی اداسی در آئی تھی۔

”ان کے بغیر زندگی جتنا کچھ اتنا آسان نہیں تھا بیٹا۔“

ان کی افسردگی کو محسوس کرتے ہوئے خود اس کا دل بھی بھر آیا تھا۔ نجائے کتنے لمبے چپ کی قید میں پھڑپھڑاتے ہوئے گزر گئے۔ پھوپھا جان کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ چونکے تو اس وقت جب کہیں قریب ہی برتنوں کی کھنک سنائی دی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا وہ دروازے میں ہی کھڑی تھی۔ اس کی جھجک کو محسوس کر کے وہ غیر ارادی طور پر نظریں اپنے ہاتھوں پہ جما گیا تھا۔

”آ جاؤ نایاب!“ پھوپھا جان نے پکارا تو وہ اندر چلی آئی۔

”یہ تمہارے جہانگیر ماموں کا بیٹا ہے۔“ انہوں نے غالباً تعارف کروانا چاہا تھا۔
 ”جی ہاں، آپ مجھے بتا چکے ہیں ابا۔“ اس کے قدرے لاپرواہ انداز پر پھوپھا جان ذرا
 مسکرا دیے تھے۔

”یہ نایاب ہے۔ کافی چھوٹی تھی جب تم نے اسے دیکھا، کیوں نوروز؟“
 ”جی، جی بالکل۔“ اس نے ذرا کی ذرا اس کی طرف دیکھا اور پھر اپنی طرف بڑھا چائے کا
 کپ تھام لیا۔

”نایاب! نوروز کے لیے صحن میں ہی بستر لگا دو۔“
 ”جی۔“ وہ سستے سے لہجے میں کہتی باہر نکل گئی۔ اسے شاید نیند سے اٹھنا اچھا نہیں لگا تھا،
 اسی لیے پورے صحن میں سڑپٹ پھر رہی تھی۔ وہ شرمندہ سا ہو کر رہ گیا۔

”میرا خیال ہے، مجھے صبح آنا چاہیے تھا۔“
 ”نہیں۔۔۔ کیوں؟ ارے بھئی، تمہارا اپنا گھر ہے، اچھا یہ دینی بڑے لو، شام کو بنائے تھے۔“
 انہوں نے پر خلوص انداز میں اصرار کیا اور یوں آدھی رات تک وہ دینی بڑے لمبکت اور چائے
 کے ساتھ پیٹ پوجا کرنے کے بعد باتوں میں مصروف رہا۔ آخر پھوپھا جان کو ہی خیال آیا تو وہ اٹھ
 کھڑے ہوئے ان کے برابر چار پائی پہ لیٹتے ہوئے اسے بے تحاشا ٹھکن کا احساس ہوا تھا اور اسی
 ٹھکن کے زیر اثر بہت جلد وہ گہری نیند میں تھا۔

اور پھر رات کا نجانے کون سا پہر تھا جب کسی نے اسے بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ اس
 قدر مدہوش تھا کہ چند لمحے یہ سب اسے محض ایک خواب سا محسوس ہو رہا تھا۔ مگر پھر یک دم ہی حواس
 بے دار ہوئے۔ اس نے پٹ سے آنکھیں کھولیں اور اس کے اوپر جھکا سایا اس سے کئی قدم دور ہٹ
 گیا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہو بیٹھا۔ سامنے کھڑی لڑکی اس سے نجانے کیا کہہ رہی تھی۔ چند ثانیے کے
 لیے اس کا ذہن سمجھ ہی نہ پایا کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟ سامنے کھڑی لڑکی کون ہے؟

مگر پھر ایک جھماکا سا ہوا۔ اسے خیال آیا، وہ رات پھوپھا جان کے گھر آیا تھا۔
 ”جلدی سیجیے نا، آپ اٹھ کیوں نہیں رہے؟ دیکھیے، ابا جان کو کیا ہو گیا ہے؟“ وہ متوحش سی
 کھڑی تھی۔

”کیا ہوا؟ کہاں ہیں پھوپھا جان؟“ وہ بکلی کی سی تیزی سے چار پائی سے نیچے اتر آیا تھا اور پھر
 یونہی ننگے پاؤں ڈگ بھرتا اس کے ساتھ کمرے تک چلا آیا تھا۔ جہاں پھوپھا جان سینے پہ ہاتھ رکھے
 درد کی شدت سے بے حال ہوئے پڑے تھے۔

”ارے پھوپھا جان! کیا ہوا؟“ اس نے فوراً انہیں کندھوں سے پکڑ کر سیدھا کرنے کی کوشش
 کی مگر وہ نڈھال ہوتے ہوئے بار بار گود میں رکھے نیچے پہ جھکے جا رہے تھے۔

”پہلے تو معمولی سا درد ہو رہا تھا جب ابا نے مجھے جگایا۔ میں نے پانی پلایا، چائے بنا کر دی
 مگر۔۔۔“ نایاب جیسے رونے کوئی، چائے کا کپ جوں کا توں بھرا ہوا میز پہ پڑا تھا۔ وہ دونوں نجانے
 کب سے جاگ رہے تھے اور اسے خبر ہی نہ ہو سکی، وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہونے لگا۔
 ”کیا پہلے بھی ایسا ہوا کبھی۔۔۔؟“

”نہیں۔ پہلے تو کبھی نہیں ہوا۔ ہے نا ابا جان؟“ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے فوراً پھوپھا جان
 سے تصدیق کروانے لگی۔

”آپس پاس کوئی ڈاکٹر؟“ پھوپھا جان کی بگڑتی حالت کے پیش نظر وہ خاصا پریشان ہو گیا تھا۔
 ظاہری حالت صاف صاف ہارٹ ایک کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

”نہیں۔ بس ایک کلینک ہے مگر وہ تو رات نو بجے کے بعد بند ہوتا ہے۔ آپ ایسا کریں،
 ہمسائے سے احسان انگل کو بلا دیں، پلینز جلدی کریں۔“ وہ پھوپھا جان کا ہاتھ پکڑنے بیٹھی تھی۔

نوروز فوراً باہر کو لپکا۔ کوئی پانچویں گھنٹی پر احسان صاحب خاصے خوفناک تیوروں کے ساتھ
 باہر آئے مگر صورت حال سننے ہی اس کے ساتھ بھاگے چلے آئے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی نایاب کی
 چیخ و پکار نے اس کے پاؤں کی مٹی چھڑا دی تھی۔ غلت میں کمرے تک پہنچتے پہنچتے وہ نجانے کن کن
 چیزوں سے ٹکراتا آیا تھا۔ پھوپھا جان چار پائی پہ آڑے تر جھکے انداز میں پڑے تھے، اور نایاب نے
 رو رو کر اپنی حالت خراب کر لی تھی۔ وہ دم بخود سے انداز میں اپنی جگہ کھڑا رہ گیا تھا۔ یوں لگا ماضی کا
 کوئی بے رحم لمحہ نکل کر سامنے آ کھڑا ہوا ہے۔

”ارے یہ صرف بے ہوش ہیں، نایاب بیٹی! سنبھالو خود کو۔۔۔“ احسان صاحب پھوپھا جان
 کی نبض پر ہاتھ رکھے کہہ رہے تھے۔ نایاب بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگی۔

”آپہیں ہاسپٹل لے جانا ہوگا، میں گاڑی نکالتا ہوں۔“ احسان صاحب اس کے قریب سے
 گزرتے چلے گئے تب اس کی ساکت وجود میں جنبش ہوئی۔ وہ آگے بڑھا۔ نایاب باپ کا ہاتھ دیوانہ
 وار چومتے ہوئے ابھی بھی روئے چلی جا رہی تھی۔ اس نے پھوپھا جان کو سیدھا کر کے لٹایا اور جب
 تک احسان صاحب نے گاڑی نکالی۔ وہ نایاب کی مدد سے انہیں باہر لے آیا تھا۔ پچھلی سیٹ پر انہیں
 لٹا کر وہ باہر نکلا تو نایاب ساتھ جانے کو تیار کھڑی تھی۔

”اس وقت آپ کا جانا مناسب نہیں۔ یوں بھی گھر کھلا پڑا ہے۔ ہمسائے سے کسی خاتون کو بلا
 لیجیے۔ ہم ابھی واپس آ جائیں گے۔“

”مگر۔“ نایاب نڑب کر اس کے پیچھے بھاگی مگر وہ گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ احسان صاحب نے
 گاڑی اشارت کی اور پھر آگے ہی آگے بڑھاتے چلے گئے۔ وہ کم صیم سی اندھیرے میں کھڑی رہی اور
 جب گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی، تب وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

وہ ڈاکٹر سے مل کر واپس آیا تو احسان صاحب گردن کندھے پر گر گئے اور گھڑے تھے۔ اس
 کے پکارنے پر ہڑبڑا کر سیدھا ہو بیٹھے۔

”کیا کہا ڈاکٹر نے۔۔۔؟“
 ”وہی ہارٹ ایک، خاصا شدید تھا مگر اللہ کا شکر، جان بچ گئی۔“ وہ ان کے قریب بیٹھ
 گیا۔ پھوپھا جان کو آئی سی یو میں رکھا گیا تھا۔ وہ بس انہیں دور سے ہی دیکھ سکا تھا۔

احسان صاحب اس سے مکمل تعارف حاصل کرنے لگے تھے۔ وہ خاصے بھلے انسان تھے۔
 آتے ہوئے عقل مندی کی کہ اپنے ساتھ کچھ رقم لیتے آئے۔ مختلف ٹیسٹوں سے لے کر ادویات اور
 فیس جمع کرانے کے لیے ابھی تک وہی رقم کام آ رہی تھی۔ پھر وہ لوگ نہ جانے کتنی دیر تک یوں ہی بیٹھے

رہے۔ رات کی سیاہی صبح کے اچالے میں بدلتی چلی گئی۔ رات کی تھکے تھکے چہروں والی نرسیں اور وارڈ بوائے نظر نہیں آ رہے تھے۔ ان کی جگہ فریش چہروں نے لے لی تھی۔ ہاسپٹل کی صفائی ستھرائی ہونے لگی۔ فنائل کی ناگوار مہک پورے ماحول پر حاوی ہو گئی تھی۔ نقاہت زدہ، بیمار لوگ امید و بیم کی کیفیت میں ہر آنے والے ڈاکٹر کا ہاتھ تھام لیتے تھے اور سستے سستے چہروں والے ان کے لواحقین پر ہیزی کھانوں کا بندوبست کر رہے تھے۔

چائے ناشتے کا دور چل نکلا تو احسان صاحب بصد اصرار اسے اپنے ساتھ لے کر ایک چھوٹے سے ہوٹل پہ آ گئے تھے۔ مگر ہاسپٹل کے ماحول نے طبیعت پر ایسا برا اثر ڈالا تھا کہ وہ بمشکل چائے کا کپ ہی پی سکا تھا۔ وہاں سے فارغ ہوئے تو احسان صاحب نے واپسی کا ارادہ کر لیا جانے سے پہلے اسے ڈھیر ساری تسلیوں کے ساتھ ایک چٹ پر اپنا فون نمبر لکھ کر دے گئے تھے۔

”جب بھی ضرورت پڑے فوراً فون کر دینا۔ میں گھر پہ ہوں نہ ہوں میرا بیٹا وہیں ہوگا فوراً چلا آئے گا۔ میں جا کر نایاب بیٹی کو تسلی دیتا ہوں بہت فکر مند ہوگی۔“ احسان صاحب چلے گئے اور وہ ہاسپٹل کی سرد پواروں سے ٹیک لگائے اس تمام صورت حال پر غور کرتا رہا۔

شام کو احسان صاحب دوبارہ چلے آئے۔ وہ آفس سے سیدھے ادھر ہی آ گئے تھے۔ ”ناياب صبح ہاسپٹل آنے کی ضد کر رہی تھی۔ میں نے شام کا کہہ کر ٹال دیا تھا۔ فی الحال وہ ان سے مل بھی نہیں سکتی۔ خواہ مخواہ باپ کو اس حال میں دیکھ کر خود کو ہلکان کرتی رہتی ٹھیک کیا نایاب نے؟“ انہوں نے رائے لینی چاہی تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

رات وہیں ہاسپٹل میں ہی گزری اور جیسی گزری تھی بس وہی جانتا تھا۔ کراہتے سکتے مریضوں کو دیکھ کر اس کا دل ہوتا رہا۔ ادویات کی ناگوار بو سے جی اٹھنے لگا۔ صبح ہوئی تو بے آرامی اور نیند کی کمی کی وجہ سے اسے اپنا سر جھکاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ نرس سے سر درد کی دو گولیاں لے کر وہ ہاسپٹل سے یوں بھاگا تھا جیسے کسی قیدی کو بمشکل رہائی ملی ہو۔ ہوٹل سے آدھی ڈبل روٹی کھانے کے بعد اس نے وہ گولیاں چائے کے ساتھ نگلیں اور منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار کر خود کو ذہنی طور پر پُر سکون کرتا ہوا ہاسپٹل واپس آیا تو وہاں اپنے ایک کزن کے ساتھ اس کا منتظر تھا۔ حسب توقع وہ اسے دیکھتے ہی گلے کرنے لگا تھا۔

”یار! تم سے اس قدر بے گانگی کی توقع نہیں تھی۔ کم از کم ایک فون ہی کر دیتے، انسان کو ہزار قسم کی ضرورتیں پڑتی ہیں ایسے موقوف پر، میں نہ سہی میرا کوئی دوست ہی ادھر تمہارے پاس رک جاتا۔ بہر حال اب بتاؤ، انگل کی طبیعت کیسی ہے؟“

”خطرے سے باہر ہیں، جلد ہی وارڈ میں شفٹ کر دیں گے۔“ اس نے مختصر آیتا یا۔

”ٹھیک ہے، ابھی ہیں ہم لوگ ادھر، تم گھر جاؤ اور ذرا اپنا حلیہ ٹھیک ٹھاک کر لو۔ کچھ دیر آرام۔“

”نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم کہو ویسے کی تقریب کیسی رہی؟“ نوروز نے دانستہ اس کا دھیان اپنی طرف سے ہٹایا۔

”بہت اچھی۔ گھر ابھی بھی مہمانوں سے بھرا پڑا ہے۔ آج سسرال میں دعوت ہے۔“

”اوہ پھر تو بڑی شدت سے تمہارا انتظار ہو رہا ہوگا۔ ایسا ہے کہ ابھی تو احسان صاحب آ جائیں گے۔ اس لیے تم لوگ آرام سے گھر جاؤ۔ ضرورت پڑی تو میں تمہیں بلوا لوں گا۔“

”شیور۔“ وہاب کو غالباً خود بھی جانے کی جلدی تھی۔

”ہاں، ہاں۔“ نوروز نے اطمینان دلایا تو وہ جلد ہی روانہ ہو گیا۔ وہ غیر شعوری طور پر احسان صاحب کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ نہ آئے اس دوران وہ کئی بار ڈاکٹر سے مل کر پھو بھیا جان کی خیریت کی اطلاع لیتا رہا ایک بار انہیں دیکھنے کی اجازت بھی مل گئی تھی۔ وہ چند لمحے انہیں دیکھتا رہا۔ ان کی رنگت کافی زرد ہو گئی تھی اور نقاہت بے ہوشی کے عالم میں بھی چہرے سے عیاں تھی۔ شام کو احسان صاحب آئے۔ صبح نہ آنے پر معذرت کی اور پھر اسے زبردستی گھر بھجوا دیا۔

”میں آج رات ادھر رکتا ہوں۔ تم اطمینان سے صبح چلے آنا۔“

انہوں نے اپنائیت کا مظاہرہ کیا۔ وہ نیکی کے ذریعے گھر پہنچا تو نایاب اس وقت گھر میں اکیلی تھی۔ اسے دیکھتے ہی پھٹ پڑی تھی۔

”کیا سمجھ رکھا ہے آپ نے اپنے آپ کو۔ کل سے میری جان عذاب میں ہے اور آپ میں سے کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ مجھے میرے باپ کے پاس لے جائیں۔ میں ان کی بیٹی ہوں، اتنا حق تو رکھتی ہوں نا کہ جا کر ان کی تیمارداری کر سکوں، دیکھ سکوں کہ وہ کس حال میں ہیں، ایک ایک گھڑی جس طرح میں نے کل سے گزاری ہے، وہ صرف میں ہی جانتی ہوں اور آپ لوگ اتنے بے حس ہیں کہ دوسروں کے احساسات و جذبات کی کوئی پروا ہی نہیں۔ ان کی حالت ٹھیک ہے یا بگڑ رہی ہے۔ میں ہر حال میں ان کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔ میرا دل کٹنے لگتا ہے یہ سوچ کر کہ وہ آنکھیں کھولتے ہوں گے تو میں ان کے سامنے موجود نہیں ہوں گی۔ وہ کچھ کہیں گے اور میں سن نہیں پاؤں گی، وہ اتنی دیر تک کبھی مجھ سے دور نہیں رہے، کبھی بھی نہیں۔“

وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ نوروز بیچ بچھن میں کھڑا چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔

”اگر ساتھ لے جاتا تو مخترمہ وہاں بھی یہ کچھ کر میں۔“ اس کی اس قدر جذباتیت پر وہ چڑسا گیا تھا۔ دل ہی دل میں سوچا مگر جب بولا تو لہجہ نرمی لیے ہوئے تھا۔

”آپ زیادہ فکر مند نہ ہوں، وہ ٹھیک ہیں۔ صبح میں آپ کو لے چلوں گا۔“ الفاظ کے معاملے میں وہ ہمیشہ سے کجوس تھا۔ اب بھی ساری تسلی اس کے لمحے میں تھی۔

”صبح۔۔۔؟“ اس نے روتے روتے سراٹھایا۔ ”آپ کا دماغ تو ٹھیک ہے، آپ کا خیال میں صبح تک انتظار کر لوں گی، کبھی نہیں اگر آپ نے نہیں جانا تو میں خود چلی جاؤں گی۔ حد ہوئی ہے کسی چیز کی۔ ایک وہ احسان انگل ہیں۔“

وہ احسان انگل کو کہنے لگی تھی۔ اس نے ایک نظر اس پر ڈالی پھر تار پلکتا تولیہ کھینچ کر ہاتھ روم میں گھس گیا۔ نہادھو کر باہر نکلا تو وہ کھنٹوں میں منہ دیے بیٹھی تھی۔ وہ اسے نظر انداز کرتا ہوا کچن میں چلا آیا نایاب نے اس کے قدموں کی آواز سنیں نہیں یا پھر سن کر بھی انجان بنی بیٹھی رہی تھی۔ وہ مختلف پتیلیوں کے ڈھکن اٹھا کر دیکھتا رہا۔ سب کی سب خالی، دھلی دھلائی۔

”کیا چاہیے؟“ وہ عقب میں آ کر روٹھے روٹھے سے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

”کچھ نہیں۔“ وہ جان چکا تھا۔ اس نے کھانا تیار نہیں کیا۔ اس لیے خوانخواہ اسے تنگ کرنا مناسب نہیں سمجھا، یونہی جا کر کمرے میں لیٹ گیا۔ بازار سے کھانا لانے کی اس نے خود میں ہمت نہیں پائی تھی۔ کئی دنوں کی بے آرامی کے بعد پرسکون سے ماحول میں لیٹا تو آنکھیں خود بخود بند ہونے لگی تھیں۔

نیند کے معاملے میں یوں بھی بہت کچا تھا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد نایاب کمرے میں آئی تو وہ گہری نیند میں تھا۔ وہ کچھ دیر تذبذب کے عالم میں کھڑی رہی پھر جگائے بغیر باہر نکل گئی۔ چند منٹ یونہی پورے صحن میں جھپکتی رہی مگر دل کو قرار کہاں۔۔۔؟

آسمان کے کنارے سیاہ پڑنے لگے۔ آجنگن میں ہلکی ہلکی تاریکی اتر آئی۔ تب وہ مجبوراً ایک بار پھر اس کے سر پہ آکھڑی ہوئی۔ کئی آدائیں دینے کے بعد بھی اس پر کوئی اثر نہ ہوا تو وہ کافی سمجھکتے ہوئے اس کا بازو ہلانے لگی۔ تب اس نے سمسما تے ہوئے ذرا سی آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور پھر غائب دماغی سے دیکھتا چلا گیا۔

”وہ۔۔۔ اٹھ جائیے۔۔۔ رات ہو رہی ہے۔“

وہ جزبزی ہو کر بولی۔

تب وہ ہلکا سا چونکا اور ست سے انداز میں اٹھ بیٹھا۔ نایاب ٹرے میں کھانا لگا کر لے آئی، تب بھی کسل مندی سے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں بالوں میں پھنسائے بیٹھا تھا۔ اس نے ہلکے سے کھٹکے کے ساتھ ٹرے میز پر رکھی۔ وہ سر اٹھا کر وال کلاک پر وقت دیکھنے لگا۔ سات بجنے میں بس کچھ ہی منٹ باقی تھے۔ گویا وہ دو گھنٹے سوتا رہا تھا۔ اس مختصر مگر بھرپور نیند نے اس کے اعصاب کو کافی پرسکون کر دیا تھا۔

انگلیوں سے بال سنوارتا وہ باہر چلا آیا۔ نایاب چپ چاپ کچن میں بیٹھی تھی۔ کسی گہری سوچ میں غلطاً۔

”آپ کھانا کھالیں پھر چلتے ہیں ہاسپٹل۔“ نوروز نے گھڑی بھر کے لیے کچن کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا اور پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر ٹل کے پاس آ کر آنکھوں پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ اس کے کھانا کھانے تک نایاب یونہی کچن سے صحن تک چکرانی رہی۔ وہ کھانا کھا کر اٹھا تو نایاب نے لپک کر اپنی چادر اٹھائی مگر وہ دو منٹ رکے کا کہہ کر باہر نکل گیا۔

واپس آیا تو اس کا سفری بیگ اس کے ہاتھ میں تھا۔ جس میں سے شلواری قمیص نکال کر وہ ہاتھ روم میں گھس گیا تھا۔ خدا خدا کر کے اس نے نایاب کو چلنے کا اشارہ کیا تو وہ طویل سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہاسپٹل میں احسان صاحب انہیں دیکھ کر کافی حیران ہوئے تھے۔ ان کا ارادہ رات ادھر ہی رکنے کا تھا مگر اس نے شکریہ کے ساتھ انہیں گھر لوٹا دیا ان کی اتنی مدد ہی اسے بہت محسوس ہوئی تھی۔

نایاب احسان صاحب کے اصرار کے باوجود واپس جانے پر تیار نہیں ہوئی تھی او وہ رات اس نے جاگ کر اور روتے ہوئے نگرانی بھی حتیٰ کہ نوروز اس کی ان مسلسل سکیوں سے چڑتا اس سے کچھ فاصلے پر ٹہلتا رہا تھا اگلے صبح پھوپھا جان کو وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ نایاب نے انہیں دیکھ کر جو

بچوں کی طرح روناشروع کیا تو پھر ڈاکٹر اور نرسوں کی ڈانٹ سننے کے بعد ہی چپ ہوئی تھی۔

☆☆☆

پھوپھا جان پہلے سے کافی بہتر تھے۔ مگر ان کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ واپسی کا ارادہ کرتا سو تمام صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے تایا ابا کو فون کھڑکا دیا تھا۔ انہوں نے اسے وہیں رکنے کی تاکید کی اور پھر پہلی فرصت میں خود بھی وہاں چلے آئے۔

پھوپھا جان کو ان کی آمد سے ایک روز قبل ہی گھر شفٹ کیا تھا۔ جس وقت وہ گھر میں داخل ہوئے نوروز انہیں سہارا دے کر صحن میں چہل قدمی کروا رہا تھا۔ تایا ابا بہت بے قراری سے ان سے ملے تھے۔ نجائے کیوں پھوپھا جان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

”بھائی میاں کہتے تھے۔ سمجھتے نہیں تھے ورنہ بہن کے رخصت ہو جانے کے بعد یوں ہم سے منہ موڑتے۔“ انہوں نے شکوہ کیا تھا۔

”کئی بار دل چاہا ملنے کو، دیکھنے کو مگر فرصت نصیب کہاں؟“ وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے تھے۔ نایاب چائے بنانے چلی گئی۔ نوروز دوائیاں لانے کے لیے باہر نکل گیا۔

”دیہاتی لوگ تھے، شہر میں نئے نئے آکر رہے تھے۔ مگر دُریب کی دنیا میں جینے کا ڈھنگ نہیں آتا تھا۔ اس ہنر کو سیکھتے سیکھتے خود کو بھی بھلائے بیٹھے تھے۔ قدم ہمانے کو زمین مل گئی تھی، مقام نہیں ملتا تھا۔ آج اپنا آپ کھو کر نام کمایا ہے۔ ایسے میں بہت کچھ چھین گیا۔ دوست احباب۔ رشتے دار، ان کے ساتھ بیٹے ہوئے وقت کی یادیں تک چھین گئیں ہاں اب وقت ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے تو زیاں کا احساس ہونے لگا ہے۔ جیسی تو بھاگا چلا آیا ہوں اپنی تمام کوتاہیوں کی معافی مانگنے۔“ تایا ابا کے ہونٹوں پر مجروح سی مسکراہٹ تھی۔

”شرمندہ مت کرو، یہ بتاؤ بچے کیا کرتے ہیں؟ اب تو ماشاء اللہ تمہارا بوجھ بانٹ رہے ہوں گے۔“ پھوپھا جان نے پوچھا تھا۔

”ہاں اللہ انہیں زندگی دے۔ سب ہی بہت نیک اور سعادت مند ہیں۔ سب سے بڑے سلیمان کی تو تعلیم سے فارغ ہوتے ہی شادی کر دی تھی دو بچوں کے بعد بہو اس دنیا سے چل بسی۔ وہ ایسا بھاگا یہاں سے کہ پاٹ کر نہیں دیکھا امریکہ میں ہوتا ہے۔ بچے دونوں یہیں ہیں، فون پر باپ سے بات کرتے ہیں تو واپسی پر زور دیتے ہیں اور مجھے لگتا ہے، وہ ان کی پکار پر ایک نہ ایک دن لوٹ ہی آئے گا۔ اس سے چھوٹا ارسلان ہے تمہاری بھابھی اپنی بھانجی نیلوفر کو بیاہ کر لائی ہیں اس کے لیے، ایک بیٹا ہے ان دونوں کا پھر سدرہ ہے اس کی منگنی کی بات چیت چل رہی ہے۔ اس سے چھوٹا انظر اور نوروز پھر سویرا۔“

تایا ابا دھیرے دھیرے سب کے بارے میں بتاتے رہے۔ نوروز کے نام پر پھوپھا جان کی آنکھیں چمک سی گئی تھیں۔

”نوروز بہت اچھا انسان ہے۔ اگر اس روز یہ نہ ہوتا تو۔“ پھوپھا جان جھرجھری سی لے کر رہے

اگلی صبح بتایا ابانے واپس جانے کا ارادہ کر لیا۔ جانے سے پہلے وہ کچھ دیر کے لیے پھوپھا جان کے کمرے میں گھسے رہے۔ نجانے کیا کیا باتیں ہوئیں، نوروز نے بس اتنا دیکھا کہ پھوپھا جان کے چہرے پر مسرتوں کا آبشار سا پھوٹا ہوا ہے۔ اس سے پہلے اتنا خوش اور مطمئن انہوں نے کسی لمحے نہیں دیکھا تھا وہ بار بار بتایا ابانے کا ہاتھ تمام کرمونیت کا اظہار کر رہے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے مارے خوشی کے ابھی رو دیں گے۔ کافی دیر بعد بتایا ابانے کمرے سے باہر نکلے، نایاب کو خوب پیار کیا۔ جاتے ہوئے زبردستی کچھ پیسے اس کے ہاتھ میں تھمائے۔

”اب تم میری بیٹی بن گئی ہو۔“ لہجہ حد درجہ معنی خیز تھا۔ نوروز نے توجہ نہیں دی۔ نایاب چونک پڑی تھی۔ وہ انہیں اسٹیشن تک چھوڑنے کے لیے نکلا تو کچھ دور تک وہ یونہی پیدل ہی چلتے رہے۔ اس نے دیکھا بتایا ابانے سے کچھ کہنے کے لیے بے چین دکھائی دے رہے ہیں مگر کہہ نہیں پارہے وہ ان کی بے چینی کو محسوس کرتا رہا مگر کھوجنا مناسب نہیں سمجھا، یہاں تک کہ وہ لوگ اسٹیشن پہنچ گئے، تب بتایا ابانے نے رک کر گھڑی بھر کے لیے بغور اسے دیکھا۔

وہ پہلے سے کچھ کمزور دکھائی دے رہا تھا۔ ملگجاسا سر مکی سوٹ اور شیونجانے کتنے دنوں سے نہیں بنوائی تھی۔ انہیں بے اختیار ہی اس پر پیار آ گیا۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ یہاں اسے آرام کے لیے بالکل بھی وقت نہیں ملتا۔

”اگر اظفر میں ذرا سا بھی احساس ذمہ داری ہوتا تو میں کل ہی اسے یہاں بھجوادیتا مگر تم تو جانتے ہو، وہ کتنا لا پرواہ ہے۔ بھائی میاں کو ٹھیک کرنے کے بجائے خدا نا خواستہ دوبارہ بیمار کر دے گا۔ انہیں ایک بہت ذمہ دار انسان کی ضرورت ہے جو کہ میرے خیال میں تم سے بڑھ کر کوئی نہیں۔“ بتایا ابانے کے ستائشی انداز نے اسے خواہ مخواہ ادھر ادھر جھانکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ تب ہی انہوں نے بھاری ریم کا لفافہ اس کے ہاتھ میں دیا تھا۔

”یہ کچھ روپے رکھ لو، بھائی میاں کی خوراک کا خاص خیال رکھنا۔ پنشن کے سوا آمدنی کا اور ذریعہ ہی کیا ہے۔ بھائی میاں کو اس لیے نہیں دیے کہ وہ خواہ مخواہ خود کو چھوٹا محسوس کرنے لگتے۔“ اس نے دل ہی دل میں ہزار شکر کرتے ہوئے وہ لفافہ ان کے ہاتھ سے لے لیا تھا کہ گھر کی حالت اس سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ جمع پونجی سے ہاسپٹل کے اخراجات ہی پورے ہوئے تھے۔ کچھ ریم احسان صاحب لگا چکے تھے۔ اس کی جیب میں موجود رقم تو بس ادھر ادھر کے کرایوں میں ہی صرف ہو گئی تھی۔ بتایا ابانے احساس نہ کیا ہوتا تو نجانے مزید کتنی مشکل ہوتی۔ اس نے تشکرانہ نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے لفافہ جیب میں رکھ لیا تھا اور پھر انہیں ٹرین میں سوار کرا کے وہ گھر پلٹا تو گوشت سبزی اور پھلوں سے لدا ہوا تھا۔

”پھوپھا جان کو دو پلاڈا؟“ اس نے سارے شاپرزمیز پر رکھتے ہوئے برتن نایاب سے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ اس کے جواب پر وہ سر ہلاتا ہر نکل آیا۔ پھوپھا جان کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہ غالباً سوراہے تھے۔ نوروز پلٹ کر صحن میں پھوپھی چار پانی پرا لٹینا۔ ایک بازو موڑ کر سر کے نیچے

گئے تھے۔

”ایک لمحے کے لیے تو مجھے یہی لگا تھا کہ میں اب کبھی سانس نہیں لے پاؤں گا مگر نایاب وہ جیسے میری بے ہوشی میں بھی مجھے پکارتی رہی تھی۔ اس کی آواز مجھے دھیرے دھیرے زندگی کی طرف منتقل لاتی تھی اور پھر نوروز کی شب و روز کی خدمت۔۔۔ ان ہی چند دنوں نے مجھے احساس دلایا ہے بختیار کہ لوگ بیٹوں کے لیے دعائیں کیوں مانگتے ہیں، ہاسپٹل میں گزارے بہت کٹھن لمحات میں بھی میرا دل و دماغ اپنی بیٹی کی طرف اٹکا رہا تھا، اس کا کوئی بھائی ہوتا تو کیا تب بھی میں اتنا ہی بے قرار ہوتا؟ ہرگز نہیں۔ اگر میرا کوئی بیٹا ہوتا تو میں بڑے آرام سے مر جاتا۔ یہ سوچ کر کہ میری بیٹی کے سر پر کوئی مضبوط ہاتھ موجود ہے مگر اب۔۔۔ اب تو یہ نایاب مجھے سکون سے مرنے بھی نہیں دے گی۔“ وہ بہت ٹوٹے پھوٹے سے لہجے میں بول رہے تھے۔

”خدا نہ کرے بھائی میاں! آپ کی عمر لمبی ہو، ایسی باتیں آپ جیسے زندہ دل انسان کو قطعاً زیب نہیں دیتیں۔“ بتایا ابانے انہیں تسلی دینی چاہی۔

”تم بہت خوش قسمت ہو بختیار! تم لڑکھڑاکر گرنے بھی لگو تو چار کرٹیل جو ان تمہیں تھانے کے لیے آگے بڑھ آئیں گے۔ خدا جانے اس نے مجھے اس نعمت سے محروم کیوں رکھا؟“

”اس کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصالحت ہوتی ہے بھائی میاں! آپ شکوہ کر کے گناہ گار مت ہوں اور یوں بھی عورت کے تحفظ کے لیے باپ، بھائی کے علاوہ بھی کئی رشتے ہوتے ہیں۔“ بتایا ابانے کی بات پر پھوپھا جان نے قدرے چونک کر انہیں دیکھا تھا۔

”جی ہاں شادی، آپ نایاب کی شادی کر دیجیے۔ شوہر سے بڑھ کر کوئی مضبوط پناہ گاہ اس کے لیے نہیں ہو سکتی۔“

”ہاں مگر۔“ پھوپھا جان کچھ کہنے جا رہے تھے، مگر دروازے سے داخل ہوتی نایاب کو دیکھ کر چپ ہو رہے۔

نایاب چائے رکھ کر باہر نکل گئی تھی۔ بتایا ابانے کوئی بات کہنے کے لیے بھائی میاں کی طرف دیکھا مگر وہ کہیں اور متوجہ تھے۔ ان کی نظروں کے تعاقب میں بتایا ابانے کی نگاہوں نے صحن تک سفر کیا تھا۔ ان کے عین سامنے نوروز اور نایاب کھڑے تھے۔ نوروز دوایاں اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کچھ سمجھا رہا تھا جسے پوری توجہ سے سنتے ہوئے نایاب بار بار اثاثات میں سر ہلا رہی تھی۔ اپنی بات ختم کر کے نوروز دو قدم آگے بڑھا تھا جب نایاب نے اسے پکارا اور کسی چیز کے متعلق پوچھنے لگی۔ اس نے قدرے جھک کر اس کی بات سنی اور پھر مختصر اُچھک کر کمرے کی طرف آنے لگا۔

بتایا ابانے نظروں کا زاویہ بدل کر دیکھا۔ پھوپھا جان کی آنکھوں میں عجب سی حسرت دکھائی دے رہی تھی۔ بتایا ابانے جیسے بہت کچھ سمجھ کر کرسی کی پشت سے ٹپک لگائی تھی اور کسی گہری سوچ میں گم ہو گئے تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے نوروز نے ان دونوں کو اپنی اپنی جگہ خاموش اور سوچ میں ڈوبے دیکھا تو وہ بھی ڈھیلے ڈھالے انداز میں ایک کرسی سنبھال کر بیٹھ گیا۔

رکتے ہوئے وہ آسمان پر نجانے کیا کھوج رہا تھا۔ کچن میں سبزی بناتی نایاب کھڑکی کی جالیوں سے متواتر اسے دیکھتی رہی تھی۔

عام سالباں بننے والا، عام سے خدو خال رکھنے والا یہ عام سا شخص مگر درحقیقت اس کے لیے کتنا خاص۔۔۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

اور پھر ڈیڑھ ماہ بعد جب اس نے واپسی کا قصد کیا تو پھوپھا جان نے بخوشی اسے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ مکمل طور پر رو بہ صحت دکھائی دیتے تھے سوا سے مزید یہاں رکینے کا کوئی جواز نہیں نظر آ رہا تھا اور اس ڈیڑھ ماہ کے عرصے میں اس نے پھوپھا جان کی اتنی خدمت کی تھی کہ اب وہ اسے دعا میں دیتے نہ تھکتے تھے۔

مقررہ وقت پر ڈاکٹر کے پاس لے جانا۔ صبح ہلکی پھلکی داک کروانا، اپنے ہاتھوں سے کھانا۔ غرض اس نے وہ سب کچھ کر لیا تھا ان کے لیے جو ان کا سگایا کر سکتا تھا اور بالآخر وہ ان کی بے تحاشا دعا میں سیٹھ واپس اپنے شہر آن پہنچا تھا۔

☆☆☆

”ارے اب جان چھوڑے اس کی۔ باتیں تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی پہلے بچے کو کچھ کھانی کر آرام تو کر لینے دیں۔“ تائی اماں اس کے بارے میں یونہی فکر مند ہو جایا کرتی تھیں اب تیسرے چوتھے چکر میں بھی تائی اماں کو اس سے باتوں میں محو پایا تو کہے بغیر نہ رہ سکیں تائی اماں نے ان کی بات سن کر چوٹکتے ہوئے وقت دیکھا تو تاسف سے سر ہلا کر رہ گئے۔

”اوہو بھئی، میں نے تو خیال ہی نہیں کیا جاؤ نوروز بیٹا! تم جا کر آرام کرو۔“

”اب کیا آرام کرے گا۔ کھانا بس تیار ہے لڑکیاں میز پر لگا رہی ہیں۔ کھا کر ہی سو جائے گا۔“ تائی اماں نے اسے اٹھنے سے منع کر دیا تھا۔ تب ہی رشانے آ کر کھانا لگنے کی اطلاع دی تو سب اٹھ کر ڈائننگ ٹیبل پر آ گئے جہاں حسب معمول اچھا خاصا شور اور ہنگامہ ہو رہا تھا۔ اظفر یا معیز کی موجودگی میں خاموشی یا سکون کا تصور ہی محال تھا۔

وہ اپنی مخصوص سیٹ سنبھال کر بیٹھ گیا۔ چاولوں پر ایک، دو کباب رکھتے ہوئے اس کی ذہنی رو بھٹک کر پھوپھا جان کے گھر تک جا پہنچی تھی وہاں ایسی کوئی عیاشی ممکن نہیں تھی۔ کھانا کسی بھی وقت کا ہو، سلاؤ، چٹنی یا راستہ جیسے لوازمات سے عاری ہوتا تھا۔ کبھی بہت ہوا تو بیٹھے کے نام پر حلوہ یا سویاں پک جاتی تھیں۔ ورنہ عموماً وال روٹی، سبزی روٹی ہی چلتی تھی۔ دودھ صرف چائے کے لیے آتا تھا۔ ان باپ بیٹی نے محدود آمدنی کے پیش نظر ضروریات بھی بہت محدود کر لی تھیں۔ جبکہ یہاں ڈائننگ ٹیبل پر عام دنوں میں بھی دنیا کی ہر نعمت موجود ہوتی تھی۔ سدرہ اور ایتھ کو کھانا پکانے کا بہت شوق تھا سو آئے دن انہیں نت نئے کھانے کھانے کو ملتے رہتے تھے۔ پھر جوائنٹ ٹیبلی سسٹم تھا۔ ہر ایک کی الگ پسند و ناپسند جس سے منسنے کے لیے سدرہ نے سب کی متفقہ رائے سے ایک ہفتہ وار مینیو کا چارٹ بنا رکھا تھا۔ ایک وقت میں دو تین افراد کی پسند کی ڈشز بنتیں تو ڈائننگ ٹیبل بھر جاتی تھی۔ یہ اہتمام البتہ صرف

رات کے کھانے پر ہی کیا جاتا تھا۔ دوپہر کے وقت اکثریت اپنے آفس، یونیورسٹی یا کالجز سے ہی لُنج لے لیا کرتی تھی، جو بانی رہ جاتے تھے، ان کے لیے فریزر میں محفوظ بچا کھچا کام آ جاتا تھا۔

وہ اپنے ہی خیالوں میں گم تھا جب اظفر نے اس کے کہنی ماری، وہ اس حرکت کے لیے بالکل بھی تیار نہ تھا، سو چچہ ہاتھ سے چھوٹ کر زوردار آواز کے ساتھ پلیٹ میں جا گرا تھا۔ سب کی نظریں بیک وقت اس کی طرف اٹھ گئیں تو وہ جھل سا ہو کر اظفر کو گھورنے لگا جواب نہایت لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کھانے میں منہمک تھا۔ اس نے سر جھٹک کر دوبارہ چچہ اٹھالیا۔

”یار! یہ اپنی سویرا اتنی پیو لگتی تو نہیں مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ اس نے بانیوں کیاب اٹھا کر پلیٹ میں رکھا ہے۔“ اظفر نے غالباً چھٹے کباب کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے سرگوشی کی تھی۔

اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا، سویرا ایک کباب پلیٹ میں رکھے اسے یونہی کانٹے سے گول گول گھما رہی تھی۔ چہرے پر ناراضی کے تاثرات نمایاں تھے۔ وہ ایک بار پھر سوچ میں پڑ گیا کہ سویرا شام کو اس سے کس بات پر ناراض ہوئی تھی۔

”نوروز! کھانا کھا چکے ہو تو جاؤ، جا کر آرام کرو۔“

اس گھر میں اس وقت تک ڈائننگ ٹیبل سے اٹھنے کا رواج نہ تھا جب تک آخری فرد بھی کھانے سے فارغ نہ ہو لے تائی اماں نے اسے ساکت بیٹھے دیکھا تو اس کی بے آرامی کے خیال سے کہہ اٹھیں۔ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے چند گھونٹ پانی پی کر سب سے معذرت کرتا اٹھ کھڑا ہوا۔ سویرا نے اسے اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تو مجھ کر رہ گئی۔

وہ کتنی دیر سے منتظر تھی کہ نوروز اس سے کوئی بات کرے اور وہ فوراً اپنی ناراضی بھلا کر اس کو بتائے کہ اس ڈیڑھ ماہ میں اس نے اسے کتنا مس کیا تھا۔ لیکن نوروز کبھی بھی اس کی امیدوں پر پورا نہیں اترتا تھا۔ آج اس کی اس حرکت نے سویرا کو رات گئے تک افسردہ کیے رکھا تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح وہ اٹھا تو بیسیوں کام تھے جو اس کی غیر حاضری کی وجہ سے رُکے ہوئے تھے۔ بجلی کا بل دو ماہ سے جمع نہیں ہوا تھا۔ ٹیلی فون ایک ہفتے سے ڈیڈ ہوا پڑا تھا اور کسی نے اسے ٹھیک کروانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ سلیمان بھائی کے بیٹے اور عزیزہ کی فیس ابھی تک جمع نہیں کروائی گئی تھی۔ نیلو بھابھی اسے ناشتا دینے کے ساتھ ساتھ کاموں کی فہرست بھی بتاتی چلی گئیں تو ناشتے سے فارغ ہوتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

دوپہر تک شدید خواری کے بعد وہ ان تینوں کاموں کو نمٹا چکا تو گھر جانے کو دل ہی نہیں چاہا، وہ سیدھا خالہ نصرت کی طرف چلا آیا وہ اس کی امی کی خالہ زاد بہن تھیں۔ اپنی محبت اور بے پایاں خلوص کے عظیم الشان مظاہروں سے وہ نوروز کو اپنی طرف اس حد تک مائل کر چکی تھیں کہ وہ اپنے گھر کے سوا کہیں اور جانا پسند کرتا تھا تو وہ واحد خالہ نصرت کا گھر ہی تھا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا، وہ موٹر سائیکل لے کر سیدھا اندر چلا آیا۔ کچن میں مصروف صائمہ نے کھٹکے

کی آواز پر بچن سے نکل کر جھانکا اور پھر خوشگوار حیرت چہرے پر سجائے باہر نکل آئی۔

”نوروز! تم بآئے؟“

”ابھی ابھی، تمہارے سامنے ہی آیا ہوں۔“ وہ اس کے ہشاش بشاش لہجے کو بطور خاص محسوس کرتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

”تم سمجھ نہیں۔ میں نے سنا تھا، تم وہاڑی گئے ہوئے تھے وہاں سے کب واپس آئے؟“ وہ اس کے پیچھے پیچھے کمرے تک آئی اور سیکھے کا بن دباتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”کل شام۔ لائٹ مت جلا نا۔“ اس نے صائمہ کو دوسرے کمرے کی طرف ہاتھ بڑھاتے دیکھا تو فوراً ٹوک دیا۔ وہ باہر تیز دھوپ سے آیا تھا اور کمرے کی نیم تاریکی جاتی آنکھوں کو بہت بھلی لگ رہی تھی، صائمہ اس سے پھو پھیا جان کی طبیعت کے متعلق پوچھنے لگی۔ وہ مختصر آیتا تارہا۔

پھر ادھر ادھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ صائمہ غالباً وہ واحد لڑکی تھی جو اپنی کوشش سے اسے بولتے رہنے پر مجبور کر دیا کرتی تھی ورنہ اس نے تو بس خود کو صرف سننے تک ہی محدود کر چھوڑا تھا اور خالہ نصرت اس کی اس عادت سے بے حد نالاں رہتی تھیں۔

”اے لڑکے! کیا گونگے کا گوکھائے رہتے ہو، جس کا دل چاہتا ہے تمہیں سنانے بیٹھ جاتا ہے۔ کبھی کھری کھری کبھی جلی کٹی اور کبھی رام کہانی۔“

”کھانا کھاؤ گے نا؟“ صائمہ نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”بنانے جا رہی ہوں؟“

”نہیں بس دو چار پھلکے ڈالوں گی۔“ وہ مسکراتی ہوئی باہر چلی گئی اور نوروز اس کے متعلق سوچتا رہ گیا۔ صائمہ کو اس نے ہمیشہ بہت مخلص پایا تھا۔ وہ بہت خوش مزاج لڑکی تھی ہر کسی کا دل جیتنے والی۔

لیکن شادی اس کو اس نہیں آئی تھی۔ محض چھ ماہ بعد نچانے کیا ہوا کہ وہ ایک بار پھر بیوہ ماں کی دہلیز پر آ بیٹھی اور اب دو سال ہونے کو آئے تھے وہ بظاہر یوں ہی ہنستی مسکراتی دکھائی دیتی تھی یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ مگر خالہ نصرت کے بعد صرف نوروز تھا جو اس کی آنکھوں کے رنگ پہچانتا تھا۔

پہلے وہ ہنستی تھی تو اس کی آنکھیں اس کی بھرپور مسکراہٹ کا ساتھ دیتی تھیں اور اب وہ مسکراتی تھی تو اس کی آنکھیں جھلملا سی جاتی تھیں۔

اداسی اور مایوسی کے مدھم رنگ اس لمحے بہت گہرے ہو جایا کرتے تھے اور یہ بات نوروز کو ہمیشہ بہت دکھی کر دیا کرتی تھی، اس کا دل چاہتا تھا وہ صائمہ کو ٹوک دے۔

”تم مسکرا امت کرو، یہ مسکراہٹ تمہارے غم سے زیادہ اذیت ناک ہے۔“

مگر وہ کچھ نہ کہہ پاتا بس سوچتا رہ جاتا، ایسا کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ پھر سے ان ہونٹوں پر پہلے والی جان داری مسکراہٹ سجادیے، ان جھلملائی آنکھوں میں زندگی کی روشنی بھر دے اور وہ پہلے والی صائمہ بن جائے جو کھلکھلا کر ہنستی تھی تو زندگی کا مفہوم سمجھ میں آنے لگتا تھا۔

”اے سو گئے ہو کیا؟“ صائمہ نے اسے پکارا تو وہ آنکھوں سے بازو ہٹاتا اٹھ بیٹھا۔

”صائمہ! تمہارے شوہر نے تم سے دوبارہ ملنے کی کبھی کوشش نہیں کی؟“

اس قدر اچانک سوال پر صائمہ چند لمحے کے لیے چپ رہ گئی تھی۔ نوروز کو بھی اپنی جلد بازی پر

شرمندگی ہونے لگی۔ صائمہ نے جواب نہیں دیا تو وہ اصرار کیے بغیر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ایک طویل خاموشی ان دونوں کے درمیان حاکم ہو گئی تھی۔ صائمہ دیوار کے سہارے کھڑی ہاتھ کی لکیروں کو کھوج رہی تھی وہ چھوٹے چھوٹے نوالے منہ میں ڈال کر چبانے لگا۔

”ابھی کچھ روز پہلے وہ آیا تھا۔“ صائمہ کی آواز بہت دھیمی تھی۔

”کون۔۔۔؟“ اس نے بے ساختہ پوچھا مگر پھر خود ہی سمجھ گیا۔

”کیا واقعی؟“ اس نے پلٹ کر۔ بے یقینی سے صائمہ کا چہرہ دیکھا، وہ اضطرابی حالت میں اپنے ہاتھوں کی انگلیاں چٹخا رہی تھی۔ اس کے پوچھنے پر بس ہلکا سا اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”کیا کہہ کر گیا ہے؟“ اس کے بے تابانہ استفسار پر صائمہ کی ایک دوسرے میں پیوست انگلیوں میں لرزش سی اتر آئی تھی۔

”وہ کچھ کہنے نہیں آیا تھا۔“

”پھر؟“

”کچھ کاغذات دینے آیا تھا۔“ صائمہ کی آواز رندھ گئی تھی، نوروز کا ہاتھ ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گیا۔

”کیسے کاغذات؟“ اسے کچھ کچھ انداز ہو چلا تھا۔

”طل۔۔۔ طلاق کے۔۔۔ طلاق کے کاغذات۔ اس نے مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا نوروز! ہمیشہ کے لیے۔ ایک ایسے جرم کی سزا ملی مجھے جو میرا تھا ہی نہیں، کوئی تصور نہیں تھا میرا، کوئی بھی نہیں۔“

وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی اور نوروز ہونٹ بنا اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس رد عمل کا اظہار کرے۔

اس نام نہاد بندھن کے ختم ہو جانے پر اسے مبارکباد دے یا اس کی آس، امید کا آخری در بند ہو جانے پر اظہار افسوس کرے۔ وہ یوں ہی الجھا الجھا سا بیٹھا لفظ جوڑتا رہا۔ حرف گنتا رہا۔ جملے ترتیب دیتا رہا مگر چپ کا بے زبان خنجر اس کے ہونٹوں پر آتے جملوں کو کاٹتا چلا گیا۔ لفظوں کی دھجیاں اڑا دیں اور خاموشی کے بلبلے میں تسلی، دلا سے، جو صلے کا نوحہ گانے لگا۔ گھڑی کی سوئیاں ہر ٹک کے بعد ایک عذاب لمحہ کائنات کی گود میں گراتی چلی گئیں۔

نچانے کتنا وقت بیت گیا۔ صائمہ روتے روتے نڈھال ہو گئی۔ اس کی ہچکیاں سسکیوں کا روپ دھار گئیں اور سسکیاں صبر کے سانچے میں ڈھس گئیں۔ پھر وہ دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل گئی نوروز نے ایک طویل سانس لے کر اسے باہر جاتے دیکھا پھر نچانے کب سے ہاتھ میں پکڑا نوالہ پلیٹ میں رکھا اور ٹرے کھسکا کر باہر نکل آیا۔ صائمہ اسے کہیں نظر نہیں آئی تھی وہ موٹر سائیکل لے کر گھر سے باہر نکل گیا اور اس شام وہ بے مقصد ہی موٹر سائیکل پر بیٹھا شہر کی ویران سڑکیں پاتا رہا تھا۔

☆☆☆

دنیا کا تماشا دیکھ لیا
غمگین سی ہے بے تاب سی ہے
امید یہاں اک وہم سی ہے
تسکین یہاں اک خواب سی ہے

دنیا میں خوشی کا نام نہیں
دنیا میں خوشی نایاب سی ہے

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“ تائی اماں کے کہے گئے ایک ہی جملے نے اس کے اپنے فیصلے کی دھجیاں اڑا دی تھیں، وہ کتنی ہی دیر بے یقین نگاہوں سے انہیں دیکھتا رہا۔ کتنی مشکل سے اس نے زندگی میں شاید پہلی مرتبہ صرف اپنی ذات کے لیے ایک فیصلہ کیا تھا مگر اسے بھی صرف ایک ہی جملے سے رد کر دیا گیا تھا۔

”تمہارے تایا ابا تمہارے لیے نایاب کو مانگ چکے ہیں۔“

”مجھ سے پوچھتے بغیر۔۔۔؟“

”کیا پوچھنا چاہیے تھا۔۔۔؟“ تائی اماں کی آنکھوں میں سوال ابھرا تھا اور وہ سر جھکا کر رہ گیا تھا۔

”تم نے پہلے کبھی صائمہ کے متعلق ذکر ہی نہیں کیا نوروز! ورنہ ہم اس کے بارے میں ضرور سوچتے۔“ تائی اماں کا نرم لہجہ آج اسے بہت بے رحم لگا تھا۔

”اب بھی تو سوچا جاسکتا ہے تائی اماں! یہ فیصلہ ابھی اس مقام تک نہیں پہنچا جہاں اس میں ترمیم کرنا ممکن نہ رہا ہو۔“

اس کی دھیمی سی آواز پر انہوں نے بری طرح چونک کر اسے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ انہیں بہت بدلا ہوا دکھائی دیا تھا۔ ہمیشہ ہر بات پر چپ چاپ سر جھکا دینے والے نوروز کی اتنی سی جت نے بھی ان کے دل کو دہلا دیا تھا۔ اسی لیے وہ رات کو قدرے پریشانی کے عالم میں تایا ابا سے بات کیے بغیر نہ رہ سکی تھیں۔

”بات کہاں تک جا پہنچی ہے، میں نہیں جانتی لیکن بہتر ہوتا کہ اس کی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کرنے سے پہلے آپ اس کی رائے معلوم کر لیتے۔ وہ بہت بچھا بچھا سا لگ رہا تھا۔“ تائی اماں کے کہنے پر تایا ابا نے عینک کے موٹے عدسوں کے پیچھے سے بغور انہیں دیکھا۔

”کچھ کہا اس نے؟“

”آپ کو بتانا، میں نے، وہ صائمہ کا ہاتھ تھا مناجا ہوتا تھا۔“ تائی اماں نے قدرے چڑ کر کہا۔ ”یہ تو اس وقت چاہتا ہو گا نا، جب تک اسے نایاب کے متعلق علم نہیں ہو گا۔ اب کیا چاہتا ہے؟“ وہ اب بھی یہ ہی چاہتا ہے۔“ تائی اماں نے نظریں چرا کر جواب دیا تو تایا ابا سیدھے ہونٹھے تھے۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ جواباً تائی اماں خاموش رہی تھیں۔

”نہیں، نہیں، بہت فرق ہے ان دونوں میں اور پھر میں بھائی میاں کو زبان دے چکا ہوں، تم سمجھا دینا اسے بلکہ صبح میں خود اس سے بات کروں گا۔“

وہ کافی پریشان ہو گئے تھے اور اسی پریشانی کے سبب وہ صبح سویرے ہی اس کے کمرے میں جا پہنچے تھے۔ وہ اس وقت فوٹو اسٹوڈیو جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ تایا ابا سے نظریں ملیں تو فوراً نظریں پڑا گیا۔

”برخوردار! بیٹھو ذرا، تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“ تایا ابا کے اس قدر سنجیدہ لہجے پر وہ دل ہی دل میں قدرے گھبراسا گیا تھا۔

”تم جانتے ہو، صائمہ کو طلاق کیوں ہوئی ہے؟“ وہ اس کے عین سامنے بیٹھے پوچھ رہے تھے۔ نوروز نے آہستگی سے ٹی میں سر ہلا دیا تھا۔

”ہوں، کیوں شادی کرنا چاہتے ہو اس سے؟ محبت کرتے ہو یا محض ہمدردی؟“ اسے تایا ابا سے اس صاف گوئی کی امید قطعاً نہ تھی۔ یونہی چپ سا دھمے بیٹھا رہا۔

”صائمہ تم سے سات آٹھ سال بڑی ہے۔ میرا خیال ہے، وہ اپنے بارے میں تم سے زیادہ بہتر سوچ سکتی ہے۔“ وہ ایک لمحے توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوئے تھے۔

”کیا اس فیصلے میں صائمہ کی مرضی بھی شامل ہے؟“ اس کا سر ایک مرتبہ پھر ٹپٹی میں ہل گیا تھا۔

”وہ ایک سمجھ دار لڑکی ہے۔ لیکن تمہارے لیے قطعی نامناسب۔ بہتر ہو گا، تم ذہنی طور پر اپنے آپ کو نایاب کے لیے تیار کر لو۔“

وہ کہہ کر چند لمحے اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھتے رہے اور جب وہ کچھ نہیں بولا تو وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔ وہ ان کے جانے کے بعد بھی اسی زاویے میں بیٹھا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ شاید وہ رو رہا ہے۔ اس نے اپنے ہاتھ سے آنسو صاف کرنے چاہے مگر انگلیوں کی پوریں جوں کی توں خشک واپس آ گئیں۔

اس نے بڑی حسرت سے اپنے سامنے لگے آئینے میں اپنی بنجر آنکھوں کو کھوجا۔ مگر سب کے سب آنسو دل پر ہی گرتے رہے۔ پیاسی آنکھ کو سیراب ہونے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

☆☆☆

وہ نیلوفر بھائی کو میکے چھوڑ کر واپس آ رہا تھا۔ جب وقت دیکھا۔ کالج کی چھٹی کا وقت ہو چکا تھا۔ رشنا اور سویرا کو ہمیشہ یہی شکایت رہتی تھی کہ شیری بھائی اپنے آفس کے کچ ٹائم میں انہیں لینے کے لیے آتے تھے۔ لہذا انہیں آدھا گھنٹہ انتظار کی کوفت اٹھانی پڑتی تھی۔ کالج چونکہ یہاں سے بے چہرہ دیکھتا تھا، سو اس نے موٹر سائیکل کا رخ موز دیا۔ جس وقت وہ گیٹ کے سامنے پہنچا۔ چھٹی ہو چکی تھی۔ لڑکیاں دھڑا دھڑا ہر نکل رہی تھیں۔

وہ شدید رش میں سے ہوتا گیٹ کے عین سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ شدید گرمی اور پسینے کی وجہ سے

وہاں ٹھہرنا کافی دشوار لگ رہا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا اگر چند منٹ تک رشنا یا سویرا میں سے کسی نے اسے نہ دیکھا تو وہ مزید نہیں رکے گا۔ ماتھے پر بہتی پسینے کی دھاریں اپنی آستین سے صاف کرتے ہوئے اس نے بڑی مایوسی سے گیٹ کی طرف دیکھا۔ تب ہی سویرا گیٹ سے باہر نکلتی دکھائی دی۔ اس نے اپنا آدھا چہرہ دوپٹے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ اور غائب گری کی وجہ سے دوپٹہ پیشانی سے آگے سرکا رکھا تھا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے موٹر سائیکل ڈرائی آگے بڑھائی تاکہ سویرا اسے دیکھ سکے مگر اگلے ہی لمحے اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی تھی جب وہ نیز تیز قدم اٹھائی اس سے کافی فاصلے پر کھڑی سفید کرولا میں جا بیٹھی تھی۔ وہ ہکا بکا سا اس گاڑی کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس گاڑی میں بیٹھا لڑکا قطعی اجنبی تھا۔

”کہیں مجھے دھوکا تو نہیں ہوا؟“ بات ناقابل یقین سی تھی۔ سو سب سے پہلا خیال یہی آیا تھا۔ مگر اس خیال پر بھی یقین کرنا کچھ ایسا آسان تھوڑی تھا۔ وہ سویرا بھی اس کی سگی بہن اسے پہچانے میں وہ غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ عجب شش و پنج کی کیفیت میں اس نے موٹر سائیکل اشارت کر لی تھی۔ روانہ ہونے سے ایک لمحہ قبل تک وہ گیٹ کی طرف دیکھتا رہا تھا۔

”ہو سکتا ہے وہ دونوں۔“ اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا تھا اور اگلے ہی لمحے وہ بری طرح شرمندہ ہو گیا تھا۔ یہ بات تو اس نے سوچی ہی نہیں تھی کہ اگر وہ سویرا بھی تو لاجمالہ رشنا کو بھی اس کے ساتھ ہی نکلنا تھا کیونکہ وہ دونوں اکٹھی ہی واپس گھر آتی تھیں۔

”اور ظاہر ہے، وہ دونوں اس وقت ہی کالج سے باہر نکلتی ہوں گی جب شیریں بھائی کے آنے کا وقت ہوتا ہوگا۔“

وہ خود پر لعنت بھیجتا گھر آ گیا تھا۔ واش بیسن پر منہ ہاتھ دھوتے ہوئے اس نے سدرہ سے کھانا لانے کو کہا اور پھر ڈرائنگ ٹیبل پر آ بیٹھا اور ابھی وہ چند لمبے ہی لے پایا تھا جب پچھلے برآمدے میں کھلنے والا دروازہ کھول کر رشنا اندر چلی آئی۔

”نوروز بھائی! کیا کھا رہے ہیں آپ؟ مجھے تو خود بڑی بھوک لگ رہی ہے۔“ وہ اس کے سامنے بیٹھی سدرہ کو آواز بس لگا رہی تھی۔

”تم آج کالج نہیں گئیں؟“ نوالہ اس کے حلق میں پھنسنے لگا تھا۔

”نہیں۔ آج زیادہ تر کلاسز نہیں ہوئی تھیں۔ سو میں نے چھٹی کر لی۔“ ذرا سی روٹی توڑ کر وہ اپنے میاں مٹھو کو کھلانے لگی تھی جو ہمہ وقت اس کے کاندھے پر سوار رہتا تھا۔

”اور سویرا؟“

”وہ تو گئی ہوئی ہے۔“

”کتنے بجے واپس آ جاتے ہو تم لوگ۔۔۔؟“ اس کا دل انجانے خدشوں کے بوجھ تلے دبا جا رہا تھا۔

”عموماً دو بجے لیکن آج سویرا کا پریکٹس تھا۔ وہ غالباً تین بجے واپس آئے گی۔“

نوروز کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ کر پلیٹ میں آگرا تھا۔ وہ مگر مگر رشنا کی شکل دیکھ گیا۔

کچھ دیر پہلے کا منظر آنکھوں کے سامنے گھوم سا گیا تھا۔ کھانا چھوڑ کر گھر سے باہر نکل آیا۔ رشنا

نے ایک نظر اسے جاتے ہوئے دیکھا اور پھر کندھے اچکا کر کھانا اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کھانے میں مشغول ہو گئی۔

وہ یونہی غائب دماغی سے تپتی سڑکوں پر چلتا ہوا خالہ نصرت کے گھر کی طرف آنکلا لیکن دروازے پر گئی لمحے کھڑے رہنے کے باوجود وہ اندر جانے کا حوصلہ نہیں کر سکا تھا۔ تب ہی ایک دم سے کوادر کھل گئے تھے۔ صائمہ اس کے عین سامنے کھڑی تھی۔ وہ شپٹا سا گیا۔

”باہر ہی سے لوٹ جانے کا ارادہ ہے۔۔۔؟“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا، میں باہر کھڑا ہوں۔۔۔؟“ وہ حیران تھا۔

”مجھے صرف یہ احساس ہوا تھا کہ باہر کوئی کھڑا ہے، تم ہو گے، یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ اندر آ جاؤ۔“

وہ صاف گوئی سے کہتی ہوئی دروازہ کھلا چھوڑ کر واپس پلٹ گئی۔ خالہ نصرت آج گھر پر ہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی ان کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔

”کہاں رہے اتنے دن؟“

”بہن! کچھ مصروفیت رہی۔“ اس نے یونہی ٹالنا چاہا۔

”اے ہاں، وہ تو میں جانتی ہوں، یہ بختیار ہاؤس کے لوگوں نے کبھی تمہیں انسان تھوڑی سمجھا ہے۔ کبھی اس کام کے لیے بھاگے جا رہے ہو تو کبھی اس کام کے لیے۔“

”خود ان کے اپنے بیٹے تو بڑے مزے میں ہیں۔ کوئی دفتر میں بیٹھتے ہیں تو کوئی پڑھنے کے بہانے عیش کرتے پھر رہے ہیں۔“ خالہ نصرت کی وہی ازلی باتیں جو وہ بچپن سے سنتا چلا آ رہا تھا۔ جو کبھی حرف بحرف معلوم ہوتیں اور کبھی سراسر جھوٹ۔ لیکن اس وقت وہ ان کی طرف زیادہ توجہ نہیں دے رہا تھا۔ ذہن کی سوئی کسی اور ہی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔ صائمہ جزبزی ہو کر ماں کی باتیں سنتی رہی۔

”تمہاری ماں زندہ ہوتی تو میں دیکھتی کہ کون تمہاری اس سادگی سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اپنے کلیجے میں چھپا کر رکھتی بھی تمہیں۔ ایسے سرخ و سفید ہوا کرتے۔ تب تم، کیا بتاؤں اور اب تو رنگت بھگت گئی ہے تمہاری ان لوگوں کی چاکری کر کر کے، خدا ہی سمجھے ان لوگوں کو، بچوں کی شیشی سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔“

”خدا کا واسطہ ہے امی! بس کریں۔ ایسا بھی ظلم کا کوئی پہاڑ نہیں ٹوٹا ہوا اس پر۔“ صائمہ نے

ماں کو خاموش نہ ہوتے دیکھا تو جھنجھلا کر ٹوک گئی۔

”لو بھئی، میں نے کچھ غلط کہا کیا؟ کیوں نوروز؟“ انہوں نے پپ بیٹھے نوروز کا بازو ہلایا۔ تو

وہ چونک کر ان کا منہ دیکھنے لگا۔

”مجھ سے کچھ کہا آپ نے۔۔۔؟“ اس کے بالکل انجان لہجے پر وہ بری طرح چڑ گئیں۔

”نہیں، ان دیواروں سے بک بک کر رہی تھی گھنٹہ بھر سے۔“ وہ بد دل سی ہو کر وہاں سے اٹھ گئیں۔

”خیریت تو ہے۔ کچھ پریشان لگ رہے ہو۔“ صائمہ نے استفسار کیا تو وہ چند لمحے غائب

اے جیسے بہت افسوس ہوا تھا اس کے ساتھ نہ آنے پر۔
”کیوں؟“

”اس لیے کہ پریکٹیکل تو ہفتے میں تین بار ہوتا ہے۔ کل بھی کر سکتی تھی مگر آپ تو کل مجھے لینے نہیں آسکتے نا؟“

”اور اگر میں کل تمہیں لینے آ جاؤں تو؟“ وہ ابھی تک اسے صرف کھوج رہا تھا۔
”کیا واقعی آپ میرے لیے اتنا کر سکتے ہیں؟“ وہ حسرت آمیز لہجے میں بولی تو نوروز خود سے شرمندہ ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے یوں خاموش ہوتا دیکھ کر سویرا سر جھٹکتی ہوئی اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

”نوروز بھائی! آپ کو پتا ہے تائی اماں آپ کی شادی کی تاریخ پکی کرنے والی ہیں۔“ وہ بڑی خوشی سے اطلاع دے رہی تھی۔ نوروز کے لیے جائے کا گھونٹ بھرنا دشوار ہو گیا۔

”آپ نے تو دیکھا ہوا ہے نا بھابھی کو؟ کیسی ہیں وہ؟ غصے کی تیز نہ ہوئیں تو میری ان سے سب سے زیادہ دوستی ہوگی۔ میری سگی والی بھابھی ہوں گی نا! ویسے تو نیلو بھابھی بھی مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ آپ نے بتایا نہیں بھائی! وہ دیکھنے میں کیسی لگتی ہیں؟“ سویرا کے لہجے سے اشتیاق جھلک رہا تھا۔

”سویرا! میرے سر میں بہت درد ہے۔ تم جاؤ اب۔“
اس کے بے حد اکتائے ہوئے انداز پر سویرا کا چہرہ خفت سے سرخ پڑ گیا تھا۔ وہ ہمیشہ یونہی کرتا تھا، اپنے آپ میں الجھ کر سامنے والے کے احساسات و جذبات کی اس کو پرواہی نہ رہتی تھی۔ سویرا تیز تیز قدم اٹھاتی کمرے سے باہر آ گئی۔ لاؤنج میں جانے سے پہلے اس نے اپنی آنسوؤں سے لبالب بھری آنکھوں کو دوپٹے سے رگڑا مگر نجانے کیوں آنسو بہتے چلے گئے تھے۔

☆☆☆

تیز چلیلائی دھون میں اظفر اور مہراں بانیک پر پونیورسٹی سے واپس آئے تو دونوں ہی تیورائے ہوئے تھے۔ آنکھیں بمشکل اتنی کھول رکھی تھیں کہ راستہ نظر آ جائے۔ اس پر گھر میں ایسا ہولناک سناٹا طاری تھا کہ وہ حیران و پریشان رہ گئے تھے۔

”یہ فوجیں کہیں مڑ گشت کرنے تو نہیں گئیں۔“ اظفر نے خیال ظاہر کیا۔
”نہیں بھئی، گرمیوں میں مڑ گشت کہاں پکتا ہے؟“ مہراں کو غالباً زیادہ ہی گرمی لگی تھی۔ اظفر نے مشکوک انداز سے اسے دیکھا اور پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا گرمیوں میں گھر کی سب سے ٹھنڈی جگہ لاؤنج ہوا کرتی تھی کیونکہ چاروں طرف کمرے تھے نیز اے سی بھی ادھر ہی لگا ہوا تھا۔ سو وہ دونوں سیدھے وہیں چلے آئے۔

”شیری بھیا کے مزے ہیں، بھی گاڑی میں آتے ہیں۔ گاڑی میں جاتے ہیں۔“ اظفر نہایت ڈھیلے ڈھالے انداز میں صوفے پر گرا۔ اگلے ہی لمحے تیز چپڑوں سے لاؤنج گونج اٹھا تھا۔
”کون بد تمیز ہے یہ؟“ یہ چھوٹی چچی کی آواز تھی۔ اظفر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر دیکھنے لگا،

دماغی سے اسے دیکھنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔

”چلتا ہوں۔“ اس نے کہا تو صائمہ نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی بس چپ چاپ اسے دروازے سے باہر نکلتا دیکھتی رہی۔

وہ گھر لوٹا تو یہاں کا منظر ہی عجیب تھا۔ تائی اماں اور چھوٹی چچی سمیت سب ہی لوگ لاؤنج میں موجود تھے۔ بڑی سی برات بیچ میں رکھے وہ لوگ گلے پھاڑ پھاڑ کر گیت گانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کی نظریں ساری محفل پر سے پھسلتی ہوئی سویرا پر جا کر ٹک گئی تھیں جو معیز سے نہ جانے کس بات پر جھگڑ رہی تھی۔

تب ہی اظفر کی نگاہ اس پر پڑی تو اس نے فوراً گانا بدل دیا۔

میرے بھیا کی جائے گی

بارات

میں ڈھول بجاؤں گا

وہ بری طرح تالیاں پیٹ رہا تھا۔

”افوہ اظفر کے بچے! اس وقت تو تم خود بیٹھے ہوئے ڈھول کی طرح بگ رہے ہو۔ اس لیے بہتر ہے، اپنا منہ بند رکھو۔“ سدرہ نے اسے سختی سے جھڑک دیا۔

”میں اپنا منہ بند رکھوں تاکہ تم اپنی بیٹج جیسی آواز سے ہمارے کانوں میں خراشیں ڈال سکو پر گز نہیں۔“ اظفر نے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس کی اس درجہ بد تمیزی پر سدرہ نے پرات اپنی طرف کھینچ لی تھی۔

”یہ لوگ اس قابل ہیں ہی نہیں کہ انہیں اپنے ساتھ محفل میں شریک کیا جائے۔ بھگاؤ ان کمبختوں کو۔“

شہلانے نعرہ لگایا تھا اور اس کے ساتھ ہی دونوں طرف سے کشن پھینکے جانے کا مقابلہ شروع ہو گیا تھا۔ وہ چند لمحے اس دنگا فساد کو دیکھتا رہا۔ پھر سویرا کو آواز دے کر چائے لانے کا کہہ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ سویرا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بچن میں بھاگ گئی۔ تھوڑی دیر میں ہی وہ چائے لے کر اس کے کمرے میں موجود تھی۔

”تمہاری پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟“

”بہت اچھی۔“ سویرا بھائی کے التفات کی ہمیشہ ہی منتظر رہتی تھی اب بھی بڑی خوش دلی سے جواب دیا تھا۔

”آج میں تمہیں لینے کے لیے کالج گیا تھا۔“ اس نے سویرا کے چہرے کو جانچتی نگاہوں سے دیکھا۔

”مجھے لینے کا کس وقت؟“ وہ بھرپور حیرت سے پوچھ رہی تھی۔ نوروز کو ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے کی رنگت بدلتی محسوس ہوئی تھی۔

”یہ ہی کوئی ڈیڑھ بجے۔“

”اوہو۔ آپ نے مجھے بتایا ہوتا تو میں پریکٹیکل مس کر کے اسی وقت آپ کے ساتھ آ جاتی۔“

جدھر سے آواز آرہی تھی، معلوم ہوا اس صوفے پر چھوٹی چچی اٹک رہی تھیں جس پر اظفر نے بیٹھنے کی کوشش کی تھی۔

باہر دھوپ سے آنے کی وجہ سے ابھی تک آنکھیں کمرے کی تاریکی سے مانوس نہیں ہوئی تھیں۔ لائٹ بھی بند تھی۔ دوسرے صوفے کا جائزہ لینے لگا، مبادا وہاں بھی کوئی اٹک رہا ہو۔
”اب اسٹیجیون کریکوں کھڑے ہو؟ وہ سامنے والا صوفہ خالی ہے، وہاں بیٹھ جاؤ۔“ اندھیرے میں ان کے عقب سے سردہ کی آواز ابھری تو وہ اچھل پڑے۔

”اور ہاں ذرا خیال سے، قالین پر اٹھو! ستراحت ہے۔ اسے مت کچل دینا۔“
”لا حول ولا قوۃ! آخر سب لوگ یہیں کیوں دن، میرا مطلب یہیں کیوں ستراحت فرما رہے ہیں اور اتنی ہدایات دینے سے تو بہتر ہوتا اگر تم اٹھ کر لائٹ جلا دیتیں۔“ مہراں چڑ کر بولا تھا۔
”اوہ سوری۔ میں سمجھی آپ کو علم ہو گا کہ آپ کی دائیں طرف موجود دیوار پر سوچ بورڈ لگا ہوا ہے۔“ اس نے شان بے نیازی سے جتایا۔

”افوہ چل یار! اسے کمرے میں ہی چلتے ہیں۔“
”کمرے میں چلتے نہیں کمرے میں چلتے ہیں۔ اس وقت سورج کی شعاعیں سیدھی آپ کے کمرے کا طواف کرتی ہیں۔“ مہراں نے گویا اسے اطلاع دی۔
”کھانا کھاؤ گے؟“ سردہ نے ہانک لگا لی تھی۔
”نہیں، اب اتنی گرمی میں بھلا کون کھانا کھائے۔“

”ہائیں! یہ کیا بات ہوئی بھلا؟“ سردہ نے حیرت کا اظہار کیا مگر اظفر جواب دیے بغیر کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ انہیں گئے ہوئے بمشکل پندرہ بیس منٹ ہوئے ہوں گے جب عجیب بے ہنگم چیخ و پکار نے لاؤنج میں موجود سب افراد کو ہڑبڑا کر اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”یالہ خیر! یہ کیا ہو رہا ہے؟“ تانی اماں حواس باختہ سی۔ کراؤنج میں چاروں طرف گھوم گئی تھیں۔ کسی کے بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ قیامت کا سا شور اور ہنگامہ کدھر ہو رہا ہے۔ آخر شہلا کی نشاندہی پر سب کی دوڑ پیچھے لان کی طرف لگ گئی تھی۔ جیسے ہی برآمدے کا دروازہ کھول کر وہ اندھا دھند باہر کی طرف نکلیں ویسے ہی چھپاک کی آواز سے کوئی چیز ان پر آ گری تھی۔ فلک شگاف چٹخیں خود بخود دان کے حلق سے نکلتی چلی گئی تھیں۔ نکلتی رہی تھیں اور پھر ایک دم خاموشی چھا گئی تھی۔ وہ اپنی خمار آلود آنکھیں جھپکاتی۔ منہ پھیڑے ایک دوسرے کو ریلین پانی میں شرابور ہوتے دیکھ رہی تھیں۔
”گرمی بہت ہو رہی تھی، بزرگوں سے سنا ہے، دوسروں پر رنگ دار پانی پھینکنے کے بعد جتنی گالیاں پڑیں گی، اتنی ہی زیادہ بارش برے گی۔ اب براہ مہربانی آپ لوگ کورس میں گالیاں دینا شروع کر دیں۔“

اظفر بہت سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ وہ سب چند لمحے اپنے سرخ سرخ آنکھوں سے اسے گھورتی رہیں اور پھر جیسے ہی ان کے ہاتھ اپنی اپنی چپلوں کی طرف بڑھے۔ اظفر نے آگے آگے دوڑ لگا دی تھی۔

شام کو وہ دونوں باقی سب بچوں کو ساتھ لیے پچھلی دیوار پر چڑھے بیٹھے تھے اور اپنی اپنی چوٹوں

☆☆☆

تایا ابا، تانی اماں، چھوٹی چچی اور سردہ کے ساتھ جا کر شادی کی تاریخ طے کر آئے تھے کہ بھوپیا جان اپنی گرمی ہوئی صحت کے سبب بار بار اصرار کر رہے تھے۔ شادی میں ابھی ایک مہینہ باقی تھا مگر لڑکیوں نے ڈھولک ابھی سے منگوالی تھی۔ ساری دوپہر برباد کرنے کے بعدرات کو پھر ڈھولک کی شامت آ جاتی تھی۔ ایسے میں نوروز اپنا زیادہ وقت گھر سے باہر گزارنے کی ہی کوشش کرتا تھا۔ اس روز بھی وہ اپنے نوٹو اسٹوڈیو میں بیٹھا تھا جو اس نے شوقیہ ہی کھولا تھا اور اب اس کی آمدنی کا ذریعہ بھی تھا جب اظفر وہاں چلا آیا۔

”گھر جا رہا تھا، سوچا تمہیں بھی ساتھ لے لوں۔ اسٹھے چلتے ہیں۔“ اظفر نے کہا تو وہ اپنے ساتھ کرنے والے لڑکے کو ہدایت دیتا ہوا اس کے ساتھ ہی باہر نکل آیا تھا۔
گلابی شام میں بازار کی رونق بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اظفر اپنی ہی پکس ہانکتا رہا، کچھ اس نے سنیں کچھ اپنی سوچ میں کھو کر نظر انداز کر گیا۔ گھر پہنچے تو تانی اماں اور چھوٹی چچی زور و شور سے باتوں میں مگن تھیں۔ لڑکیاں ادھر ادھر مصروف تھیں۔
”خیریت بھی، آج ڈھولک کا پروگرام کیمنسل ہو گیا کیا؟“ اظفر نے اندر داخل ہوتے ہی شور مچانا شروع کر دیا تھا۔
”کھانا تیار ہونے میں ابھی کچھ دیر ہے مہمان آگئے تو بچیاں ان کی تواضع میں مصروف ہو گئیں۔“

”ہائیں! کون سے مہمان آگئے تھے؟“ وہ دونوں وہیں ان کے پاس بیٹھ گئے تھے۔ اظفر کے اشتیاق پر تانی اماں اپنی باتیں چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہو گئیں اور پھر بطور خاص نوروز کو بتانے لگیں۔
”کوئی اجنبی لوگ تھے۔ کم از کم ہمارے رشتہ داروں یا جاننے والوں میں سے نہ تھے۔ سویرا کے رشتے کی بات کر رہے تھے۔ اے صفیہ! مجھے تو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ بالکل غیر لوگ، ہماری سویرا ان کی نظر میں آئی کیسے؟“ تانی اماں الجھی الجھی سی لگ رہی تھیں۔ نوروز کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے کار میں بیٹھے اس نوجوان کا چہرہ گھوم گیا تھا۔

”سویرا کی کسی دوست وغیرہ کے توسط سے تو نہیں آئے یہ لوگ؟“ وہ کچھ سوچ کر بولا تھا۔
”انہوں نے کسی کا نام تو نہیں لیا بس مبہمی بات کر رہے تھے۔“

کمال ہے، یہ بھی، یہ لوگ تو ہماری سویرا کے پیچھے ہی پڑ گئے ہیں؟“ تائی اماں فکر مند سے لہجے میں کہتی ہوئی پچھلے برآمدے میں بچھے تخت پر آ بیٹھی تھیں، مسالے صاف کرنی ہوئی چھوٹی چچی نے سر اٹھا کر دیکھا۔

”خیریت تو ہے؟“

”ہاں ہے تو خیریت۔۔۔ اے نیلو! بیٹا ذرا بھاگ کر میرے لیے ایک کپ چائے کا کہہ آؤ کسی سے۔“

انہوں نے کنپٹیاں دباتے ہوئے کہا تو ٹیپو کو بڑے انتہاک سے ہوم ورک کرواتی نیلو فوراً ہی اٹھ گئی تھی۔

”وہی لوگ دوبارہ آئے بیٹھے ہیں۔ وہ تو شکر ہوا، اظفر کے ابا موجود تھے اب خود ہی نبٹ لیں گے۔“

”تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے آپا؟ جس گھر میں پیری ہو، وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں۔ ہماری نہیں مرضی تو وہ کیا کر لیں گے۔ ٹال دیجیے انہیں کہہ دیں کہ ہمارے ہاں خاندان سے باہر رشتے نہیں کیے جاتے۔“ چھوٹی چچی نے خاصے تعجب سے انہیں دیکھا تھا۔ جس پر تائی اماں راز دارانہ انداز میں ان کے قریب کھکھک آئیں۔

”دیکھو، صرف تم سے بات کر رہی ہوں۔ یہ عورت اور اس کی بیٹیاں اس رشتے پر کچھ زیادہ راضی نظر نہیں آتیں۔ عجیب کتر یا کتر یا سا انداز ہے ان کا، ایک آدھ بار اپنے بیٹے کا نام بھی لیا ہے کہ اس کی وجہ سے انہیں دوبارہ یہاں آنا پڑا ہے بس ایک یہ ہی بات کھٹک گئی ہے مجھے۔ اظفر کے ابا کو سمجھا آئی ہوں کہ ہمیں پرانے لوگوں سے رشتہ داریاں نہیں بنانی لہذا کوئی نہ کوئی بہانا کر کے چلتا کریں۔“

”یہ تو اچھا کیا آپ نے۔ خیر اب فکر مند نہ ہوں۔ بھائی صاحب کو بات کرنے کا طریقہ سلیقہ آتا ہے، خود ہی مناسب طریقے سے ٹال دیں گے انہیں۔ یہ لیجیے نیلو چائے لے آئی ہے۔ آپ سکون سے چائے پیئیں۔“ چھوٹی چچی نے نیلو کو آتے دیکھا تو بڑے سجاؤ سے بات بدل گئیں۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ نیلو پر اعتبار نہیں کر سکتی تھیں لیکن بعض معاملات وہ صرف آپس تک ہی محدود رکھنے کی عادی تھیں۔ یہ بھی ایک ایسا ہی معاملہ تھا۔

”ہم ماں بیٹی بھی کیسے نصیب لے کر آئی ہیں اس دنیا میں۔ ماں بیوہ اور بیٹی طلاق یافتہ۔ تم زندگی کے ایک نئے سفر کا آغاز کرنے جا رہے ہو۔ ان مبارک ساعتوں میں ہم اس لیے تمہاری طرف

”آپ نے کیا کہا اماں؟“ اظفر نے یونہی پوچھا تھا، مگر تائی اماں اسے یوں گھورنے لگی تھیں جیسے اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہو۔ ”ارے کہنا کیا ہے؟ ماشاء اللہ سے گھر بھرا پڑا ہے لڑکوں سے ایک سے ایک لائق فائق اور فرمانبردار بچہ موجود ہے خاندان میں، ہم بھلا کیوں اپنی بیٹی پرانے گھر میں بھیجیں۔“

ان کے استحقاق بھرے قطعی لہجے پر اظفر کھسیانی ہنسی ہنس کر رہ گیا تھا۔ جبکہ نوروز نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اگلے ایک دو روز تک ڈھولک کا شور سننے میں نہیں آیا، تائی اماں نے ایک دوبار تذکرہ کیا کہ سویرا کی طبیعت ٹھیک نہیں اور ان کی بات سننے ہی اس کا ذہن نئی کہانیاں بنانے لگتا تھا۔ اسی ٹینشن میں وہ سویرا کی طبیعت کا پوچھنے اس کے کمرے تک بھی نہیں جاسکا تھا۔

شادی میں چند روز باقی تھے جب گاؤں سے بڑی چچی کی آمد بھی ہو گئی۔ ان کے آنے سے شادی کے ہنگاموں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا، وہ خاصی زندہ دل خاتون تھیں۔ محفل کو کشت زعفران بنادینا ان کے بائیں ہاتھ کا تھیل تھا۔ سلجھے ہوئے ذہین و فطین شیریں بھیا اور نازک سی اہیقہ کو دیکھ کر وہ بارہا حیرت کا اظہار کرتی رہیں۔

”ارے آپا! ذرا دیکھو تو یہ میرے بچے لگ ہی نہیں رہے، کیسی اچھی قسمت ہے میری، اپنے تھاپے تھاپے سسرال میں آئی تھی۔ سبھی سوچا بھی نہیں تھا، میری اولاد اتنا پڑھ لکھ جائے گی اور یہ شہری گود دیکھو ذرا عینک لگا کر کیسا ماسٹر لکھنے لگتا ہے۔“ ان کی بائیں سن کر شیریں بھیا جھپٹنے اور بائی مسکراتے رہے۔

”مجھ سے ملنے بھی تو نہیں آتے یہ۔ دل کیسا ترستار ہوتا ہے ان کو دیکھنے کے لیے۔ پچھلے سال آئے تھے یہ دونوں بہن بھائی اور اب میں آئی ہوں۔“ وہ اہیقہ کے بال سنوارتے ہوئے شکوہ کر رہی تھیں۔

”بس بہن! اولاد کی بہتری کے لیے والدین کو بہت کچھ سہنا پڑتا ہے۔“

تائی اماں کے کہنے پر بڑی چچی نے بھی اثبات میں سر ہلادیا تھا۔ پھر بڑی چچی کی ایما پر ہی سب لوگ مایوں کی رسم ادا کرنے پر راضی ہو گئے تھے ورنہ نوروز نے کہہ رکھا تھا کہ ابھی سے یہ کھڑاک پھیلائے کی ضرورت نہیں۔

”ارے لڑکوں کا کیا ہے، شرم کے مارے کہہ دیتے ہیں ایسی باتیں۔“

بڑی چچی اس کی بات چنگیوں میں اڑا گئی تھیں۔ پھر اسی شام اظفر اور مہراں نوروز کو کھینچ کھانچ کر اس کے کمرے سے باہر نکال لائے تھے چوکی پہ بٹھا کر مایوں کی رسم داکئی، ڈھولک کی تھاپ اور نسوانی قہقہوں سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ نوروز نے کنپٹیوں پر تیل کی بہتی دھاریں محسوس کیں تو اسے بے اختیار وہاب یاد آ گیا اور اس کے ساتھ ہی وہ رات جب اس نے سرخ دروازوں پر لکھے ہوئے B-4 کو ذہن نشین کیا تھا۔ مایوں کی رسم ادا کرنے کے بعد یہاں بھی طوفان بدتمیزی کا آغاز ہو گیا تھا۔ نہ نہ کرتے بھی وہ ایک دوسرے کی درگت بنانے پر تل گئے تھے اور جب خوب تھیل تماشے کے بعد وہ لوگ دولہا کی ہیئت نرانی دیکھنے کے لیے اس کی طرف متوجہ ہوئے تو معلوم ہوا کہ دولہا صاحب وہاں سے غائب ہو چکے تھے۔

مجھے ہے یاد وہ سب جو کبھی ہوا ہی نہیں
اگر یہ حال ہے دل کا تو کوئی سمجھائے
تمہیں بھلانا بھی چاہوں تو کس طرح بھولوں
کہ تم تو پھر حقیقت ہو، کوئی خواب نہیں
گھر نزدیک آگیا تھا، ڈھولک کی آواز یہاں تک سنائی دے رہی تھی۔ وہ بہت آہستگی سے
گیٹ کھول کر گھر میں داخل ہو گیا تھا۔

☆☆☆

رات آدھی سے زیادہ بیت گئی تھی مگر نیند آنکھوں سے ایسی غائب ہوئی تھی کہ بار بار کروٹیں
بدلنے کے بعد وہ جیسے تھک کر اٹھ بیٹھا تھا۔ باقی سب لوگ تھوڑی دیر پہلے ہی ڈھولک پیٹ کر، گلے
پھاڑ پھاڑ کر گانے کے بعد تھک ہار کر سونے کے لیے گئے تھے۔ جوں جوں شادی کا دن نزدیک آتا
جا رہا تھا ان لوگوں کا جوش و خروش بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ آج بھی انہوں نے شام ہی سے خوب ہنگامہ کر
رکھا تھا۔ وہ اسٹوڈیو سے واپس آیا تو محفل اپنے عروج پر تھی۔ چھوٹی چچی اور تانی اماں دو بیٹیوں پر گونا گونا
رہی تھیں۔ سدرہ سلائی مشین سنبالے بیٹھی تھی اور ڈھولک بد قسمتی سے میر اور مہران کے ہتھے چڑھ گئی
تھی اور تو اور اسل بھائی بھی اپنی مصروفیت میں سے وقت نکال کر نچانے کیسے یہاں آ بیٹھے تھے۔
سوریا کو پتا نہیں کیا ہوا تھا وہ کھٹنوں میں منہ دیے صوفے میں دھنسی بیٹھی تھی۔

”ارے دو لہا میاں! کبھی دو گھڑی ہمارے پاس بھی بیٹھ جایا کرو۔“
بڑی چچی نے اسے اپنے کمرے کی طرف جاتا دیکھ کر آواز لگائی تو وہ پلٹ کر وہیں آ بیٹھا۔ بڑی
چچی اس سے ایک دو باتیں کرنے کے بعد دوبارہ تانی اماں سے مختلف رسومات کو ڈیکس کرنے لگی
تھیں۔ وہ یونہی بے دلی سے وہاں بیٹھا رہا۔

”ارے ہوا کچھ نہیں۔ کل سے ایک ہی ضد پکڑ رکھی ہے کہ شادی پر پانچ جوڑے بنواؤں گی۔
ارے سب نے چار چار جوڑے بنوائے ہیں۔ اس کو پانچواں بنا دیا تو باقی بھی ماؤں کے سر ہو جائیں
گی۔“

تانی اماں کی جھنجھلائی ہوئی آواز پر وہ اپنے خیالوں سے چونکا۔ سوریا کے انداز نشست میں کوئی
تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اسل بھائی جو جب سے اس کی ناراضگی کی وجہ پوچھ رہے تھے۔ اپنی جگہ سے اٹھ
کر اس کے برابر جا بیٹھے تھے اور اب اسے اپنے بازو کے گھیرے میں لیے بڑی محبت سے اس سے
پوچھ رہے تھے۔ وہ بھیکی پلکیں لیے، قالین پر نظریں جمائے بالکل ایک ضدی بچی کی طرح لگ رہی
تھی۔ چہرے پر ناراضی کے تمام اثرات موجود تھے۔

”تو ٹھیک ہے بھی اگر ایک سوٹ کے بدلے ہماری گڑیا کے چہرے پہ مسکراہٹ آ سکتی ہے تو
ہمیں یہ سودا مہنگا نہیں۔“ اسل بھائی نے سر جھٹکا اور جب سے والٹ نکال کر ہزار ہزار کے کئی نوٹ
نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔

نہیں آتے کہ کہیں ہم تیرہ بختوں کا سایہ تمہاری خوشیوں پر نہ پڑ جائے ہم نہیں چاہتے کہ ہم کسی محفل
میں جائیں اور لوگ ہمیں منحوس سمجھتے ہوئے ایک کونے میں بٹھا دیں۔ یہ سب میرے لیے نیا ضرور
ہے مگر عجیب نہیں۔ اپنے بچپن میں میں نے کئی بار اپنی ماں کو اس صورت حال کا سامنا کرتے ہوئے
دیکھا تھا اور مجھے اندازہ تھا کہ میرا مقدر مجھ سے ایک چیز چھینے کا تو اس کے ساتھ ہزار باتوں سے خود
مجھے دست بردار ہونا پڑے گا مجھے علم تھا کہ اللہ مجھے صرف ایک دکھ دے گا اور اس کے ساتھ ہزاروں غم
میرے اپنوں کی دین ہوں گے۔ سو تم مجھ سے شکوہ مت کرو، میں اپنے گھر میں بیٹھ کر بھی تمہاری
خوشیوں کو شیر کر سکتی ہوں۔“

”خوشیاں۔“ وہ زیر لب دہراتا ہوا اپنے دل میں اس لفظ کو کھوجنے لگا۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر بیٹھیں۔ دن بھر کی جلتی جلتی کائنات
رات کے آغاز میں ٹھنڈی پڑ چکی تھی، ہوا کے جھونکوں میں قدرے تیزی تھی اور صحن کی دہائی دیوار کے
ساتھ لگے شہتوت کے درخت اس ہوا کے زور پر ہولے ہولے جھونے لگتے تھے۔ آسمان پر ادا حورا
چاند ہولے ہولے مغرب کی سمت سرک رہا تھا۔ صائمہ کا آدھا جود اس ادھورے چاند کی نیم جان سی
چاندنی کی زد میں تھا اور خود وہ مکمل طور پر اندھیرے میں بیٹھا تھا۔

”ای کو تمہاری شادی کی خبر سن کر کافی دھچکا لگا تھا۔ اگر تم پہلے سے انہیں اطلاع دے دیتے
تو۔۔۔“ وہ بات نامکمل کر چھوڑ کر خواخوہی سر جھٹک کر مسکرا دی تھی۔

”وہ ایک بار پھر مجھے ایسے راستے پر چلتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھیں جس کے درمیان میں پہنچ کر
مجھے واپسی کا سفر طے کرنا پڑتا اور واپسی کا سفر بعض اوقات بہت اذیت ناک ہوتا ہے نوروز۔“ اس کی
آواز میں کمی سی گئی تو وہ بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”تم اب جاؤ، امی اٹھ گئیں تو ان کی باتوں میں تمہیں دیر ہو جائے گی۔“ وہ اس کی طرف سے
رخ موڑے کھڑی تھی، وہ دھیرے دھیرے سیڑھیاں اترتا ہر دلی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔
”اور ہاں کوشش کرنا کہ اب تم یہاں زیادہ نہ آؤ یہ تمہارے حق میں بھی بہتر ہوگا اور میرے حق
میں بھی۔“

صائمہ کا لہجہ مضبوط تھا۔ اس کے دل سے خون کا ایک قطرہ درد بن کر نکلا اور پورے وجود میں
سرایت کر گیا۔ اس نے قدم اٹھا کر دلیز کے پار رکھا تو پھر پلٹ کر نہیں دیکھا۔

میں بھول جاؤں تمہیں یہ ہی مناسب ہے
مگر بھلانا بھی چاہوں تو کس طرح بھولوں
کہ تم تو پھر بھی حقیقت ہو کوئی خواب نہیں
یہاں تو دل کا یہ عالم ہے کیا کہوں کم بخت
بھلا سکا نہ یہ وہ سلسلہ جو تھا ہی نہیں
وہ اک خیال جو آواز تک گیا ہی نہیں
وہ ایک بات جو میں کہہ نہیں سکا تم سے
وہ ایک ربط جو ہم میں کبھی رہا ہی نہیں

”یہ لو اور بہت ہی زبردست سا سوٹ ہونا چاہیے، جسے پہن کر ہماری گڑیا بالکل شہزادی لگنے لگے۔“ ارسل بھائی اسے ہمیشہ کسی ننھی بچی کی طرح ہی ٹریٹ کیا کرتے تھے۔ سویرا پیسے تھانے کے بجائے چہرہ موڑ کر بغور انہیں دیکھنے لگی تھی۔

”ارے بھئی، لونا۔“ شفقت، محبت ان کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ لہجے سے بھی چھلک رہی تھی۔ سویرا نے ہاتھ بڑھا کر وہ میسے لے لیے تھے۔ پھر نوروز کی طرف دیکھا اور ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ چند لمے اسے دیکھتی ہی رہی تھی۔ بہت عجیب سا انداز تھا، اس کا شکوہ کرتا ہوا۔ کچھ جتا ہوا۔

”شاید سویرا کی خواہش تھی کہ ارسل بھائی کی جگہ میں۔“ اس نے نظروں کا زاویہ بدلتے ہوئے سوچا، عین اسی لمحے سویرا اٹھی تھی اور بھاگتی ہوئی لاؤنچ سے باہر نکل گئی تھی نوروز کو ایک لمحے کے لیے انسو ہوا۔

”چلو کوئی بات نہیں، کل اسے اپنے ساتھ بازار لے جاؤں گا۔ اپنی مرضی سے جو خریدنا چاہے گی، لے دوں گا۔“

اس نے دل ہی دل میں ارادہ باندھا، خود کو تسلی دی اور سونے کی نیت سے اوپر چلا آیا تھا۔ مگر اس شور میں نیند کا آنا محال تھا۔ وہ یونہی کانوں پہ تکیہ رکھے لیٹا رہا تھا۔ اور اب جب ہر طرف سکون پھیل گیا تھا تو نیند آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی۔ اس نے کمرے سے باہر نکل کر لاؤنچ میں جھانکا۔ ہر چیز جوں کی توں بڑی تھی۔ عین وسط میں پھٹی ہوئی ڈھولکی، سدرہ کی سلائی مشین، صوفوں پر بکھرے رنگین کپڑے اور چائے کی خالی کپوں سے بھری ہوئی ٹرے۔

”پتا نہیں ہر روز ان لوگوں میں اتنی انرژی کہاں سے آ جاتی ہے؟“ وہ سوچتے ہوئے پلٹا تھا تب ہی اس کی نگاہ پیچھے برآمدے میں کھلنے والے دروازے پر جا پڑی۔ ایک لمحے کے لیے اسے لگا جیسے وہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ پریشان ہوتے ہوئے فوراً ہی زینہ اترنے لگا تھا۔ شادی والے گھر میں ایسی لاپرواہی کوئی بہت بڑا نقصان بھی پہنچا سکتی تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا مختلف چیزیں پھلا گتلا دروازے تک پہنچا جو واقعی کھلا ہوا تھا۔

”حد ہوئی ہے لاپرواہی کی، اگر تایا اب میری جگہ ہوتے تو اسی وقت اس لاپرواہی پر سب کو لائن حاضر کر لیتے۔“ اس نے بڑبڑاتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔

چاند پورا تھا اور اس کی اجلی چاندنی میں پورا لان جگمگا رہا تھا۔ اس نے گہری سانس لے کر ڈھیر سارے پھولوں کی ملی جلی مہک اپنے اندر اتاری اور سرسراہٹ ہو اسے لطف اندوز ہونے کے لیے لان میں ٹہلنے لگا، تب ہی چھپلی دیوار کے ساتھ لگے امرود کے چھوٹے سے درخت کے پیچھے ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی وہ یونہی چلتا چلتا ادھر آ گیا۔ امرود کے درخت کے پیچھے اسے کسی بیوے کا شائبہ ہوا تھا۔

”کون ہے۔۔۔؟“ اس نے ٹھٹھک کر رکتے ہوئے یونہی اپنی تسلی کرنی چاہی تھی مگر اس کے جواب میں کوئی تھا جو تیزی سے بھاگ کر بیری کے گھنے درخت کی طرف بھاگتا تھا جس کی شاخیں بڑھ کر زمین کو چھو رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے اس کی ریڑھ کی ہڈی نہیں سننا نہ ہی دوز گئی تھی۔

”اے خبردار! رک جاؤ۔“ وہ خود کو ہر قسم کی صورت حال کے لیے تیار کرتا ہو چلا یا تھا اور ایک

ہی جست میں اس تک پہنچ کر ایسے کھینچ کر بیری کے جھنڈ میں چھپنے سے روکا تھا، اس کے زوردار جھٹکے کے جواب میں نسوانی آہ ابھری تھی اور نوروز اپنی جگہ ساکت ہو گیا تھا۔

وہ کون ہو سکتی تھی، اس کا اسے اندازہ تھا مگر دل نے پوری شدت سے خواہش کی تھی کہ ایسا نہ ہو۔ اپنے منجند وجود کو حرکت دیتا وہ اس تک آیا تھا۔ چادر میں پلٹا وجود زمین پر گرا ہوا تھا۔ اس کے آگے بڑھنے سے قبل ہی وہ سنبھل کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ نوروز کی کیکپائی انگلیوں نے چہرے سے لپٹے نقاب کو ایک جھٹکے سے ہٹایا تھا۔

”کاش! اس ایک چہرے کو یہاں دیکھنے سے پہلے مجھے موت آگئی ہوتی۔“ اس کے دل نے دعا کی تھی سویرا لڑکھڑاتی ہوئی دیوار کے ساتھ جا لگی تھی۔ نیم تاریکی میں اس کا سفید پڑتا چہرہ اسے بخوبی دکھائی دے رہا تھا۔

”کہاں جا رہی تھیں تم۔۔۔؟“ وہ سرد آواز میں غزایا تھا۔ سویرا کے لیے سانس لینا مشکل ہو گیا تھا۔ اس نے اس صورت حال کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

”میں پوچھ رہا ہوں، کہاں جا رہی تھیں تم۔۔۔؟“ اس کا کھر درا ہاتھ یک لخت ہی اس کی گردن پر جم گیا تھا۔ سویرا کی پھٹی پھٹی آنکھوں سے آنسو نکل کر اس کی کلائیوں پہ گرنے لگے تھے۔ وہ خوف کے مارے خود میں جینے کی ہمت بھی پیدا نہ کر سکتی تھی۔

”بولو جواب دو۔“ شدید غم و غصے سے اس کی گرفت خود بخود سخت ہوتی چلی گئی تھی۔

”نہیں، آپ کو جواب نہیں دوں گی، آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گی۔“ وہ گھٹی گھٹی آواز میں چلائی تھی۔

”کیا ہو رہا ہے یہاں۔۔۔؟“ حد درجہ متعجب مانوس آواز بہت قریب سے سنائی دی تھی۔

نوروز ایک جھٹکے سے اسے چھوڑ کر خطاب کی طرف پلٹا تھا۔

”تائی اماں۔۔۔ تائی اماں! آپ نے دیکھا، یہ کیا کرنے چلی تھی، دیکھ رہی ہیں آپ یہ، یہ۔“ الفاظ اس کی زبان کا ساتھ نہیں دے پا رہے تھے۔

سیاہ چادر میں چھپا وجود، پاؤں کے پاس گرا ہوا چھوٹا سا بیگ، وہ بھلا کیا پوچھتیں، سب کچھ تو صاف صاف دکھائی دے رہا تھا۔

”سویرا۔۔۔!“ ان کے لہجے میں ایسی بے یقینی تھی کہ سویرا اندامت کے مارے زمین میں گر گئی تھی۔

”یہ کیا کرنے چلی تھی سویرا تجھے ہمارا خیال نہیں آیا۔“ وہ گہرے صدمے کے زیر اثر تھیں۔

”اگر کچھ ہو جاتا۔“ کا روح فرسا خیال ان کے دھڑکتے دل کو ساکت کر رہا تھا۔ سویرا ایک قدم آگے بڑھی مٹی اور ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح لڑکھڑا کر تائی اماں کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ تائی اماں کے بے جان ہوتے ہوئے بوڑھے بازوان کے پہلو میں لٹک رہے تھے۔

”مت کرو یہ مکر و فریب۔“ نوروز نے وحشت کے عالم میں اسے بازو سے کھینچ کر تائی اماں سے علیحدہ کر دیا تھا۔

”تمہارا یہ فعل اتنا گھٹیا اتنا بچ ہے کہ تم سے کوئی ہمدردی نہیں کی جاسکتی۔“ وہ مٹھیاں بھینچ کر

دھاڑا تھا۔ سویرا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے، لرزتے کانپتے وجود کے ساتھ تائی اماں پہ نظریں جمائے کھڑی تھی۔

”میرا دل چاہ رہا ہے، میں تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر کے یہیں اس زمین میں دفن کر دوں۔“ غم کی شدت نوروز کو ہوش و حواس سے بے گانہ کیے جا رہی تھی۔

”نوروز! آہستہ بولو خدا را اپنی آواز اونچی مت کرو۔“ تائی اماں کی آواز ان کے حلق میں گھٹی جا رہی تھی۔

”تم ادھر آؤ۔ چلو میرے ساتھ۔“ تائی اماں کو اس صورت حال سے نبٹنا تھا۔ انہوں نے سویرا کو کلائی سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تھا مگر نوروز درمیان میں آگیا۔

”نہیں تائی اماں! یہ اس طرح دوبارہ۔“

”نوروز! تم اس وقت خاموش رہو۔“ انہوں نے ڈپٹ کر کہا اور سویرا کو کھینچتی تقریباً بھاگتی ہوئی گھر کے اندرونی حصے کی طرف بڑھیں۔

”اس نے ہم سب کا اعتماد توڑا ہے۔“ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ان کے پیچھے تھا۔ سسکتی ہوئی نیم جان سی سویرا خود بخود تائی اماں کے ساتھ کھٹکتی جا رہی تھی۔

”نوروز! چپ ہو جاؤ۔“ تائی اماں کی لہجہ التجائیہ تھا۔ وہ اسے لیے سیدھا اپنے کمرے میں آگئی تھیں۔ دھاڑے دروازہ کھولا ہوا نوروز بھی وہیں پہنچ گیا تھا۔

”اے اپنی اس حرکت کا جواب دینا ہوگا۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں، اس سے کہ۔۔۔“

”لیکن میں آپ کو کچھ بھی پوچھنے کا حق نہیں دیتی۔“ رونی ہوئی سویرا ایک دم چیخ اٹھی تھی۔

”کون ہوتے ہیں آپ میرے؟ کیا لگتے ہیں؟ کیوں جواب دوں میں آپ کو؟ کس ناتے سے آپ مجھ سے یہ سوال جواب کر رہے ہیں؟ یہ سامنے کھڑی ہیں آپ کے جنہوں نے مجھے ماں بن کر پالا ہے۔ یہ سوال کریں گی تو میں جواب دوں گی۔ یہ سزا سنائیں گی تو میں سن لوں گی۔ یہ ماریں گی تو میں سہہ لوں گی۔ میں اس گھر کے ایک ایک فرد کے سامنے جواب دہ ہو سکتی ہوں مگر آپ کے سامنے نہیں۔ صرف آپ کے سامنے نہیں۔ آپ اپنا ہر حق کھو چکے ہیں۔ ہر مقام پر مجھے مایوس کر کے۔۔۔“

سویرا پھٹ پڑی تھی۔ نوروز دم بخود کھڑا تھا اور تائی اماں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

”خدا نے تمہاری عزت بچالی ہے، اس کا کچھ خیال کرو۔ یوں اپنے ہاتھوں اپنا تماشا مت بناؤ۔ یہ سارا گھر نشے کی پڑیا کھا کر نہیں سو رہا۔ کوئی آگیا تو تمہیں منہ چھپانے کو جگہ نہیں ملے گی۔“

وہ گھٹنوں میں منہ دے کر سکنے لگی، تب وہ نوروز کی طرف پائیں جو کسی بت کی طرح کمرے کے وسط میں ایستا وہ تھا۔

”نوروز بیٹا تم جاؤ اسے کمرے میں۔“ اس کا بازو تھام کر انہوں نے بہت نرمی سے کہا۔ وہ گم صم سا دھندلائی آنکھوں سے آنکھیں دیکھ گیا۔

”نوروز بیٹا! میری جان، اتنے پریشان مت ہو۔ کچھ نہیں ہوا۔“ وہ اس کا چہرہ تھام کر اسے تسلی دینے لگیں تب اس نے ذرا سی پلکیں جھپکیں۔

ایک تہا آنسو اس کی پلکوں پر آکر ٹھہر گیا تھا تائی اماں نے اس کے ہونٹوں پر کپکپاہٹ اترتے دیکھی تو ٹھہرا ہی گئیں۔

”نوروز!“ انہوں نے پکارا تھا اور نوروز بھر بھری مٹی کی طرح زمین پر بیٹھتا چلا گیا تھا۔ اپنی بہت سختی سے بھنچی ہوئی مٹھیوں پر سر گر گئے وہ بہت اذیت میں لگ رہا تھا۔ تائی اماں نے بے قرار سا ہو کر اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا اور وہ ان کی دونوں کلاسیاں پکڑے کسی نو عمر بچے کی طرح ٹوٹ کر رو دیا تھا۔

تائی اماں کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔ اس طرح تو وہ اپنے ماں باپ کی موت پر بھی روتا دکھائی نہیں دیا تھا۔ اسے اپنے سینے میں بچتے ہوئے تائی اماں کے لیے اپنی سسکیوں کو روکنا محال ہو گیا تھا۔



”تایا ابا کے کمرے میں میننگ چل رہی ہے، سمجھ میں نہیں آتا معاملہ کیا ہے؟ ایسی رازداری اس سے پہلے بھی نہیں برتی گئی۔۔۔۔“ اظفر کے پیٹ میں مسلسل درد ہو رہا تھا۔

”میننگ کے شرکاء کے نام بیان کیے جائیں، تاکہ معاملے کی نوعیت کا اندازہ لگایا جاسکے۔“ سردہ بھی کھونجے لگی۔

”تایا ابا، تائی اماں، ارسل بھائی اور چھوٹی چچی۔۔۔۔“

”ہائیں بڑی چچی اور وہ خاندان کے سب سے عقل مند ذہین و فطین شیریں بھیا۔“ مہران نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ دونوں تو خیر بازار گئے ہوئے ہیں، تشویش کی بات تو یہ ہے کہ اس میننگ میں نیلو بھیا بھی کو بھی شامل نہیں کیا گیا۔“ اظفر کی اطلاع پر نیلو بھیا بھی کامنہ بن گیا تھا۔

”چھوٹی عمر کی شادی کی یہ ہی تو مصیبت ہے، بندے کا عہدہ بڑا ہو جاتا ہے لیکن شمار نا سمجھ لوگوں میں ہی ہوتا ہے۔“

”تو گویا آپ در پردہ ہمیں نا سمجھ قرار دے رہی ہیں۔“ انیقہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

”در پردہ کیوں؟ وہ تو ڈنکے کی چوٹ پر کہہ رہی ہیں۔“ مہران نے پھوٹ ڈلوانے کی کوشش کی۔

”انورہ دفع کر دو اس بات کو، میں کھون لگا کر آتا ہوں کہ اصل معاملہ کیا ہے؟“ اظفر اٹھا تو معیز بھی اس کے پیچھے لپکا تھا۔ باقی سب لوگ شدت سے اس کا انتظار کرنے لگے۔ ذرا دیر بعد معیز اڑی

اڑی رنگت کے ساتھ ندو، مدد پکارتا بھاگا چلا آیا تھا۔

”کیا ہوا؟“ شہلانے عجلت میں پوچھا۔

”اظفر، اظفر، بھنسن گیا۔“

برخاست ہوگی اور وہ باہر نکلنے کی کوشش میں پھنس کر رہ گئے۔“ اس اندوہناک خبر پر وہ سب ہی بھاگ کھڑے ہوئے تھے اور جب بمشکل اسے کھینچ کھانچ کر واپس لاؤنچ میں لانے میں کامیاب ہوئے تب چھوٹی چچی ہنسی مسکراتی چلی آئیں۔

”مبارک ہو بھئی سب کو۔“

”یہ کون سا موقع ہے مبارک باد دینے کا؟“ اظفر اپنی گردن سہلارہا تھا۔

”ارے یہ ہی تو موقع ہے مبارک باد کا خصوصاً تمہارے لیے۔“

”ہائیں! کیا مطلب؟“

”بھئی ایک خوش خبری ہے تم سب لوگوں کے لیے۔“ چچی ان کا تجسس بھڑکار رہی تھیں۔

”جلدی سنائیں نا۔“

”نوروز کی شادی کے ساتھ ایک اور شادی طے پاگئی ہے۔“

”کیا؟ کس کی؟“ اس کی حیرت دیکھنے لاقی تھی۔

”اظفر اور سویرا کی۔“

”ہاں۔۔۔“ سب ایک ساتھ اظفر کی طرف پلٹے جو ”نہیں“ کی آواز لگا کر صوفے پر لڑھک گیا تھا۔

”تین دن میں ایک اور شادی کی تیاری۔۔۔ کیسے ہو گا یہ سب؟“ سدرہ اور انیقہ چلا اٹھیں۔

شہلا اور رشنا، سویرا کے کمرے کی طرف بھاگی تھیں۔ مہراں اور معیز اظفر کو اٹھائے بھٹکڑا ڈال رہے تھے۔

☆☆☆

اگلے چند روز سب کے لیے بے حد پریشانی میں گزر رہے تھے۔ نو جوان پارٹی ایک ساتھ دو

شادیوں کی تیاری میں بے حال ہو گئی تھی بزرگ خواتین نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے سے

سوال کرتیں۔

”ہم نے ٹھیک کیا نا؟“

سویرا اپنے کمرے تک محدود ہو گئی تھی۔ تائی اماں غیر محسوس انداز میں چوبیس گھنٹے اس کے آس

پاس منڈلائی رہیں۔ نوروز کے کمرے کا دروازہ ان تین دنوں میں بس کبھی کبھار ہی کھلا تھا۔

جوں جوں شادی کا دن نزدیک آتا گیا، توں توں اس کے چہرے پہ تفکرات کے سائے مزید

گہرے ہوتے گئے تھے۔ اس دن کے واقعہ کے بعد تائی اماں نے اسے ایک بار بھی بولتے نہیں سنا

تھا، بس ایک گہری چپ تھی جس نے اس کے ہونٹوں پہ مہر لگا دی تھی، سب لوگ اسے چھیڑ چھیڑ کر اظفر

کی مثال دیتے رہے جو اپنی شادی پر خود ہی دھمال ڈالتا پھر رہا تھا۔

”ارے ہم نے تو بڑے بڑوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔“ وہ شیریں بھیا کو چھیڑ رہا تھا جو عمر میں اس سے

بڑے تھے مگر کنوارے رہ گئے تھے۔

نوروز کی رسم مہندی کے بعد سویرا کا نکاح اظفر سے پڑھوایا گیا تھا وہ نچلے کمرے سے رخصت

282

ہو کر اوپر والے پورشن میں اظفر کے بچے سجائے کمرے میں آ بیٹھی اور اس رات اس نے اظفر کا نیا ہی

روپ دیکھا تھا۔ وہ بہت بولڈ اور پراعتقاد تھا۔ وہ جانتی تھی مگر یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ بے حد رومانٹک بھی

ہو سکتا ہے، اس کی استحقاق بھری شرارتوں اور معنی خیز جملوں نے ایک رات ہی میں اس کی ساری

اداسی کو گھبراہٹ اور شرم میں بدل دیا تھا، اگلے روز نایاب بیاہ کر اس گھر میں آئی تھی۔

نوروز اپنی ٹینشن میں اس سے ڈھنگ سے بات بھی نہ کر سکا، رونمائی کے ننگن اس کی کلائیوں

میں پہنا کر جو بیڈ پر گرنا تو صبح تک اپنا ہوش بھی نہ تھا، سدرہ ناشتالے کر کمرے میں آئی تو وہ تیز بخار

میں چنک رہا تھا۔ گھر بھر اس کے گرد جمع ہو گیا تھا، تائی اماں اس کا سراپنی گود میں رکھے آیتیں پڑھ

پڑھ کر پھونکتی رہیں۔ سویرا اپنے آپ میں چور بنی یارہا اس کے کمرے میں گئی اور دور سے ہی دیکھ کر

واپس آ گئی۔ نایاب گھبرائی گھبرائی سی پریشان بیٹھی تھی، اس کا دل بہلانے کو سدرہ اسے اپنے ساتھ

لے کر باہر آ گئی اور اس کی جھجک ختم کرنے کو سب کا تعارف کروانے لگی۔

”شہلا، مہراں، رشنا اور معیز چھوٹے چچا کے بچے ہیں۔ چھوٹے چچا کی عارف والا میں کاٹن کی

فیکٹری ہے۔ وہ زیادہ تر وہیں رہتے ہیں۔ چھوٹی چچی البتہ یہیں ہوتی ہیں۔“

پھر بڑے چچا اور بڑی چچی سے تعارف کروایا۔ وہ دونوں گاؤں میں ہوتے تھے اور ان کے

بچے شیریں بھیا اور انیقہ سے دل مل چکی تھی، باقی فیملی سے وہ پہلے سے متعارف تھی کہ بچپن میں یہاں آنا

جانا لگا رہتا تھا۔ سوا چنانیت اور خلوص کے اس منظر ہرے کے بعد نایاب کو ان سے کھل مل جانے میں

زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔

☆☆☆

ٹھک کی آواز سے کھڑکی کے دونوں پٹ کھلے تھے اور گرد آلود ہوا کا پہلا ہی جھونکا مٹھی بھر خاک

سارے کمرے میں بکھیر گیا تھا۔ نوروز نے کتاب سے نظریں ہٹا کر دیکھا۔ کھلی کھڑکی سے نظر آتا

آسمان بے تحاشا گرد سے اٹا ہوا تھا اور ہوا زور پکڑتی جا رہی تھی۔ اس نے لمحے بھر کے لیے بڑی امید

سے کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھا مگر چند لمحوں تک کسی کی آمد نہ ہوئی تو مجبوراً اسے خود ہی

بیڈ سے اترنا پڑا تھا۔ دو تین ہفتے بدن سے چپکار بننے والا بخارا چھپی خاصی نقاہت سے نواز کر ہی واپس

گیا تھا۔ مگر نہ وہ اتنا سست ہرگز نہیں تھا۔ کھڑکی تک پہنچتے پہنچتے کمرے کے فرنیچر اور قالین پر گرد کی

ہلکی ہلکی سی تہ جم گئی تھی۔

کھڑکی بند کرنے سے قبل دونوں ہاتھ چوکھٹ پر جما کر اس نے گردن باہر نکال کر ذرا کی ذرا

نیچے جھانکا جہاں ایک شور ہنگامہ مچا ہوا تھا، تائی اماں چیخ چیخ کر سست الوجود لڑکیوں کو باہر نکلنے کے لیے

کہہ رہی تھیں کیونکہ شام کی چائے کے برتن ابھی تک تھیں لان میں دھرے تھے۔ نیلو بھی سارے

لان میں بھاگ بھاگ کر اپنے بچوں کے یہاں وہاں بکھرے کھلونے جمع کر رہی تھیں، رشنا اور شہلا

ہوا میں رنگ برنگے دوٹے لہر اکرنجانے کوں سا کھیل کھیل رہی تھیں۔ سدرہ اور انیقہ الگ سے کپڑے

اتارنے کے لیے اوپر بھاگی چلی آ رہی تھیں۔

283

”اف یہ آندھی بھی کس قدر اچانک۔“ جھوم جھوم کر ایک دوسرے سے ٹکراتے درختوں کو دیکھتے ہوئے وہ اذیت کی آدھی بات ہی سن پایا تھا۔

”گویا آندھی کو بھی ہارن بجاتے ہوئے“ بختیار ہاؤس“ میں داخل ہونا چاہیے۔“

اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے کھڑکی بند کر کے چٹنی چڑھائی اور پردہ کھینچ کر برابر کر دیا کہ آندھی اب شدت اختیار کرتی جا رہی تھی اور اسے اس لڑکی کا پورا خیال تھا جو بڑی محنت اور لگن سے ہر روز اس کمرے کو اپنے ہاتھوں سے سنوارا کرتی تھی۔ اس نے باقی کھڑکیاں چیک کرنے کے بعد کمرے کا دروازہ کھولا اور باہر نکل کر گرل یہ جھک کر نیچے جھانکنے لگا۔ گھر کے زیادہ تر افراد اس وقت مزے سے لاؤنج میں براجمان تھے۔ ٹی وی فل والیوم میں چل رہا تھا لیکن خبرنامے کے باعث تایا ابا کے سوا کوئی بھی اس طرف متوجہ نہیں تھا۔

تائی اماں اور چھوٹی چچی سر جوڑے صوفے پر بیٹھی تھیں۔ ارسلان پھائی فائلیں سامنے رکھے کافی مصروف نظر آ رہے تھے۔ شیری بھائی اور اظفر کی اپنی میننگ چل رہی تھی۔ لڑکیاں غالباً سب کی سب کچن میں مصروف تھیں۔ باہر چٹنی چٹکھاڑتی ہوا کی وحشت کا یہاں شائبہ تک نہ تھا۔ گھر کی تیسری کچھ اس طرح ہوئی تھی کہ سامنے والے برآمدے میں کھلنے والا کٹری کا مضبوط نقش دروازہ اور پچھلے برآمدے میں کھلنے والا دروازہ بند کر دیا جاتا تھا تو بیرونی ماحول اندرونی ماحول پر بالکل بھی اثر انداز نہ ہوتا تھا اور پر تلے بنے ہوئے کمروں کی دو قطاریں آسنے سامنے تھیں اور درمیان میں جو وسیع جگہ بچی تھی اسے ٹی وی لاؤنج کی شکل دے دی گئی تھی۔ چھت پورے گھر پہ ایک ہی ڈالی گئی تھی سواو پر کے کمرے سے نیچے کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔

وہ چند لمحے وہاں کھڑا رہنے کے بعد کمرے میں واپس چلا آیا تھا۔ بیڈ پر بیٹھنے سے قبل اس نے کھڑکی سے پردہ ہٹا کر باہر دیکھا جہاں گھپ اندھیرا تھا اور آندھی زوروں پر، وہ پتھکے کی رفتار تیز کرتا ہوا بیڈ پہ آگیا اور ابھی ورق گروائی کرتے ہوئے چند لمحے ہی گزرے ہوں گے جب کمرہ ایک دم اندھیرے سے بھر گیا روشنی بجھ گئی تھی اور اس کے پاس سوائے طویل سانس لینے کے اور کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ کتاب ایک طرف رکھ کے وہ چپ چاپ بند ہوتے پتھکے کی سرسراہٹوں کو سننے لگا۔ جوتاری کی اوٹ میں چھپی خاموشی کو کاٹتی جا رہی تھیں۔ باہر ہوائیں مزید زور آور ہو گئی تھیں اور جیسے کھڑکیوں کے پٹ توڑ دینے کو بے تاب سی ہو رہی تھیں۔

تب ہی دروازہ ہلکی سی آہٹ کے ساتھ کھل گیا تھا۔ کینڈل اسٹینڈ میں مومی شمعیں روشن کیے آنے والی شہلا تھی۔

”نوروز بھائی! نیچے آئیے نا، یہاں اکیلے کیوں پڑے ہیں؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ کہیں پھر سے بخار و خار تو نہیں ہو گیا؟“

وہ ایک تواتر سے بوتلی کینڈل اسٹینڈ سائڈ ٹیبل پر رکھنے لگی۔

”اللہ کچھ تو بولے نوروز بھائی! قسم سے اتنے اندھیرے میں تو مجھے ہر چیز جن بھوت یا چڑیل ہی نظر آتی ہے۔“ شہلا کے لیے ایک لمحے کی خاموشی ناقابل برداشت تھی۔

”کھانا تیار ہو گیا کیا۔۔۔؟“

”ہائیں، آپ کو ابھی سے بھوک لگنے لگی۔۔۔؟“

اس نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں۔ بھوک تو نہیں لگ رہی۔ وہ تو تم نے بولنے کو کہا تھا۔ میں نے یونہی پوچھ لیا۔“

اس کے قدرے معصومانہ انداز پر وہ بے اختیار ہنس دی۔ پھر دروازہ کھول کر باہر نکلتے نکلتے پلٹی۔

”اگر آپ اکیلے بور ہو رہے ہیں تو میں نایاب کو بجھوا دوں۔۔۔؟“ اس کے لہجے میں چھپی شرارت کو محسوس کر کے نوروز نے صرف مسکرا کر ہی اکتفا کیا تھا کمرے میں کافی جیس ہو گیا تھا۔ وہ ابھی اٹھنے کا سوچ ہی رہا تھا جب نایاب آگئی۔

”کھانا لے آؤں؟“

”نہیں، لائٹ آجائے پھر کھالوں گا۔“ اس کے نفی میں سر ہلانے پر وہ کھڑکیاں کھولنے کے بعد ٹیس کی طرف کھلنے والا دروازہ کھولنے لگی تھی۔ کھڑکیاں کھلنے سے کمرے میں موجود جس تیزی سے ختم ہونے لگا تھا۔ ہوا کا زور دم توڑ چکا تھا اور اب ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے بہت خوشگوار معلوم ہو رہے تھے۔

اس نے دیکھا، نایاب ٹیس پہ نکل گئی تھی۔ وہ بھی اٹھ کر چلتا ہوا کمرے سے باہر آگیا تھا۔ فضا میں خشک مٹی کی مہک ابھی بھی محسوس ہو رہی تھی اس نے ٹیس سے نیچے جھانکنے کی کوشش کی جہاں اس وقت نو جوان پارٹی نے آسمان سر پر اٹھایا ہوا تھا۔ ان سب کے درمیان گانوں کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ شہلا اور اذیت پھر بھی قدرے سر میں تھیں لیکن اظفر، معیز اور مہراں ایسی بھونڈی آواز میں گارہے تھے کہ اس کے لیے مسکراہٹ روکنا دشوار ہو رہا تھا۔

”ارے خدا کا واسطہ ہے گدھو! اپنی ڈھب چوں ڈھب چوں کا ولیم تھوڑا کم کر دو جس روز بھی لائٹ بند ہوتی ہے اور تم لوگ یہ خوفناک مقابلہ منعقد کرتے ہو، اس روز صبح دفتر جاتے ہوئے مجھے محلے بھر کی شکایتیں سننا پڑتی ہیں۔“

اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر ان پہ پھٹ پڑنے والے یہ شیری بھیا تھے۔

شکوہ نہ کر گلہ نہ کر

لائٹ بند ہے پیارے

ہم گرمی کے مارے

گاتے رہیں گے

شکوہ نہ کر۔۔۔۔

وہ آفت کے پرکالے کسی کو خاطر میں لانے والے نہ تھے۔

”مردم سب۔“ ان کی بیٹی ہوئی آوازوں کے جواب میں دھاڑے کھڑکی بند ہوئی تھی۔

تیرے ساتھ ہی جنیں گے

تیرے ساتھ ہی مریں گے

وہ ایک بار پھر کورس میں گانے لگے تھے۔ نوروز ان کی شرارت پر مسکراتا ہوا نایاب کی طرف

پلانا تو اسے پہلے سے اپنی طرف متوجہ پا کر ٹھنک سا گیا۔ چند ٹائیپے اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ اس کی اس حرکت سے کچھ سمجھ نہ پایا تو گردن موڑ کر دوسری جانب دیکھنے لگا تھا۔
 ”نوروز! آپ سے ایک بات پوچھوں؟“ وہ کچھ دیر بعد گویا ہوئی تھی۔
 ”آپ ان سب لوگوں کے ساتھ کھل مل کر کیوں نہیں رہتے؟“

وہ اس کی بات پر قد رے چونک سا گیا تھا۔
 ”نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ اس نے قطعی لہجے میں اس کی بات کی نفی کر دی۔

”لیکن میں نے تو محسوس کیا ہے۔ آپ ان سب کے درمیان موجود ہوتے ہوئے بھی موجود نہیں ہوتے۔ بہت الگ تھلگ محسوس ہوتے ہیں، سویرا ہے تو وہ آپ سے بات کرنے کو ترستی نظر آتی ہے۔ تائی اماں ہیں تو ان کی بے قرار نظریں آپ کے چہرے پر بچانے کیا کھوجتی رہتی ہیں، آپ بتایا ابا کی بات کو ہوں، ہاں میں ٹالتے رہتے ہیں تو اس لمحے وہ بہت افسردہ سے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ میں جانتی ہوں، آپ بہت کم گوانسان ہیں، بہت ریزور رہتے ہیں لیکن اگر صرف یہ ہی بات ہے تو ان سب لوگوں کو اب تک اس کا عادی ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ اتنے بے چین سے کیوں نظر آتے ہیں؟“ وہ اپنی الجھن بیان کرنے کے بعد اس کے جواب کا انتظار کرنے لگی تھی مگر وہ جوں کا توں رخ موڑے کھڑا رہا۔

”نوروز!“ نایاب نے آہستگی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”مجھے بھوک لگ رہی ہے، کھانے کو کچھ لے آؤ۔“ وہ بس اتنا کہہ کر کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا اور نایاب کچھ دیر تک اپنی جگہ سے ہل بھی نہ پائی تھی۔ چونکی تو اس وقت جب بتایا ابا کی گرج دار آواز کے ساتھ نیچے مکمل خاموشی چھا گئی، وہ سستی سے قدم اٹھائی آگے بڑھی۔ ایک نظر مرغ دان کے قریب بیٹھے نوروز پر ڈالی اور پھر نیچے چلی آئی، جہاں سب لوگ ”ربا میرے ربا“ اور انظر ”ابا میرے ابا“ گنگناتے ہوئے پناہ گاہ تلاش کر رہا تھا۔

”میرا شیوں کا گھر سمجھ رکھا ہے، بد بختوں نے، کوئی ادھر سے سر لگا رہا ہے تو کوئی ادھر سے تان اٹھا رہا ہے اللہ کا نام بھی بھولے سے بھی ان کی زبان پر نہیں آیا۔“ بتایا ابا بولنے پر آئے تو بولتے چلے گئے۔

”مقابلے میں شامل افراد نوٹ فرما لیں، کل سے مقابلہ نعتوں کا ہوا کرے گا۔“ مہراں نے سرگوشی کی جبکہ سدرہ سارے گھر میں اعلان کرتی پھر رہی تھی۔

”کل پچھلے لان میں میلاد منعقد کیا جائے گا، حاضرین سے شرکت کی درخواست ہے۔“
 ”تبرک کے طور پر کیا ملے گا۔“ انیقہ سدا کی چٹوری تھی۔

”بوندی۔۔۔ نہیں بداند۔۔۔ آں بوند ابا بندی۔“ سدرہ کے لیے انتخاب دشوار ہو رہا تھا اور ان ہی حرکتوں سے ذرا دیر بعد وہ لوگ ایک بار پھر ہنسی ٹھٹھول میں مصروف ہو گئے تھے۔

وہ رات خاصی بے چینی سے ٹکی تھی۔ بجلی نہ ہونے کے باعث کمروں میں گرمی اور جس بڑھ گیا تھا۔ جس جس کا داؤ چلا وہ اسٹور روم سے چار پائی نکال کر لان میں جا پہنچا۔ مہراں کو بھی یہ خیال سوچھا تھا مگر ذرا دیر سے۔ اس کے پیچھے تک آخری چار پائی بھی بک ہو چکی تھی اور اتفاق سے وہ چار پائی

میز کے ہاتھ لگی تھی اس کا ٹھانڈے سے کھلی فضا میں سوپا ان دونوں کو ہی گوارا نہ تھا سو آدھی رات کو وہ بھوت بن کر اسے ڈرانے کی کوشش کرتے رہے جو کہ قطعی طور پر ناکام ہو گئی تھی اس لیے کہ محترم معیز صاحب نے آیت الکرسی پر ایسا اندھا اعتقاد قائم کر رکھا تھا کہ اگر ان کی جگہ کوئی اصلی والے جن بھوت بھی آجاتے تو معیز انہیں ایک آدھ زوردار پھونک اور دو چار جھانپڑ رسید کرنے کے بعد کروٹ بدلتا اور آرام سے سو جاتا ہاں ایک ترکیب کی ناکامی کے بعد نوبت یہاں تک آن پہنچی تھی کہ ایک بندہ چار پائی اٹھائے آگے آگے اور دو عدد بندے نیکی اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہے تھے البتہ چار پائی اٹھانے والا بندہ ہر پھیرے میں بدل جاتا تھا اور صبح سویرے جاگنگ کے لیے اور نماز کے لیے اٹھنے والے افراد نے عجب منظر دیکھا تھا۔
 لان کے بچوں بیچ تین افراد سبز مسلی ہوئی گھاس پر جو خواب تھے اور ان کے نزدیک ایک عدد چار پائی اپنی خستہ حالت کے ساتھ بالکل خالی پڑی تھی۔

☆☆☆

نوروز ہاتھ روم سے نہا کر نکلا تھا جب کسی نے جلالت میں دروازے پر دستک دی۔

”آجائے۔“ نایاب کیلا تولیہ میز پر پھیلا رہی تھی۔ وہیں سے آواز لگائی تو ارسل بھائی کافی تیزی سے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

”نوروز! یارتیری آف وہا بیٹ شرٹ کہاں ہے؟ اس بجلی نے تو سارا کام خراب کر دیا۔ پینٹ تو استری شدہ مل گئی ہے مگر شرٹ۔“ انہیں آفس سے دیر ہو رہی تھی۔

”میںیں دارڈروب میں ہوگی ارسل بھائی! دیکھ لیجیے۔“ نوروز نے بال بناتے ہوئے کہا تو وہ نورواڈ ڈروب کھول کر کھڑے ہو گئے۔

”واہ بھائی! بڑے ٹھانڈے ہیں۔“ انہوں نے ہینگ کیے ہوئے استری شدہ کپڑے دیکھ کر ستائش بھرے لہجے میں کہا۔

”اجھی بچوں کا جھنجھٹ نہیں ہے۔ اسی لیے اتنے مزے میں ہو۔ ذرا ہمارے کمرے میں جھانک کر دیکھو، ڈریسنگ ٹیبل ادویات اور سیرپ سے بھر رہی ہے۔ بیڈ پر بچوں کی کاپیاں، کتابیں اور بچوں کی کاٹ میں ہماری آفس فائلز، جتنے قدم اٹھاؤ، اتنی ٹھوکریں کھاؤ، بچوں کے کھلونے بھرے ہوئے ہیں نا۔“

انہوں نے حیران کھڑی نایاب کی آنکھوں میں جھانکا اور شرٹ ہاتھ میں لیے یہ جاوہ جا، وہ یونہی ہونق بنی نوروز کی طرف پئی۔

”اب اتنا برا حال بھی نہیں، میں خود کئی بار گئی ہوں بھابھی کے کمرے میں۔“

”وہ مذاق کر رہے تھے۔“ اس نے جیسے اطلاع دی تھی تو وہ خفیف سی شرمندگی کے ساتھ اس سے ناشتے کے متعلق پوچھنے لگی اور ابھی باہر جانے کو پٹی ہی تھی جب دھاڑ سے دروازہ کھلا اور اندر داخل ہوتا مہراں ٹھنک کر رک گیا۔

”اوہ سوری نیا بھابی! میں بھول ہی گیا کہ آپ بھی۔“ اسے سامنے دیکھ کر وہ سرخ ہو گیا تھا۔
 ”کوئی بات نہیں۔“ وہ مسکراہٹ دہانی کمرے سے باہر نکل گئی۔
 ”نوروز بھیا! وہ کوئی استری کی ہوئی شرٹ مل جائے گی۔۔۔“ وہ کان کھجاتے ہوئے پوچھ رہا تھا اور نوروز کے پاس اس کی مسکین سی شکل دیکھ کر اور کوئی چارہ نہ رہا تھا کہ وارڈروب کھول کر اس کے سامنے رکھ دے۔

نایاب ناشتا لے کر آئی تو اس کے پیچھے پیچھے تاپا ابا بھی چلے آئے۔

”ہوں! ناشتا کیا جا رہا ہے۔۔۔؟“

”جی۔۔۔“ نوروز نے ٹرے اپنی طرف کھسکاتے ہوئے مختصر اُکھا تھا۔

”آپ بھی آئے نانا تاپا ابا۔“ نایاب نے جھٹ کر سی اٹھا کر بیڈ کے سامنے رکھی اور خود جلدی

سے پیالی میں دلیہ نکالنے لگی کہ تاپا ابا کو ناشتے میں دلیہ بے حد پسند تھا۔

”ارے بس بس بھئی، میں تھوڑا ہی لوں گا۔“ انہوں نے اسے روک دیا اور پہلا چمچ منہ میں

ڈال کر تعریف کیے بنا نہ رہ سکے۔

”بہت لذیذ ہے بلکہ اس نے تو مجھے میرے بچپن کی یاد دلادی ہے۔ پتا ہے ہماری بے بے اکثر ناشتے میں دلیہ ہی بنا کر دیا کرتی تھیں۔ اس وقت فرنیچ، فریزر کا تو عام آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سو ہماری بے بے رات کو ہی دلیہ بنا کر مٹی کی کٹوریوں میں بھر دیا کرتی تھیں۔ صبح سویرے ہم لوگ کھڑاؤں پہنچے مسجد سے بھاگے بھاگے آتے تو وہ کٹوریاں سامنے رکھے ہماری منتظر ہوتی تھیں۔ ہم اپنی انگلیوں سے ہی کھانا شروع ہو جاتے۔ ہمیں بے تابی سے کھانا دیکھ کر وہ مسکراتی رہیں اور ہم کھا پی کر دوبارہ بھاگ کھڑے ہوتے۔ کبھی بے بے سے پلٹ کر یہ بھی نہیں کہا کہ بے بے! تم دلیہ بہت اچھا بناتی ہو، اس میں سے تمہاری محبت کی خوشبو آتی ہے اور اگر ہم کہہ دیا کرتے تو وہ نجانے کتنی خوش ہوتیں۔“

تاپا ابا کسی سوچ کی افسردگی میں کھو گئے تھے، نایاب نے دیکھا، نوروز بالکل خاموشی سے کھانے

میں مصروف تھا، یوں جیسے اس وقت اس سے زیادہ ضروری کام اور کوئی نہیں۔

”بعض اوقات ہم لوگ اپنے لفظوں کو بیچ وقت پر اور طریقے سے استعمال نہیں کر پاتے اور یہ

ہی چیز بعد میں ہمارے لیے بچھتاوا بن جاتی ہے۔“ تاپا ابا جیسے خود سے کہہ رہے تھے۔

☆☆☆

”نوروز! بچے! کیا تم اس شادی پر خوش ہو؟“ خالہ نصرت نے پوچھا تو وہ نظروں کا زاویہ بدل کر شہتوت کے درخت سے جھوٹی چیزوں کو دیکھنے لگا تھا۔ آج طبیعت ذرا سنبھلی تھی وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ادھر چلا آیا۔

”ذرا دیکھو تو کیسا کھلایا ہوا ہے تمہارا چہرہ، جن کے دل خوش ہوں ان کے چہرے سے نظر آ جاتا ہے۔ وہ دیکھا نہیں اظفر کو۔ خوشی کیسے پھوٹ رہی تھی اس کے چہرے سے اور میں تو کہتی ہوں اس

سوراجی پر بھی ظلم ہی ہوا ہے۔ خاندان میں بہتیرے نوجوان تھے۔ کاروبار کرنے والے روزگار سے وابستہ لیکن اس کو باندھ دیا اس کھٹو کے لیے جسے ہر وقت ہنسی ٹھٹھول کے سوا کچھ اور سوچتا ہی نہیں۔ اب دیکھو ذرا شادی کے فوراً بعد سیر سپاٹا کر کے واپس بھی آ گیا، اے نوروز! تمہاری شادی بھی تو اس کے ساتھ ہی ہوئی ہے۔ تم لوگ کہیں کھوئے نہیں گئے؟“ خالہ نصرت اسے کرید رہی تھیں۔

”خالہ! میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ نینا نے بھی اصرار نہیں کیا تو پھر میں نے ارادہ بدل دیا۔“

”نیا۔۔۔؟“

”نایاب کی بات کر رہا ہوں گھر میں سب لوگ اسے نیا ہی کہتے ہیں۔“ اس نے جیسے جھنجھلا کر

وضاحت کی تھی۔ پھر کچھ دیر بیٹھنے کے بعد اس کا وہاں بھی دل نہ لگا تو وہ چلا آیا صائمہ گھر پہنچی سو اس کا مزید ٹھہرنا ممکن بھی نہ تھا۔

☆☆☆

گرمی زوروں پر تھی، ہوا بالکل بند اور کمرے جس زدہ۔ سدرہ کا تو جیسے سانس ہی گھٹنے لگا تھا۔ جونہی ذرا سورج ڈھلا، وہ عقبی لان میں چلی آئی۔ وائرل پمپ سے پائپ لگا کر اس نے پہلے یونہی کیاریوں میں پانی بھرا پھر ٹھنڈے ٹھار پانی سے ہاتھ منہ اور پاؤں دھونے کے بعد کھائے ہوئے درختوں، پودوں پر پانی بہانے لگی تب ہی گرمی سے بے زار انیقہ وہاں چلی آئی۔

”سدرہ پلیز! تھوڑی نظر کمرہ پر بھی۔“ وہ تخت پر گرتے ہوئے پکاری تو سدرہ نے فوراً پائپ

کارخ اس کی طرف موڑ دیا تھا۔

”ارے، ارے نہیں۔ میں ابھی کپڑے بدل کر آئی ہوں۔“

اس نے بری طرح پیچھے ہوتے کہا تو سدرہ نے ہنستے ہوئے برآمدے کے فرش پر پانی بہانا

شروع کر دیا تھا۔ انیقہ نے چھت پر لگا پنکھا فل اسپید میں چلا دیا تھا۔ ذرا دیر بعد قدرے ٹھنڈک کا

احساس ہونے لگا تھا۔ انیقہ وہیں تخت پر لیٹ کر کسی ڈائجسٹ میں محو ہو گئی۔ سدرہ گرد سے اٹے

درختوں پر خوب پانی برسا کر انہیں نکھارنے لگی۔ ارسل بھائی کا نیو بھی نیلو فر بھابی سے آنکھ بچا کر

وہیں چلا آیا تھا اور جامن کے درخت پر لٹکتے ٹائیں، ٹائیں کرتے تو توں کو پکڑنے کی سعی کرنے لگا تھا

اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا تو پھر سبز گھاس پر گرمی جامنیں اکٹھی کرنے لگا۔ سدرہ اسے بار بار

شرٹ سے ہاتھ صاف کرنے پر نوک رہی تھی جس پر جامن کے رنگ کا بجا اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

”تم لوگ ادھر ہو میں تمہیں سارے گھر میں تلاش کرتی پھر رہی تھی۔“

رشنا اپنے مٹھوسمیت وہاں آگئی تھی، گرمی اور پیاس کی شدت سے بے حال چیزیاں اپنی چونچیں

کھولے ہانپ رہی تھیں۔ کسی کو اپنی طرف متوجہ نہ ہوتے دیکھ کر وہ درخت کی شاخوں میں پھنسا پانی کا

کنورا ہی نکالنے لگی تھی جو اس وقت بالکل خشک ہو رہا تھا۔

”نیا کتنی اچھی ہے ناں، اتنے تھوڑے سے دنوں میں ہم سے اس طرح گھل مل گئی جیسے برسوں سے یہیں رہتی آئی ہو۔“ کیاری سے خشک پتے نکال کر باہر پھینکتے ہوئے سدرہ نے کہا تو رشنا اس کی

ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے نل کے پاس جا کر کٹورادھو نے لگی۔
 ”توبہ ہے۔ یہ رائسز بھی کتنا جھوٹ لگتی ہیں۔“ گھٹنے بھر سے رسالے میں محو انیقہ نے سر اٹھاتے ہوئے بلند آواز میں کہا تھا۔
 ”کیا مطلب۔۔۔؟“ پانی سے لہا لب کٹورادو بارہ شاخوں میں پھنساتے ہوئے پلٹ کر اس نے حیرت سے انیقہ کو دیکھا جو خاصی اکتائی ہوئی لگ رہی تھی۔
 ”ہاں نا، اب دیکھو یہ محترمہ راحت جیوں صاحبہ، ان کی ہر کہانی میں ساون بھی ایسے منایا جاتا ہے جیسے عید، بقر عید، جھولے ڈالے جاتے ہیں، ست رنگے دوپٹے رنگوائے جاتے ہیں اور تو اور ساون کے گیت بھی گائے جاتے ہیں۔“
 ”تو اس میں جھوٹ والی کون سی بات ہے۔ بعض زندہ دل لوگ ساون کی خوشی میں ایسا چھوٹا موٹا اہتمام کر ہی لیتے ہیں۔“
 ”کہاں کرتے ہیں بھی، اتنے سال ہو گئے۔ ساون آتا ہے، جاتا ہے۔ کبھی آس پڑوس میں ایسا اہتمام ہوتے میں نے تو نہیں دیکھا زیادہ ہی ہوا تو بارش کی خوشی میں سدرہ کوئی ڈش بنا کر کھلا دیتی ہے اور بس۔“ وہ غالباً گرمی کی وجہ سے زیادہ ہی جلی جھنی بیٹھی تھی۔
 ”تو اس میں قصور کس کا ہوا؟ تم لوگوں کا۔۔۔؟“ یہ اچانک ٹپک پڑنے والا اظفر تھا۔
 ”نہ ہو میں تم رائسز جیسی حساس اور دمینک ورنہ ساون اتنا روکھا پھیکا بھی نہ گزرے۔“
 ”کیا مطلب۔۔۔؟“ انیقہ نے پلٹ کر اسے گھورا۔
 ”مطلب یہ کہ اگر تم لوگ بھی تھوڑی سی ہمت کر لو تو تمہارا ساون بھی ایسا ہی رنگین ہو جائے گا جیسا ان ناول، افسانوں میں۔“
 ”نہیں، ویسا ساون پھر بھی نہیں ہو سکتا۔“ انیقہ نے مایوسی سے سر ہلایا۔
 ”وہ کیسے۔۔۔؟“
 ”وہ ایسے کہ ان کے ہر ناول میں ایک عدد ہیر و بھی موجود ہوتا ہے جو ساون کی پہلی بارش پر ہر حال میں ہیر وٹن کے گھر تک پہنچ جاتا ہے۔ درمیان میں خواہ کتنے ہی مسائل ہوں۔۔۔ ساون کی بارش اس اس کے لیے تمام راستے صاف کر دیتی ہے اب تم بتاؤ کہ باقی سب تو پورا ہو جائے گا مگر یہ ہیر و کہاں سے آئے گا۔“
 ”چچ، چچ۔۔۔ کاش میری شادی نہ ہوئی ہوتی تو میں تمہاری یہ حسرت ضرور پوری کر دیتا۔“ اظفر نے اظہارِ افسوس کیا۔
 ”وہ بے باقی داوے، یہ ہیر و کو کیسے معلوم ہوتا ہوگا کہ آج ساون کی پہلی بارش ہوگی۔“ رشنا ان کے قریب چلی آئی تھی۔
 ”ہو سکتا ہے کہ وہ محکمہ موسمیات میں ملازم ہو۔“ یہ اندازہ سدرہ کا تھا۔
 ”افوہ، کن باتوں میں پڑ گئے تم لوگ۔ چلو ہم بھی اس دفعہ ساون منانے کا اہتمام کرتے ہیں۔“ انیقہ کا جوش و خروش پورے عروج پر تھا۔
 ”تو ٹھیک ہے۔ ذرا بتاؤ کہ تمہاری یہ رائسز صاحبہ ساون کے لیے کن کن لوازمات پر زور دیتی

ہیں۔“ اظفر تیار ہوا بیٹھا تھا۔ انیقہ نے رسالے پر دوبارہ نظریں گاڑ دیں۔ رشنا بھاگ کر باقی پلٹن کو بلا لائی۔ اظفر اس مہم کا سربراہ اعلیٰ بنا بیٹھا تھا اور ہر کسی کو اس کی استعداد کے مطابق کام سونپ رہا تھا۔ جھولا ڈالنے کا کام نیلو بھائی کے سپرد تھا۔ ست رنگ دوپٹے رنگوانے کی ذمہ داری مہراں نے بخوش قبول کر لی تھی۔ سدرہ اور انیقہ نے پگوان تلنے تھے۔ بچوں کو جامنیں اکٹھی کرنے کی ذمہ داری دی گئی تھی۔ معیز کو منڈی سے آم لے کر آنا تھا، نیا نے معصومیت کی انتہا کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ جھولا لینے پر ہی اکتفا کر لے گی۔ سویرا نے ڈشز سے انصاف کر لینے کو ہی بہت سمجھا تھا اور سب سے اہم کام یعنی ساون کے گیت گانے کے لیے چھوٹی چچی کو چنا گیا تھا کہ ان کی آواز خاصی سریلی تھی۔
 اور یہ تمام کام بائٹنے کے بعد انتظار تھا تو صرف ساون کی پہلی بارش کا۔ لڑکے ہر روز کسی جھگڑالو بزرگ پر رنگ دار پانی پھینکتے، خواتین چھت پر چڑھ کر دور دور تک بالوں کی تلاش میں نظریں بھینکتی ہیں اور پھر مایوس ہو کر پلٹ آتیں۔ بچے جامنوں کی ٹوکریاں بھرے بارش کی دعائیں مانگتے رہے۔ مگر بارش نے جی بھر کے سب کو مایوس کیا تھا لیکن پھر وہ دن بھی آ ہی گیا جب ہانپتا ہو امیز سب کے بند دروازوں پر ٹکریں مارتا پھر رہا تھا۔
 ”ارے وہ آ رہے ہیں۔۔۔ وہ آتے جا رہے ہیں۔۔۔ اب نکل بھی آؤ۔“
 ”کون آ رہے ہیں۔۔۔؟“ نیلو فر بھا بھی آنکھیں ملنے ہوئے باہر نکلیں۔
 ”وہ کالے، کالے آ رہے ہیں۔“
 ”کون سنگھاڑے۔۔۔؟“ ان کے خیال میں صرف سنگھاڑے ہی کالے ہو سکتے تھے۔
 ”افوہ بھابھی! ساون کے بادل۔ اتنے سیاہ بالکل تو جیسے چیتنے چنگھاڑتے ہاتھیوں کے غول کی طرح بڑھے ہی چلے آ رہے ہیں۔“ اتنا سننا تھا کہ بھابھی جھولا لے کر عقبی لان کی طرف بھاگ گئیں سارے گھر میں تھر تھکی سی چل گئی۔
 ”جلدی ہاتھ ہلاؤ۔ بارش آنے سے پہلے تمام ڈشز تیار ہونی چاہئیں۔“
 سدرہ اور انیقہ نے فیصلہ کیا تھا۔ معیز منڈی کی طرف بھاگ نکلا۔ بچے جامنوں کے درخت کے ساتھ لٹک گئے۔ زوردار ہوانے ٹپاٹپ ایسی جامنیں گرائیں کہ ان کا سارا مسئلہ حل ہو گیا۔ مہراں ست رنگے دوپٹوں کا ڈھیر گود میں لیے سب کو آوازیں لگا رہا تھا۔
 ”ست رنگے دوپٹے لے لو۔ ست رنگے دوپٹے۔“
 پھر کچھ وقت ہی لگا تھا، ادھر سدرہ نے ٹھک سے چولہا بند کیا ادھر نیا نے پہلا جھولا لیا اور بارش کی نوخیز بوندیں جلتی جلتی دھرتی کے پیاسے ہونٹوں کو چھو گئیں۔ بچے بارش میں نہانے کے لیے بے تاب ہوئے تو اظفر نے ان کی شرمیں ہوا کے سپرد کیں اور خود جینز کے پانچے چڑھا کر ان کے ساتھ بچہ بی بی بن گیا۔ نیلو بھابھی نے جہازی ساز آموں کی قاشیں کاٹ کاٹ کر ڈشیں پھر دیں۔
 مہراں نے تخت برآمدے کے عین وسط میں کھینچ کر ارد گرد کرسیاں لگا دی تھیں۔ نوجوان یارٹی کا فیصلہ تھا کہ پہلے بارش میں خوب نہائیں گے پھر سب مزے سے کھائیں گے۔ لہذا بزرگ خواتین و حضرات کو پہلے ہی فارغ کر دیا جائے۔ لہذا شہلا اور رشنا نے مل کر چکن رول، قیمہ پلاؤ، سمو سے،

اہلی اور پودنے کی چٹنی کے ساتھ تخت پر سجا دیے تھے۔ ساتھ انواع و اقسام کے پھل تھے۔ چھوٹی چچی نے گھر میں لگے لیموں توڑ کر اسکنجبین کے جگ بھر دیے تھے۔
تالی اماں چائے کا فلاس بھر لائی تھیں۔ تایا ابا، ارسل بھائی اپنے کمروں سے باہر نکلے تو یہاں کارنگ ہی بدلا ہوا تھا۔

دھواں دھار برستی ہوئی بارش نے زمین سے آسمان تک پانی کی چادر سی تان دی تھی، مست جھومتی ہوئی ہوائیں۔ درخت ایک دوسرے سے ٹکرائے کر بے حال ہو رہے تھے۔ لڑکوں نے لان میں طوفان بدتمیزی مچایا ہوا تھا وہ بچوں کو یوں ایک دوسرے کی طرف اچھال رہے تھے جیسے ان میں ہوا بھری ہو، نیلو بھابھی زرد رنگت کے ساتھ انہیں کو سے جارہی تھیں۔

سورابرا آمدے کے ستون سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ باقی سب لڑکیاں برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی بارش کے اڑتے ہوئے چھینٹوں سے کھیل رہی تھیں۔ خوشیوں کے رنگ بہت نمایاں تھے۔ شیری بھیا کمرے میں بند نوروز کو بھی کھینچ کھا کر وہاں لے آئے تھے۔ وہ لوگ کھانے میں مشغول ہوئے تو نیا اور سدرہ بھاگ کر جھولے پہ آگئیں۔ نے جھولا سنبھالا اور سدرہ اسے ہواؤں کے حوالے کرنے لگی۔

اظفر کو نجانے کیا سوچھی تھی بھاگ کے آیا اور سدرہ کی جگہ لے لی، ایسے زور زور سے پٹینگیں دیں کہ جب پہلی مرتبہ نیا اوپر بہت اوپر گئی تو اس کا سانس تک رک گیا تھا۔ دوسری مرتبہ ایک چیخ بلند ہوئی تھی۔ نیچے سدرہ اظفر سے اٹھ رہی تھی اور پھر ان سب آوازوں کے درمیان ایک ایسی آواز ابھری تھی جو پورے ماحول پر حاوی ہو گئی تھی۔ اظفر نے ایک دم نیا کو تھام کر جھولا روک دیا تھا۔ وہ ہکا بکا کسی برآمدے کی سمت دیکھنے لگی جہاں کا منظر اس وقت کچھ اور ہی تھا۔

وہ نوروز تھا جو سب کے سب بیٹھا پیش کے عالم میں بول رہا تھا اور اگلے ایک لمحے میں اس نے جیسے بے قابو ہو کر اپنے ہاتھ کو حرکت دی تھی اور ان گنت برتن زمین پر گر کر لاتعداد ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ نیا غیر ارادی طور پر جھولے سے اتر کر پھاگتی ہوئی وہاں تک پہنچی تھی۔

”جولڑی کل تک میرے لیے قطعی نامناسب تھی، وہ آج آپ کے بیٹے کے لیے مناسب ہو گئی ہے۔ کل تک اسے اس گھر میں نہ لانے کی ہزار دلیلیں تھیں۔ سینکڑوں جواز تھے تو اب یہ دلیلیں، یہ جواز بے کار کیوں ہو گئے؟ میں نے ہمیشہ آپ کا کہا مانا ہمیشہ آپ نے جو پہنایا، میں نے پہنا جو کھلایا، میں نے کھلایا۔ آپ نے اپنی پسند کی لڑکی سے میری شادی کر دی، میں نے بخوشی اسے قبول کر لیا تو آپ آج یہ فیصلہ کر کے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟ یہ ہی ناکہ مجھ میں لڑنے کی جرأت نہ تھی اور آپ نے میری اس بزدلی سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔“

تایا ابا کے سامنے بہت گستاخی سے بولتا ہوا نوروز اپنے آپ میں نہیں لگ رہا تھا۔ سورابرا سے برداشت نہ ہو سکا تو وہ چیخ اٹھی تھی۔

”نوروز بھائی! آپ بہت بدتمیزی کر رہے ہیں، مت بھولے کہ یہ ہمارے محسن ہیں۔“
”ہاں، یہ ہمارے محسن ہیں، ان کے احسانات تلے میری گردن جھکی جا رہی ہے۔ یہ محسن ہیں جب ہی تو میں ان کے سامنے کبھی سر اٹھا سکا نہ زبان کھول سکا، میری ایک ایک سانس ان کی مقروض

ہے، ان کا یہ احسان کیا کم ہے کہ انہوں نے دو تین بچوں کو اپنے گھر میں پناہ دی۔ یہ احسان کیا کم ہے کہ انہوں نے اپنے بچوں کی لمبیتوں و شفقتوں میں ہمیں حصے دار بنایا۔ ہمیں پالا، پوسا، بڑا کیا اور سب سے بڑا احسان کہ تم جیسی لڑکی کو اپنی بہو بنایا۔ ہاں ان کے احسانات بہت ہیں میری عمر کے تمام سال ان کے احسان ہیں، مگر اب، اب یہ بوجھ اٹھانا بہت دشوار ہے۔ ان لوگوں نے میری بزدلی، میری کمزوری کو میرے ہی خلاف استعمال کیا ہے۔ انہوں نے میری زندگی کے سب سے بڑے فیصلے کو بیک جنبش رد کر دیا۔ وہ فیصلہ جو زندگی میں، میں نے پہلی بار صرف اپنے لیے کیا تھا۔ انہوں نے قبول نہیں کیا۔ میری ذات کو چٹکیوں میں مسل دیا اور آج اسی فیصلے پر اپنی پسند کی مہر لگا رہے ہیں مگر میری جگہ کوئی اور کھڑا ہے یہ ثابت کر دیا ہے انہوں نے کہ ماں باپ بننے اور ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے بہت فرق۔“ وہ ہر خند لہجے میں کہتا ہوا پلٹنا تھا پھیکے پڑے چہرے کے ساتھ ہر فرد اپنی جگہ ساکت تھا۔ چھوٹی چچی کی نگاہوں نے گیٹ تک جاتے ہوئے نوروز کو دیکھا تو وہ فوراً اپنی جگہ سے آگے بڑھیں۔ نیا کو پکڑا اور اسے پیچھے ہٹنے کی طرف لپکیں۔

”اس کے دماغ میں خناس سما ہوا ہے، نیا! تو اس کے ساتھ جا۔“
”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ میں کہاں۔۔۔؟ کسی لڑکے کو بھیجیں ان کے پیچھے۔“ وہ رو ہانسی ہو کر بولی تھی۔

”ابھی وہ واپس نہیں آئے گا۔ تو اس کے ساتھ جا، وہ جہاں بھی جاتا ہے۔ تو ساتھ ہوگی تو اسے لوٹ کر یہیں آنا پڑے گا۔“
چھوٹی چچی نے اسے زبردستی باہر نکالا۔ اس نے کونے سے مڑتے ہوئے نوروز کی جھلک دیکھی تو بے تحاشا بارش میں اس کے پیچھے بھاگتی چلی گئی تھی۔

☆☆☆

”اے اچھا ہوا جو تم سیدھے یہاں چلے آئے۔ مگر مینا! بات کیا ہوئی۔۔۔؟“
کوئی تیسری مرتبہ خالہ نصرت نے پوچھا تو نیا کو فٹ زدہ سے انداز میں پہلے انہیں اور پھر نوروز کو دیکھنے لگی جو سارا راستہ اس پر برستار ہاتھ مگر یہاں آ کر لب سے بیٹھا تھا۔ خالہ نصرت نے چند لمحے امید بھری نگاہیں اس کے چہرے پر جمائے رکھیں اور پھر دوبارہ سے شروع ہو گئیں۔
”ارے اس طرح منہ بنائے کیوں بیٹھے ہو؟ شکر کرو اس خواہ مخواہ کی چاکری سے تمہاری جان چھوٹی اب حواس ٹھکانے آئیں گے، ان کے جب گھنٹہ گھنٹہ بھر بل جمع کر دانے کے لیے قطاروں میں کھڑے ہونا پڑے گا۔ چار دن کے لیے تمہاری طرح کھن چکر بننا پڑے گا، تو آپوں آپ تمہاری طرف بھاگے چلے آئیں گے۔ غضب خدا کا ان لوگوں نے تو بھی تمہیں انسان سمجھا ہی نہیں، تمہارے مال و دولت پر عیش کر رہے ہیں۔ اور تم ہی سب سے کنگال وہ ایک ماچس کی ڈبیا جتنا، نوٹو اسٹوڈیو کھول رکھا ہے، میں پوچھتی ہوں، کیا یہ ہی تمہاری اوقات تھی۔ خود ان کے اپنے بیٹوں کو دیکھو ذرا بڑے پر خوب رقم لگا کر باہر بھجوا دیا۔ عیش کر رہا ہے وہاں، اس سے چھوٹا ہے تو وہ یہاں نوٹ چھاپ

رہا ہے۔ اب تو سنا ہے وہ اظفر بھی کاروبار میں ہاتھ بٹانے لگا ہے، اور وہ جو تمہارے بڑے چچا کا بیٹا ہے وہ الگ اپنی فیکٹریاں کھولے راج کر رہا ہے۔ ملے دے کر ایک تم ہی رہ گئے، کبھی پوچھتے تو سہی کے جائیداد میں سے جو تمہارے باؤ کا حصہ بنتا ہے، وہ کہاں گیا؟ ارے میں تو کہتی ہوں عدالت میں جاؤ اپنا حصہ وصول کرو تمہارے بھی عیش ہو جائیں گے۔“

خالہ نصرت کو تو اتر سے بولتے سن کر مارے حیرت کے نیا کام نہ کھل گیا تھا۔ ناگواری اس کے چہرے سے صاف واضح تھی اور اسے حیرت اس بات پر تھی کہ نور روز اتنی خاموشی سے یہ سب کیسے سنتا جا رہا ہے۔ چائے لے کر کمرے میں داخل ہوئی صائمہ نے اسے دیکھا تو شرمندہ ہو کر رہ گئی۔

”امی! آپ خواہنا وہ اسے بہک رہی ہیں۔ بہتر ہے، اس کا دماغ مزید خراب نہ کریں۔“
”لو بھئی، نئی بات سنو، میں کیوں بہکانے لگی اسے، وہ خود سمجھ دار ہے جانتا ہے سب، پوچھو نور روز سے جو میں نے ایک بات بھی چھوٹ کہی ہو۔“ خالہ تنک کر بولی تھیں۔

”بہر حال جو بات بھی ہے، تم لوگ چائے پیو اور گھر جانے کی تیاری کرو۔“ وہ دو ٹوک لہجے میں بولی تھی۔

”میں اب وہاں نہیں جاؤں گا۔“ نور روز کے انداز میں ہٹ دھرمی تھی۔

”وجہ۔۔۔؟“

”اس گھر میں مجھے ہمیشہ تیسرے درجے کا فرد سمجھا گیا ہے۔“

”بکواس کر رہے ہو تم یہ سراسر تمہارے دماغ کا خلل ہے یا شاید پھر امی کی باتوں کا اثر۔ میں خود وہاں آتی جاتی رہتی ہوں۔ میں نے بھی کوئی ایسی بات محسوس نہیں کی۔ گھریلو ذمہ داریاں ادا کرنے سے انسان تیسرے درجے کا فرد نہیں بن جاتا۔ ہر مہینے دو چار بل جمع کروادینے، بچوں کے اسکول میں حاضری دینے سے تمہارے عزت و وقار میں کمی نہیں آسکتی۔ وہ تمہارے تایا ابا اپنے محکمے میں انیسویں گریڈ کے آفیسر ہیں لیکن لان کی کاٹ چھانٹ وہ اپنے ہاتھوں سے کرتے ہیں۔ بچوں کو اسکول چھوڑنا، لڑکیوں کو کالج پک اینڈ ڈراپ کرنا، ہر ماہ سودا سلف کی خریداری۔ گھر کی ٹوٹی پھوٹی چیزوں کی مرمت، کبھی کسی ہاتھ روم میں پانی نہیں آ رہا۔ کبھی کسی کمرے کا فیوز خراب، کون کرتا ہے یہ سب کام؟ وہی ارسل بھائی، وہی شیریں اور وہی اظفر۔ تم ایسا کون سا گرا پڑا کام کرتے تھے جو تمہیں تیسرے درجے کا فرد سمجھا جاتا ہے۔ تم ان کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہو۔ عالی شان کمرے میں رہتے ہو، اس گھر کی سب سہولیات سے فائدہ اٹھاتے ہو، میں نہیں مان سکتی کہ تمہارے ساتھ کوئی امتیازی رویہ اختیار کیا گیا ہے۔ گھر چھوڑنے کی اور کوئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ مگر یہ نہیں جو تم بیان کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔“

صائمہ بہت صاف اور کھری لڑکی تھی۔ لگی لپٹی رکھنے کی قائل نہ تھی۔ سو صاف صاف کہہ دیا۔
نور روز سر جھکائے کہنے ہی لمبے یونہی بیٹھا رہا۔

”تم میرے یہاں آنے پر خوش نہیں ہو۔۔۔؟“ تھوڑی دیر بعد وہ گویا ہوا تھا۔

”تم نے ایسا کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیا جس پر میں خوشی سے نہال ہو کر تمہیں تنغے پہنائے لگوں۔“ صائمہ نے ساٹ انداز میں کہتی نیا کا ہاتھ پکڑے دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔

نور روز لب کاٹتے ہوئے سر جھٹک کر رہ گیا تھا۔

”ارے یہ تو بے وقوف ہے۔ تم اطمینان سے اسے اپنا گھر سمجھ کر یہاں رہو۔ جتنے دن تمہارا دل چاہے۔“ خالہ نصرت نے تسلی آمیز لہجے میں کہا تھا۔ وہ چپ چاپ وہاں چار پائی پہ نیم دراز ہو کر چھت جی کڑیاں گننے لگا تھا۔

☆☆☆

زیت کی راہ پہ گزرے ہوئے کچھ لمحوں

میں

ہم نے چاہا تھا تیرے ساتھ چلیں

تیرے ہونٹوں پہ ہنسی

آنکھ میں جگنو بن کر

دل کی دھڑکن میں سما کر

تجھے جیتا دیکھیں

تیرے خوابوں کو سجا لیں

اپنی ان آنکھوں میں

تیرے چہرے کی اداسی کو

خوشی میں بدلیں

اور کچھ رنگ بھی بھر دیں

تیرے روز و شب میں

پھر تجھے رنگ بہاروں کے چراتا دیکھیں

زیت کی راہ پہ گزرے ہوئے

کچھ لمحوں میں

ہم نے چاہا تھا

”صائمہ میری دوست تھی، بہت اچھی دوست۔ میری پوری زندگی میں وہ ایک ایسی لڑکی تھی جو چاہتی تھی کہ میں اپنے دل کی بات اس سے بیان کروں۔ اپنی خوشی، اپنا غم اس کے ساتھ بانٹوں۔ میں اس کے پاس بیٹھتا تو وہ بہانوں بہانوں سے مجھے بولنے پر مجبور کرتی۔ میں اداس ہوتا تو مجھے ہنسانے کو، ادوٹ پٹانگ باتیں کرنے لگتی۔ کبھی میرا کوئی چیز کھانے کو دل چاہتا تو میں سیدھا صائمہ کے پاس آتا، کسی مہینے میرا جب خرچ وقت سے پہلے ختم ہو جاتا تو میں ہمیشہ صائمہ کے پاس بھاگا آتا۔ ایسا نہیں کہ اس گھر سے مجھے محبت نہیں ملی، ضرور ملی، مگر میں جس پناہ کا متلاشی تھا، وہ مجھے نہیں مل سکی تھی۔ سو برا بہت چھوٹی تھی، تاکی اماں اسے چوبیس گھنٹے گود میں لیے پھرتیں۔ میں بھی ایسی ہی گود چاہتا تھا جس میں منہ چھپا کر سو رہوں تو مجھے کوئی فکر، کوئی اندیشہ لاحق نہ ہو مگر میں ایسی گود سے محروم

”تمہارے تایا اب مجھ سے ملنے آئے تھے۔“ اس اچانک انکشاف نے اسے بری طرح چونکا دیا تھا۔

”کب۔۔۔؟“

”تمہاری شادی کے فوراً بعد۔۔۔“

”وہ میرے لیے سلیمان کا پرپوزل لے کر آئے تھے اور سلیمان سے شادی کے لیے میں نے خود ہاں کی تھی۔“ وہ بہت نارمل سے انداز میں بتا رہی تھی۔ نیا کی نظروں نے بہت خاموشی سے نوروز کے چہرے کو کھوجا تھا۔

”ابھی تک ای بھی اس بات سے بے خبر ہیں۔“ صائمہ اپنی انگلیاں چٹانے لگی تھی۔
”تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں کہ ابھی کچھ دیر قبل میں غیر ارادی طور پر اندر آئے ہوئے تمہاری بات سن چکی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے تم کسی غلط فہمی کا شکار ہو جاؤ۔ تمہیں معلوم ہے، نوروز! مجھے طلاق کیوں ہوئی تھی؟“

اس نے سوال کیا تھا مگر نوروز کے پاس گوگی چپ کے سوا کوئی جواب نہ تھا۔
”مجھے اس لیے طلاق ہوئی تھی نوروز کہ میں ماں نہیں بن سکتی تھی۔ میں ایک ناجنحہ عورت ہوں۔ بنجر زمین کا ایک ایسا ٹکڑا جس پر لاکھ بارش برسائے، پھول نہیں اگتے۔ میرا وجود ایک صحرا ہے نوروز! ریت ہی ریت بھری ہے میرے اندر۔“ اس کی آواز رندہ گئی۔

نیا کا دل کٹ کر رہ گیا تھا اور نوروز نے کسی گہرے صدمے سے چور ہو کر آنکھیں میچ لی تھیں۔
”ہر انسان اپنی نسل آگے بڑھانا چاہتا ہے۔ فاروق کی بھی یہی خواہش تھی کہ اس دنیا میں اس کا کوئی وارث ہو مگر ڈاکٹر ری رپورٹ نے بہت جلد ثابت کر دیا تھا کہ میں اسے بھی یہ خوشی نہیں دے سکتی، بھی بھی نہیں۔“ صائمہ کی آنکھوں میں آنسو ایک لکیر کی صورت بننے لگے تھے۔

”اس بات کی خبر میری ماں کے بعد صرف تمہارے تایا ابا کو تھی۔ فاروق سے علیحدگی کے بعد ان کی پوری کوشش رہی تھی کہ وہ مجھ میں اور فاروق میں مصالحت کروا سکیں۔ تب مجبوراً انہیں یہ بات بتانی پڑی۔ یہ جرم میرا نہیں، یہ گناہ میں نے نہیں کیا مگر میں سب سے چھٹی پھر رہی تھی۔ میں کسی کو بتانا نہیں چاہتی تھی، لوگوں کی ترحم بھری نظریں، نام نہاد ہمدردیاں، ان سب کا سامنا کرنا میرے لیے بہت مشکل تھا، میں اپنی زندگی سے سمجھوتا کر چکی تھی۔ امی نے ہزار بار چاہا کہ مجھے ایک بار پھر کسی کے لیے باندھ کر اپنا بوجھ ہلکا کر لیں۔ مگر میرے لیے اب یہ ناممکن تھا میں اپنی قسمت کے ہر فیصلے پر سر تسلیم خم کر چکی تھی تمہارے تایا ابا چلے آئے، انہوں نے کہا تھا۔

”میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا، بس ایک آپشن دے کر جا رہا ہوں۔ اس پر غور ضرور کرنا، سلیمان کے بچوں کو تمہاری ضرورت ہے۔ تمہاری سونی گود بھی بھر جائے گی اور سلیمان کا گھر بھی بس جائے گا۔“

اور بٹتے کھلکھلاتے بچے کے اچھے نہیں لگتے نوروز! مجھے تو یوں لگا جیسے میں پیاس سے مری جا رہی تھی اور کسی نے پانی سے لبالب بھرا پیالہ میرے لبوں سے لگا دیا ہو۔ میں نے تو سوچنے کی زحمت بھی نہیں کی اسی وقت ہاں کر دی۔ اب بتاؤ نوروز! کیا میں نے غلط کیا یا تمہارے تایا ابا نے تمہارے

ہی رہ گیا۔ میں اپنی ذات میں پناہ لینے کا عادی ہو چکا تھا اور ایسے میں صائمہ کا رویہ مجھے وہ محفوظ پناہ گاہ فراہم کرتا تھا یہ مجھ سے کئی سال بڑی تھی کسی ماں کی طرح میرا خیال رکھتی کسی بہن کی طرح مجھ سے لاڈ اٹھوائی اور کسی دوست کی طرح لڑتی جھگڑتی رہتی۔

پھر صائمہ کی شادی ہو گئی اور میں بہت رویا تھا یہ سوچ کر کہ میری دوست مجھ سے چھین جائے گی۔ میری پناہ گاہ مجھ سے دور ہو جائے گی۔

مگر پھر یوں ہوا کہ چند ماہ بعد یہ دوبارہ یہاں آ گئی اور میں بہت خوش ہوا گویا مجھے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ میں پہلے کی طرح صائمہ کے پاس بھاگا چلا آتا مگر صائمہ بہت بدل گئی تھی۔ یہ بٹتے بٹتے ایک دم رونے بیٹھ جاتی۔ باتیں کرتے کرتے اپنے خیالوں میں کھوجاتی اور میں افسردہ سا واپس لوٹ جاتا اور جب تک اسے طلاق نہیں ہوئی تھی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں بھی صائمہ سے شادی کے بارے میں سوچوں گا لیکن اس دن میں نے اسے پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا تھا۔ صائمہ کی آنکھ میں آنسو دیکھنا میرے لیے کچھ ایسا آسان نہیں تھا۔ سو مجھے واحد حل یہ ہی نظر آیا کہ میں صائمہ سے شادی کر لوں۔ مجھے اس سے کوئی افلاطونی قسم کا عشق نہیں تھا۔ نہ ہی اسے ہمدردی کہہ سکتے ہیں۔ بس میں اسے خوش دیکھنا چاہتا تھا، بالکل پہلے کی طرح کہ وہ ہنسے تو اس کی آنکھوں میں آنسو نہ آئیں۔

اور جب میں نے تاکی اماں سے اس خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے بتایا، بتایا ابا نایاب کو میرے لیے مانگ چکے ہیں۔ میں بھی ان سے ضد نہیں کرتا تھا۔ ان کے کسی فیصلے سے انحراف کی مجھے کبھی جرات ہی نہیں ہوتی تھی۔ سو یہاں بھی میں بہت آسانی سے ہار گیا۔ ایسا نہیں تھا کہ انہوں نے مجھ کو بہت ڈرا دھمکا کر رکھا ہو مگر ایک ایسی آن دیکھی دیوار تھی جو مجھے میری اپنی قائم کردہ حدود سے آگے بڑھنے ہی نہیں دیتی تھی۔

سو تم میری زندگی میں چلی آئیں اور میں نے ہمیشہ کی طرح سر جھکا دیا۔ تمہیں قبول کر لیا اور اس روز تایا ابا نے کہا تھا۔

”سلیمان واپس آ رہا ہے ہمیشہ کے لیے اور ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کے آتے ہی صائمہ اور سلیمان کا نکاح کر دیا جائے گا۔“

اور یہ بات میرے دل میں تیر کی طرح لگی تھی۔ صائمہ کو اس گھر میں آنا ہی تھا تو میرے حوالے سے بھی آ سکتی تھی۔ مگر ان سب لوگوں نے یہ بات ثابت کر دی وہ اپنے فیصلے مجھ پر ٹھونس کر ہمیشہ کے لئے مجھ پر حاوی رہنا چاہتے ہیں۔ مجھے نہیں یاد پڑتا کہ میں نے انہیں کبھی کوئی ٹھیس پہنچانی ہو پھر نجانے انہوں نے مجھ سے کس بات کا بدلہ لیا ہے۔“ نوروز کہتے کہتے جیسے تھک سا گیا تھا۔

نیا چپ چاپ بیٹھی تھی یہ سب باتیں سننے کے دوران اور سننے کے بعد اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔

تب ہی دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہوا، وہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر چونک گئے، اندر داخل ہونے والی صائمہ تھی۔ جس کے چہرے پر پھیل سیدھی غیر معمولی تھی۔ وہ چلتی ہوئی سیدھی نوروز کے پاس آ کر کھڑی تھی، کچھ لمحے یونہی اسے گھورتی رہی۔ نوروز قدرے حیرت کے ساتھ اسے دیکھنے لگا تھا۔

ساتھ دھوکا کیا۔۔۔؟ انہوں نے تو تمہارے لیے بہتر سوچا۔ نایاب جیسی بیوی مل گئی تمہیں۔ ان سب سے نکل کر لے کر میرا ہاتھ تھامتے تو بچ رہتے میں تھک کر گر جاتے۔ نہ واپسی کا راستہ کھلا ملتا نہ ساتھ چلنے کا یارا رہتا، اب کم از کم ہمارے پاس چلنے کے لیے اپنی اپنی راہیں تو موجود ہیں نا؟“

صائمہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ کمرے میں اس کے سوا دو نفوس تھے اور دونوں ہی اس لمحے ساکت۔۔۔ وہ طویل سانس لیتی وہاں سے اٹھی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھانی کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

کافی دیر بعد نیا نے سر اٹھا کر دیکھا، نوروز کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ کچھ بھی بولنے کے قابل نہ لگ رہا تھا۔ یہ انکشاف ہی ایسا تھا کہ خود نایاب بھی حیرت زدہ رہ گئی تھی۔ ایک بہت مطمئن سی سانس لیتے ہوئے اس نے چادر اوڑھی اور اپنی چار پائی پر لیٹ گئی۔ کمرے میں تاریکی اور خاموشی لمحہ بہ لمحہ گہری ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

گھر میں پھیلنا سناٹا ایسا ہولناک تھا کہ سدرہ کو وحشت سی ہونے لگی تھی سب کے بند کمروں پر حسرت بھری نگاہ ڈال کر وہ پچھلے برآمدے میں آگئی تھی۔ وہاں انیقہ کو دیکھ کر اسے کافی تسلی ہوئی تھی۔

”میں بھی شاید تم بھی سو رہی ہوگی۔“

”اتنی گرمی میں نیند کہاں آتی ہے۔۔۔؟“ وہ اپنے گرد رسالوں کو ڈھیر لگائے بیٹھی تھی مگر سب کے سب بند پڑے تھے۔

”نیا کتنی یاد آتی ہے نا۔۔۔؟ میرا دل چاہتا ہے کسی روز اس سے ملنے چلیں۔“

”ہوں۔“ سدرہ نے مختصر کہا تھا۔ اس کی نظریں آم کے درخت تلے ہلکورے لیتے جھولے پر ٹک گئی تھیں۔ نیچانے کتنے دن ہو گئے تھے انہیں گئے ہوئے۔ مگر ان لمحات کو یاد کر کے اب وہ بھی افسردہ ہو جاتی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد جیسے سارے گھر کو سانپ سو گھ گیا تھا۔ تاپا ابا لڑکھڑاتے ہوئے جا کر اپنے کمرے میں بند ہو گئے تھے۔ تانی یاں نے وہیں تخت پہ بیٹھ کر رونا شروع کر دیا تھا۔ باقی سب گم سم ہو گئے تھے اور سو پر کوا لیس چپ لگی تھی کہ انظر کی ہزار باتوں کے جواب میں بھی نہیں ٹوٹی تھی۔ اس دن سے یہ جھولا یونی خالی ہلکورے لیتا رہتا تھا۔ بھی شام کو بچے جھولنے لگتے مگر گرمی سے گھبرا کر جلد ہی بھاگ لیتے۔

صرف دو افراد کے جلے جانے سے پورے گھر میں ویرانی سی پھیل گئی تھی۔ اس دن کے بعد کئی مرتبہ بارش ہوئی تھی مگر سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں بند ہو گئے۔ وہ چاروں سو گوار انداز میں بیٹھی لگا تار برستی بارش کو دیکھتی رہیں۔

مست ہوا میں، پھولوں سے لدے درخت، پھولوں سے بھری ٹہنیاں اور زمین کی پیاس بجھاتے بارش کے چھوٹے بڑے قطرے سب کچھ وہی تھا۔ بس وہ ایک سرخوشی جو پہلی بارش پہ جسم کے رویں رو میں میں پھوٹ رہی تھی مفقود تھی۔ اس کی جگہ اسی تھی جو بارش کے ہر قطرے کے ساتھ

دلوں پر برس رہی تھی۔

”اور اب تو سوان بھی ختم ہونے کو آیا ہے۔ اللہ جانے کس روز آخری بارش ہو اور یہ مہینہ ہمیں اگلے سال تک کے لیے انتظار سونپ کر چلتا ہے۔“

”اسکنجبین پیوگی؟“ انیقہ کی آواز پر سدرہ چونکی۔

”ہاں۔“

”ٹھہرو، میں برف ڈال کر لاتی ہوں۔ تھوڑی گرم ہوگئی ہے۔“ انیقہ قریب پڑا جگ اٹھا کر بچکن کی طرف بڑھ گئی تھی۔

سدرہ برآمدے کے ستون سے لپٹی بوگن ویلیا کے آتش پھولوں کو ایک ایک کر کے زمین پہ گرتے ہوئے دیکھنے لگی تھی۔

☆☆☆

نیا کی طبیعت اچانک ہی خراب ہو گئی تھی۔ نوروز گھر پہ نہیں تھا، سو صائمہ اسے ساتھ لے کر لیڈی ڈاکٹر کے پاس چلی گئی تھی۔ واپسی ہوئی تو نوروز بے چینی سے ان کا انتظار کر رہا تھا۔

”خیریت تو تھی؟ اتنی دیر لگا دی تم لوگوں نے۔“

”میں نے اسے پہلی مرتبہ کسی کے لیے اتنا فکر مند ہوتے دیکھا ہے۔“ صائمہ نے سرگوشی کی تھی مگر وہ کھل کر مسکرا بھی نہ سکی تھی۔

”نوروز! تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے مجھ سے سنو گے یا نیا سے۔۔۔؟“ صائمہ شوخی پر اتری ہوئی تھی، نوروز نے تھکی تھکی سی نیا کو کمرے کی طرف جاتے دیکھا اور پھر صائمہ کی طرف متوجہ ہوا۔

”تم ہی بتا دو۔“

”تمہارے آنگن میں بہت جلد ایک پھول کھلنے والا ہے۔ میری طرف سے مبارک باد قبول کرو۔“

”کیا واقعی؟“ وہ قدرے جھینپتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ صائمہ نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ مسکرا ہٹ دبا تا کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

”یہ میں کیساں رہا ہوں۔۔۔؟ کیا صائمہ سچ کہہ رہی ہے۔۔۔؟“

”ہاں، اللہ نے ہم پر اپنا بڑا کرم کیا ہے۔ ورنہ صائمہ کے بارے میں جان کر تو مجھے دھڑکا سا ہی لگا رہتا تھا۔“ اس نے معصومیت سے دل کی بات کہہ دی تھی۔ نوروز نے دیکھا، وہ کافی بچھی بچھی سی لگ رہی تھی۔

”نایاب! تم مجھے خوش نہیں لگ رہیں۔“ وہ بغور اس کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ نایاب نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

”نوروز! میں یہ خوش خبری ان لوگوں کو سنانا چاہ رہی تھی جو شاید یہ خبر سن کر ہم سے بھی زیادہ

خوش ہوتے۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا تھا۔ نوروز اس کی بات سن کر ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔

”نوروز! میں گھر جانا چاہتی ہوں۔“ اس نے جیسے التجا کی تھی۔ نوروز نظریں پڑا گیا۔

”یہ بھی گھر ہی ہے۔“ اس کا لہجہ کھوکھلا تھا۔

”نہیں نوروز! میں اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔“ اس نے بے تاب ہو کر اس کا بازو تھام لیا تھا۔

”یہاں بہت اجنبیت ہے۔ درو دیوار اجنبی، غیر آسمان، نا آشنا پھول پتے مجھے یہاں چین نہیں ملتا۔ نوروز! میں یہاں اپنی مرضی سے چل پھر نہیں سکتی۔ کھانا نہیں سکتی اور وہ خالہ نصرت کی عجیب و غریب باتیں، پتا نہیں کیا ذہنیت ہے ان کی۔ میرے لیے تو سانس لینا مشکل ہونے لگا ہے یہاں۔“ وہ خواخوہشیں روئے لگی تھی۔

”تم خواخوہشیں۔۔۔“

”خواخوہشیں نہیں نوروز! تم سمجھتے کیوں نہیں کہ مجھے ذہنی سکون کی ضرورت ہے، جو مجھے صرف وہیں مل سکتا ہے، جہاں سب میرے اپنے ہیں، مجھے چاہنے والے، مجھ سے محبت کرنے والے، آخر تم یہ کیوں نہیں مان رہے کہ تم غلطی کرتے غلط نہیں بہت معمولی سی تھی مگر تمہارا رد عمل بہت شدید تھا اور اب تم وہاں جانے سے خوف زدہ ہو کہ کہیں وہ لوگ نہیں دھتکار نہ دیں۔“ وہ جیسے پھٹ پڑی تھی۔

”ان لوگوں کا سامنا کرنا کچھ ایسا آسان نہیں، اس روز میں نے جو کچھ کہا۔ اب سوچتا ہوں تو خود سے نظر نہیں ملایا تھا۔“ اس کی آواز پست تھی۔

”مجھ جیسے لوگوں کا یہ ہی تو المیہ ہوتا ہے نایاب! ہم لوگ اپنی ذات کے اندر جیتے ہیں، اپنی ذات کے اندر مر جاتے ہیں۔ دوسروں سے رویے برتنے کا سلیقہ نہیں آتا اور جب وقت گزر جاتا ہے تب ہم پیچھتاتے ہیں۔“ وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھتا تھا۔

”ابھی وقت نہیں گزرا ہے نوروز! ابھی تمہاری غلطی پیچھتاوا بن کر تمہاری زندگی میں شامل نہیں ہوئی۔ ابھی تو تلافی کی بہت گنجائش ہے۔ ہم واپس چلتے ہیں نوروز! میں وعدہ کرتی ہوں۔ میں آپ کو، آپ کی ذات میں مقید نہیں رہنے دوں گی۔ چلیں، ہم واپس چلتے ہیں۔“ وہ اسے آمادہ دیکھ کر منت سماجت پہ اتر آئی تھی۔

”جائیں گے نیا! ہمیں لوٹ کر وہیں تو جانا ہے بس تھوڑا انتظار اور۔۔۔“

”دیکھ لینا نوروز! یہ تھوڑا سا انتظار حسرت میں نہ بدل جائے۔“ وہ انجانے واہموں کا شکار ہو رہی تھی۔

”خدا نہ کرے۔“ نوروز کی بے ساختگی نے نیا کے دل و جان میں طمانیت سی دوڑا دی تھی۔

☆☆☆

آج بہت دنوں بعد ہوا شوخی پر اترتی تھی، پھول پتے سب ترنگ میں تھے انکا دیکھا بادل بھی آسمان پر دکھائی دے رہے تھے۔ محکمہ موسمیات کی طرف سے بارش کی پیش گوئی بھی کی گئی تھی۔ اظفر

گھر میں داخل ہوا تو اذیت بڑی حسرت سے آسمان پر چھاتے ہوئے بادلوں کو دیکھ رہی تھی۔ سدرہ تخت پر لیٹی زمین یہ آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔

”دل دکھ رہا ہے۔۔۔؟“ وہ سیدھا اذیت کے پاس آ کر رکھا تھا۔

”شاید یہ سادوں کی آخری بارش ہو۔“ وہ بہت دل گرفتہ لگ رہی تھی۔

”میں سچ کہتی تھی نا، یہ راتر ز واقعی بہت جھوٹ لگتی ہیں، ناولوں، افسانوں میں سادوں کی بارش ڈھیر ساری خوشیاں لاتی ہے۔ ایک یہ ہمارا سادوں ہے، ہماری اولین بارش میں ہی دکھ کی سوغات سے جھولی بھر گیا۔“ وہ شکوہ کناس نظروں سے سرمی بادلوں کو دیکھ رہی تھی۔

”کیا خیال ہے، آج تھوڑا بہت اہتمام نہ کر لیا جائے۔“ اظفر نے سرسری سے انداز میں کہا۔

مگر سدرہ اچھل کر بیٹھ گئی تھی۔

”ہرگز نہیں۔ اس روز اہتمام کر کے دیکھ لیا تم نے، آخری بارش ہے کل بھادوں کا مہینہ شروع ہو جائے گا۔ اسے بھی یونہی برس جانے دو، ہم کسی اور کو نہیں کھونا چاہتے۔“ سدرہ کی آواز بھڑائی تھی۔

اظفر چلتا ہوا اس کے پاس آ بیٹھا۔

”بے وقوف ہو تم۔ ایک دو کے چھن جانے کا غم منار ہی ہو، یہ جواتے سارے تمہارے آس پاس ہیں۔ ان کا تمہیں کوئی خیال نہیں۔ سویرا کا ہی سوچو، اس روز سے کمرے میں بند پڑی ہے۔ وہ میری بیوی ہی نہیں یار! تمہاری بہن بھی ہے، اسے بہلانے کے لیے ہی تھوڑا ہلکا کھانا کھا کر لو اٹھو شاباش۔“ اس کے بے حد اصرار پر وہ دونوں بے دلی سے اٹھ گئیں۔

”اور ویسے بھی سنا ہے، سادوں کی بارش میں کھوئے ہوئے لوگ مل بھی جاتے ہیں۔“ اس کی آخری بات پر دونوں نے بیک وقت اس کی طرف دیکھا۔

”کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟“ وہ کندھے اچکا کر رخ موڑ گیا تھا۔

ذرا سی کوشش کے بعد وہ معیز اور مہران کو بھی متحرک کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ معیز کو اس کی ذمہ داری سمجھاتے ہوئے منڈی کی طرف دوڑا دیا۔ بچوں کو باقی لڑکیوں کو باہر نکلنے کا کام سونپ دیا۔ انہوں نے بیٹ اور ہاکیوں سے دروازے کھٹکھٹا کر ان کا نام میں دم کر دیا اور انہیں اپنے اپنے کمروں سے نکلنے ہی بنی۔

نوروز اور نایاب گھر میں داخل ہوئے تو دونوں کی کیفیات مختلف تھیں۔

نایاب کی چال میں تیزی تھی، اعتماد تھا، خوشی تھی جبکہ نوروز جھک رہا تھا۔ ایک ایک قدم من من بھر کا ہو رہا تھا۔ شرمندگی ہر آن اس کے قدموں سے لپٹی جا رہی تھی۔ گھر کا ماحول اور فضا بالکل وہی تھی جیسی وہ چھوڑ کر گئے تھے۔ بانیوں سے بھرے سیاہ بادل دن میں بھی رات کا سماں پیدا کر رہے تھے۔ پکوان تلنے کی خوشبو سارے گھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ سامنے والے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے لگے تو ہوا کا زور دار جھونکا برآمدے کے شید پہ پھیلی بوگن ویلیا کے سرخ پھولوں کا ایک ڈھیران پر چھا کر گر گیا تھا۔ نیا نے پوں کھلکھلا کر اس کی طرف دیکھا تھا جیسے کہہ رہی ہو۔

”دیکھو، اس گھر کی ہوائیں بھی ہمیں کس طرح خوش آمدید کہہ رہی ہیں۔“

وہ لوگ لاؤنج میں آگئے جو اس دقت بالکل خالی تھا۔ تب ہی سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی

چاپ سنائی دی تھی۔ نوروز ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گیا۔ نجانے کس کا سامنا سب سے پہلے کرنا ہوگا۔

اس نے ڈرتے ڈرتے پلٹ کر دیکھا تھا۔ آخری سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے سویرا ٹھٹھک کر رک گئی۔ ویران آنکھوں میں حیرت ہی حیرت تھی۔ وہ آگے بڑھنے کے بجائے تذبذب کے عالم میں اسے دیکھتی رہی تھی۔

”سنو! سویرا سے سامنا ہو تو اس سے اپنی بہن کی حیثیت سے نہیں میری بیوی کی حیثیت سے ماننا۔ اپنی بہن کو تو ہو سکتا ہے، تم کبھی معاف نہ کر سکو لیکن سویرا انظر اپنی غلطی کا اعتداف شادی کی پہلی رات ہی میرے سامنے کر چکی ہے اور میں یہ قطعی برداشت نہیں کروں گا کہ جس غلطی کو میں بھول چکا ہوں، کوئی دوسرا اسے بار بار دہرائے۔“ انظر کی کچھ دیر پہلے یہی گئی بات اس کے کانوں میں گونجی تھی۔

”سویرا! اپنے بھائی سے ملو گی نہیں، اس کے اپنے درمیان موجود رشتے کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ سویرا آگے بڑھی تھی۔ رک تھی۔ یہ تھی اور پھر بھاگ کر اس کے سینے میں سما گئی تھی۔“

”نوروز بھائی! میں نے۔ میں نے آپ کو بہت مس کیا تھا۔“ وہ بھل بھل آنسو بہانے لگی تھی۔

”ہاں، مجھے یقین ہے کہ تم نے مجھے مس کیا ہوگا۔ بہنوں کے جذبات میں کھوٹ نہیں ہوتا۔“

”آپ پہلے تایا ابا سے مل لیں، آپ کے جانے کے بعد سے وہ بہت دکھی ہیں۔“ سویرا نے کہا تو وہ تایا ابا کے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

”تم کل ہی وہاں چلی جانا۔ یہ اس کی ماں کی جائیداد کے کاغذات ہیں جو چھ سالہ مقدمے کے بعد میں اس کے سوتیلے بھائیوں سے حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہوں اور یہ فائل ان تمام شیئرز پر مشتمل ہے جو مختلف کمپنیوں میں، میں نے اس کے نام سے خرید رکھے تھے۔ اسی میں اس کے بینک اکاؤنٹس کی تفصیلات بھی درج ہیں۔ اگر وہ کبھی کاروبار کے معاملے میں سنجیدگی ظاہر کرتا تو یہ سب باتیں میں خود اسے سمجھا تا مگر اب تم یہ فائلیں اسے دے دینا۔ وہ ہمارے ساتھ رہنا نہیں چاہتا اور میں اسے مجبور نہیں کروں گا۔“

تایا ابا کی آواز بھاری پڑ گئی تھی۔ باہر دروازے پر کھڑے نوروز کا دل ڈوب ڈوب گیا۔

”آپ تو خواخواہ پریشان ہو رہے ہیں میں خود اسے جا کر لے آؤں گی بچہ اگر کنوئیں میں چھلانگ لگانے کو تیار ہو تو کیا ہم اسے لگانے دیں۔ ہرگز نہیں میں اسے سمجھاؤں گی۔ وہ سمجھ جائے گا۔ جانتی ہوں اسے اچھی طرح سویرا کے معاملے کی وجہ سے پریشان تھا اوپر سے بیماری نے چڑا کر رکھا تھا اسی لیے اول فول بکنے لگا تھا۔“

تائی اماں اس کی صفائیاں پیش کر رہی تھیں۔

”ان فرشتہ صفت لوگوں کا دل دکھایا تم نے نف ہے تم پر۔“ اس نے خود پر لعنت بھیجی عین اسی وقت دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ سامنا کرنے کی ہمت ہی نہ رہی چند لمحے تک سامنے خاموشی چھائی رہی پھر تایا ابا کی آواز ابھری۔

”اندر آ جاؤ۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ اسے تایا ابا کے ہونٹوں پر مبہم سی

مسکراہٹ کا شائبہ ہوا تھا۔

”سنجا لو اسے۔۔۔ آگیا ہے تمہارا شہزادہ۔ جی تو چاہتا ہے، کان سے پکڑ کر دو جوتے لگاؤں۔ لیکن شادی شدہ ہو گیا ہے، اس لیے لحاظ کر گیا ہوں۔“ تایا ابا کی آواز خوشی کے تمام رنگوں سے ہم آہنگ تھی۔ اس کی آنکھ میں آنسو چلے آئے۔

”تایا ابا! میں۔۔۔“

”بس، بس۔۔۔ محبت اور خلوص کی پہچان کرنا سیکھو بر خوردار! یہ جذبے اتنے سستے نہیں کہ جب دل چاہا، ٹھوکر مار کر چلتے بنے۔“ وہ کھڑکی میں جا کھڑے ہوئے تھے۔

”سویرا تایا ابا۔“ وہ پیچھے سے جا کر کسی بچے کی طرح ان سے لپٹ گیا تھا۔

”آؤ ادھر دیکھو ذرا، یہ سب لوگ تمہارے بغیر کتنے اداس ہیں۔“ انہوں نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے برابر لا کھڑا کیا۔ عقیبی لان کا منظر واضح تھا، خالی جھولا۔ آسم کے پیڑ کے نیچے بارش کی کن من سے بے نیاز اپنے ہی خیالوں میں کھوئی ہوئی سدرہ۔ پریشان کم سم سے معیز اور مہراں نہ کوئی اچھل کود نہ کوئی شور ہنگامہ۔

”جاؤ بیٹا! جا کر ان سب لوگوں کو ان کی کھوئی ہوئی خوشیاں لوٹا دو۔“

تائی اماں نے آن کر اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا تو وہ اثبات میں سر ہلاتا باہر کی طرف پلٹا۔ سویرا اور نیا ابھی تک اس کی واپسی کا ہی انتظار کر رہی تھیں۔ اسے آتے دیکھا تو پہلے ہی عقیبی لان کی طرف بھاگ کھڑی ہوئیں۔ ذرا سی دیر میں لان عجیب و غریب چیخوں سے گونج اٹھا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھا۔ عین اسی لمحے چھپاک کی آواز سنائی دی۔ وہ ہلک سا بنا کھڑا تھا اور رنگ دار پانی اس کے کپڑوں سے قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔ انظر اس کے استقبال کے لیے پہلے سے تیار تھا۔

”تم گدھے! الو۔“

”اور، اور۔“ انظر ایک ایک قدم پیچھے ہٹنے لگا تھا۔ عین اسی وقت بادل گر جاتا اور ایسی موسلا دھار بارش شروع ہوئی تھی کہ معیز اور مہراں سچ اٹھتے تھے۔

”نوروز بھائی کی گالیوں نے کام کر دکھایا۔“ وہ لوگ اسے کھینچ کھانچ کر بارش میں لے گئے تھے۔ اوپر کھڑکی میں کھڑے تایا ابا اور تائی اماں اپنے آنگن میں ابھرنی ان کی چپکاریں سن رہے تھے اور ان خوشیوں کو بری نظر سے محفوظ رہنے کی دعا کر رہے تھے۔

لان کا منظر بہت مسور کن تھا۔ دھواں دھار برستی ہوئی بارش اٹھکھیلیاں کرتے بچے۔ آسمان کی بلند یوں کو چھوتا ہوا جھولا، سارے لان میں رنگ ہی رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ شہلا اور سویرا، انظر کے ساتھ آم کھانے کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ خود کو ہارتے پایا تو آموں کی ساری گٹھلیاں اس کی گود میں پھینک کر وہ بارش میں آ کر کھلی ڈالنے لگیں۔

تائی اماں کیس کا چھوٹا سا چوہا اٹھا کر برآمدے میں لے آئیں اور بارش کی ہلکی پھورا کا مزا لیتے ہوئے پورے تلتے لگیں۔ چھوٹی چچی اپنے سر درست کر چکی تھیں۔ پورے تلتے ہوئے وہ بڑی موج میں گارہی تھیں۔

ساون بر سے
ساون بر سے
رستوں پر کھرا ہرائے
مینا، مور، پیپہا گائے
مست یون کے جھونکے آئیں
تجھ بن سخی، میں بے رنگی
کیسے نکلوں گھر سے
ساون بر سے

ساون میں بھیکے خوشیوں کے تمام رنگ مکمل تھے۔

